اے حمید

گلستانِ ادب کی سنہری یادیں



گلستانِ ادب کی سنہری یادیں

اے حمید

ناشر
مکتبہ القریش ◎ سرکلر روڈ
اردو بازار۔ لاہور۲۔ فون: 7668958
E.mail: al_quraish@hotmail.com

معیاری اور خوبصورت کتابیں

بااہتمام محمد علی قریشی

بار اول ـــــ 2007ء

مطبع ـــــ نیر اسد پریس

ڈیزائن ـــــ عبیداللہ

کمپوزنگ ـــــ کلاسک گرافکس

قیمت ـــــ 250/- روپے

انتساب:

اپنے پیارے بھانجے

لیفٹیننٹ کرنل (ر) طارق احتشام کے نام

خوشبودار...... پراسرار...... اے حمید

امرت سر کی گلیاں اور کوچے جانتے ہیں۔

اے حمید تب بھی ایسا ہی تھا...... شفاف رنگ، چھریرا بدن...... رومان پسند و رومان پرور...... عالی ذوق و عالی ظرف...... جاذبِ دید...... جاذب لباس...... کوٹرائے کا نفیس تراشیدہ کوٹ...... گداز مفلر اور اس کے ہونے سے اطراف میں پھیلتی ایلن مور کے تمباکو کی مسحور کن خوشبو......

آخر کسی کو تو ایسا ہونا چاہیے تھا......

آخر کسی کو ایسا بھی تو ہونا تھا......

اور وہ ہو گیا تھا...... یا شاید جماندرو ہی ایسا تھا...... دوسری بات صحیح کے زیادہ قریب ہے...... کوئی ہوتا ہے...... یا کوئی نہیں ہوتا......

خود پہ اس کا خود کب وا ہوا......؟ یہ وہ خود جانتا ہے...... مگر دوسروں پہ بھی جلد ہی کھل گیا...... ایک ایک پرت...... ایک ایک تہ...... تہ در تہ...... پرتوں اور تہوں سے بنا...... رنگوں اور خوشبوؤں میں بسا...... جب جب، جو جو پرت کھلی سارے میں اک نمکین سی مٹھاس گھل گئی...... خوشبودار، نمکیلی سی مٹھاس......

ہم عصران میں بھی اور اس کے عصر سے ذرا پہلے کے عہد میں بھی کیا کیا نابغہ روزگار قلم کاروں نے جنم لیا...... سرزمینِ ہند میں کیسے کیسے انوکھے پیدا ہوئے...... اپنے اپنے اسلوب میں یکتا...... گل کاریٔ قلم میں یگانہ...... اپنے اپنے رنگ میں رنگے...... اپنے اپنے پروازِ خیال میں اکلوتے۔

اس سارے میں کہیں سے وہ نمودار ہوا...... اس دُبلے پتلے، اُداس آنکھوں اور مضطرب نگاہوں والے ایک کشمیری نے ایک خوش رنگ و خوشبو کلی گلستانِ ادب کی نظر کی۔ ایک جدا رنگ...... ایک جدا خوشبو...... ایک جدا انگ...... سب نے پڑھا...... ایک نظر اس ابھرے بدن کے خوش رنگ و وضع دار پر ڈالی اور زبان سے نکلنے والی "واہ" کو روکنا ان کے یارے میں نہ تھا۔

وہ اپنے ڈھب کا نرالا ہے۔ اس کا ہونا محبت کی نرم آنچ میں پکا ہے...... مکئی کے آٹو دانے کی طرح...... نرم نرم...... اور کوسا کوسا......

خواب آسا...... رومان کی پرورش اپنے اچھوتے، انوکھے جذبوں سے کرنے والا......

اس کا ذوق ذائقے سے بندھا ہے...... اور شوق لمس سے...... وہ ہر تجربے کو محسوس کرتا ہے اور ہر تجربے کو محسوس کرواتا ہے...... چھوٹے چھوٹے تجربات...... ننھی ننھی جزئیات جب اس کے قلم سے ادا ہوتی ہیں تو قاری کو ان کی اہمیت کا ادراک ہوتا ہے۔ سگار کی خوشبو کا لمس...... سیلون کی چائے کا لمس...... بھاپ اُڑاتی کافی کا لمس...... برفیلی سردیوں میں ادھ کھلی کھڑکی سے در آنے والے کہرے کا لمس...... ساگوان، دیوار اور چنار کے درختوں پہ چھائے سکوت کا لمس...... تا حد نگاہ زمین کو ڈھانپے گیندے کے پھولوں کی باس کا لمس...... مینہ برسنے کی سُر تال کا لمس...... سِلی سِلی تنگ گلیوں کی عجیب سی ٹھنڈ کا لمس...... جدا ہوتے موسموں کے آخری اُداسی بھرے معانقے کا لمس...... پو پھٹنے سے ذرا پہلے اوس کے پانیوں کا ہریالے سے مخموری وصال کا لمس...... ہر لمس ذائقے سے بندھا ہے...... ہر واقعہ لمس اور ہر حاصل واقعہ ایک ذائقہ...... زبان سے تالو کے پچھلے حصے تک ایک ان مٹ یاد کی لکیر چھوٹ جانے والا ذائقہ۔

ایسے اَن چھوئے لمس اور ان کہے نہ جانے کتنے ذائقے کہاں ملتے تھے......؟

اب تک یہ تو ہوا تھا کہ کردار چھوٹی زمین اور تنگ آسمان والی گلیوں سے گزرتے ضرور تھے...... لیکن اب تک یہ نہیں ہوا تھا کہ قاری کو بھی ان تنگ اور تاریک گلیوں کی ٹھنڈی دیواروں سے اٹھتی سیلن محسوس ہوئی ہو۔

اب تک یہ تو ہوا تھا کہ کردار اِک گوشۂ رنگ و بُو سے محظوظ ہوا تھا۔

اب تک یہ نہیں ہوا تھا کہ پڑھنے والے کی حسیاتِ بصارت و شامہ نے اس رنگ اور اس بُو کو اپنے مشامِ جاں کا جزو بنتے محسوس بھی کیا ہو۔

آتش دان میں سلگتی صندل کی لکڑی نے افسانے کے کردار کے اردگرد کو تو گرمایا تھا مگر صندلی سلگتی لکڑی کی خوشبو قاری پہ حاوی کبھی نہ ہوئی تھی۔

خزاں زدہ خشک زرد پتوں کا ذکر تو ملتا ہے لیکن خزاں زدہ خشک زرد پتوں پہ چلنے سے سکوت میں در آنے والے ارتعاش سے قاری کی سماعتیں نا آشنا ہی تھیں۔

اسبابِ فطرت کے ذکر سے دنیا کا ادب تہی نہیں...... لیکن اسبابِ فطرت کی رگوں میں مچلتے جذبوں کے ساتھ وارفتگی اور نسبت اور کہاں ملتی ہے......؟ اس کے یہاں فطرت بے جان نہیں، باقاعدہ جان دار ہے...... جیتے جاگتے کرداروں سے کہیں زیادہ جیتی جاگتی...... اتنی جیتی جاگتی کہ جیتے جاگتوں کو جیتے جاگتے کا وجدان دان کرتی...... اگر اسے خیاروں کے درمیان چوکڑیاں بھرتے سکوت سے پیار ہے تو وہ سکوت بھی تو اس کے ساتھ چہلیں کرتا ہے۔

اگر اسے آتش دان میں سلگتے صندل کی کیف آگیں خوشبو سے عشق ہے تو صندل کی خوشبو بھی تو اسے مثلِ دوشیزہ تو بہ شکن اپنی بانہوں میں لے کر آمادۂ رقص کرتی ہے۔

اگر اسے سری لنکا کے پراسرار جنگلوں کی باس سے تعلق ہے تو سری لنکا کے پراسرار جنگلوں کی باس بھی تو ان جانے رستوں پہ اس کی انگلیوں میں انگلیاں پھنسائے چلتی رہتی ہے۔ اس کا سر اپنی گود میں لے کر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی ہے۔

لاہور کی سڑکیں اور بازار دیکھتے ہیں۔

اے حمید اب بھی ویسا ہی ہے۔ شفاف رنگ، چھریرا بدن...... رومان پسند و رومان پرور...... جاذبِ دید...... جاذبِ لباس...... وہی کوٹرائے کا نفیس کوٹ...... وہی گداز مفلر...... اور وہی اس کے ہونے سے اطراف میں پھیلتی ایلن مور کے تمباکو کی مسحور کن خوشبو......!

احمر سہیل بسرا

پروڈیوسر ریڈیو پاکستان

فہرست

سید محمد وجیہہ السیما عرفانی

حضرت سید محمد السیما عرفانی چشتی رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ اپنی چالیس، پینتالیس سالہ دیرینہ رفاقت کا جو اعزاز مجھے حاصل ہے اس پر میں جتنا بھی فخر کروں کم ہوگا۔ اس پُرنور رفاقت کا جزو اعظم میری ان سے محبت تھی۔ اپنی دوستی کا شرف انہوں نے خود مجھے عطا کیا تھا۔ جس پر آج میں ناز کرتا ہوں۔ حضرت صاحب کی صحبت میں گزارے ہوئے پرانوار لمحات کو قلمبند کرنے سے پہلے میں ایک دو باتوں کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ پہلی بات یہ کہ میں الحمدللہ مسلمان ہوں۔ اللہ اور اس کے نبی آخر الزمان ﷺ پر میرا ایمان ہے۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کے نام پر میری جان بھی قربان۔ بزرگان دین اور صوفیائے عظام کو میں وہ مینارۂ نور سمجھتا ہوں جن کی روشنی سالک راہ حقیقت کی رہنمائی کرتی ہے۔ میلان طبع کے اعتبار سے میں لٹریچر یعنی ادب نگاری کا طالب علم ہوں اور یہی وجہ شناخت بن گئی ہے۔ لٹریچر میں میرا رجحان رومانیت کی طرف ہے جس کا سرچشمہ خالق کائنات کی مخلوق سے محبت ہے۔ اس اعتبار سے میں محبت کا آدمی ہوں۔ وہ رشتہ محبت ہے جس نے مجھے آج سے پینتالیس سال پہلے عرفانی صاحب کی شخصیت اور ان کی ذات سے وابستہ کیا۔ اس وقت میں ان کے تبحر علمی اور ان کے وجدان کی گیرائی اور گہرائیوں سے واقف نہیں تھا۔ یہ میری محبت تھی جو مجھے بے اختیار ان کی طرف کھینچ کر لے گئی۔ جس طرح کوئی بڑا سیارہ کسی چھوٹے سیارے کے قریب سے گزرے تو چھوٹا سیارہ خود بخود کھنچ کر بڑے سیارے کی طرف آ جاتا ہے۔ علاوہ بریں محبت کے معاملے میں، میں پہلی نظر کی محبت کا قائل ہوں۔ عرفانی صاحب سے میری محبت پہلی نظر کی محبت تھی۔ میں نے انہیں دیکھا اور ان کی محبت کا اسیر ہو گیا۔

اس وقت مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ میرے چھوٹے سے حقیر سے سیارے نے ایک بہت بڑے روشن اور درخشاں سورج کو پکڑ لیا ہے۔ جب مجھ پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا تو عرفانی صاحب نے تبسم فرمایا اور کہا۔

''دل کا دروازہ کھلا ہو تو روشنی کے ساتھ کبھی کبھی سورج بھی گھر میں آ جاتا ہے۔''

میں حضرت صاحب کو اگر اپنی تحریر میں کبھی عرفانی صاحب کے نام سے یاد کروں تو اسے میری گستاخی پر محمول نہ کیا جائے۔ اس امر کی اجازت خود انہوں نے مجھے عطا کر رکھی تھی اور ان کے ساتھ گزرے ہوئے طویل عرصے کے مختلف النوع واقعات کی حقیقت نگاری کے لئے بھی انہیں کبھی کبھی اس نام سے یاد کرنا میرے لئے ازبس ضروری ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ عرفانی صاحب نے لاہور میں اپنی ابتدائی مجلسی زندگی کا سب سے غالب عرصہ لاہور ریڈیو سٹیشن اور لاہور کی صحافتی فضاؤں میں گزارا اور مجھے دونوں فضاؤں میں ان کی رفاقت کا شرف حاصل رہا۔

ریڈیو سٹیشن اور صحافتی دنیا کے لوگ میرے اور حضرت صاحب کی رفاقت کے عینی گواہ رہے اور آج بھی اس حقیقت کی گواہی دیں گے۔

حضرت عرفانی صاحب سے میری گفتگو کا غالب پہلو فلسفہ یورپ اور عالمی ادب' (خاص طور پر عربی' فرانسیسی اور برطانوی ادب) ہوتا تھا۔ تصوف' وجدان اور علوم دینی پر بھی وہ بلاغت کمال سے گفتگو فرماتے اور ایسے ایسے گہرہائے تابدار میری آنکھوں کے سامنے لاتے کہ جن کی روشنی مجھے چکا چوند کر دیتی۔ میں اسے تقاضائے ربی ہی سمجھتا ہوں کہ جب کبھی عرفانی صاحب مجھ سے فلسفہ یورپ' عالمی ادب' عربی فارسی لسانیات' علوم دینی و اخلاقی اور قرآن پاک کی عظمت پر گفتگو کرتے تو میں گھر جا کر ان کی بحث کی بعض باتیں نوٹ کر لیتا تھا۔ آج وہ ساری لکھی ہوئی یادداشتیں میرے کام آ رہی ہیں۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ انشاء اللہ ان یادداشتوں کی راہنمائی اور اپنی محبت کی روشنی میں حضرت عرفانی صاحب پر ایک کتاب ضرور لکھوں گا۔ یہ مجھ پر واجب بھی تھا۔ ایک ادیب ہونے کے ناطے میرا فرض بھی بنتا تھا اور یہ میرے لئے ایک اعزاز کی بات بھی تھی اور یہ میری اس محبت اور عقیدت کا تقاضا بھی تھا جو مجھے عرفانی صاحب سے تھی اور

آج بھی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ وقت آ گیا ہے۔

بعض لوگ سورج کو اس وقت دیکھتے ہیں جب وہ آسمان کے وسط میں اپنی پوری تابانیوں اور آب و تاب اور جلال و جمال کے ساتھ چمک رہا ہوتا ہے۔ بعض لوگ سورج کا اس وقت نظارہ کرتے ہیں جب وہ مشرقی افق سے سنہری کرنوں کی روشنی بکھیرتا طلوع ہو رہا ہوتا ہے۔ میں ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہوں جنہوں نے سورج کو طلوع ہوتے دیکھا ہے۔ مجھے حضرت عرفانی صاحب سے اس وقت ملاقات کا شرف حاصل ہوا جب وہ طلوع آفتاب کی طرح لاہور کے افق پر اپنی تمام تر نورانی کرنوں کے ساتھ نمودار ہو رہے تھے۔ سورج اس وقت بھی پورا سورج ہوتا ہے جب وہ طلوع ہو رہا ہوتا ہے اور ہمیں اس کا صرف ایک روشن کنارا ایک روشن قوس ہی نظر آتی ہے یہ میری خوش قسمتی تھی کہ طلوع آفتاب سے قبل میرا چہرہ مشرقی افق کی جانب تھا۔ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ میرا رخ شہر کی اس آبادی کی طرف تھا جس طرف سے حضرت عرفانی صاحب تشریف لا رہے تھے۔ حضرت صاحب کی صحبت پرنور میں گزارے ہوئے ایک طویل عرصے کی عکس بندی یا قلمبندی میں' میں کسی مبالغے سے کام نہیں لوں گا۔ میں واقعات کو من و عن بیان کرتا چلا جاؤں گا۔

ان کے علمی مواعظ' ان کی فکر انگیز باتوں کو اپنی یادداشتوں اور یادوں کی روشنی میں حرف بہ حرف لکھتا رہوں گا۔ میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس عہد زریں میں حضرت عرفانی صاحب جو گفتگو فرماتے تھے میں اس کے نوٹ ایک طرح سے شارٹ ہینڈ کی شکل میں اپنے ذہن کے کمپیوٹر میں فیڈ کر دیتا تھا۔ میں ایک بار پھر عرض کرنا چاہوں گا کہ میں محبت کا آدمی ہوں اور سچی محبت کرنے والوں کی یادداشت بڑی تیز ہوتی ہے۔ پینتالیس برس کا عرصہ بظاہر ایک طویل عہد ہوتا ہے مگر جب میں پیچھے مڑ کر ایک نظر ڈالتا ہوں تو مجھے وہ سارا زمانہ یادوں کی روشنی میں اپنی تمام تر جزئیات اور تفصیل کے ساتھ بالکل صاف اور روشن دکھائی دینے لگتا ہے۔ میں عرفانی صاحب کو چلتے پھرتے' چائے پیتے' اپنے ساتھ باتیں کرتے' خاص انداز میں مسکراتے دیکھتا ہوں۔ میں انہیں حضور نبی کریمؐ کے ذکر مبارک پر رقت کے عالم میں اشکبار دیکھتا ہوں۔ اس وقت مجھ پر بھی رقت طاری ہو جاتی تھی۔ حضرت عرفانی صاحب کو حضور نبی اکرمؐ کی

ذات بابرکات سے جو محبت تھی اس کا اندازہ لگانے کیلئے میں بڑا کمتر اور چھوٹا آدمی ہوں۔

عرفانی صاحب کوچہ عشق و رقت کے شہسوار تھے اور میں اس کوچے کی گرد تھا اور گرد و غبار ہوں۔ مجھے اس پر بھی فخر ہے' ناز ہے کہ یہ غبار اپنے شہسواروں کے پیچھے پیچھے اڑتا اڑتا ایک نہ ایک دن مجھے بھی پار اتار دے گا۔ حضرت عرفانی صاحب کو حضور اکرم سے جو بے پایاں محبت اور عشق تھا اس نے ان پر انوار ربانی کے در کھول دیئے تھے۔ میری ان سے تقریباً ہر روز مجلس لگتی تھی اور کوئی مجلس ایسی نہیں ہوتی تھی جس میں گفتگو کے دوران حضور نبی پاکؐ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک نہ ہوتا ہو اور جب بھی حضور اکرم کا ذکر پاک ہوتا تو عرفانی صاحب پر بے اختیار رقت طاری ہو جاتی۔ وہ دیر تک اسی عالم رقت میں رہتے۔ میں بھی سر جھکائے خاموش ان کی خدمت میں بیٹھا رہتا پھر وہ خود ہی گفتگو کا سلسلہ شروع کرتے اور میں حسب عادت ہمہ تن گوش ہو جاتا۔

محبت میں بڑا اثر ہوتا ہے۔ سچی محبت کرنے والوں کو دوسرے کے دل کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔ میری محبت نے تو عرفانی صاحب کے پاؤں کو میری آغوش میں جکڑ ہی رکھا تھا لیکن عرفانی صاحب بھی مجھ سے بڑا پیار کرتے تھے۔ کبھی کبھار اگر میں ان سے بے تکلف ہونے کی کوشش کرتا تو وہ ہنس دیا کرتے تھے۔ میری بے تکلفی یہ ہوتی تھی کہ وہ چائے پی رہے ہوتے تو میں ان کے آگے سے ان کی پیالی اٹھا لیتا اور کہتا۔ مجھے اجازت دیں کہ اس پیالی میں سے تھوڑی سی چائے پلیٹ میں ڈال کر میں بھی پی لوں۔ یا کبھی ان کی جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ کا پیکٹ نکال لیتا۔ ایسے موقعوں پر وہ صرف تبسم فرما کر خاموش ہو جاتے تھے۔

ان چھوٹی چھوٹی بے تکلفیوں سے قطع نظر میں ان کا بے حد احترام کرتا تھا۔ یہ میں سن 49-1948ء کی بات کر رہا ہوں جب ریڈیو سٹیشن لاہور کی پرانی عمارت کے سٹاف اور اخباری دنیا میں عرفانی صاحب کی بظاہر شناخت ایک اخبار نویس کی حیثیت سے تھی لیکن اس وقت بھی' میں انہیں ایک اخبار نویس سے بہت بلند مقام کی شخصیت سمجھتا تھا۔ اس وقت میں بھی ان کے تبحر علمی اور دل و دماغ کے جلال و جمال کی نورانی دنیا سے واقف نہیں تھا مگر میں ان کا بے حد ادب کرتا تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ مجھے ان

سے محبت ہو گئی تھی۔ یہ پہلی نظر کی محبت تھی۔ میں نے ان کے چہرے پر کچھ دیکھ لیا تھا۔ وہ کیا تھا؟ میں کوشش بھی کروں تو اسے الفاظ کی شکل میں بیان نہیں کر سکتا۔ نہ بہت پہلے بیان کر سکتا تھا' نہ اب بیان کر سکتا ہوں اور نہ آگے چل کر کبھی بیان کر سکوں گا۔ یہ کوئی ماہتاب ہوتا ہے' کوئی چاند ہوتا ہے جو خدا کے اشارے پر دل کے اندر ہی اندر اچانک طلوع ہوتا ہے۔ دل کے اندر ہی اندر ہر شئے کو انوار الٰہی سے منور کر دیتا ہے۔ یہ چاند خود تو نظر نہیں آتا مگر اس کی روشنی کا عکس چہرے پر ضرور جھلک اٹھتا ہے۔ شاید اسی روشنی کی ایک جھلک تھی جو مجھے عرفانی صاحب کے معصوم اور ہر وقت نیم متبسم رہنے والے چہرے پر نظر آ گئی تھی۔

بہرحال یہ ایک زندہ حقیقت ہے کہ میں انہیں ایک نظر دیکھتے ہی ان کا گرویدہ ہو گیا تھا۔ ابھی میں نے عرفانی صاحب سے کوئی بات نہیں کی تھی ان کی زبان سے کوئی بات نہیں سنی تھی۔ ابھی میں نے ان کی آواز بھی نہیں سنی تھی۔ صرف انہیں سٹیج پر ایک طرف سے دوسری طرف جاتے ہی دیکھا تھا۔ غالباً یہ 1948ء کی بات ہے۔ راولپنڈی میں ایک کل پاکستان مشاعرہ ہو رہا تھا۔ پنڈال سجا تھا۔ میں بھی اپنے شاعر دوستوں کے ساتھ پنڈی پہنچ گیا تھا۔ محض ایڈونچر کے طور پر حالانکہ میں شاعر نہیں ہوں۔ عرفانی صاحب دبلے پتلے نوجوان تھے۔ بال گہرے سیاہ اور لہریالے' چہرے پر اوائل شباب کی چمک اور معصومیت تھی۔ یہ معصومیت اور چمک ان کے چہرے پر اواخر عمر میں بھی درخشندہ و تابندہ رہی۔ میں اس کل پاکستان مشاعرے کی بات کر رہا تھا جو شاید پاکستان کا پہلا عظیم الشان مشاعرہ تھا۔ اس مشاعرے میں عرفانی صاحب نے سٹیج کا انتظام و انصرام سنبھالا ہوا تھا۔ میں پنڈال کی اگلی قطار میں اپنے لاہور کے دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ میں نے سرسری نظر سے عرفانی صاحب کو سٹیج پر مصروف کار دیکھا اور مجھے ان کے مسکراتے ہوئے چہرے پر ایک روحانیت سی نظر آئی۔ پھر ایسا ہوا کہ عرفانی صاحب دوبارہ دکھائی نہ دیئے۔ شاید وہ دوسری جانب یا سٹیج کے پیچھے کسی کام میں مصروف ہو گئے تھے۔ بہرحال ہم لوگ ایک رات راولپنڈی میں گزار کر اگلے دن واپس لاہور آ گئے۔ اگر میں بھول نہیں رہا تو ان دنوں عرفانی صاحب راولپنڈی میں اخبار نوائے وقت کے نامہ نگار خصوصی تھے۔

لاہور میں عرفانی صاحب سے میری دوسری ملاقات ہوئی۔ اس زمانے میں عرفانی صاحب اپنے دستخط ڈبلیو ایس عرفانی کے نام سے کیا کرتے تھے۔ ان دنوں ریڈیو پاکستان لاہور کا نام پاکستان براڈ کاسٹنگ سروس لاہور تھا اور اس کے دفاتر اور سٹوڈیوز شملہ پہاڑی کے پیچھے ایک پرانے بنگلے میں ہوا کرتے تھے۔ میں وہاں نیا نیا بطور سٹاف آرٹسٹ کام پر لگا تھا۔ ریڈیو کے ساتھ میری وابستگی تو شروع سے ہی تھی۔ فیچر' تقاریر اور ڈرامے وغیرہ لکھا کرتا تھا مگر سٹاف آرٹسٹ بن جانے سے میری ایک معینہ تنخواہ لگ گئی تھی۔ سوائے نظم کے تقریباً ہر پروگرام کے لئے مجھے کچھ نہ کچھ لکھنا پڑتا تھا چونکہ میرا کام ہی لکھنا تھا اس لئے یہ کام مجھے اچھا لگتا تھا۔ چونکہ دفتر آنے جانے کی کوئی پابندی نہیں تھی اس لئے میں اپنے کام سے بہت ہی خوش تھا۔ تقریر' ڈرامہ' کمپیئرنگ وغیرہ میں گھر سے لکھ کر لے آتا تھا۔ ریڈیو سٹیشن پر سوائے دوستوں کے ساتھ کینٹین میں بیٹھ کر چائے پینے' پروگرام کے بارے میں باتیں کرنے اور کبھی کبھی کوئی ایمرجنسی سکرپٹ لکھ دینے کے اور کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔

پاکستان نیا نیا بنا تھا۔ بڑا جوش اور جذبہ تھا۔ تعمیر نو کے علاوہ دینی پروگرام بھی بڑی محنت سے تیار کروا کے نشر کئے جاتے تھے۔ سارے کے سارے پروگرام جوں کے توں یعنی (Live) ہوتے تھے۔ ابھی پروگراموں کے لئے ان شعبہ جات کی قابل اور لائق ترین شخصیات سے رابطہ قائم کیا جاتا تھا۔ اس ضمن میں عربی لغت کے ایک پروگرام کی تیاری کیلئے عرفانی صاحب کو بھی مدعو کیا گیا۔ مجھے یاد ہے میں ریڈیو سٹیشن کی عمارت کی دوسری منزل میں پروگرام پروڈیوسروں کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ وہاں پر شاد امرتسری کے علاوہ پروڈیوسر بدل حق محمود بھی بیٹھے تھے۔ سردیوں کا موسم تھا عرفانی صاحب گیلری میں سے ہوتے ہوئے کمرے میں تشریف لائے۔ سیاہ چمکیلی شرعی داڑھی' آنکھوں پر نظر کا چشمہ' جس میں سے جھانکتی روشن روشن آنکھیں اور تھری پیس گرم سوٹ پہنے ہوئے چہرے پر وہی روحانی چمک' معصومیت اور نورانی سی مسکراہٹ۔

میں نے انہیں فوراً پہچان لیا۔ راولپنڈی والے کل پاکستان مشاعرے کے بعد میں انہیں دوسری بار دیکھ رہا تھا۔ کمرے میں دونوں پروڈیوسروں کے علاوہ کچھ دوسرے لوگ بھی بیٹھے تھے۔ عرفانی صاحب کمرے میں داخل ہوئے تو میں احتراماً کھڑا ہو گیا۔

ریڈیو کے دونوں پروڈیوسر میرے کولیگ بھی تھے اور میرے دوست بھی تھے۔ انہوں نے میرے اٹھ کھڑے ہونے پر میری طرف بڑی حیرانی سے دیکھا کیونکہ وہ عرفانی صاحب کو ایک Talker سمجھ رہے تھے یعنی جو ریڈیو پروگرام میں حصہ لینے آئے تھے اور بھی کوئی پروڈیوسر کسی ٹاکر کے لئے کرسی نہیں چھوڑتا۔ مجھے ان دونوں پروڈیوسروں کے حیران اور متعجب چہرے آج تک یاد ہیں جبکہ عرفانی صاحب میری طرف دیکھ کر مسکرا رہے تھے اور میں نے کرسی چھوڑ کر ان کا جو ادب و احترام کیا تھا اس کے لئے ان کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک آ گئی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر ان سے ہاتھ ملایا۔ میرے پاس کہنے کیلئے کچھ بھی نہیں تھا۔ صرف محبت اور عقیدت تھی۔ میرا چہرہ فرط جذبات سے سرخ ہو رہا تھا۔ مجھے یاد ہے بالکل ایسے جیسے یہ کل کی بات ہو۔ عرفانی صاحب نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور مسکراتے ہوئے کہا۔

''ایک تقریر لکھنے کے سلسلے میں آیا ہوں۔''

اس پر متعلقہ پروڈیوسر نے انہیں اپنے پاس بٹھا لیا اور پروگرام کے بارے میں ضروری باتیں ہونے لگیں۔ میں کمرے سے نکل کر دوسری منزل والی گیلری میں آ گیا۔ یہاں سنہری دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ نیچے لان میں سے سبزے اور سویٹ پیز کے پھولوں کی ہلکی ہلکی خوشبو آ رہی تھی۔ میں گیلری کے ستون کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اب میں اس انتظار میں تھا کہ عرفانی صاحب باہر نکلیں تو میں انہیں ساتھ لے کر ریڈیو کینٹین میں جاؤں اور انہیں چائے پلاؤں۔ بس میرا دل چاہ رہا تھا۔ حالانکہ اس وقت تک میں عرفانی صاحب کے پورے نام سے بھی واقف نہیں تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ عرفانی صاحب عربی' فارسی' انگریزی اور فلسفہ کے بہت بڑے عالم ہیں اور علوم دینی' علوم شرقیہ اور منقولات و معقولات پر انہیں کس قدر عبور حاصل ہے۔ ابھی میری ان سے کبھی کوئی بات بھی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن میں ان کے حلقہ کشش میں آ چکا تھا۔

گیلری میں کھڑا خدا سے یہی دعا مانگ رہا تھا کہ کہیں پروڈیوسر بھی عرفانی صاحب کے ساتھ ہی باہر نہ آ جائے۔ یا وہ ان کے لئے اوپر ہی چائے نہ منگوا لے۔ دراصل میری اس وقت کی حالت بالکل ایسی تھی کہ جس طرح کسی محبت کرنے والے کو اس کا محبوب اچانک مل جائے اور وہ اس کے ساتھ تنہائی میں بیٹھ کر باتیں کرنے کو بے

چین ہو۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں۔ لاہور ریڈیو سٹیشن کی یہ پہلی عمارت ایک پرانی وضع کی کوٹھی تھی۔ اس کے دو گیٹ تھے جن پر لوہے کے دروازے لگے ہوئے تھے۔ ایک دروازہ مستقل طور پر بند رہتا تھا۔ جس کے باہر پان سگریٹ والا لڑکا بیٹھتا تھا۔ ہم جنگلے میں ہاتھ ڈال کر اس سے پان اور سگریٹ لیتے تھے۔ دوسرے گیٹ پر پہرے دار ہوتا تھا۔ کوٹھی کا سامنے والا لان بڑا چھوٹا تھا۔ اس میں سوائے گھاس کے اور کچھ نہیں تھا۔ دیوار کے ساتھ ساتھ مالی موسم کے پھول لگا دیتا تھا۔ گیٹ کے اندر داخل ہوں تو وہاں آمنے سامنے چیڑھ کے تین چار درخت لگے تھے۔ یہ درخت پہاڑوں پر پوری آن بان کے ساتھ اپنی بہار دکھاتے ہیں۔ میدانی علاقوں میں یہ اداس اداس رہتے ہیں۔ ایک بار ان درختوں کی طرف اشارہ کر کے عرفانی صاحب نے مجھے کہا تھا۔

''صحیح آدمی غلط جگہ پر آ جائے تو اس کی پریشانیوں میں اضافہ بھی ہو جاتا ہے اور یہ اس کی آزمائش کا وقت بھی ہوتا ہے۔''

لاہور ریڈیو کی پرانی کوٹھی کے لان میں اگے ہوئے چیڑھ کے درخت سخت آزمائش میں ڈال دیئے گئے تھے۔ پھر بھی ان کی ہمت تھی کہ ابھی تک زندہ تھے۔ کوٹھی کے پیچھے بھی ایک کھلی جگہ تھی۔ جہاں ایک فوارے کا حوض تھا جو خشک پڑا تھا اور اس میں سگریٹ کی خالی ڈبیاں اور جلے بجھے ٹکڑے پڑے رہتے تھے۔ پہلو میں کوٹھی کا گیراج تھا اسی گیراج میں ریڈیو سٹیشن کی کینٹین تھی۔ کچھ کرسیاں گیراج کے اندر اور کچھ گیراج کے باہر رکھی ہوئی تھیں۔ ہم لوگ اسی جگہ بیٹھ کر چائے پیتے تھے۔ اس روز میں اس کینٹین میں عرفانی صاحب کے پاس بیٹھ کر چائے پینا چاہتا تھا۔ کچھ دیر پروگرام پروڈیوسر سے باتیں کرنے کے بعد عرفانی صاحب کمرے سے باہر تشریف لائے۔ مجھے گیلری میں ستون کے پاس کھڑے انتظار کرتے دیکھا تو مسکرائے۔

میں نے کہا چلیے کینٹین میں چل کر چائے پیتے ہیں۔ عرفانی صاحب نے بڑی کشادہ دلی سے میری حقیری سی دعوت قبول کر لی۔ ہم دوسری منزل کی سیڑھیاں اتر کر کینٹین میں آ گئے۔ موسم چونکہ سرد تھا چنانچہ ہم گیراج کے اندر بیٹھے۔ میں نے چائے منگوائی اور عرفانی صاحب سے پروگرام کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔ بہت جلد مجھ پر یہ انکشاف ہو گیا کہ عرفانی صاحب عربی' فارسی کے بہت بڑے عالم ہیں اور خاص طور

پر عربی لغت پر انہیں بے پناہ عبور حاصل ہے۔ میں ان کے آگے مؤدب ہو کر بیٹھ گیا اور ان کی زبان سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ کو اپنے دل میں اتارنے لگا۔

عربی کے کسی خاص لفظ کی تشریح کرتے ہوئے وہ مجھے سب سے پہلے اس لفظ کا مادہ بتاتے پھر اس کے ابواب سے روشناس کراتے۔ درمیان میں وہ انگریزی میں بھی مجھے سمجھاتے تھے۔ باتوں ہی باتوں میں انہوں نے زبان کی تاریخ کے بارے میں ایک انگریز نقاد کا حوالہ دیتے ہوئے اس کا لکھا ہوا پورا کا پورا ٹکڑا انگریزی میں سنایا۔ وہ بڑی روانی سے انگریزی بول رہے تھے اور ان کا لہجہ بڑا صاف اور بے داغ تھا۔ میں بڑا خوش ہوا کہ عرفانی صاحب ایک ایسے روشن دماغ عالم ہیں جن کی نگاہ عربی' فارسی کے علاوہ انگریزی لسانیات کا بھی احاطہ کئے ہوئے ہے۔ ابھی ان سے میری انگریزی ادب اور فلسفے پر کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ میں نے بڑی محبت اور بڑے ادب سے ان کو چائے بنا کر دی۔ وہ پیالی پر ذرا سا جھکے اور میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

''چینی کتنی ڈالی تھی؟''

میں نے چینی کی مقدار بتائی تو ہنس پڑے۔

''سبحان اللہ بالکل ٹھیک ہے۔''

پھر انگریزی میں کہا کہ میں سمجھتا ہوں چینی ہمارے ہاں چائے کا جزو ہے۔

میں نے انہیں سگریٹ پیش کیا۔ تو انہوں نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔

''نہیں اس وقت آپ کو میرا سگریٹ پینا ہوگا۔''

عرفانی صاحب نے مجھے تھری کیسل کا سگریٹ عطا کیا۔ وہ ہمیشہ بڑے اعلیٰ سگریٹ پیا کرتے تھے اور بہت کم پیتے تھے۔ کسی وقت خیال آیا تو سگریٹ سلگا لیا کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ دو دو تین تین گھنٹے گزر جاتے اور انہیں سگریٹ کا خیال ہی نہیں آتا تھا۔ ان تمام باتوں کا علم مجھے آگے چل کر ہوا۔ اس وقت تو میری ان سے چائے پر پہلی ملاقات تھی لیکن میری محبت نے انہیں پوری طرح اپنے اندر سما لیا ہوا تھا۔

ان کے پنجابی لہجے میں پوٹھوہار کی شیرینی گھلی ہوئی تھی۔ اردو بڑی صاف' شستہ اور آسان بولتے۔ علمی مسئلے پر بات کرتے ہوئے وہ انتہائی سادہ اور دل نشیں لہجے میں دونوں زبانوں کو اپنے استعمال میں لاتے۔ انگریزی ادب پر گفتگو فرماتے ہوئے وہ

بڑی روانی سے انگریزی بولتے۔ انہیں شیلے' کیٹس اور ورڈز ورتھ کے کتنے ہی اشعار زبانی یاد تھے۔ شیکسپیئر کے ڈراموں پر وہ کمال ناقدانہ انداز میں روشنی ڈالتے۔ اس کی فنی کمزوریوں اور اچھے پہلوؤں کو اجاگر کرتے اور میکبتھ اور ہیملٹ کے ٹکڑوں کے ٹکڑے مجھے زبانی سناتے۔

میں انگریزی ادب کے بڑے بڑے استادوں سے مل چکا ہوں لیکن عرفانی صاحب کو انگریزی اور فرانسیسی ادب اور یورپ کے فلسفے کا جو عرفان حاصل تھا' وہ میں نے صرف ان ہی کے ہاں دیکھا۔ تب میں اس نتیجے پر پہنچا کہ انگریزی کے استادوں اور پروفیسروں کے پاس انگریزی ادب کا علم ضرور تھا' عرفان اور وجدان نہیں تھا۔ جبکہ ہمارے عرفانی صاحب کے پاس علم بھی تھا' عرفان بھی تھا اور وجدان بھی تھا۔ علم وادب میں یہ مقام کسی کسی کو ہی حاصل ہوتا ہے۔ عرفانی صاحب اس مقام پر بہ فضل ربی فائز ہو چکے تھے۔ یہ سب باتیں اور ان حقائق کی تفصیل میں انشاء اللہ آگے چل کر باری باری بیان کروں گا۔ اس وقت میں پرانے ریڈیو سٹیشن کی گیراج والی کینٹین کا ذکر کر رہا تھا جہاں میں پہلی بار عرفانی صاحب کی خدمت میں بیٹھا ان کے ساتھ چائے پینے کا شرف حاصل کر رہا تھا۔

پرانے ریڈیو سٹیشن پر بادامی رنگ کی ایک چھوٹی سی بلی ہوا کرتی تھی۔ یہ بلی بلونگڑے سے ذرا بڑی تھی۔ یعنی یہ بلونگڑا تھی اور نہ ابھی بڑی بلی بنی تھی۔ یہ کینٹین میں ادھر ادھر پھرا کرتی تھی۔ کبھی دفتر کے کسی کمرے میں بھی نکل آتی۔ اس روز جب میں اور عرفانی صاحب کینٹین میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے تو وہ بلی ایک طرف سے نمودار ہوئی کچھ دیر باہر دروازے کے پاس بیٹھی منہ اٹھا کر ہماری طرف تکتی رہی۔ پھر دوڑ کر آئی اور عرفانی صاحب کے پاؤں کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی اور اپنا چہرہ ان کے پاؤں کے ساتھ ملنے لگی۔

مجھے حیرانی ہوئی' حیرانی اس بات پر ہوئی کہ وہ بلی کوئی گھریلو بلی نہیں تھی اور میں نے اسے پہلے کبھی کسی انسان کے ساتھ اتنا مانوس ہوتے' اس قدر محبت کا اظہار کرتے نہیں دیکھا تھا۔ بلکہ اگر کوئی اسے دودھ پلانے یا کوئی چیز کھلانے کی کوشش کرتا تو وہ بھاگ جاتی تھی۔ یہ اس کوٹھی میں بلی کے نمودار ہونے کا شروع شروع کا زمانہ تھا۔

عرفانی صاحب کا چہرہ معصومیت اور خوشی سے سرخ ہو کر چمکنے لگا۔ انہوں نے ہاتھ نیچے کر کے بولی کے سر پر پیار کیا۔ بلی اور زیادہ سمٹ کر عرفانی صاحب کے قریب آ گئی۔ پھر انہوں نے پرچ میں تھوڑا سا دودھ ڈال کر بلی کے آگے رکھ دیا۔ بلی بڑے مزے سے دودھ پینے لگی۔ میں نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی کہ بلی اس اطمینان اور یکسوئی سے دودھ پی رہی تھی جیسے وہ اپنے محبت کرنے والے دیرینہ مالک کے قدموں میں بیٹھی ہو۔ عرفانی صاحب بلی کی طرف بڑی رحم بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہرے پر ایک نورانی تبسم تھا۔ فرمانے لگے۔

''حمید صاحب! یہ بھی اللہ جل شانہ کی مخلوق ہے۔ اس کا رزق بھی اللہ جل شانہ نے لکھ دیا ہے۔''

کینٹین میں کچھ اور لوگ بھی بیٹھے تھے۔ وہ بھی بلی کو عرفانی صاحب کے پاؤں کے ساتھ لگ کر دودھ پیتے دیکھ کر حیران ہو رہے تھے اور خوش بھی ہو رہے تھے۔ مجھے احساس ہوا کہ عرفانی صاحب کے ساتھ خوشی اور سکون و اطمینان کی ایک لہر کینٹین میں داخل ہو گئی ہے۔ اس لہر نے فضا میں محبت اور مسرت کی روشنی سی پھیلا دی تھی۔ دودھ پینے کے بعد بلی اپنا چہرہ آہستہ آہستہ عرفانی صاحب کی پتلون کے پائنچے کے ساتھ رگڑنے لگی جیسے ان کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کر رہی ہو۔ پھر وہ چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے عرفانی صاحب سے کہا۔

''مولانا! یہ بلی آپ کے دل میں چھپی ہوئی محبت کو پہچان گئی ہے۔''

عرفانی صاحب نے جیسے عالم جذب میں تھوڑی دیر کیلئے آنکھیں بند کر لیں پھر آنکھیں کھول کر اللہ اور اس کے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی حمد وثنا کا ورد کیا اور مسکرا کر فرمایا۔

''محبت تو اس ساری کائنات میں جاری وساری ہے۔ کبھی کسی کی اس محبت پر نظر پڑ جاتی ہے اور کبھی یہ محبت کسی کو دیکھ کر اپنے پاس بلا لیتی ہے۔''

پھر وہ خوش ہو کر مسکرائے۔ جب وہ مسکراتے تو ان کے سفید ہموار دانت موتیوں کی لڑی کی طرح چمک اٹھتے تھے۔ چائے پینے کے بعد میں ان کے ساتھ انہیں رخصت کرنے ریڈیو سٹیشن کے گیٹ تک آیا۔ پھر ان کے ساتھ فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔

شملہ پہاڑی کے قریب پہنچ کر وہ رک گئے اور میری طرف دیکھ کر اپنے خاص اور دلکش متبسم انداز میں فرمایا۔

"اب آپ واپس دفتر جا کر اپنا کام کریں مجھے یہاں سے تانگہ مل جائے گا۔"

میں نے کہا۔ "مولانا! مجھے ایک سکرپٹ لکھنا تھا جو میں لکھ کر دے آیا ہوں آپ کے ساتھ چلنے میں مجھے خوشی حاصل ہوتی ہے۔"

"یہ آپ کی محبت ہے۔"

اتنا فرما کر عرفانی صاحب گرم واسکٹ کی جیبوں میں ہاتھ دیئے آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ چوک میں پہنچے تو ایک خالی تانگہ سامنے آ گیا۔ انہیں مال پر "نوائے وقت" کے دفتر پہنچنا تھا جو ان دنوں شاہ دین بلڈنگ کی دوسری منزل میں ہوا کرتا تھا۔ ابھی نوائے وقت کی اپنی بلڈنگ تعمیر نہیں ہوئی تھی۔ میں ان کے ساتھ پیدل مال روڈ تک چلنا چاہتا تھا مگر خالی تانگے نے ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔

وہ تانگے میں بیٹھ کر چلے گئے۔ میں ریڈیو سٹیشن واپس آ گیا۔ یہ قیام پاکستان کا ابتدائی زمانہ تھا۔ ابھی سکوٹر' رکشا' ویگن وغیرہ چلنا شروع نہیں ہوئی تھیں۔ سڑکوں پر صرف تانگے اور اومنی بسیں ہی چلتی تھیں۔ نہ ٹریفک کا شور ہوتا تھا نہ لوگوں کا ہجوم ہوتا تھا۔ اومنی بسیں بھی چھ سات ہی چلتی تھیں۔ ان میں دو منزلہ بسیں تھیں۔ کبھی کسی بس میں سواریوں کا رش دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ اتوار کے روز چھٹی ہوتی تھی۔ اس دن مال روڈ خالی پڑی رہتی۔ کبھی کبھی کوئی تانگہ' سائیکل سوار یا کوئی موٹر کار گزر جاتی۔ ایجرٹن روڈ پر جہاں آج کل ٹیلی فون والوں کی بلند عمارت کھڑی ہے وہاں پر ایک پرانی کوٹھی ہوا کرتی تھی۔ اس کوٹھی پر ڈائریکٹر انڈسٹریز کے دفاتر ہوتے تھے۔ واپڈا کی عالی شان بلڈنگ کی جگہ پرانی وضع کا میٹرو ہوٹل ہوتا تھا۔ الفلاح بلڈنگ بھی ابھی نہیں بنی تھی۔ یہاں ایک چھوٹا سا باغیچہ ہوا کرتا تھا۔ جس کے درمیان میں سال انڈسٹریز والوں نے کاٹیج کی طرز کا ایک چھوٹا سا دفتر بنا رکھا تھا۔ جہاں آج کل آپ ٹیلی ویژن اور ریڈیو پاکستان لاہور کی جدید عمارتیں دیکھ رہے ہیں۔ یہاں ایک چھوٹی سی کوٹھی تھی' جہاں فوجی بھرتی ہوا کرتے تھے۔

جناب عرفانی صاحب کی نوائے وقت اخبار سے وابستگی اور ان کی صحافتی مصروفیات کی نوعیت کچھ اس قسم کی تھی کہ انہیں کچھ وقت راولپنڈی میں بھی گزارنا ہوتا تھا۔ ریڈیو سٹیشن پر ان کا پھیرا ہفتے دس دن کے بعد ہی ہوتا تھا۔ وہ خود پروگرام کی تلاش میں کبھی ریڈیو سٹیشن نہیں آتے تھے ان کی ہمہ گیر قابلیت اور بلند ترین علمی رتبے کی وجہ سے متعلقہ پروگرام پروڈیوسر خود ان کی تلاش میں رہتے تھے۔ جونہی خبر ملتی کہ عرفانی صاحب لاہور میں تشریف لائے ہوئے ہیں وہ فوراً ان کی خدمت میں پہنچ جاتے۔ جب مجھے پتہ چلتا کہ آج عرفانی صاحب کسی پروگرام میں تقریر کرنے تشریف لا رہے ہیں تو میں صبح ہی سے بڑے اشتیاق کے ساتھ ان کا انتظار کرنے لگتا۔ ان کا پروگرام عام طور پر سہ پہر کے وقت نشر ہوا کرتا تھا۔ جب ان کے آنے کا وقت ہوتا تو میں گیٹ پر آ جاتا۔ پھر وہ مجھے دور سے فٹ پاتھ پر بڑے سکون سے قدم اٹھا کر چلتے نظر آتے اور میں آگے بڑھ کر ان سے مصافحہ کرتا اور بڑی بے تکلفی سے کہتا۔

"مولانا پہلے چائے پی جائے گی۔"

وہ مجھے اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر وہیں کھڑے ہو جاتے تھے۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ ہوتی اور انہوں نے دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں دیئے ہوتے تھے۔ یہ ان کا خاص سٹائل تھا۔ اس سٹائل میں بچوں ایسی معصومیت اور سادگی تھی۔ وہ فرماتے:

"پہلے پروگرام پروڈیوسر کو Intimation دے دیں۔ یہ میرا اخلاقی فرض ہے۔"

پروگرام پروڈیوسر کے کمرے تک میں ان کے ساتھ جاتا۔ دل کو یہی بے تابی لگی رہتی کہ عرفانی صاحب جلدی فارغ ہوں اور میں انہیں لے کر کینٹین میں جاؤں۔ وہاں ان کے پاس بیٹھوں۔ ان کیلئے خود چائے بناؤں اور پھر ان کی عالمانہ باتوں سے اپنے دل و دماغ کو روشن کروں۔

ایک روز وہ کوئی دو ہفتوں کے وقفے کے بعد ریڈیو سٹیشن پر تشریف لائے۔ ان کے Live پروگرام کا وقت ہو رہا تھا۔ پروگرام پروڈیوسر انہیں گیٹ سے سیدھا سٹوڈیو میں لے گیا۔ میں صرف عرفانی صاحب سے مصافحہ ہی کر سکا۔ اتنا ضرور کہہ دیا کہ پروگرام کے بعد چائے میرے ساتھ پئیں گے۔ عرفانی صاحب نے مسکراتے ہوئے

ہال میں سر ہلایا اور سٹوڈیوز میں داخل ہو گئے۔ میں ڈیوٹی روم میں ان کی تقریر سننے کیلئے آ گیا۔ ڈیوٹی افسر ان دنوں قمر قریشی صاحب ہوتے تھے۔ عرفانی صاحب کی تقریر کا موضوع "عالم اسلام میں پاکستان کی اہمیت" (کچھ اس قسم کا) تھا۔ یہ ان کی بھرپور جوانی کا عالم تھا۔ وہ انگریزی لٹریچر اور فلسفہ بھی پڑھے ہوئے تھے۔ مگر ان کے علم کی بنیادیں دین اسلام کی گہرائیوں میں استوار ہوئی تھیں۔ دانش فرنگ کا جلوہ انہیں خیرہ نہ کر سکا تھا۔ وہ عربی زبان' قرآن پاک' حدیث پاک اور فقہ کے جید عالم تھے۔ دل میں عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نورانی شمع روشن تھی۔ اس شمع حقیقت کے نور نے ان پر کائنات کے اسرار و رموز اور زندگی کے حقائق روشن کر دیئے تھے۔ ان تمام حقائق کا علم مجھے وقت کے ساتھ آہستہ آہستہ ہوا۔

بہرحال عرفانی صاحب تقریر ختم کر کے سٹوڈیو سے باہر آئے تو میں انہیں کینٹین کی جانب لے آیا۔ دھوپ کا رنگ گلابی ہو رہا تھا۔ کینٹین میں سازندے' موسیقار اور کافی لوگ بیٹھے تھے۔ دروازے کے پاس صرف ایک میز خالی تھی۔ میں اور عرفانی صاحب وہیں بیٹھ گئے۔ چائے آ گئی۔ میں بڑے اہتمام سے چائے بنانے لگا۔ شام کے وقت سردی ہو گئی تھی۔ عرفانی صاحب نے گلے میں بڑا خوبصورت گرم مفلر ڈال رکھا تھا۔ ہم ریڈیو پروگرام کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ چائے پی کر میں ان کی معیت میں گیٹ کی طرف بڑھا۔ ابھی ہم چند قدم ہی چلے تھے کہ ایک طرف سے وہی بادامی رنگ کی بلی دوڑ کر آئی اور عرفانی صاحب کے قدموں میں لوٹ پوٹ ہونے لگی۔ وہ وہیں رک گئے جھک کر بلی کو محبت بھری نظروں سے دیکھا۔ پھر میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا۔

"اس کا ہم پر کچھ قرض ہے۔"

میں سمجھ گیا فوراً کینٹین میں گیا پلیٹ میں دودھ ڈال کر لایا۔ عرفانی صاحب نے دودھ والی پلیٹ خود بلی کے آگے رکھ دی۔ بلی نے معصوم چہرہ اٹھا کر عرفانی صاحب کی طرف دیکھا جیسے ان کا شکریہ ادا کر رہی ہو اور پھر بڑے سکون کے ساتھ دودھ پینے لگی۔ میں عرفانی صاحب کو رخصت کرنے حسب عادت پرانے ریڈیو سٹیشن کی کوٹھی کے باہر فٹ پاتھ تک آیا۔ جب شملہ پہاڑی کے قریب وہ مجھ سے رخصت ہوئے تو میں

نے پلٹ کر دیکھا' بادامی رنگ کی بلی کوٹھی کی دیوار پر خاموش بیٹھی معصوم نظروں سے تک رہی تھی جیسے وہ بھی محبت کے ساتھ عرفانی صاحب کو الوداع کہہ رہی ہو۔

جناب سید محمد وجیہ السیما عرفانی صاحب کو چائے کا نہایت عمدہ اور اعلیٰ ذوق تھا۔ پاکستان کو قائم ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا اور اس زمانے میں لاہور میں کئی ایسے ریستوران تھے جہاں بڑی خالص اور لطیف چائے مل جاتی تھی۔ مثال کے طور پر ریگل چوک والا شیزان' نقی بلڈنگ میں واقع کیفے اورینٹ اور سب سے بڑھ کر لورینگو۔ اب ان میں سے کوئی بھی ریستوران باقی نہیں ہے۔ لورینگو کی چائے کا ایک اپنا الگ مقام تھا۔ یہاں کا ماحول بھی بڑا پرسکون اور صاف ستھرا ہوتا تھا۔ سارے کے سارے فرش پر قالین بچھا تھا۔ گول میزیں اور ان کے اوپر رکھے ہوئے تانبے کے گلدان چمک رہے ہوتے۔

اس زمانے میں ابھی اتنا رش بھی نہیں ہوا تھا۔ لورینگو ریستوران شاہ دین بلڈنگ میں مال روڈ کی جانب واقع تھا۔ کبھی کبھی میں جناب عرفانی صاحب کو لے کر اس ریستوران میں آ جاتا۔ عرفانی صاحب کو بھی اس ریستوران کی لطیف اور خالص چائے اور یہاں کا صاف ستھرا پاکیزہ ماحول اور خاموشی بہت پسند تھی۔ مگر وہ طبعاً درویش خدا مست تھے۔ ریڈیو سٹیشن کے باغ میں گھاس پر بیٹھ کر بھی اسی رغبت اور محبت سے چائے پیتے تھے۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ میں عرفانی صاحب کی خدمت میں اسی لارینگو ریستوران میں بیٹھا ان کی روح پرور باتیں سن رہا تھا کہ میرے دو تین دوست وہاں آ گئے۔ یہ خالصتاً مغرب زدہ نوجوان تھے۔ ان میں سے ایک انگریزی کا اور دوسرا فلسفے کا ایم اے کر رہا تھا۔ اتنا مجھے معلوم تھا کہ ان کا فلسفے اور انگریزی ادب کا علم صرف نصاب کی کتابوں تک محدود ہے۔ وہ انگریزی ادب اور فلسفے کے ان طالب علموں میں سے تھے جو گیس پیپرز اور خلاصے پڑھ کر امتحان دیتے ہیں اور پوری توجہ اور دلی وابستگی سے علم حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ پاک ٹی ہاؤس اور کافی ہاؤس میں بیٹھ کر وہ شیلے' بائرن اور ارسطو' سقراط پر سطحی قسم کی باتیں کیا کرتے تھے اور انگریزی بول کر دوسرے کو مرعوب کرنے کی کوشش بھی کیا کرتے تھے۔ جب انہوں نے مجھے ایک ایسے شخص کے پاس

بیٹھے دیکھا جس کی شخصیت پرکشش اور باوقار ضرور تھی مگر جس نے شرعی داڑھی رکھی ہوئی تھی' تو وہ میری طرف دیکھ کر طنزیہ انداز میں مسکرائے۔ وہ بھی اسی ٹیبل پر بیٹھ گئے۔

میں نے بڑے فخر سے عرفانی صاحب کا ان سے تعارف کرایا۔ انہوں نے اس تعارف کو کوئی زیادہ اہمیت نہ دی اور مجھ سے انگریزی فلموں اور والٹ ڈزنی کی باتیں شروع کر دیں۔ جناب عرفانی صاحب حسب عادت بڑے سکون کے ساتھ بیٹھے تھے۔ چہرے پر معصوم نورانی مسکراہٹ تھی۔ میں جانتا تھا کہ جب حضرت عرفانی نے گفتگو شروع کی تو میرے ان سطحی علوم رکھنے والے اور محض فیشن کے طور پر انگریزی بولنے والے دوستوں کی زبانیں گنگ ہو جائیں گی۔

میں اس موقع کا بے تابی سے انتظار کر رہا تھا لیکن یہ بات میرے بھی وہم و گمان میں نہیں تھی کہ اس روز مجھ پر بھی عرفانی صاحب کے فکر و وجدان کا ایک نیا باب کھلنے والا ہے۔ عرفانی صاحب پر اپنی نصابی علمیت کا اثر ڈالنے کی کوشش میں میرے فلسفے کے طالب علم دوست نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''مائی ڈیئر اس بار کالج میگزین میں ڈچ فلسفی سپوزا کی دہریت پرستی پر انگریزی میں میرا ایک مضمون آ رہا ہے۔ ضرور پڑھنا تا کہ تمہاری بھی کچھ آنکھیں کھلیں۔''

میں جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ جناب عرفانی صاحب نے متبسم چہرے کے ساتھ نوجوان کی طرف دیکھا اور بڑے محبت بھرے لہجے میں سمجھانے کے انداز میں کہا۔

''میرے عزیز! پہلی بات تو یہ ہے کہ جس فلسفی کا آپ نے نام لیا وہ ڈچ نہیں تھا وہ ہالینڈ میں ضرور رہا اور فوت ہوا مگر اس کے ماں باپ اندلس سے نقل وطن کر کے ہالینڈ آ کر آباد ہو گئے تھے اور اس کے فلسفے پر عرب مفکروں کا گہرا اثر تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ فلسفی سپوزا دہریت پرست نہیں تھا بلکہ اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ مذہب کا قائل اور خدا پرست تھا۔ اس نے عرب علماء کی تقلید میں تصوف اور جبر و قدر کے حق میں قلم اٹھایا۔''

میرے دوست کچھ حیران سے ہو کر عرفانی صاحب کو تکنے لگے۔ میں بڑا خوش

ہوا۔ خوشی اور فخر سے میرا چہرہ سرخ ہو گیا لیکن میرے دوستوں نے ابھی اپنی شکست تسلیم نہیں کی تھی۔ میرا جو دوست فلسفے کا طالب علم تھا اس نے اپنا روائتی حربہ استعمال کرتے ہوئے انگریزی بولنی شروع کر دی۔ عرفانی صاحب کے چہرے پر وہی نورانی معصوم مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ انہوں نے بڑے سکون کے ساتھ جواب میں فرمایا۔ (اب وہ بڑی فصاحت اور روانی کے ساتھ انگریزی بول رہے تھے۔)

سپوزا کی توحید پرستی اور اس کی مسئلہ جبر و قدر اور تصوف سے وابستگی کو علامہ اقبالؒ نے ایک شعر میں یوں بیان کیا ہے۔ علامہ صاحب نے اس نظم کا عنوان بھی سپوزا (Sepoza) ہی رکھا ہے' شعر یہ ہے:

نظر حیات پہ رکھتا ہے مرد دانشمند
حیات کیا ہے؟ حضور و سرور و نور و وجود

حضرت علامہ نے اس شعر میں سپوزا کے فلسفے کو پیش کرنے کے بعد خالص فلسفہ اسلام کی روشنی میں اپنے دوسرے شعر میں یوں اظہار خیال فرمایا ہے:

حیات و موت نہیں التفات کے لائق
فقط خودی ہے' خودی کی نگاہ کا مقصود

نوجوان طالب علم عرفانی صاحب کو فصیح انگریزی زبان میں فلسفے پر روانی کے ساتھ بولتے دیکھ کر حیرت زدہ تھے۔ اب حضرت عرفانی صاحب نے سپوزا کے مضامین کے ترجمے کا ایک اقتباس سنایا جو سارے کا سارا انہیں زبانی یاد تھا۔ میں نے بعد میں عرفانی صاحب سے گزارش کر کے یہ اقتباس اپنی یادداشت کی کاپی پر نقل کر لیا تھا جو آج بھی میرے پاس موجود ہے۔ اتنے سال گزر جانے پر اس کی سیاہی تھوڑی پھیکی پڑ گئی ہے لیکن میں نے وہ اقتباس ایک دوسری کاپی پر اتار لیا ہوا ہے۔ وہ اقتباس جو کافی دقیق انگریزی میں تھا یہ ہے۔ عرفانی صاحب نے انگریزی میں فرمایا:

To hate is to acknowledge our inferiority and our fear. We do not hate a foe whom we are confident we can overcome. Minds are conquered not by arms but by greatness of soul. We mustremember that all things follow by the eternal decrees of God. Perhaps it will teach us the intellectual love of God, where by we shall

accept the laws of nature gladly and find our fulfilment within our limitations.
We are parts of the great stream of law and cause
We must distinguish carefully the various forms of knowledge and trust only the knowledge that leads us to God ''

جناب عرفانی صاحب کا چہرہ علم و دانش کے نور سے منور تھا۔ میرے نوجوان مغربی تہذیب کے دلدادہ دوست حیرت کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔ قدرتی طور پر اب وہ بڑے مؤدب ہو گئے تھے۔ میں خود حیرت زدہ تھا۔ میرے سامنے جناب عرفانی صاحب کے بے پایاں علم و فضل کا ایک باب کھل گیا تھا۔ عرفانی صاحب نے اس کے بعد اردو میں فرمایا۔

''یورپ کا سارا فلسفہ خواہ وہ تصوف اور جبر و قدر کے کتنا ہی قریب کیوں نہ ہو منطقی دانش کی پیداوار ہے۔ اقبالؒ نے اسے دانش برہانی کہا ہے۔ اس کے مقابلے میں اقبالؒ دانش نورانی کا قائل ہے جو اللہ جل شانہ پر مکمل ایمان اور حضور اکرمؐ پر جان فدا کر دینے کے اعلیٰ ترین جذبے سے وجود میں آتی ہے۔''

عرفانی صاحب علم و عرفان کے موتی لٹا رہے تھے۔ اس وقت ان کے سامنے کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسرز بھی ماند پڑ گئے تھے۔ چائے ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ کسی کو اتنا ہوش ہی نہیں تھا کہ چائے پیتا۔ آنکھیں عرفانی صاحب کے روشن چہرے پر لگی تھی۔ کان ان کی آواز کے سوا دوسری کوئی آواز نہیں سن رہے تھے۔ فلسفے کے سٹوڈنٹ نے انتہائی ادب سے سوال کیا۔

سر! ہمیں Sophists کے بارے میں کچھ بتایئے۔

فلسفے کے سٹوڈنٹ نے یہ سوال انگریزی زبان میں پوچھا تھا۔ عرفانی صاحب نے بڑی شفقت سے انگریزی زبان میں ہی اپنی خاص مسکراہٹ کے ساتھ فرمایا۔

They were the wandering philosophers of GREECE. They engaged lecture halls, gave there their courses of instructions and then passed on to other cities to repeat them. Some of these men, like Protagoras called themseles SOPHISTAI teachers of wisdom.

اس کے بعد سوفسطائی فلسفے پر عرفانی صاحب نے نہایت بلاغت سے روشنی ڈالی۔ یہ علم و عرفان کی ایک روح پرور محفل بن گئی تھی۔ آخر میں عرفانی صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔

اب جبکہ اس مجلس میں زیادہ تر یونانی فلاسفروں کے بارے میں باتیں ہوتی رہی ہیں تو میں یونانیوں کے سب سے دانا شخص سقراط کے ایک قول کو دہراتے ہوئے اس موضوع کو سمیٹتا ہوں سقراط نے کہا تھا۔

No evil can happen to a good man in life or after death

سقراط کا یہ قول میں نے ول ڈیوراں کی مشہور ''The story of philosophy'' میں PLATO کے باب میں پڑھا تھا۔ میں عرفانی صاحب کے یونانی فلسفے پر جدید یورپی تنقیدات کے مطالعے سے بے حد متاثر ہوا بلکہ میرے تاثرات میں بڑا حیران کن اور خوشگوار اضافہ ہوا۔ میں آپ کو ایک بار پھر یاد دلانا چاہتا ہوں کہ یہ وہ زمانہ تھا جب عرفانی صاحب کوٹ پتلون پہنا کرتے تھے۔ یہ ان کے بھرپور شباب کے دن تھے۔ متشرع داڑھی گھنی اور سیاہ تھی۔ سرخ و سپید چہرے پر ہر وقت ایک نور سا چمکتا تھا۔ لورینگو ریستوران کی اس علمی ادبی محفل پر ایک وجدانی کیفیت طاری تھی۔ رخصت ہوتے وقت میرے دوستوں نے جھک کر بڑے ادب و احترام کے ساتھ عرفانی صاحب سے مصافحہ کیا۔ ایک دوست عرفانی صاحب سے کچھ باتیں کرنے لگا۔ دوسرے دوست نے ایک طرف ہو کر مجھ سے پوچھا۔

''عرفانی صاحب نے انگریزی ادب میں پی ایچ ڈی کیا ہے یا فلسفے میں؟''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''دونوں میں۔''

میرا دوست سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''جب ہی انہیں یورپی ادب اور فلسفے پر اتنا عبور حاصل ہے۔ ایسی باتیں تو ہمارے ادب اور فلسفے کے پروفیسروں کو بھی معلوم نہیں ہیں۔''

عرفانی صاحب کی تعریف سن کر میرا دل خوشی اور فخر سے لبریز ہو رہا تھا۔ خود مجھ پر بھی اس روز عرفانی صاحب کے انگریزی فلسفے اور ادب کے کئی ایک محاسن روشن ہو

گئے تھے۔ میں ان کے پہلو بہ پہلو شاہ دین بلڈنگ کے پہلو میں کیفے اورینٹ کی طرف جا رہا تھا۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں علم و ادب کے ایک روشن ستارے کے ساتھ چل رہا ہوں۔ یہ میری عادت بن چکی تھی کہ میں عرفانی صاحب کے ساتھ کبھی قدم سے قدم ملا کر نہیں چلتا تھا بلکہ چلتے وقت اپنے قدم تھوڑے پیچھے رکھتا تھا۔ یہ میری اس محبت اور عقیدت کا تقاضا تھا جو مجھے آج سے پینتیس چالیس برس پہلے بھی عرفانی صاحب سے تھی۔ بعد میں جوں جوں وقت گزرتا گیا اور حضرت صاحب کی شخصیت کے دوسرے پرانوار پہلو مجھ پر روشن ہوتے گئے' تو اس محبت' عقیدت اور احترام میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ میں جب ان دنوں کا خیال کرتا ہوں تو ایک عجیب لذت اور سرور کی کیفیت مجھ پر طاری ہو جاتی۔ عرفانی صاحب پاکیزہ شباب کی رعنائیوں والے روشن چہرے کے ساتھ انگریزی سوٹ میں ملبوس میرے ساتھ چل رہے ہیں' میں بھی کوٹ پتلون میں ہوں۔

انگریزی ادب اور فلسفے پر عرفانی صاحب کبھی اردو میں اور کبھی انگریزی میں مختلف کتابوں کے اقتباس سنا کر مجھے سمجھا رہے ہیں۔ وہاں سے ہمیں ریڈیو سٹیشن جانا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اس روز سہ پہر کی ٹرانسمیشن کے دیہاتی پروگرام میں عرفانی صاحب کی کوئی تقریر شیڈول تھی۔ موسم خوشگوار تھا ہم مال روڈ کے فٹ پاتھ پر ہو گئے جو اس زمانے میں سارا سارا دن تقریباً خالی دکھائی دیتا تھا۔ ہم اس زمانے کے لارنس گارڈن اور آج کے باغ جناح کے چڑیا گھر والے گیٹ کے آگے سے گزر گئے۔ تب چڑیا گھر کے پہلو سے ایک کشادہ راستہ لارنس باغ میں جاتا تھا۔ اب یہ راستہ بند ہو گیا ہے اور وہ درختوں میں گھری ہوئی سڑک چڑیا گھر میں شامل کر دی گئی ہے۔ چڑیا گھر کے سامنے نہ تو واپڈا ہاؤس کی عظیم الشان بلڈنگ تھی نہ آواری ہوٹل تھا۔ ان کے بجائے یہاں کونے میں پرانی طرز کا میٹرو ہوٹل ہوتا تھا۔ اس سے آگے مغربی پاکستان اخبار کا دفتر تھا۔ آگے لدھیانہ کے درانی شاہزادگان کی قالینوں کی چھوٹی سی دکان ہوتی تھی۔ آج کل الحمرا آرٹ کونسل کی بغل سے ایک سڑک شملہ پہاڑی کی طرف جاتی ہے۔ تب یہ سڑک نہیں ہوتی تھی۔ ہم نے بڑے آرام سے مال روڈ عبور کی اور کشمیر روڈ پر آ گئے۔ جو صاحبان اس دور کی کشمیر روڈ سے گزرے ہیں صرف وہی تصور کر سکتے ہیں کہ تب یہ سڑک کتنی خاموش اور خالی خالی ہوا کرتی تھی۔

گورنمنٹ ہاؤس کی دیوار کے اوپر سے بانس کے جھنڈ سڑک پر جھکے ہوئے تھے۔ بائیں جانب پرانے زمانے کی ایک خاموش کوٹھی ہوتی تھی جس کے باہر کشمیر ہاؤس لکھا ہوتا تھا۔ کہتے ہیں کہ یہاں لورینگو ریستوران کا یورپی مالک رہتا تھا۔ اس کوٹھی کے صحن میں کبھی کوئی بچہ عورت یا آدمی نظر نہیں آیا تھا۔ ہم آہستہ آہستہ چلتے ایجرٹن روڈ پر آ گئے۔ اس سڑک کی دونوں جانب پیپل کے بڑے گھنے درخت ہوتے تھے۔ سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ ہم شملہ پہاڑی سے ریڈیو سٹیشن کی پرانی عمارت کی طرف مڑ گئے۔ ڈیوٹی آفیسر قمر قریشی نے عرفانی صاحب کو بتایا کہ متعلقہ پروگرام پروڈیوسر ان کا انتظار کر رہا ہے۔ عرفانی صاحب نے تبسم فرمایا۔ میں عرفانی صاحب کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ان کے سفید اور ہموار دانت موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ ہم پروگرام پروڈیوسر کے کمرے میں آ گئے۔ پروگرام پروڈیوسر عرفانی صاحب کو لے کر سٹوڈیو کی طرف چل دیا۔

تقریر ختم کرنے کے بعد عرفانی صاحب باہر آئے تو میں ان کے انتظار میں کاریڈار میں ٹہل رہا تھا۔ ان کی تقریر میں نے ڈیوٹی روم میں رکھے ہوئے ریڈیو سیٹ پر سن لی تھی۔ عرفانی صاحب کا تقریر کرنے کا انداز بالکل ایسا ہوتا جیسے وہ محفل میں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ یہ بڑا دلنشیں اور متاثر کرنے والا لہجہ تھا۔ اس میں عرفانی صاحب کے قلب کی سچائی اور ایمان کی حرارت بھی شامل ہوتی اور سامعین انہیں ہمہ تن گوش ہو کر سنتے۔

ابھی دن کی روشنی باقی تھی۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ پرانے ریڈیو سٹیشن میں لگے جامن کے درختوں کی سب سے اونچی شاخوں کے پتے شفق کی سرخی میں لال ہو رہے تھے۔ میں نے عرفانی صاحب سے گزارش کی کہ چائے پی جانی چاہئے۔ عرفانی صاحب اپنے خاص انداز میں قدم قدم چلتے ایک دم رک گئے۔ میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا۔

''سبحان اللہ۔''

ریڈیو سٹیشن کی بلی نے عرفانی صاحب کی خوشبو محسوس کر لی تھی۔ چنانچہ جونہی ہم ریڈیو سٹیشن کی کینٹین کی طرف بڑھے یہ بلی عقبی صحن کے دروازے میں سے نکل کر

عرفانی صاحب کے قدموں میں آ گئی۔ عرفانی صاحب رک گئے۔ بلی عرفانی صاحب کے قدموں میں لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔ ہم ایک میز کے ساتھ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ بلی بھی عرفانی صاحب کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ کبھی اپنا معصوم چہرہ اٹھا کر عرفانی صاحب کو دیکھتی اور کبھی اپنا سر ان کے پاؤں کے ساتھ رگڑنے لگتی۔ عرفانی صاحب نے بلی کو پیار کیا اور کینٹین والے سے دودھ منگوا کر پلیٹ بلی کے سامنے رکھ دی۔ بلی بڑے شوق سے دودھ پینے لگی۔ عرفانی صاحب بلی کو بڑی محبت سے دودھ پیتے دیکھ رہے تھے۔ دودھ پی چکنے کے بعد بلی وہاں سے گئی نہیں بلکہ وہیں عرفانی صاحب کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

مجھ پر انگریزی ادب اور فلسفے کی اس گفتگو کا ابھی تک اثر تھا جو عرفانی صاحب نے لورینگو میں فرمائی تھی۔ چنانچہ میں نے اس کے حوالے سے انگریزی ڈرامے' خاص طور پر شیکسپیئر کا ذکر چھیڑ دیا۔ عرفانی صاحب چائے پی رہے تھے۔ انہوں نے پیالی پلیٹ میں رکھتے ہوئے اپنے خاص انداز میں پنجابی میں فرمایا۔

''انگریزوں کے پاس ڈرامے کی ساری روایت یونان سے آئی ہے بلکہ یوں کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ یونانی ڈرامے نے دنیا کے ہر ملک کے ادب کو متاثر کیا۔ شیکسپیئر کا نام انگریزی ڈرامے میں واقعی ایک بڑا نام ہے۔''

میں نے سوال کیا:

''مگر بعض نقادوں کا کہنا ہے کہ شیکسپیئر نام کا کوئی ڈرامہ نگار نہیں تھا۔ یہ سارے ڈرامے مارلو نے لکھے ہیں۔ اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔''

''میں شیکسپیئر ہی کے ایک ڈرامے کی لائن کا ترجمہ کرتے ہوئے کہوں گا کہ پھول کو چاہے جس نام سے بھی پکاریں وہ پھول ہی رہے گا۔ شیکسپیئر کے ڈرامے جس کسی نے بھی لکھے وہ شیکسپیئر ہی تھا۔ میری ایک بات یاد رکھیں علم و ادب میں جب کوئی شخص دانشمندی کی بات لکھے تو اس کی دانشمندی کی بات پر توجہ دیں یہ مت دیکھیں کہ بات کہنے والا کون ہے لیکن عام زندگی میں اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کرے تو اس کی رائے کی طرف توجہ نہ دیں بلکہ یہ دیکھیں کہ رائے دینے والا شخص کون ہے۔ اس کی سماجی حیثیت کیا ہے اور کیا وہ معتبر شخص ہے۔''

عرفانی صاحب کی جہاں اور بہت سی بصیرت افروز باتیں میرے دل و دماغ

میں نقش ہو چکی ہیں اور زندگی کے اندھیروں میں روشنی بن کر میری رہنمائی کرتی ہیں وہاں ان کی یہ بات بھی میرے دل میں نقش ہو کر رہ گئی ہے۔ ان کا یہ پورے کا پورا جملہ' بلکہ جملے میں نے اسی رات گھر آ کر اپنی کاپی پر لکھ لئے تھے۔ آج جب میں نے ان جملوں کو پڑھا تو مجھے وہ ساری باتیں یاد آ گئیں جو پرانے ریڈیو سٹیشن کی کینٹین میں عرفانی صاحب نے فرمائی تھی۔ میری یادداشت ویسے بھی بڑی تیز ہے لیکن اتنے طویل عرصے میں جناب عرفانی صاحب کی نورانی صحبت میں انہوں نے جو گفتگو فرمائی میں نے اس گفتگو کے چند ایک اقوال اپنی کاپی میں ضرور نوٹ کر لئے تھے۔ یہ نوٹ آج ایک Chip کا کام کر رہے ہیں۔ میں انہیں اپنی یادداشت کے کمپیوٹر میں فیڈ کر کے بٹن دباتا ہوں تو جس محفل میں عرفانی صاحب نے وہ خاص گفتگو فرمائی تھی اس محفل کی ساری سکیچنگ سارا منظر اپنی تمام جزئیات کے ساتھ سکرین پر ظاہر ہو جاتا ہے۔ شیکسپیئر پر ہی گفتگو فرماتے ہوئے عرفانی صاحب نے کہا۔

''شیکسپیئر نے بڑی خوبصورت نظمیں بھی لکھیں ہیں۔ انگریزی ادب کے سبھی طالب علم ان نظموں کو جانتے ہیں۔ آپ ادب کے سٹوڈنٹ ہیں۔ آپ نے بھی وہ نظمیں ضرور دیکھی ہوں گی۔ مجھے اس وقت شیکسپیئر کی ایک نظم کے دو شعر یاد آ رہے ہیں وہ آپ کو سناتا ہوں۔

What is your substance,
Whereof are you made,
That millions of strange
Shadows on you tend?
Since everyone hath every One
One shadow
And you, but one,
Can every shadow lend

اس شعر میں شیکسپیئر نے انسانی تخلیق کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ علم و عرفان کی شناسائی کی جانب اٹھا ہوا ایک قدم ہے اور یاد رکھیں لٹریچر میں صرف وہی ادب زندہ رہتا ہے جس کی بنیادیں علم و حکمت اور معرفت خداوندی کے احساس پر اٹھائی گئی ہوں۔

عرفانی صاحب کی باتیں میرے دل میں اتر جاتی تھیں۔ مجھے عرفانی صاحب سے جو محبت تھی اس نے پہلے ہی میرے دل میں گداز پیدا کر دیا ہوا تھا۔ چنانچہ ان کی گفتگو کا ایک ایک لفظ میرے دل میں اپنے آپ نقش ہوتا چلا جاتا۔ ان کی باتوں کی خوشبو آج بھی میرے دل میں ہے۔ چشم تصور سے میں آج بھی اپنے آپ کو ان کی خدمت میں بیٹھے ان کے ہمراہ چلتے دیکھتا ہوں۔ یہ منظر بڑا زندہ منظر ہوتا ہے۔ مجھے ان کی شخصیت کی چمک دکھائی دیتی ہے۔ ان کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔ ان کی دلنشیں آواز سنائی دیتی ہے۔ میری خوش قسمتی پر کس کو شک ہو سکتا ہے۔ میں اپنی خوش نصیبی پر جتنا فخر کروں کم ہے۔

انہیں مغل پورہ گنج کی طرف جانا ہوتا تھا۔ میں ان کے ساتھ کافی دور تک جاتا۔ یہ میں اپنے لالچ کی وجہ سے کرتا کیونکہ جب میں ان کے پاس بیٹھا ہوتا' ان کی معیت میں چل رہا ہوتا تھا تو اپنے اندر ایک گہرا سکون اور مسرت محسوس کرتا تھا۔ ان سے الگ ہوتے ہی تنہائی اور اکیلے رہ جانے کا احساس مجھے گھیر لیتا۔ اگر عرفانی صاحب کو ٹرین کے ذریعے مغل پورہ جانا ہوتا تو میں ریلوے سٹیشن تک ان کے ساتھ آتا۔ جب ٹرین میری نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی تب پلیٹ فارم سے باہر نکلتا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ لاہور میں ویگن کا کسی نے نام بھی نہیں سنا تھا۔ اومنی بس بھی صرف دو ایک روٹوں پر ہی چلتی تھی۔ ایک دو منزلہ بس کرشن نگر کے آخری سٹاپ سے آرائے بازار تک جاتی تھی۔ ایک بس ریلوے سٹیشن سے شاہدرہ چوک تک جاتی تھی۔ اتنا مجھے یاد ہے کہ کبھی کبھی عرفانی صاحب مال روڈ پر نہر کے قریب کسی سٹاپ پر سے اومنی بس پر سوار ہوتے تھے۔ ہو سکتا ہے اس بس کا مغل پورے کی طرف کوئی روٹ ہو۔

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ہم پرانے ریڈیو سٹیشن سے نکلتے تو ڈیوس روڈ پر آ جاتے۔ اس زمانے کی ڈیوس روڈ اور آج کی ڈیوس روڈ میں اگر میں زمین و آسمان کا فرق کہوں تو یہ مبالغہ نہ ہوگا۔ اس سڑک پر دن کے وقت بھی خال خال ہی کوئی آدمی نظر آتا تھا۔ جن لوگوں نے اس دور کی ڈیوس روڈ دیکھی ہے وہ میری تائید کریں گے۔ یہاں نہ کوئی دکان ہوتی تھی نہ کوئی ورکشاپ ہوتی تھی۔ نہ کسی اخبار کا دفتر ہوتا تھا۔ بیس پچیس فٹ چوڑی سڑک ہوتی تھی جس کی ایک جانب لال لال اینٹوں کا چھوٹا سا فٹ پاتھ

تھا۔ سڑک پر دونوں جانب سرخ پھولوں والے بڑے ہی خوبصورت درخت لگے ہوئے تھے۔ موسم بہار میں درختوں پر پھول کھلتے تو فٹ پاتھ پر بھی پھول گرتے رہتے۔ سارے فٹ پاتھ پر پھولوں کی سیج بچھ جاتی۔

عرفانی صاحب کو اس سڑک کی خاموشی اور درختوں کے سرخ پھول بہت پسند تھے۔ چنانچہ بہار کے موسم میں وہ اکثر اس سڑک پر سے ہو کر مال روڈ والے نہر کے پل کی طرف جاتے۔ اس روز بھی میں ان کے ساتھ اسی خاموش خالی خالی پرسکون سڑک پر جا رہا تھا۔ ابھی موسم بہار شروع ہوا تھا۔ سارے درختوں پر لال پھولوں کے شگوفے پھوٹ رہے تھے۔ ہم فٹ پاتھ پر ان پھولوں والے درختوں کے نیچے سے گزر رہے تھے۔ وہ منظر آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ ہم ایسے چل رہے تھے جیسے ٹہل رہے ہوں۔ مجھے یاد ہے میں عرفانی صاحب کے احترام میں اپنا پاؤں ان کے قدم سے آگے نہیں بڑھا رہا تھا۔ عرفانی صاحب نے کوئی سیاسی قسم کا لطیفہ سنایا تھا جس پر ہم ہنستے ہنستے کھڑے ہو گئے تھے پھر میں نے بھی انہیں ریڈیو سٹیشن کے میوزیشنوں کا ایک لطیفہ سنایا تھا جس پر وہ بہت ہنسے۔

آگے مال روڈ کا وہ چوک تھا جہاں سے ایک چھوٹی سی سڑک ایکمن روڈ کو جاتی ہے۔ مال روڈ بھی تقریباً خالی خالی تھی۔ کبھی کبھار کوئی تانگہ موٹر یا بس گزر جاتی تھی۔ ابھی شہر کی اس خوبصورت سڑک نے سکوٹر' ویگنیں' ہنڈا موٹر سائیکل اور شور مچاتے دھواں چھوڑتے رکشا نہیں دیکھے تھے۔ ایسی خاموشی اور سکون تھا کہ جیسے ہم شہر کے کسی باغ میں سے گزر رہے ہوں۔ ابھی نہر کا پل نہیں آیا تھا کہ عرفانی صاحب ایک بس سٹاپ پر رک گئے۔ فرمایا:

"حمید صاحب! میرا خیال ہے آج یہیں سے بس پکڑتے ہیں۔"

جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں یہ وہ زمانہ تھا جب ابھی اخبار "نوائے وقت" کی بلڈنگ نہیں بنی تھی اور اخبار کے دفاتر شاہ دین بلڈنگ کی دوسری منزل پر واقع تھے۔ ایک بہت بڑے ہال کمرے میں پارٹیشن کر کے کئی کمرے بنا لئے گئے تھے۔ گرمیوں میں یہ ہال کمرہ بڑا گرم ہو جاتا تھا اور یہاں کوئی اے سی وغیرہ نہیں لگا تھا۔ کسی روز اس دفتر میں عرفانی صاحب سے ملاقات ہو جاتی تو ہم باہر برآمدے میں نکل

آتے۔ شاہ دین بلڈنگ کے برآمدے میں ایک گیلری بلکہ چھوٹی سی بالکونی ہے جس کا رخ اسمبلی ہال کی طرف ہے۔ یہاں دو کرسیاں اور ایک چھوٹی سی میز بچھی ہوتی تھی۔ پیچھے ایک کھوکھا نما کینٹین تھی ہم اس بالکونی میں آ کر بیٹھ جاتے۔ یہاں ہوا بھی چل رہی ہوتی تھی۔ عرفانی صاحب سفید قمیص اور ہلکی نسواری رنگ کی پتلون میں ملبوس ہوتے۔ سر کے لہریالے گہرے سیاہ بال چمک رہے ہوتے۔ چائے آ جاتی ہم مال روڈ کی رونق بھی دیکھتے اور چائے پیتے ہوئے باتیں بھی کرتے جاتے۔

عرفانی صاحب کو دیسی گلاب کے سرخ پھولوں سے بھی بڑا پیار تھا۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں پرانے ریڈیو سٹیشن کا سامنے والا باغیچہ بڑا مختصر سا تھا۔ گھاس زیادہ اگی ہوئی تھی۔ دیوار کے ساتھ موتیا یا شاید رات کی رانی کے پودے لگے تھے جن کے جھاڑ اوپر تک گئے ہوئے تھے۔ گلاب کے ایک دو پودے ضرور تھے مگر ان پر بڑے چھوٹے چھوٹے پھول آتے تھے۔ کسی روز جب عرفانی صاحب پرانے ریڈیو سٹیشن آتے تو ان کے ہاتھ میں کبھی دیسی سرخ گلاب اور کبھی موتیے کا پھول ہوتا۔ ایک دن انہوں نے مجھے بڑی محبت سے گلاب کا ایک پھول دیا۔ یہ میرے لئے بہت بڑا اعزاز تھا۔ میں ان کے دیئے ہوئے پھول کے لائق نہیں تھا مگر انہوں نے اپنی وسیع القلبی سے مجھے اس لائق سمجھ لیا تھا۔

وہ سرخ پھول میں نے ان سے الگ ہونے کے بعد ایک صاف لفافے میں ڈال کر اپنے گھر کی الماری میں محفوظ کر لیا تھا مگر میری کم نصیبی کہ جب میرے قیام امریکہ کے دوران پیچھے سارا مکان ڈھا کر دوبارہ بنایا گیا تو گلاب کا وہ قیمتی پھول مجھ سے جدا ہو گیا۔ اس زمانے کے لارنس باغ اور آج کے باغ جناح میں گلاب کے پھولوں کے بے شمار پلاٹ تھے۔ ایک چھوٹا سا پلاٹ جہاں اوپن ایئر کیفے ہے اس کے کونے میں پہاڑی کے دامن میں ہوا کرتا تھا۔ آج کل اس پلاٹ کی جگہ ایک کیبن بنا ہوا ہے۔ جس روز عرفانی صاحب ''نوائے وقت'' کے دفتر میں ہوتے یا پرانے ریڈیو سٹیشن سے نکل رہے ہوتے اور ان کی خواہش ہوتی تو وہ لارنس باغ کی سیر کا ارادہ کرتے اور میں ان کے ساتھ لارنس باغ کی طرف روانہ ہو جاتا۔ ہم اس چھوٹے سے پلاٹ میں آ کر گھاس پر بیٹھ جاتے۔ گلاب کے سرخ پھول ہمارے بالکل قریب

ہوتے۔

عرفانی صاحب ان کی طرف دیکھ کر بڑے خوش ہوتے۔ سبحان اللہ کا ورد زبان پر جاری ہو جاتا۔ پھر مجھے دیسی اور ولائتی گلاب کے بارے میں بتاتے کہ دیسی گلاب کے ساتھ ولائتی گلاب کی قلم کو پیوند کیسے لگائی جاتی ہے۔ کبھی مولانا رومی اور کبھی علامہ اقبال کا کوئی فارسی شعر سناتے اور اس کی تشریح بھی فرماتے۔ ان کی فرمائی ہوئی تشریحات کا ایک ایک لفظ میرے دل میں نقش ہوتا چلا جاتا۔ ایک بات میں نے اس زمانے میں ہی خاص طور پر محسوس کی تھی کہ جناب عرفانی صاحب پر کبھی کبھی ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ وہ میرے قریب بیٹھے ہوتے۔ مجھ سے گفتگو فرما رہے ہوتے یا میری کوئی بات سن رہے ہوتے مگر مجھے محسوس ہوتا کہ وہ جہاں تشریف فرما ہیں' وہاں نہیں ہیں۔ میرا چھوٹا ذہن اور محدود فکر عرفانی صاحب کی وجدانی اور روحانی کیفیات و مقامات کا احاطہ نہیں کر سکتا تھا مگر میری محبت مجھے ایک آدھ اشارہ ضرور کر دیتی تھی کہ عرفانی صاحب کسی اور مقام پر ہیں۔ ان کی اس کیفیت کو محسوس کر لینے کے بعد میں خاموش ہو جاتا اور نظریں جھکا لیتا تھا۔ عرفانی صاحب میرے بالکل قریب بیٹھے ہوتے مگر مجھے نہ تو ان کے لباس کی کوئی سرسراہٹ آتی اور نہ ہی ان کے سانس لینے کی آواز سنائی دیتی۔ یہ کیفیت کچھ دیر طاری رہتی اس کے بعد گہرا سانس لے کر سبحان اللہ' سبحان اللہ کہتے اور درود شریف پڑھنے لگتے۔ ایک دن بڑا پراسرار سا واقعہ ہو گیا۔

اس زمانے میں یعنی 50-1949ء میں میرا ایک آرٹسٹ دوست لندن گیا ہوا تھا۔ وہاں اس کی بڑی ہمشیرہ رہتی تھیں۔ وہاں سے وہ مجھے خط لکھتا رہتا تھا۔ لندن گئے اسے کوئی تین ماہ ہو گئے تھے۔ ایک روز مجھے اس کا تار آیا جس میں اس نے لکھا تھا کہ وہ گیارہ دسمبر کو لاہور پہنچ رہا ہے۔ تار میں اس نے کراچی سے لاہور تک جو فلائٹ پکڑنی تھی اس کا نمبر بھی لکھ دیا تھا۔ مجھے گیارہ دسمبر کی تاریخ آج بھی اچھی طرح یاد ہے کیونکہ اسی تاریخ کو وہ پراسرار واقعہ ہوا جو میں آپ کو سنانے والا ہوں۔

میں مصری شاہ میں رہتا تھا۔ گیارہ دسمبر کو میں دوپہر کے بعد پہلے پاک ٹی ہاؤس اپنے دوستوں کے پاس آ گیا۔ وہاں بیٹھ کر چائے پی۔ ناصر کاظمی اور دوسرے شاعر ادیب دوستوں سے کچھ دیر گپ شپ کی اور پھر ''نوائے وقت'' کے شاہ دین

بلڈنگ والے دفتر کی طرف روانہ ہو گیا۔ کراچی سے میرے دوست کی فلائٹ آنے میں ابھی اڑھائی گھنٹے باقی رہتے تھے۔ میں یہ پروگرام گھر سے طے کر کے نکلا تھا کہ کچھ دیر جناب عرفانی صاحب کے پاس بیٹھوں گا۔ ان سے باتیں کروں گا۔ ان کی باتیں سنوں گا۔ میں نوائے وقت کے دفتر میں آ گیا۔ وہ اپنے کیبن میں بیٹھے کام کرتے مل گئے۔ انہیں دیکھ کر میرا دل وہ جو کہتے ہیں نا کہ باغ باغ ہو گیا۔

مجھے ایسا لگتا کہ مجھے میری محنت کا ثمر مل گیا ہے۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ میں ریڈیو سٹیشن یا نوائے وقت کے وقت میں یہ آس لے کر گیا کہ جناب عرفانی صاحب سے ضرور ملاقات ہو گی۔ جب وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ عرفانی صاحب نہیں ہیں تو مجھے ایسے افسوس ہوتا کہ جیسے میری کوئی بڑی قیمتی شے کھو گئی ہے۔ میری دوستی کا حلقہ اس زمانے میں بھی جبکہ میں نوجوان تھا کافی وسیع تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے 1948ء میں پہلا افسانہ لکھ کر ہی اللہ کے کرم سے ادب میں اپنا ایک خاص مقام حاصل کر لیا تھا۔ لوگ مجھ سے مل کر بڑا خوش ہوتے تھے اور میں بھی لوگوں سے مل کر بڑا خوش ہوتا تھا۔ پھر لاہور کے ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کا حلقہ تھا جو سب میرے دوست تھے۔ مجھ سے پیار کرتے تھے۔ جب عرفانی صاحب نہ ملتے تو میں چینیز لنچ ہوم یا پاک ٹی ہاؤس یا کافی ہاؤس میں اپنے شاعر ادیب دوستوں میں آ جاتا مگر بڑا اداس ہوتا کہ عرفانی صاحب سے ملاقات نہیں ہوئی۔

چنانچہ اس روز جب میں نے کیبن کا پردہ ہٹا کر عرفانی صاحب کو اپنی کرسی پر بیٹھے کام کرتے دیکھا تو بڑا خوش ہوا۔ میں سلام کر کے ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ انہوں نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور وعلیکم السلام کہہ کر اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ وہ ادبی میگزین میں چھپنے کے لئے آیا ہوا کوئی مضمون دیکھ رہے تھے۔ دسمبر کا مہینہ تھا۔ لاہور میں خوب سردی پڑ رہی تھی۔ عرفانی صاحب نے گرم تھری پیس سوٹ پہن رکھا تھا۔ گلے میں مفلر بھی تھا۔ چہرے پر بڑی معصوم مسکراہٹ تھی۔ مضمون پر سے نگاہیں ہٹائے بغیر کہنے لگے۔ ''بس ایک صفحہ رہ گیا ہے پھر آپ سے باتیں ہوں گی۔''

میرے لئے یہی بہت کچھ تھا کہ عرفانی صاحب میرے سامنے بیٹھے تھے اور میں انہیں دیکھ رہا تھا، ممکن ہے آپ میں سے بعض احباب کو یہ خیال آئے کہ میں

مبالغے سے کام لے رہا ہوں۔ نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ عرفانی صاحب سے مجھے جو محبت تھی وہ آج بھی ہے۔ اس کے بیان کرنے میں جس قدر بلاغت سے بھی کام لوں یقین کریں وہ کسر نفسی ہو گی مبالغہ نہیں ہو گا۔ یعنی میں محبت کے اس جذبے کو الفاظ میں شاید کبھی بھی بیان نہیں کر سکوں گا۔ اگر سارا دن بھی بیان کرتا رہوں تو وہ اس محبت کا عشر عشیر بھی نہیں ہو گا جو مجھے عرفانی صاحب سے تھی اور ہے۔ بہرحال یہ دل کی باتیں ہیں دل کے معاملات ہیں۔ یہ لفظوں میں بیان نہیں ہوتے۔ ہاں اگر جذبہ عشق سچا ہو، سلامت ہو تو اس کی ایک جھلک کبھی کبھی بجلی کی طرح چمکتی ہوئی ضرور دکھائی دے جاتی ہے۔ بہرحال میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔

یاد رہے کہ یہ گیارہ دسمبر کا دن تھا اور مجھے اپنے دوست کو لینے ایئرپورٹ جانا تھا جو لندن سے کراچی اور کراچی سے اورینٹ ایئرویز کے ایک جہاز کے ذریعے لاہور پہنچ رہا تھا۔ اس زمانہ میں پی آئی اے کا نام اورینٹ ایئرویز ہوا کرتا تھا۔ عرفانی صاحب کام سے فارغ ہو کر میری طرف متوجہ ہوئے۔ فرمایا آپ کے لئے چائے منگوائی جائے؟ میں نے گھڑی کی طرف دیکھ کر عرض کیا۔

''مجھے ایئرپورٹ پہنچنا ہے۔ مجھے پتہ ہے یہاں چائے دیر سے آتی ہے۔''

عرفانی صاحب ہنس پڑے۔ پنجابی میں کہا۔

''چھڈو جی! کیا کریں گے ایئرپورٹ جا کر؟ ہمارے ساتھ بیٹھ کر چائے پئیں آج سردی بھی بہت ہے۔''

میں نے انہیں بتایا کہ میرا ایک گہرا دوست لندن سے لاہور پہنچ رہا ہے۔ اس کا تار آیا ہوا ہے اور مجھے اسے لینے ایئرپورٹ جانا ہے۔ تب عرفانی صاحب نے میری طرف دیکھا ان کے چہرے پر اب مسکراہٹ نہیں تھی بلکہ ایک جلال افروز متانت تھی کہنے لگے۔

''آپ کا دوست نہیں آ رہا۔''

میں بالکل نہ سمجھ سکا کہ عرفانی صاحب نے ایسا کیوں کہا تھا۔ میں نے بے اختیار ہاتھ اٹھا دیئے۔ عرفانی صاحب نے آنکھیں بند کر لیں اور دعائے فاتحہ پڑھنے لگے۔ میرا دل ایک بار زور سے دھڑکا۔ دعائے فاتحہ پڑھنے کے بعد عرفانی صاحب

بولے۔

"آپ ضرور حیران ہو رہے ہوں گے کہ میں کس کی فاتحہ پڑھ کر اس کی روح کی بخشش کی دعا مانگ رہا تھا۔ اب میں آپ کو بتاتا ہوں اور آپ کو میں صرف اس لئے بتا رہا ہوں کہ آپ میرے بہت قریب ہیں۔ بات یہ ہے کہ آپ کا دوست لندن میں اپنی جس ہمشیرہ کے ہاں قیام پذیر تھا اس کا انتقال ہو گیا ہے۔ آپ کے دوست نے پاکستان کا سفر ملتوی کر دیا ہے۔ آپ ایئرپورٹ پر جائیں گے تو آپ کو مایوسی ہو گی۔"

میں جناب عرفانی صاحب کو دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔ کیونکہ مجھے پورا یقین تھا کہ عرفانی صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے وہ بالکل صحیح ہے' بالکل سچ ہے۔ اس کی ایک وجہ تھی اور وہ وجہ میرا عرفانی صاحب پر یقین اور اعتقاد تھا۔ یہ اعتقاد اور یقین مجھے اس محبت نے عطا کیا تھا جو مجھے عرفانی صاحب کی ذات اور ان کی بے داغ شخصیت سے تھی۔ جس لمحے عرفانی صاحب کو پہلی بار دیکھنے سے میرے دل میں ان کے لئے محبت پیدا ہوئی تھی' اسی لمحے یہ یقین بھی اس محبت کے ساتھ ہی پیدا ہو گیا تھا۔ مجھے حیرانی ضرور تھی اور حیرانی اس بات کی تھی کہ انہیں ہزاروں میل دور بیٹھے لندن میں مقیم میرے دوست کی ہمشیرہ کی وفات کا کیسے علم ہو گیا؟ میرے دل کو اپنے آپ یقین آ گیا تھا کہ عرفانی صاحب بالکل ٹھیک فرما رہے ہیں اور میرے دوست کی ہمشیرہ کا لندن میں انتقال ہو گیا ہو گا مگر تعجب اس امر پر تھا کہ جناب عرفانی صاحب کو یہ کشف کیسے ہو گیا؟ کیونکہ اس سے پہلے میں نے ان کی شخصیت میں اور ان کی صحبت میں کبھی کوئی ایسی بات نہیں دیکھی تھی۔ یہ میرے لئے بھی عرفانی صاحب کی ذات کا ایک کشف تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے ان کی شخصیت کی ایک نئی ڈائی مینشن' ایک نئی جہت کا در کھل گیا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو شاید عرفانی صاحب کی محفل سے اٹھ کر ایئرپورٹ کی طرف چل پڑتا مگر میں ایسا کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اس لئے کہ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میرا دوست لاہور نہیں آ رہا۔ وہ لندن ہی میں اپنی ہمشیرہ مرحومہ کی تجہیز و تکفین میں مصروف ہے۔

اس واقعہ پر میری حیرت صرف تھوڑی دیر کے لئے ہی تھی کیونکہ عرفانی صاحب کے جذب و وجدان اور ان کے کشف کرامت کے ساتھ یہ میرا پہلا تعارف اور تجربہ تھا۔ میری جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو وہ عرفانی صاحب کو پہلا سوال یہ کرتا کہ انہیں

کیسے پتہ چل گیا؟ یہ سوال میرے دل میں بھی پیدا ہوا تھا اور یہ ایک قدرتی بات تھی۔ کیونکہ اس سے پہلے مجھے عرفانی صاحب کے ساتھ ایسا حیران کن تجربہ کبھی نہیں ہوا تھا مگر یہ سوال ایک پل کے لئے میرے دل میں پیدا ہو کر خود ہی سوال کا جواب دے کر ہمیشہ کیلئے غائب ہو گیا تھا اور وہ جواب یہ تھا کہ عرفانی صاحب ایسا بتا سکتے ہیں اور اس کی تائید بھی ہو گئی۔ اگلے روز ہی مجھے میرے دوست کا دوسرا تار مل گیا جس میں لکھا تھا کہ:

"میری ہمشیرہ انتقال کر گئی ہیں۔ میں ابھی لاہور نہیں آ سکوں گا۔"

کتنی عجیب بات ہے کہ مجھے اپنے دوست کا تار پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ خوشی اس بات کی ہوئی کہ عرفانی صاحب کی بتائی ہوئی بات صحیح نکلی تھی۔ میں تار لے کر فوراً عرفانی صاحب کے دفتر پہنچا۔ انہیں تار دکھاتے ہوئے بڑے جذباتی انداز میں کہا۔

"آپ نے ٹھیک فرمایا تھا عرفانی صاحب! یہ تار پڑھ لیجئے۔"

عرفانی صاحب نے تار میرے ہاتھ سے لے کر پڑھا۔ تار نیچے رکھ دیا اور ایک بار پھر ہاتھ اٹھا کر دعائے فاتحہ پڑھنے لگے۔ میں بھی ہاتھ اٹھا کر ان کی دعا میں شریک ہو گیا۔ دعا کے بعد انہوں نے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر پھیرے اور کہا۔

"چلئے آج لارڈز میں چل کر چائے پیتے ہیں۔"

لارڈز ریسٹورنٹ مال روڈ پر نقی بلڈنگ میں ہوا کرتا تھا۔ اس کا شمار لاہور کے جدید ارسٹوکریٹک ریسٹورانوں میں ہوتا تھا۔ یہاں بڑی کوالٹی کی چائے بلینڈ کر کے پیش کی جاتی تھی۔ یہ ریستوران لاہور کے صحافیوں' وکلاء اور ادیبوں' دانشوروں کی آماجگاہ تھا۔

حمید نظامی' مولانا چراغ حسن حسرت' مظفر احسانی' عبدالسلام خورشید' م ش' سردار شوکت حیات' مجید نظامی' سعادت حسن منٹو' مولانا صلاح الدین احمد' جمیل الزمان' عبداللہ بٹ' منظور قادر' ریاض قادر اور دوسرے کئی ابھرتے ہوئے دانشور' نقاد' ادیب اور صحافی یہاں بیٹھتے تھے۔

میں بھی لارڈز میں دن میں ایک آدھ پھیرا ضرور ڈالتا تھا۔ عرفانی صاحب بھی کبھی کبھی حمید نظامی کے ساتھ یہاں دیکھے جاتے تھے۔ جناب حمید نظامی' عرفانی صاحب کی بے حد عزت اور قدر کرتے تھے۔ ان پر حضرت عرفانی صاحب کی شخصیت کا

صرف ایک ہی پہلو روشن تھا' یعنی یہ کہ عرفانی صاحب عربی' فارسی اور انگریزی زبانوں کے بڑے عالم تھے۔ ایک بار خود عرفانی صاحب نے مجھے بتایا کہ شاہ اردن کی سالگرہ تھی۔ حمید نظامی صاحب نے ہمارے حضرت عرفانی صاحب سے فرمائش کی کہ شاہ اردن کی سالگرہ کے موقع پر ہمیں مبارکباد کا پیغام بھیجنا ہے۔ آپ عربی زبان میں اس کی عبارت بنا دیجئے' جو اردن کے بادشاہ کے شایان شان ہو۔ حضرت عرفانی صاحب فرماتے ہیں۔

''میں نے عربی میں سالگرہ مبارکباد کا مضمون بنا کر حمید نظامی صاحب کو دے دیا۔ کوئی ڈیڑھ ہفتے کے بعد حمید نظامی صاحب نے مجھے آدمی بھیج کر بلایا۔ وہ بڑے خوش تھے۔ میرے سامنے عربی میں شاہی پیڈ پر انگریزی زبان میں ٹائپ کیا ہوا ایک خط رکھ دیا اور کہا۔

مولانا شاہ اردن کا جوابی خط آیا ہے پڑھ لیجئے گا۔ میں نے خط پڑھا اس میں شاہ اردن نے ایڈیٹر نوائے وقت حمید نظامی صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا کہ آپ کا مبارکباد کا پیغام ملا۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ پاکستان میں اتنی اعلیٰ عربی زبان جاننے والے اور لکھنے والے بھی موجود ہیں۔''

مجھے یاد ہے حضرت عرفانی صاحب یہ قصہ سنا کر ذرا سے مسکرائے تھے اور مجھے کہا تھا۔

''حمید صاحب! عربی تو ہماری روح کی زبان ہے۔ اس زبان میں تو اللہ جل شانہ نے اپنے نبی پاک پیغمبر دو عالم سیدنا محمد مصطفیٰ ﷺ سے کلام کیا تھا۔''

اور مجھے یہ بھی یاد ہے کہ پھر عرفانی صاحب کی آواز بھرا گئی تھی۔ ان پر رقت طاری ہو گئی تھی اور وہ کوٹ کی جیب سے رومال نکال کر اپنی آنکھیں پونچھنے لگے تھے۔ ایسا میں نے کئی بار دیکھا تھا کہ حضور نبی کریم کا ذکر پاک' ان کا اسم مبارک زبان پر آتے ہی عرفانی صاحب پر رقت طاری ہو جاتی تھی۔ اس کے بعد وہ بیٹھے ہوئے ہوں یا میرے ساتھ چل رہے ہوں وہ کافی دیر تک چپ رہتے تھے۔ ایک عجیب جذب کے عالم میں محو ہو جاتے تھے۔ جب ان پر یہ کیفیت طاری ہوتی تھی تو ان کا چہرہ گلنار کی طرح دمک اٹھتا تھا۔ مجھے ان کے جسم سے نکلتی ہوئی روشنی کی کرنوں کی پرسکون حرارت

محسوس ہونے لگتی تھی۔

موسم سرما کی سہ پہر تھی لارڈز ریستوران میں کافی رش تھا۔ ریستوران کی فضا کا ٹمپریچر بڑا خوشگوار تھا۔ میں حضرت عرفانی صاحب کے پیچھے چل رہا تھا۔ ہم مختلف میزوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے کونے والی ایک ٹیبل پر جا کر بیٹھ گئے۔ باتیں ہونے لگیں۔ میگزین ایڈیشن کے دو ایک مضامین پر کچھ باتیں ہوئیں' کچھ اس زمانے کے سیاسی ماحول پر باتیں ہوئیں۔ میرے لئے یہ باتیں صرف اس واسطے توجہ کا مرکز تھیں کہ یہ باتیں جناب عرفانی صاحب کر رہے تھے۔ میں ان کی یہ بات پوری توجہ اور دلچسپی سے سنتا تھا اور جب وہ کسی ادبی یا دینی مسئلے پر بات شروع کرتے تو میں ہمہ تن گوش ہو جاتا۔

اس وقت میں آس پاس کے ماحول سے بالکل بے نیاز ہوتا تھا۔ مجھے صرف عرفانی صاحب کی آواز سنائی دیتی تھی۔ مجھے صرف عرفانی صاحب کا چہرہ ہی دکھائی دیتا تھا اور میری خواہش ہوتی تھی کہ صرف ان ہی کا چہرہ میرے سامنے ہو۔ صرف ان کی ہی آواز میرے کانوں تک پہنچے۔ دوسرا کوئی چہرہ نظر کے سامنے نہ ہو۔ دوسری کوئی آواز مجھے سنائی نہ دے۔ میں عرفانی صاحب کے لئے چائے بنا رہا تھا کہ باہر لارڈز کے سامنے ایک تانگہ آ کر رکا۔

اس زمانے میں مال روڈ پر تانگے چلا کرتے تھے۔ موٹر کار کبھی کبھی ہی دکھائی دیتی تھی۔ میں نے ریستوران کی شیشے کی دیوار سے دیکھا کہ میرا وہی دوست تانگے سے اتر رہا تھا جو انگریزی ادب اور فلسفے کا سٹوڈنٹ تھا اور چند روز پہلے لورینگو ریستوران میں عرفانی صاحب سے ڈچ فلسفی سپنوزا پر ایک لیکچر سن کر ان سے بے حد متاثر ہوا تھا۔ ریستوران کے اندر آ کر اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں' ہمیں کونے والی ٹیبل پر بیٹھے دیکھا اور خوشی خوشی ہماری طرف بڑھا۔ عرفانی صاحب سے بڑے ادب سے جھک کر مصافحہ کیا اور میرے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا:

''میں نوائے وقت میں گیا تھا وہاں سے پتہ چلا کہ آپ تھوڑی دیر ہوئی اتر کر نیچے گئے ہیں۔ میں نے سوچا آپ ضرور لارڈز میں بیٹھے ہوں گے۔''

عرفانی صاحب بڑی خندہ پیشانی سے اسے ملے جیسا کہ وہ اکثر نوجوان طلبہ

سے ملا کرتے تھے۔ اگرچہ وہ عرفانی صاحب کے بھی بھرپور شباب کا زمانہ تھا مگر وہ نوجوان طالب علموں کے ساتھ بڑی بزرگانہ شفقت کا برتاؤ کرتے تھے۔ میں نے اپنے دوست کے لئے چائے کا آرڈر دیا۔

میرا دوست عرفانی صاحب کے سامنے بڑا مودب ہو کر بیٹھا تھا۔ ان کے سامنے وہ اپنی ساری انگریزی دانی بھول چکا تھا۔ بلکہ مجھے یقین تھا کہ عرفانی صاحب نے اس روز انگریزی کے جو اقتباسات زبانی بول کر سنائے تھے وہ مشکل ہی سے اس کی سمجھ میں آئے ہوں گے۔ مگر میرے دوست کی یہ بات بڑی قابل قدر تھی کہ اسے علم کا شوق تھا اور یہی شوق اسے عرفانی صاحب کی طرف کھینچ کر لے آیا تھا۔ وہ بڑے احترام اور ادب کے ساتھ بولا۔

''محترم عرفانی صاحب! اس روز فلسفہ یورپ پر آپ نے جو باتیں بیان فرمائیں وہ میں نے پہلے نہ کبھی کسی کتاب میں پڑھی تھیں اور نہ ہی کسی پروفیسر کی زبانی کبھی سنی تھیں۔ مجھے ایسا لگا کہ میں اب تک اندھیروں میں بھٹک رہا تھا۔ آپ مجھے روشنی میں لے آئے۔ آپ نے مجھے بتایا کہ فلسفہ کیا ہے؟ اور فلسفے کو کس طرح پڑھنا چاہئے؟ اور فلسفے کی اصل حقیقت کیا ہے؟ آپ نے مجھ پر جو احسان کیا ہے میں اس کا کبھی بدلہ نہیں چکا سکوں گا۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ جب تک زندہ رہا آپ کو دعائیں دیتا رہوں گا۔''

عرفانی صاحب اس کی طرف دیکھ کر تھوڑا تھوڑا مسکرا رہے تھے۔ کہنے لگے:

''برادر عزیز! ایک چیز ہوتی ہے علم۔ ایک چیز ہوتی ہے اکتساب علم یعنی علم کو حاصل کرنا۔ کتابیں پڑھنے سے آدمی صرف علم کو پڑھتا ہے علم حاصل نہیں کرتا۔ علم کسی صاحب علم کی رہنمائی سے ہی حاصل ہوتا ہے۔''

میرا دوست اک عالم حیرت میں گم بت بنا عرفانی صاحب کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس نے بڑے ادب سے عرض کی۔

''محترم مجھے افلاطون کے فلسفے کے بارے میں کچھ فرمائیے۔ یونان کا یہ واحد فلسفی ہے جس کے بارے میں نقادوں کی رائے میں بے حد تضاد پایا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی میرے دوست نے انگریزی زبان میں بولنا شروع کر دیا اور افلاطون کے فلسفے

پر دو چار کتابی باتیں کر کے چپ ہو گیا۔ عرفانی صاحب اپنی عادت کے مطابق مسکرا رہے تھے۔ انہوں نے اردو میں فرمایا۔

''برادر عزیز! خود افلاطون کی زندگی اور اس زمانے کے معاشرے کے ساتھ اس کے رویے میں تضاد پایا جاتا ہے۔ اگر تم فلسفے کے طالب علم ہو تو تمہیں معلوم ہو گا جب سقراط کو کسی نے کہا کہ افلاطون مکالموں کی شکل میں ایک کتاب لکھ رہا ہے جس میں آپ کا بھی ایک کردار شامل ہے بلکہ آپ اس کتاب کا مرکزی کردار ہیں تو سقراط نے اپنا سر پیٹ لیا تھا اور کہا تھا۔

میرے خدا! افلاطون رومانی ناول نگار ہے' اس نے خدا جانے کتنی جھوٹی باتیں میرے نام منسوب کر دی ہوں گی۔ لیکن بہرحال افلاطون نے انسانی فکر کو ایک نئی راہ ضرور دکھائی۔ اس نے کثرت میں وحدت کو دیکھا اور اس وحدت کو کائنات کے سارے حسن و جمال کا مرکز تسلیم کیا۔ وہ سوفسطائیوں کے بعد پہلا یونانی مفکر تھا جس نے کہا کہ اس کائنات کو پیدا کرنے والی ہستی ضرور ہے۔''

میرے دوست نے انگریزی میں پوچھا:

''محترم! کیا آپ افلاطون کے نظریہ اخلاق کے بارے میں کچھ فرمائیں گے؟ میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں اگر آپ انگریزی زبان میں بیان فرمائیں کیونکہ مجھے اپنا تھیسس انگریزی میں لکھنا ہے۔''

عرفانی صاحب یہاں پہنچ کر خاموش ہو گئے اور میرے دوست کی طرف دیکھتے ہوئے اس سے اردو میں پوچھا۔

''کیا آپ نے اسلامی مکتب فکر کا مطالعہ کیا ہے؟''

اس پر میرے دوست نے کچھ ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔

''بہت کم' ہمارے ہاں اردو میں اسلامی فلسفہ کی کتابیں تقریباً نایاب ہیں۔''

''تو آپ انہیں انگریزی میں پڑھیے۔'' عرفانی صاحب نے جواب دیا۔

''انگریزی میں تقریباً سبھی مسلمان فلاسفروں کی کتابوں کے تراجم مل جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں سب سے بڑی پرابلم یہ ہے کہ ہم لوگ یورپ کے فلسفے سے بڑی جلدی متاثر ہو جاتے ہیں اور اسے حرف آخر سمجھنے لگتے ہیں جبکہ حقیقت میں ایسی کوئی بات نہیں

ہے۔ جن یورپی فلسفہ دانوں کو آپ اس علم میں حرف آخر تصور کرتے ہیں۔ خود انہوں نے مسلمان فلسفیوں اور مسلمان اہل فکر کی خوشہ چینی ہی نہیں کی بلکہ ان کے فکر و دانش کے چراغوں سے اپنے چراغ روشن کئے ہیں۔ بوعلی سینا' ابن خلدون اور ابن رشد کے نام آج بھی یورپ کی دانش گاہوں میں بڑے ادب سے لئے جاتے ہیں۔

یہ وہ مسلمان دانشور ہیں جن کی رہنمائی کے بغیر یورپ سائنسی علوم میں کبھی اتنی ترقی نہیں کرسکتا تھا۔ اس کا اعتراف خود یورپ کے سائنس دان اور حکما کرتے ہیں۔ یورپ میں جب احیاء العلوم کا آغاز ہوا تو فرانس اور اٹلی کی دانش گاہوں میں قدیم یونانی اور رومی فلاسفروں کی کتابوں کی تلاش شروع ہوئی۔ ان لوگوں کو جو کتابیں ملیں وہ یونانی زبان میں لکھی ہوئی تھیں جس سے اہل روم وفرانس کے بیشتر دانشور نابلد تھے۔ اندلس میں اسلامی حکومت کے دوران مسلمان اہل علم و دانش نے ان تمام یونانی کتابوں کے عربی زبان میں ترجمے کر ڈالے تھے۔ چنانچہ یورپ میں ان کتابوں کے لاطینی اور فرانسیسی زبان میں ترجمے کئے گئے اور یوں یورپ میں علم کی روشنی پھیلنے لگی۔

اس روشنی میں جو سورج اور ستارے گردش کر رہے تھے وہ اسلامی فکر کے افق سے طلوع ہوئے تھے۔ آپ اپنے دین اسلام کے قیمتی ورثے پر بھی نگاہ ڈال لیا کریں۔ یہ اندلس کے عرب مسلمان اہل علم تھے جنہوں نے یورپ کو علم کی روشنی عطا کی۔

آپ کو معلوم ہوگا بلکہ آپ پر یہ حقیقت واضح ہوگی کہ اگر حضور نبی اکرم ہادی برحق ﷺ رحمت دو عالم ﷺ اس دنیا میں تشریف نہ لاتے تو فکر انسانی کو کبھی دنیا و آخرت کی روشنی نصیب نہ ہوتی۔

حضور نبی اکرم ﷺ کا ذکر پاک زبان پر آتے ہی عرفانی صاحب پر رقت طاری ہوگئی۔ میرے دوست کی آنکھوں میں بھی آنسو تیرنے لگے۔ میری آنکھیں بھی نم ہوگئیں۔ عرفانی صاحب کی آنکھیں بند تھیں۔ ان کا چہرہ اپنے سینے پر دل کی جانب جھکا ہوا تھا۔ لارڈز ریسٹورنٹ کے گاہکوں سے بھرے ہوئے ماحول میں ہماری میز کے اردگرد ایک عجیب پرسکون سرمدی فضا طاری ہوگئی تھی۔ کچھ دیر بعد عرفانی صاحب نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا۔ دونوں ہاتھ چہرے پر پھیر کر درود شریف پڑھا اور میری طرف متوجہ ہوکر

فرمایا۔

''حمید صاحب! ہماری چائے تو ٹھنڈی ہوگئی۔''

میرا نام وہ جس طرح لیتے تھے اس طرح میں نے آج تک کسی کی زبان سے نہیں سنا۔ وہ مجھے کبھی اے حمید کہہ کر نہیں بلاتے تھے۔ ہاں کبھی کبھی موڈ میں آکر مجھے خواجہ صاحب بھی کہہ دیتے۔ میرا نام وہ لفظ دال پر تشدید کے ساتھ پکارتے۔ شاید یہ ان کے پوٹھوہاری لہجے کا تقاضا تھا۔ بہرحال وہ جب بھی میرا نام لیتے تو مجھے بڑی مسرت ہوتی۔ یوں لگتا جیسے کسی نے پہلی بار مجھے میرے نام سے بلایا ہے۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے عرفانی صاحب ایسی ہمہ جہت' عظیم المرتبت شخصیت کا قرب حاصل تھا اور میری سب سے بڑی خوش نصیبی یہ تھی کہ وہ مجھ سے بڑی محبت اور اپنائیت کے ساتھ باتیں کرتے تھے۔ اس ایک بات پر ہی میں اپنی قسمت پر جس قدر ناز کروں کم ہے کہ میں نے اس روشنی کو جو آج ساری فضا میں پھیلی ہوئی ہے اس وقت دیکھا تھا جب وہ افق پر ابھی طلوع ہو رہی تھی۔ جو خوشبو آج سارے چمن کو مہکا رہی ہے میں نے اس کے لمس کو اس وقت محسوس کیا تھا جب وہ ابھی اپنے غنچہ شوق میں مستور تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ غنچہ اس وقت بھی بہار کا پورا کھلا ہوا پھول تھا۔ مگر اس پھول کو کوئی کوئی ہی دیکھ سکتا تھا۔ یا یہ پھول کسی کسی کو ہی اپنا جلوہ دکھاتا تھا۔ میں یہ کس طرح کہوں کہ میں نے اس غنچے میں پورے کھلے ہوئے پھول کی ایک جھلک دیکھ لی تھی۔ یا یہ کہ عرفانی صاحب نے اپنی نوازش خاص سے اس پھول کی ایک جھلک دکھا دی تھی۔ بہرحال جو کچھ بھی تھا میں عرفانی صاحب کی صحبت میں بیٹھ کر اپنے آپ کو بے حد خوش اور دنیا کا خوش قسمت آدمی سمجھتا تھا اور میری سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ یہ صحبت کبھی ختم نہ ہو۔ وقت گزرتا چلا جا رہا تھا۔ مال روڈ پر تانگے کم اور موٹر کاریں پہلے سے زیادہ نظر آنے لگی تھیں۔ پھر بھی ابھی انتشار نہیں ہوا تھا۔ ابھی بڑا پرسکون زمانہ تھا۔ ابھی واپڈا ہاؤس اور الفلاح کی بلڈنگ بھی نہیں بنی تھی۔ شملہ پہاڑی کے قریب ایمپریس روڈ پر نئے ریڈیو سٹیشن کی عمارت کی تعمیر شروع ہو چکی تھی۔

عرفانی صاحب کا قیام مغل پورہ گنج کے ایک محلے میں ہی تھا۔ وہ وہیں سے نوائے وقت کے دفتر میں تشریف لاتے۔ اگر ریڈیو پر ان کی کوئی تقریر ہوتی تو وہ سہ پہر

کے بعد ریڈیو سٹیشن تشریف لاتے۔ کیونکہ ریکارڈنگ تو ابھی شروع نہیں ہوئی تھی اور ریڈیو کا پروگرام وقت کے وقت نشر ہوتا تھا۔ چونکہ میرا ریڈیو سٹیشن پر روز ہی جانا ہوتا تھا اس لئے مجھے پتہ چل جاتا تھا کہ آج عرفانی صاحب کسی دینی یا علمی ادبی پروگرام میں شرکت کیلئے آ رہے ہیں۔ چنانچہ میں دوپہر کے بعد ریڈیو سٹیشن پر ہی رک جاتا اور عرفانی صاحب کا انتظار کرنے لگتا۔ اس دوران کوئی دوست چائے پینے کی دعوت دیتا تو میں کسی نہ کسی بہانے اس کو ٹال دیتا کیونکہ میں صرف عرفانی صاحب کے ساتھ ہی سہ پہر کی چائے پینا چاہ رہا ہوتا تھا۔ عرفانی صاحب آتے تو میری عید ہو جاتی۔

حضرت عرفانی صاحب دن کے بارہ بجے سے پہلے پرانے ریڈیو سٹیشن پر بہت کم آتے تھے۔ اس وقت وہ نوائے وقت کے دفتر میں اپنی ڈیوٹی پر ہوتے تھے۔

ریڈیو سٹیشن پر بھی ابھی دن کے وقت ریکارڈنگ وغیرہ کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا' چنانچہ پرانے ریڈیو سٹیشن پر عرفانی صاحب سے عام طور پر میری ملاقاتیں سہ پہر کے وقت ہوا کرتی تھیں۔ ایک دن ایسا ہوا کہ عرفانی صاحب صبح صبح ہی ریڈیو سٹیشن تشریف لے آئے اس وقت دن کے ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ جنوری کا مہینہ تھا۔ سخت سردی پڑ رہی تھی مجھے ایک ضروری ریڈیو سکرپٹ لکھنا تھا۔ میں آٹھ بجے ہی دفتر پہنچ گیا تھا اور پرانے ریڈیو سٹیشن کی کوٹھی کے پہلو میں زینے والے کمرے میں بیٹھا سکرپٹ لکھ رہا تھا۔ یہ صوفی غلام مصطفی تبسم صاحب کا کمرہ تھا۔ انہوں نے مجھے اپنے کمرے میں جس وقت چاہوں بیٹھنے اور لکھنے کی اجازت دے رکھی تھی۔

کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے سے حضرت عرفانی صاحب گزر رہے ہیں۔ ان کے قدموں کی رفتار معمول سے کچھ تیز تھی۔ وہ ہمیشہ بڑے پرسکون انداز میں چلا کرتے تھے جیسے باغ دنیا کی سیر کر رہے ہوں۔ اس روز میں نے انہیں قدرے تیز تیز قدموں سے کینٹین کی طرف جاتے دیکھا تو کام چھوڑ کر کمرے سے باہر آ گیا۔ میں نے انہیں مولانا کہہ کر بڑے احترام سے آواز دی تو وہ وہیں رک گئے۔ مڑ کر میری طرف دیکھا اور مسکرا کر فرمایا۔

''اب آپ نے مجھے پکڑ ہی لیا تو آ جائیں۔''

یہ کہہ کر وہ کینٹین کی طرف بڑھے۔ میں بھی جلدی جلدی قدم اٹھاتا ان کے

پاس پہنچا۔ وہ تھری پیس گرم سوٹ میں تھے۔ سر اور داڑھی کے سیاہ بال چمک رہے تھے۔ اس سے زیادہ نورانی چمک ان کے چہرے پر تھی۔ میں نے دیکھا کہ ایک ہاتھ میں پرانا سویٹر لپیٹ کر تھام رکھا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں مٹی کی رکابی تھی۔ میں بڑا حیران ہوا کہ ایک تو جناب عرفانی صاحب صبح صبح تشریف لائے ہیں۔ دوسرے یہ مٹی کی رکابی اور پرانی سویٹر ساتھ کیوں لائے ہیں۔ مگر میں نے ان سے کوئی سوال نہ کیا۔ چپ چاپ ان کے ساتھ ہو گیا۔ کینٹین کھل چکی تھی مگر ابھی چائے تیار ہونا شروع نہیں ہوئی تھی۔ ایک لڑکا دودھ پتیلے میں ڈال رہا تھا۔ عرفانی صاحب نے اس لڑکے کو ایک آنہ جیب سے نکال کر دیا اور فرمایا۔

''بھائی اس میں ایک آنے کا دودھ ڈال دو۔''

لڑکے نے رکابی کو ایک نظر دیکھا اور کہا۔

''جی اس میں ایک آنے کا دودھ پورا نہیں آئے گا۔''

حضرت عرفانی صاحب نے مسکرا کر کہا۔

''یار! جتنا آتا ہے ڈال دو۔''

رکابی میں دودھ ڈلوا کر عرفانی صاحب وہیں سے اس دروازے کی طرف مڑ گئے جو کوٹھی کے عقبی لان کی طرف کھلتا تھا۔ ہم لان میں سے نکل کر دوسری طرف کی دیوار والے دوازے سے گزرتے ہوئے ریڈیو سٹیشن والی کوٹھی کی دوسری طرف آ گئے۔ اس طرف بھی ایک پرانا گیراج ہوا کرتا تھا جو اکثر بند رہتا تھا۔ دیوار کے ساتھ ساتھ جھاڑ جھنکاڑ اگا ہوا تھا۔

اس وقت وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ اچانک ایک طرف سے کسی بلی کی آواز آئی۔ یہ آواز ایسی تھی جیسے بلی تکلیف میں آہستہ آہستہ کراہ رہی ہو۔ عرفانی صاحب ایک درخت کی طرف بڑھے۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے تھا۔ میں نے دیکھا کہ ریڈیو سٹیشن والی بلی درخت کے نیچے خشک جھاڑیوں میں دبک کر بیٹھی ہوئی ہے اور اس نے ایک ٹانگ آگے کو پھیلا رکھی تھی جس پر وہ منہ آگے کر کے بار بار اپنی زبان پھیر رہی تھی۔ عرفانی صاحب کو دیکھ کر بلی نے بڑی بے قراری سے میاؤں میاؤں کر کے آواز نکالی اور عرفانی صاحب کی طرف بڑھی اور ان کے پاؤں سے لپٹنے کی کوشش کی مگر وہ اپنی

پھیلی ہوئی ٹانگ کو گھسیٹ نہ سکی۔ عرفانی صاحب جلدی سے اس کے پاس بیٹھ گئے۔ دودھ کی رکابی آگے کر کے بلی کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور چمکار کر کہا۔

"بی بلی! فکر نہ کرو اللہ تعالیٰ شافی و کافی ہے۔"

عرفانی صاحب جو گرم سویٹر ساتھ لائے تھے' وہ انہوں نے بلی کے جسم کے گرد لپیٹ دیا کیونکہ بلی کو سردی بھی لگ رہی تھی۔ بلی بڑے سکون کے ساتھ دودھ پی رہی تھی۔ عرفانی صاحب اس کی طرف دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

"اس کی ٹانگ پر کسی نے سوٹی ماری ہے۔ بلی کو نہیں مارنا چاہئے۔"

میں نے پوچھا۔ "مگر حضرت جی! آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ بلی یہاں بیمار پڑی ہے؟"

حضرت عرفانی صاحب مسکرائے۔ مسکراتے ہوئے وہ چہرہ ذرا سا پیچھے کر لیا کرتے تھے۔ کہنے لگے۔

"ایسی باتیں نہیں پوچھا کرتے۔"

میں نے اس کے بعد کوئی سوال نہ کیا۔ بالکل نہ پوچھا کہ انہیں کیسے پتہ چل گیا کہ بلی کی ٹانگ میں چوٹ آئی ہے اور وہ چل پھر نہیں سکتی اور درخت کے پاس سردی میں بھوکی پیاسی پڑی ہے۔ عرفانی صاحب نے بلی کی گردن پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور کہا۔

"اللہ شفا دے گا۔"

وہ اٹھے اور ریڈیو سٹیشن کے پرانے گیٹ کی طرف ہو گئے۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے چلا۔ میں نے کہا اتفاق سے آپ تشریف لے آئے ہیں تو کمرے میں چلئے۔ چائے منگواتا ہوں۔

جناب عرفانی صاحب وہیں رک گئے اور میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے فرمایا:

"پہلی بات یہ ہے کہ مجھے ایک اور جگہ بھی جانا ہے' وہاں بھی کسی کو مجھ فقیر کی امداد کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد دفتر بھی پہنچنا ہے۔ چار بجے سہ پہر ملاقات گی۔

بذل حق محمود صاحب کے پروگرام میں ایک چھوٹی سی تقریر ہے۔"

گیٹ کے باہر کوئی تانگہ نہیں تھا۔ میں نے انہیں کہا کہ وہ وہیں ٹھہریں میں شملہ پہاڑی سے تانگہ لے آتا ہوں۔ عرفانی صاحب نے میرے کندھے پر آہستہ سے ہاتھ رکھا اور فرمایا۔

"آپ میری زیادہ فکر نہ کریں' سب ٹھیک ہے مجھے جہاں جانا ہے میں وہاں پیدل ہی جاؤں گا۔"

اور وہ میرے کندھے کو ذرا سا دبا کر شملہ پہاڑی کی طرف روانہ ہو گئے۔

ایسی بہت سی باتیں تھیں جو حضرت عرفانی اس زمانے میں مجھے نہیں بتایا کرتے تھے۔ خود مجھے بھی اتنا شعور نہیں تھا لیکن جب ان کی صحبت میں میری زندگی کے مزید بیس پچیس سال گزر گئے اور حضرت عرفانی صاحب کے ساتھ میری محبت میں اضافہ ہی ہوتا گیا اور مجھے محبت کے سوا اور کچھ یاد نہ رہا تو ایک بار حضرت عرفانی صاحب نے مجھ سے ایک بات کی۔ مجھے یوں لگا جیسے اندھیری کوٹھڑی میں کسی نے کھڑکی کا پٹ ذرا سا کھول دیا ہو اور روشنی ہی روشنی اندر آنے لگی ہو۔ اس روشنی میں مجھ پر ایک کیفیت سی طاری ہو گئی۔ میں چاہوں بھی تو اس کیفیت کو بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ جیسے گونگے نے گڑ کھا لیا ہو اور بیان نہ کر سکتا ہو کہ گڑ کا ذائقہ کیسا ہے۔

حضرت عرفانی صاحب اب مستقل لاہور آ گئے تھے۔ ان کا قیام مغل پورہ گنج میں تھا۔ ایک روز میں ان کے ساتھ ساتھ ایبٹ روڈ سے شملہ پہاڑی کی طرف جا رہا تھا۔ پنجاب پبلک ریلیشنز کے دفاتر کے آگے شملہ پہاڑی کے چوک تک بائیں جانب زمین کا کافی بڑا ٹکڑا خالی پڑا تھا۔ یہاں فوجی بھرتی کا ایک جانب کونے میں دفتر تھا جہاں کبھی کبھی کچھ نئے رنگروٹ نظر آ جاتے تھے۔ جب ہم اس خالی قطعہ اراضی کے قریب سے گزر رہے تھے تو میں نے یونہی کہہ دیا۔

"عرفانی صاحب! یہ جگہ ایک عرصے سے خالی پڑی ہے۔"

عرفانی صاحب مسکرائے فرمانے لگے۔

"ویرانے آباد ہوں گے۔ بڑی محفلیں لگیں گی بڑی رونقیں ہوں گی۔"

اس وقت میرے گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ دو سال کے بعد اسی قطعہ

اراضی پر ریڈیو پاکستان لاہور کی نئی دو منزلہ عمارت تعمیر ہوگی اور اس عمارت کی لائبریری میں جناب عرفانی صاحب کے ساتھ علم و عرفان کی وہ محفلیں منعقد ہوں گی کہ جن کی روشنی کی کرنیں دنیا کے کونے کونے میں پہنچیں گی۔

اس واقعے کے کچھ ہی دنوں بعد معلوم ہوا کہ شملہ پہاڑی کے سامنے جو خالی زمین ہے وہاں ریڈیو سٹیشن کی نئی عمارت کی تعمیر شروع ہونے والی ہے۔

عرفانی صاحب تقریر کرنے ریڈیو سٹیشن پر تشریف لائے تو میں نے بڑے جذباتی انداز میں انہیں یہ خبر سنائی اور کہا۔

''آپ کی پیش گوئی بالکل درست ثابت ہوئی مجھے تو اسی روز یقین ہو گیا تھا کہ آپ نے جو فرمایا ہے وہی ہوگا۔''

عرفانی صاحب مسکرائے۔ ان کے چہرے پر ایک نورانی سی چمک آ گئی۔ فرمانے لگے۔

''حمید صاحب اللہ جل شانہٗ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ زمین کے اس ٹکڑے کو اس واسطے خالی رکھا گیا تھا کہ یہاں ایک روز ریڈیو سٹیشن کی نئی عمارت بنے گی۔''

مجھے اپنے دل میں بڑی خوشی محسوس ہو رہی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے عرفانی صاحب کی زبان سے نکلی ہوئی بات کو قبولیت کا شرف بخشا۔ نئے ریڈیو سٹیشن کی تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔ وقت گزرتا گیا۔ جناب عرفانی صاحب سے میری ملاقاتیں پرانے ریڈیو سٹیشن پر ہی ہوتیں کسی روز میں نوائے وقت کے دفتر ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتا۔ کبھی کبھی ہم صحافیوں کے پسندیدہ ریستوران لارڈز میں جا بیٹھتے۔ وہاں ہماری محفل لگتی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب عرفانی صاحب نے انگریزی لباس ترک کر دیا تھا اور شلوار قمیص زیب تن کرتے تھے۔ سردیوں کے موسم میں گرم واسکٹ کے اوپر لمبا کوٹ پہن لیتے۔ نئے ریڈیو سٹیشن کی عمارت تیار ہو گئی۔ نئے سٹوڈیوز اور ریکارڈنگ رومز میں پروگرام نشر کرنے اور ریکارڈنگ کرنے کا تمام ساز و سامان لگا دیا گیا تھا مگر ابھی ہم لوگ اس نئی عمارت میں منتقل نہیں ہوئے تھے۔ اسی دوران رن کچھ کی لڑائی شروع ہو گئی اور نئے سٹیشن کے سٹوڈیو میں پہلا ملی اور فوجی نغمہ ملکہ ترنم نور جہاں کی آواز میں ریکارڈ کیا

گیا' یہ نغمہ تھا۔

اے وطن کے سجیلے جوانو
میرے نغمے تمہارے لئے ہیں

جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے اسے قتیل شفائی نے لکھا تھا لیکن یہ نغمہ جمیل الدین عالی کے نام سے نشر ہوا اور نشر ہوتا رہا۔ اس کی دھن موسیقار شہریار نے بنائی تھی۔ یہ میں نے آپ کو ایک ایسی راز کی بات بتائی ہے جو شاید ہی کوئی بتا سکے۔ بہرحال رن کچھ میں بھارت کو ذلت آمیز شکست اٹھانی پڑی۔ پاک فوج کے بہادر جوانوں نے دشمن کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملا دیا۔ عرفانی صاحب نے ان دنوں ریڈیو پر اسلام کے جذبہ جہاد میں سرشار ہو کر بڑی ایمان افروز اور پرجوش تقریریں نشر کیں۔ ان کی تقریروں کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی جس روز انہیں تقریر براڈ کاسٹ کرنی ہوتی تھی میں پرانے ریڈیو سٹیشن کے ڈیوٹی روم میں ریڈیو سے کان لگائے بیٹھا ہوتا اور بڑے انہماک کے ساتھ ان کی تقریر کا ایک ایک لفظ سنتا اور اپنی روح میں ایک نئی توانائی محسوس کرتا۔ ایک روز وہ تقریر نشر کر کے سٹوڈیو سے باہر نکلے تو میں کاریڈور میں ان کے خیر مقدم کو موجود تھا۔

مجھے دیکھتے ہی وہ رک گئے اور مسکرانے لگے۔ میں نے ان کی تقریر کی دل کی گہرائیوں سے تعریف کی۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔

''چلئے کینٹین میں تھوڑی دیر بیٹھتے ہیں۔''

شام کا وقت تھا۔ موسم گرما تھا۔ ہم کینٹین کے گیراج کے باہر ہی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ باتوں ہی باتوں میں عرفانی صاحب ایک دم خاموش ہو گئے۔ چہرے پر جذب کی ایک خاص کیفیت کے اثرات ابھر آئے۔ اس کیفیت کو میں فوراً پہچان لیا کرتا تھا اور پھر ان سے کوئی بات نہیں پوچھتا تھا۔ چپ ہو جاتا تھا۔ اس دوران عرفانی صاحب کے چہرے پر ایک قسم کا نور سا جھلکنے لگا۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اردگرد کے ماحول سے بے نیاز ہیں اور خدا جانے کس دنیا میں پہنچ چکے ہیں۔ پانچ سات منٹ اسی حالت میں گزر گئے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے سر کو ہلکی سی جنبش دی۔ کلمہ شریف پڑھ کر درود شریف پڑھا۔ چہرے پر دونوں ہاتھ پھیرے اور اپنی چائے کی پیالی کی طرف

دیکھ کر فرمایا۔

"پیالی خالی ہے۔"

میں نے کہا۔"بس میں بنانے والا ہی تھا۔"

اور میں جلدی سے ان کی پیالی میں چائے انڈیلنے لگا۔ دراصل میں انتظار میں تھا کہ وہ اپنی حالت جذب سے واپس رجوع کریں تو میں چائے بنا دوں تاکہ انہیں تازہ گرم چائے ملے۔ چائے ٹھنڈی نہ ہو جائے۔ چائے کا ایک گھونٹ لینے کے بعد عرفانی صاحب نے ایک عجیب سرخوشی کے عالم میں فرمایا۔

"سبحان اللہ حمید صاحب! ابھی ہم لوگ بہت کچھ دیکھیں گے۔ اللہ جل شانہ! اپنے بندوں کا امتحان لے گا۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ دل ایمان کی حرارت سے گرم ہیں۔ سینے روشن ہیں۔ ان شاء اللہ ہم سرخرو ہوں گے۔"

میں دل میں خدا سے دعا مانگنے لگا کہ یا اللہ مسلمانوں کو ہر امتحان میں سرخرو فرمانا۔

کچھ وقت گزرنے کے بعد ہم پرانے ریڈیو سٹیشن کو چھوڑ کر نئی عمارت میں آ گئے۔ یہ سن 1964ء کے اواخر کا زمانہ تھا۔ اس دوران عرفانی صاحب کے بالوں میں سفیدی آنے لگی تھی۔ ان کے لباس میں بھی مزید تبدیلی آ گئی تھی۔ اب وہ سردیوں میں شلوار قمیص اور اوپر گرم اوورکوٹ کی بجائے چھوٹا گرم کوٹ پہننے لگے تھے۔ کبھی کبھی سردیوں کے موسم میں دھسہ یا شال بھی اوڑھ لیتے۔ ان کے احباب اور عقیدت مندوں کا حلقہ بھی آہستہ آہستہ وسیع ہونے لگا تھا۔ شملہ پہاڑی پر درس قرآن و حدیث کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا تھا۔

نئے ریڈیو سٹیشن کے گیٹ سے ذرا آگے دائیں جانب عرفانی صاحب نے ایک چھوٹی سی مسجد اپنے ہاتھوں سے تعمیر کی تھی۔ اس مسجد کی چھت نہیں تھی بس ایک چبوترہ تھا اور قبلہ رخ بغیر گارے کے اینٹیں جوڑ کر چھوٹی سی محراب بنا دی گئی تھی۔ عرفانی صاحب نے چار پانچ صفیں بھی بچھا دی تھیں۔ ہر روز وہ ان صفوں پر گرے ہوئے درختوں کے پتوں کو صاف کرتے۔ ریڈیو کے اکثر ملازمین وہیں آ کر نماز ادا کرتے۔ عرفانی صاحب ہی کی کوششوں سے محکمے نے ان کی یہ تجویز منظور کر لی کہ سامنے والے

باغیچے میں ایک چھوٹی سی جدید طرز کی پختہ مسجد تعمیر کی جانی چاہئے۔ نئی مسجد کی تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔ عرفانی صاحب خود وہاں مزدوروں کی طرح کام کرتے۔ اگرچہ احباب آگے بڑھ کر عرض کرتے کہ ہم اس خدمت کے لئے حاضر ہیں۔ اس پر عرفانی صاحب مسکراتے اور فرماتے۔

"مگر مجھے اس خدمت سے محروم نہ کریں۔"

نئی مسجد کا بڑا خوبصورت جدید اور قدیم طرز تعمیر کے امتزاج سے گنبد بنایا گیا تھا۔ وضو کے لئے پانی کا معقول انتظام کیا گیا۔ شیشے کے دروازے کھڑکیاں لگائی گئیں۔ جب مسجد بن کر تیار ہو گئی تو عرفانی صاحب نے خود اذان دی اور پہلی امامت فرمائی۔ یہ مسجد آج بھی قائم و دائم ہے۔ ریڈیو کے عملے کے علاوہ باہر کے لوگ بھی آ کر وہاں نماز باجماعت ادا کرتے ہیں۔

ستمبر سن 65ء میں جب بھارت نے کسی اعلان کے بغیر پچھلے پہر کی تاریکی میں لاہور پر بزدلانہ حملہ کر دیا تو عرفانی صاحب کی یہ پیش گوئی بھی درست ثابت ہو گئی کہ قوم پر ایک آزمائش کا وقت آئے گا اور وہ آزمائش میں سرخرو ہو کر نکلے گی۔ ایسا ہی ہوا۔ ساری قوم دشمن کے حملے کے خلاف متحد ہو کر سیسہ پلائی دیوار بن کر کھڑی ہو گئی۔ پاک فوج کے جیالوں نے اپنے سے تین گنا بڑی طاقت کا سر کچل کر رکھ دیا۔ جرأت اور دلیری کے ایسے ایسے معرکے لڑے گئے کہ ساری دنیا پاک فوج کی شجاعت و سرفروشی پر انگشت بدنداں ہو کر رہ گئی۔ اس دوران عرفانی صاحب بھی اپنے محاذ پر پوری سرگرمی سے مصروف عمل رہے۔

وہ ریڈیو پاکستان لاہور کے اردو اور پنجابی دینی پروگراموں میں جذبہ جہاد کی اہمیت اور اسلامی تاریخ کی معرکہ آرا جنگوں پر تقریباً ہر روز ایک تقریر نشر کرتے۔ وہ صبح ریڈیو سٹیشن پر موجود رہتے۔ خود بھی تقریر نشر کرتے اور دوسروں کے لئے بھی تقریریں لکھتے۔ مختلف غیر ملکی اخبارات کے تبصرے انگریزی سے اردو میں منتقل کرتے۔ اسلامی جنگوں کی تاریخ اور مسلمانوں کے جذبہ جہاد پر قرآن کی روشنی میں لکھے گئے ان کے مضامین اخباروں میں چھپتے۔ عرفانی صاحب ایک سچے مسلمان مجاہد کی طرح کام کر رہے تھے۔ ریڈیو سٹیشن کے عملے کے آدمیوں' شاعروں اور ادیبوں کی طرح عرفانی صاحب

بھی کھانے پینے سے بے نیاز ہو چکے تھے۔ بھوک محسوس ہوتی تو کام کرتے کرتے' کوئی تقریر لکھتے لکھتے دو چار سلائس منگوا کر چائے کے ساتھ کھا لیتے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ میں ان کے لئے کینٹین سے کھانا منگوا لیتا۔ ہم لائبریری میں یا کسی دوسرے کمرے میں بیٹھ کر جلدی جلدی کھانا کھاتے اور پھر اپنے اپنے کام میں مصروف ہو جاتے۔ یہی حال پوری پاکستانی قوم کا تھا۔ ساری قوم یکمشت ہو کر میدان عمل میں کود پڑی تھی۔ اس اتحاد' تنظیم اور یقین محکم نے قوم کو سرخرو کیا اور اسے ہر محاذ پر فتح و کامرانی عطا ہوئی۔ پاک فوج کے غازیوں اور شہیدوں نے اپنے محدود وسائل مگر نا قابل شکست جذبہ ایمانی کے ساتھ دشمن کو اپنی پاک سرحدوں سے نکال کر باہر پھینک دیا۔ بھارت واویلا مچانے لگا۔ اس نے گھٹنے ٹیک دیئے اور جنگ بندی قبول کر لی۔

ریڈیو پاکستان کی نئی عمارت میں آنے کے بعد عرفانی صاحب کی توجہ کلی طور پر دینی علوم کی نشر و اشاعت کی طرف مبذول ہو چکی تھی۔ اخبارات کے دینی ایڈیشن میں ان کے بصیرت افروز مضامین اکثر شائع ہوتے رہتے تھے۔ ان کے درس و تدریس کا سلسلہ وسیع سے وسیع تر ہو رہا تھا۔ جیسے جیسے آفتاب بلند ہوتا جا رہا تھا اس کی روشنی اور حرارت کا میدان بھی وسیع ہوتا جا رہا تھا۔ ریڈیو سٹیشن پر بھی ان کی مصروفیات میں اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ مختلف دینی پروگراموں میں حصہ لیتے' تقاریر لکھتے۔ قرآن حکیم کی تعلیمات کے بارے میں تقاریر نشر کرتے' حدیث شریف' فقہ' احکامات شرعیہ' عربی لسانیات' منقولات و معقولات اور قرآن پاک کی تعلیمات کے سلسلے میں اس وقت عرفانی صاحب سے بڑھ کر اور کوئی عالم فاضل شخصیت ریڈیو سٹیشن پر نظر نہ آتی تھی۔ ان تمام علوم کے علاوہ انہیں انگریزی زبان و ادب پر بھی عبور حاصل تھا۔ عربی فارسی کے بھی وہ عالم تھے۔ قومی اور بین الاقوامی سیاسیات پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔

ان سب پر مستزاد یہ کہ عرفانی صاحب زاہد خشک بالکل نہیں تھے۔ ان کا پیمانہ علم شدت جذبات سے لبریز تھا۔ وہ رقت کی دولت سے مالا مال تھے۔ جو جذبات کا سرمایہ اور دل کے گداز پن کا سرچشمہ ہے۔ جب حضور پاک ﷺ کا اسم مبارک ان کی زبان پر آتا تو ان پر بے اختیار رقت کا عالم طاری ہو جاتا۔ ریڈیو پر تقریر ریکارڈ کراتے وقت اکثر ایسا ہو جاتا تھا۔ اس کا میں چشم دید گواہ ہوں۔ میرے پاس ریڈیو پر دینی علوم

کا پروگرام نہیں تھا یہ پروگرام ہمارے دوست اور ساتھی پروڈیوسر عبدالحئی قریشی کے پاس تھا لیکن جب عرفانی صاحب کی کوئی تقریر یا مباحثہ ریکارڈ ہونے والا ہوتا تھا تو میں عبدالحئی قریشی کے پاس بوتھ میں ضرور موجود ہوتا تھا اور بوتھ یعنی ریکارڈنگ روم کی شیشے کی دیوار میں سے عرفانی صاحب کو تقریر پڑھتے یا کسی مباحثے میں بات کرتے دیکھ رہا ہوتا تھا۔

عرفانی صاحب سے میری محبت مجھے کھینچ لاتی تھی۔ میں انہیں تقریر پڑھتے' مباحثے میں دوسرے شرکاء سے بات چیت کرتے دیکھنا چاہتا۔ ان کی آواز سننا چاہتا' ان کی عالمانہ اور اثر انگیز باتیں سننا چاہتا تھا۔ عرفانی صاحب کی رفاقت میں یہ میری زندگی کے سنہری دور کا آغاز تھا۔ عرفانی صاحب بھی پوری طرح صوفیانہ رنگ میں رنگ چکے تھے۔ ان سے ملاقات کا شرف مجھے ہر روز حاصل ہوتا۔ عرفانی صاحب صبح نو بجے' ساڑھے نو بجے کے قریب تشریف لاتے۔ میں صبح آٹھ ساڑھے آٹھ بجے ریڈیو سٹیشن آ جاتا۔ جب تک عرفانی صاحب نہ آتے میں صبح کی پہلی چائے کے خوبصورت لمحات کو بچائے رکھتا۔ میں پہلی چائے عرفانی صاحب کے پاس بیٹھ کر پینا چاہتا۔ میرے میوزیشن دوست بھی صبح صبح آ جاتے تھے۔ ان میں سے دو ایک سے میری بڑی گہری دوستی تھی۔ وہ چائے کے لئے کہتے تو میں کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر ٹال دیتا بعد میں جب انہیں معلوم ہو گیا کہ میں صبح کی پہلی چائے عرفانی صاحب کے ساتھ ہی پیتا ہوں تو ایک روز ایسا ہوا کہ انور وائلن نواز نے صبح مجھے کینٹین میں چل کر چائے پینے کے لئے کہا تو اصغر حسین وائلن نواز نے ہنس کر کہا کہ:

''حمید صاحب اس وقت صرف عرفانی صاحب کے ساتھ ہی چائے پئیں گے۔''

مجھے یہ خیال بھی آتا کہ یہ لوگ بڑی محبت سے مجھے چائے کی پیشکش کرتے ہیں اور میں انہیں مایوس کرتا ہوں۔ یہ دل میں کیا سوچتے ہوں گے کہ میں خود غرض قسم کا آدمی ہوں اور محبت میں تو بہت ہی خود غرض ہو جاتا ہوں۔ چونکہ مجھے اپنے عیب کا علم ہے اس لئے میں اسے دور کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں اور خدا کے حضور دعا بھی مانگتا رہتا ہوں۔

بہرحال جہاں تک ریڈیو سٹیشن پر صبح کی پہلی چائے کا تعلق ہے میں وہ عرفانی صاحب کے ساتھ ہی پینا چاہتا اور میری کوشش ہوتی کہ میں ان حسین لمحات کو ہاتھ سے نہ جانے دوں۔ جن دوستوں کے بارے میں مجھے معلوم ہوتا کہ وہ مجھے چائے پینے کے لئے کینٹین پر لے جائیں گے میں ان سے آنکھیں چرا لیتا۔ انہیں دور سے آتا دیکھ کر ادھر ادھر ہو جاتا۔ جب نو بجتے تو میں ریڈیو سٹیشن کے گیٹ کے پاس آ جاتا۔ تھوڑی دیر گیٹ سے باہر آ کر پان سگریٹ والے شکور کے کھوکھے کے پاس کھڑا ہو جاتا۔ ایک روز میں وہاں کھڑا تھا کہ میرا ڈرامہ آرٹسٹ دوست حامد رضا آ گیا وہ جانتا تھا میں عرفانی صاحب کا انتظار کر رہا ہوں۔ ہنس کر بولا۔

''خواجہ یار! تم عرفانی صاحب کا اس طرح انتظار کیسے کر رہے ہو جس طرح کوئی اپنے محبوب کا انتظار کرتا ہے۔''

میں مسکرا دیا۔ حامد رضا نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ میں اپنے محبوب ہی کا انتظار کر رہا تھا۔ پھر جب سڑک پر رکشا آ کر رکتا اور عرفانی صاحب رکشے سے باہر تشریف لاتے تو میرے چہرے پر اس طرح رونق آ جاتی جیسے کسی صحرا کے پیاسے نے اچانک اپنے سامنے آبشار گرتی دیکھ لی ہو۔ عرفانی صاحب اپنے خاص انداز میں میری طرف تبسم فرماتے اور وہیں کھڑے ہو کر میری طرف دیکھ کر مسکراتے رہتے' میں جلدی سے ان کی طرف بڑھتا۔ پھر انہیں ساتھ لے کر کبھی ریڈیو کی نئی کینٹین پر اور کبھی لائبریری روم میں آ جاتا۔ سردیوں میں دھوپ نکلی ہوتی تو ریڈیو سٹیشن کے لان میں گلاب کے پھولوں کی کیاری کے پاس جا کر بیٹھ جاتے۔ دم کی ہوئی چائے آ جاتی۔ میں بڑے احترام اور اہتمام سے عرفانی صاحب کے لئے چائے بناتا۔ وہ بڑے خوش ہوتے۔ مسکراتے ہوئے خالص پوٹھوہاری لہجے میں کہتے۔

''حمید صاحب! چائے گلاب کے پھولوں کے پاس بیٹھ کر ہی پینی چاہیے۔''

کبھی ایسا ہوتا کہ میں گلاب کے دو تین پھول توڑ کر کسی کیاری میں چھپا رکھتا اور عرفانی صاحب کے آنے کا انتظار کرنے لگتا۔ پھول اپنے ہاتھ میں اس لئے نہ رکھتا کہ لوگ نظر نہ لگا دیں۔ یہ پھول میں نے عرفانی صاحب کے لئے توڑے ہوتے تھے۔ چاہتا تھا کہ سوائے عرفانی صاحب کے ان پر کسی کی نظر نہ پڑے۔ جب وہ آتے میں دوڑ

کر باغ کی کیاری میں سے پھول لاتا اور انہیں پیش کرتا۔ وہ بڑے خوش ہوتے۔ آپ یقین کریں کہ میں نے عرفانی صاحب کو ہر حال میں خوش دیکھا ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ خود خوش رہتے بلکہ اپنی خوشیاں دوسروں میں بانٹتے رہتے تھے۔ کوئی غمزدہ سے غمزدہ شخص بھی ان کے پاس آتا تو ان کی باتیں سن کر خوشی سے نہال ہو جاتا۔ عرفانی صاحب کی آنکھوں میں اگر میں نے آنسو دیکھے ہیں تو یہ وہ آنسو تھے جو اللہ اور اس کے رسول پاک ﷺ کے مبارک نام پر ان کی آنکھوں میں بے اختیار بھر آتے تھے۔ یہ انتہائے محبت کے آنسو تھے۔ رقت کے آنسو ہوتے تھے۔ ان آنسوؤں کی مسرتوں کا اندازہ صرف وہی خوش قسمت لگا سکتے ہیں جو ان مقدس آنسوؤں کی لازوال نعمت سے سرفراز ہیں۔

عرفانی صاحب کی شخصیت اور ان کے روحانی مراتب سے وابستہ کچھ باتیں ایسی ہیں جن کو معرض اظہار میں لانے کی انہوں نے مجھے اجازت نہیں دی ہوئی۔ یہ باتیں میرے دل میں اس طرح محفوظ ہیں جس طرح سیپ کے اندر موتی بند ہوتے ہیں' محفوظ ہوتے ہیں۔ البتہ کچھ واقعات ایسے ہیں جن کے بیان کی انہوں نے مجھے اجازت دے رکھی تھی۔ اب جبکہ یہ سعادت میرے حصے میں آئی ہے کہ میں عرفانی صاحب کے قدموں میں بسر کی ہوئی طویل رفاقت کو معرض تحریر میں لاؤں تو کچھ واقعات میں ساتھ ساتھ بیان کرتا جاؤں گا۔

پہلا واقعہ بیان کرتا ہوں۔ عرفانی صاحب اگر کسی روز دن کے وقت نہ آتے تو غروب آفتاب سے ذرا پہلے ریڈیو سٹیشن تشریف لاتے۔ اس روز مجھے پتہ ہوتا تھا کہ وہ دن میں ریڈیو سٹیشن نہیں آ رہے۔ چنانچہ اس روز میں بھی اپنے کام کا شیڈول دوپہر کے بعد شروع کرتا اور دوپہر کے بعد ہی ریڈیو پر آتا۔ ریڈیو سٹیشن پر میری ڈیوٹی کا معمول کچھ ایسا تھا کہ مجھ پر وقت کی کوئی پابندی نہیں تھی۔

ہمیں ایک متعینہ ریکارڈنگ ٹائم ضرور ملا ہوتا تھا مگر چونکہ سبھی میرے دوست تھے اور میرا پروگرام بھی پانچ دس منٹ کا ہوتا تھا اگر معینہ وقت پر ریکارڈنگ نہ ہوتی تو میں کسی نہ کسی پروڈیوسر سے دس پندرہ منٹ لے کر پروگرام ریکارڈ کر لیتا تھا۔

اس روز بھی عرفانی صاحب کو دوپہر کے بعد ریڈیو سٹیشن آنا تھا۔ مجھے ایک دن

پہلے انہوں نے صرف یہی فرمایا تھا کہ کل دوپہر کے بعد ہی آنا ہوگا۔ میں جذبہ بے اختیار شوق کے تحت دو بجے ہی ریڈیو سٹیشن پہنچ گیا۔ عرفانی صاحب ابھی تشریف نہیں لائے تھے۔ میں کچھ دیر پروگرام منیجر سعید مرزا صاحب کے کمرے میں بیٹھا رہا پھر یاسمین طاہر کے کمرے میں آ گیا۔ تھوڑا وقت یہاں گزار دیا۔ دل عرفانی صاحب کی طرف لگا ہوا تھا۔ ابھی مجھے فضا میں ان کی خوشبو محسوس نہیں ہوئی تھی۔ یہ کسی پرفیوم کی خوشبو نہیں تھی بلکہ خوشبوؤں کی خوشبو' محبت کی خوشبو تھی۔ میں وہاں سے اٹھ کر سٹوڈیو میں آ گیا۔ سوچا اپنا پروگرام ہی ریکارڈ کروا لیتا ہوں۔ سکرپٹ میری جیب میں تھا۔ سٹوڈیو میں عتیق اللہ شیخ کسی پروگرام کی ریکارڈنگ ختم کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔

''یار! میری بھی ریکارڈنگ کرا دو۔''

عتیق اللہ شیخ نے ہنس کر کہا۔''خواجہ صاحب! آج کیا بات ہے؟ اتنی جلدی کس لئے؟''

میں نے کہا۔''بھائی ایک ضروری کام ہے۔''

وہ ہلکا سا قہقہہ لگا کر بولا۔''سٹوڈیو میں چلئے' بندہ حاضر ہے۔''

میں سٹوڈیو میں آ کر بیٹھ گیا۔ بیس پچیس منٹ میں یہ کام بھی ہو گیا۔ سٹوڈیو سے باہر نکلا تو مجھے ہوا میں خوشبوئے الفت کی ایک ہلکی سی لہر قریب سے گزرتی محسوس ہوئی۔ خوشبو کی یہ لہر لائبریری روم کی طرف سے آئی تھی۔ میرے قدم بے اختیار لائبریری کی طرف اٹھ گئے۔ لائبریری کے دروازے کا ایک پٹ کھلا تھا۔ اندر داخل ہوا تو دائیں جانب کرسی پر عرفانی صاحب تشریف فرما تھے۔ ان کے سامنے ایک مرد اور ایک عورت بیٹھی تھی۔ دونوں ادھیڑ عمر کے تھے۔ مرد کی عمر زیادہ لگتی تھی۔ لباس دونوں کا شہر کے رہنے والوں جیسا تھا۔ عورت نے دوپٹے سے سر ڈھانپ رکھا تھا اور سر جھکائے ہوئے بیٹھی تھی۔ انہوں نے میری طرف دیکھا۔ عورت کی آنکھوں سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ روتی رہی ہے۔

عرفانی صاحب کو سلام کر کے میں دروازے میں ہی کھڑا رہا۔ میں عرفانی صاحب کی اجازت کے بغیر کمرے میں داخل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ عرفانی صاحب نے میری طرف دیکھا اور شہادت کی انگلی اٹھا کر ایسے اشارہ کیا جیسے کہہ رہے ہوں ایک منٹ

انتظار کریں۔ میں الٹے قدم واپس ہو گیا۔ عرفانی صاحب کے پاس اب اکثر ان کے ارادت کیش' عقیدت مند' ان سے محبت کرنے والے اصحاب آتے رہتے تھے اور اپنے مختلف مسائل بیان کرتے تھے اور عرفانی صاحب ان کی تالیف قلب کرتے تھے۔

میں دوبارہ سٹوڈیوز میں آ گیا۔ بوتھ میں بیٹھا مختلف پروگراموں کی ریکارڈنگ سنتا رہا۔ جب آدھا گھنٹہ گزر گیا تو سوچا کہ اب وہ لوگ جا چکے ہوں گے میں سٹوڈیو سے باہر لابی میں آیا تو دیکھا کہ وہ دونوں یعنی عورت اور مرد عرفانی صاحب کے پیچھے پیچھے بڑے ادب سے قدم اٹھاتے ہوئے لائبریری روم سے نکل رہے تھے۔ میں ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ وہ لوگ انتہائی احترام کے ساتھ عرفانی صاحب کو سلام کر کے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد عرفانی صاحب نے ہلکے سے تبسم کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ میں ان کے قریب آ گیا۔ عرفانی صاحب کے تبسم میں آج مجھے افسردگی کا ہلکا سا تاثر نظر آیا تھا۔ میں نے بالکل نہ پوچھا کہ یہ لوگ کون تھے اور آپ کی مسکراہٹ میں افسردگی کا امتزاج کیوں ہے۔ عرفانی صاحب نے فرمایا۔

''چائے کہاں بیٹھ کر پی جائے؟''

میں نے عرض کی کہ کینٹین میں چلتے ہیں۔ اس پر عرفانی صاحب نے فرمایا کہ لائبریری میں ہی بیٹھتے ہیں۔ میں نے چائے کا آرڈر دیا اور تھوڑی دیر بعد میں عرفانی صاحب کے قریب بیٹھا چائے بنا رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ عرفانی صاحب کسی گہری سوچ میں گم ہیں۔ میں نے انتہائی محبت اور صفائی کے ساتھ چائے بنا کر انہیں پیش کی تو وہ عالم استغراق سے نکل آئے۔ گہرا سانس بھرا اور فرمایا۔

''حمید صاحب! لوگ اللہ جل شانہ' کی بنائی ہوئی خوبصورت دنیا کو بگاڑنے کی کوشش کیوں کرتے ہیں۔ کیا انہیں معلوم نہیں کہ اس طرح وہ محض اپنی دنیا اور اپنی عاقبت ہی کو بگاڑتے ہیں۔''

میں سمجھ گیا کہ جو لوگ ابھی ابھی عرفانی صاحب کے پاس بیٹھے تھے انہیں کسی سنگین مسئلے کا سامنا ہے۔ عرفانی صاحب خاموشی سے چائے پیتے رہے۔ پھر انہوں نے فارسی کا ایک شعر پڑھا جو مجھے آج بھی یاد ہے۔ مجھے یہ یاد نہیں رہا کہ شاعر کا نام عرفی لیا تھا یا نظیری۔ بہر حال شعر یہ تھا:

ملال آدمیاں دم بدم دگرگون است
منم کہ مدت عمر بہ یک ملال گذشت

اس کے ساتھ ہی عرفانی صاحب نے مجھے بڑی تفصیل سے اس شعر کا مطلب سمجھایا اور بتایا کہ وہ لوگ ان کے پاس کیا مسئلہ لے کر آئے تھے۔ مسئلہ یہ تھا کہ اس ادھیڑ عمر عورت کا ایک ہی جوان بیٹا تھا۔ جس کے نام اس کا باپ گاؤں میں کچھ زمین چھوڑ گیا تھا۔ زمین کا محل وقوع بڑا اہم تھا۔ برادری میں اس قطعہ اراضی کے معاملے میں جھگڑا چل رہا تھا۔ بقول اس بیوہ عورت کے' زمین کا جائز حق دار اس کا بیٹا تھا۔ برادری والے اسے متنازعہ سمجھتے تھے اور انہوں نے کورٹ کچہری میں مقدمہ بھی دائر کر رکھا تھا۔ بیٹے نے جس کا نام غلام اکبر تھا' یہ زمین فروخت کر دی اور لاہور کے مضافات میں ایک چھوٹی سی کوٹھی خرید کر اپنی ماں کے ساتھ وہیں رہنے لگا۔ برادری والوں کو اس بات کا بڑا رنج تھا۔ دشمنی پہلے ہی تھی زمین کی فروخت کے بعد دشمنی پکی ہو گئی۔

ایک دن غلام اکبر' گاؤں' زمین کے سلسلے میں پٹواری سے ملنے گیا اور واپس نہ آیا۔ ماں نے سوچا کہ رات پٹواری کے ہاں ٹھہر گیا ہو گا۔ جب دوسرے دن بھی نہ آیا تو ماں کو تشویش ہوئی۔ اس نے اپنے بڑے بھائی کو (جو عورت کے ساتھ عرفانی صاحب سے ملنے ریڈیو سٹیشن پر آیا تھا) گاؤں بھیجا کہ بیٹے کی خیریت دریافت کرے۔

بھائی گاؤں گیا تو پٹواری نے بتایا کہ غلام اکبر آیا ضرور تھا مگر اسی روز تھوڑی دیر رکنے کے بعد واپس چلا گیا تھا۔ بھائی برادری کے لوگوں سے بھی ملا۔ انہوں نے کہا غلام اکبر ہمارے پاس نہیں آیا۔ ماں تو اپنے اکلوتے جوان بیٹے کے غم میں بستر پر پڑ گئی۔ بھائی دوڑ دھوپ کرتا رہا۔ دس دن گزر گئے غلام اکبر کا کوئی سراغ نہ ملا۔ پولیس میں رپٹ درج کرا دی گئی۔

بھائی نے یہی لکھوایا کہ انہیں خدشہ ہے کہ برادری والوں نے غلام اکبر کو قتل کر دیا ہے۔ پولیس کے پاس قتل کا کوئی ثبوت نہیں تھا پھر بھی تفتیش شروع ہو گئی۔ پولیس کو مقتول کی لاش کی تلاش تھی۔ جب بیس پچیس روز گزر گئے تو گاؤں میں' ایک کھیت میں ہل چلاتے ہوئے کسی لاش کا پنجر ملا۔ پولیس نے یہ پنجر اپنی تحویل میں لے لیا۔ ہڈیوں کا تجزیہ کرایا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ کسی ایسے نوجوان کی لاش کا ڈھانچہ ہے جس کی عمر پچیس

سال کے قریب ہے۔ پنجر کی پنڈلی کی ہڈی ایک جگہ سے ٹوٹ کر دوبارہ جڑی ہوئی تھی۔ غلام اکبر کی ٹانگ بھی پنڈلی سے ذرا اوپر ایک بار ٹوٹ گئی تھی۔ اور اسے دوبارہ جوڑا گیا تھا۔

ماں نے یہ سنا تو بے اختیار رونے لگی۔ پولیس نے کہا کہ یہ غلام اکبر کی لاش کا ہی پنجر ہے۔ پولیس نے اب قتل کی تفتیش شروع کر دی۔ مگر بیوہ ماں بار بار اپنے بھائی کو یہی کہتی کہ میرا دل نہیں مانتا۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ غلام اکبر زندہ ہے۔ خدا کے لئے مجھے کسی ایسے بزرگ کے پاس لے چلو جو دلوں کا حال معلوم کر لیتا ہو۔ چنانچہ بھائی اپنی بیوہ بہن یعنی غلام اکبر کی ماں کو لے کر عرفانی صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ اس روز یہ دونوں بہن بھائی یہی مسئلہ لے کر عرفانی صاحب کے پاس آئے تھے۔ یہ ساری باتیں مجھے عرفانی صاحب کی زبانی معلوم ہوئیں۔ فرمانے لگے۔

"اللہ تعالیٰ اولاد کا غم کسی کو نہ دکھائے اور اس بیوہ ماں کا بیٹا تو جوان تھا۔ اکلوتا بیٹا تھا۔ ابھی اس کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔"

میں نے پوچھا۔ "آپ کا کیا خیال ہے' غلام اکبر کو برادری کے لوگوں نے واقعی قتل کر دیا ہے؟"

عرفانی صاحب ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گئے پھر فرمایا۔

"یہ خیال کا معاملہ نہیں ہے۔ یہ تو نظر کا معاملہ ہے۔ دیکھنا پڑے گا۔ بیوہ ماں کی فریاد نے میرے دل پر اثر کیا ہے۔ اللہ جل شانہ رحم فرمائے۔"

عرفانی صاحب اداس ہو گئے تھے۔ ان کو اداس اور غم زدہ دیکھ کر میں بھی اداس ہو گیا۔ اس موضوع پر مزید بات کرنے کی مجھے جرأت نہ ہوئی۔ چائے کی محفل ختم ہوئی تو عرفانی صاحب نے لائبریری روم سے باہر نکلتے ہوئے فرمایا۔

"کل رات کے وقت ریڈیو سٹیشن ضرور آ جائیں۔"

دوسرے روز میں صبح آٹھ بجے ہی ریڈیو سٹیشن پہنچ گیا۔ عرفانی صاحب ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے تشریف لائے۔ سردیوں کا موسم تھا۔ انہوں نے شلوار قمیص کے اوپر گرم کوٹ پہن رکھا تھا۔ میں نے حسب عادت ریڈیو سٹیشن کے گیٹ پر ہی ان کا خیر مقدم کیا۔ وہ مجھے دیکھ کر جس طرح مسکرایا کرتے تھے' مسکرائے۔ مگر ان کی مسکراہٹ

میں تشویش کا ہلکا سا رنگ بھی تھا۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں' عرفانی صاحب کسی کو مصیبت زدہ دیکھ کر اپنی خوشی کو بھول جاتے تھے اور ہر ممکن طریقے سے مصیبت زدہ انسان کی پریشانی دور کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

میں ان کے ہر موڈ کو پہچان لیتا تھا چنانچہ اس روز بھی میں نے ان کے تبسم میں فکرمندی کی ہلکی سی لہر کو صاف دیکھ لیا تھا۔ اس فکرمندی کی وجہ وہ بیوہ ماں تھی۔ جس کا جوان بیٹا قتل کر دیا گیا تھا یا کہیں گم کر دیا گیا تھا۔

عرفانی صاحب اس روز ٹیکسی میں تشریف لائے تھے۔ مجھے اپنے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھایا اور ٹیکسی ڈرائیور کو چلنے کا اشارہ کیا۔ موسم ابر آلود تھا ٹیکسی شہر کی مختلف سڑکوں پر سے ہوتی ہوئی شہر کے شمالی مضافات میں پہنچ گئی۔ یہ لاہور کی جدید آبادی تھی جو ابھی نئی نئی بن رہی تھی۔ چھوٹی کوارٹر نما کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں۔ ٹیکسی ایک کوارٹر نما کوٹھی کے باہر رک گئی۔ عرفانی صاحب نے ڈرائیور سے کہا۔

''بیٹا! گیٹ پر جا کر گھنٹی دو۔''

ڈرائیور نے باہر نکل کر گھنٹی کا بٹن دبایا۔ دو تین بار بٹن دبانے پر وہی آدمی جو ایک روز پہلے بیوہ ماں کے ساتھ ریڈیو سٹیشن آیا تھا گرم چادر کی بکل مارے باہر نکلا اور ٹیکسی والے سے پوچھا۔

''کس سے ملنا ہے؟''

ٹیکسی والے نے اپنی گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ اس شخص نے عرفانی صاحب کو گاڑی میں بیٹھے دیکھا تو سب کچھ بھول گیا۔ بجلی ایسی تیزی کے ساتھ گاڑی کے پاس آیا اور ہاتھ سینے پر باندھ کر بولا۔

''حضرت صاحب! آپ اندر تشریف لائیے۔''

معلوم ہوا کہ عرفانی صاحب نے انہیں شام کے وقت آنے کو کہا تھا مگر کسی خاص مصلحت کے پیش نظر انہوں نے ارادہ بدل دیا اور دن کے وقت تشریف لے گئے۔ مقتول یا گمشدہ غلام اکبر کی بیوہ ماں بھی بھاگی بھاگی گیٹ پر آ گئی۔ نوکر نے ڈرائنگ روم کھول دیا۔ عرفانی صاحب کو نہایت ادب واحترام سے بٹھایا گیا۔ عرفانی صاحب نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

''ہم نہ کچھ کھائیں گے نہ پئیں گے۔ وقت ضائع نہ کریں۔ مجھے غلام اکبر کی اگر کوئی تصویر ہے تو لا کر دی جائے۔''

بیوہ ماں اندر سے ایک فریم میں جڑی ہوئی فوٹو لے آئی۔ یہ ایک خوش شکل نوجوان کی فوٹو تھی جس نے ٹائی لگا رکھی تھی۔ بال گھنگریالے تھے اور وہ مسکرا رہا تھا۔ ماں نے اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو دوپٹے سے پونچھتے ہوئے کہا۔

''بیٹے نے یہ فوٹو میری خواہش پر اتروائی تھی۔ میں اسے کہا کرتی تھی۔ اکبر بیٹا گھر میں تمہاری کوئی فوٹو نہیں ہے۔ تم جاتے ہو تو میں کم از کم تمہاری فوٹو ہی دیکھ لیا کروں گی۔''

اور پھر ماں دوپٹہ منہ کے آگے رکھ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ عرفانی صاحب لڑکے کی تصویر کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ مختصر سے ڈرائنگ روم میں خاموشی طاری تھی۔ باہر بادلوں کی ہلکی گرج سنائی دی۔ پھر باہر اگے ہوئے درخت کے پتوں پر بارش کے قطروں کے گرنے کی آواز آنے لگی۔ عرفانی صاحب نے لڑکے کی تصویر میز پر رکھ دی۔ ایک گہرا سانس لیا۔ بند کھڑکی کی طرف دیکھا اور فرمایا۔

''کھڑکی کھول دیں۔''

ادھیڑ عمر آدمی نے جلدی سے اٹھ کر کھڑکی کھول دی۔ سرد ہوا کا جھونکا اندر آیا جس میں بارش کی خوشبو تھی۔ عرفانی صاحب ایک لمحے کے لئے جیسے مراقبے میں چلے گئے۔ کمرے میں اب صرف باہر ہلکی ہلکی بوندا باندی کی آواز کے سوا دوسری کوئی آواز نہیں تھی۔ آہستہ سے عرفانی صاحب نے اپنا سر اٹھایا کلمہ شریف پڑھ کر چہرے پر دونوں ہاتھ پھیرے۔ ان کا چہرہ جلال سے چمک رہا تھا۔ فرمانے لگے۔

''بی بی! زندگی اور موت اللہ کے اختیار میں ہے۔ موت اللہ کے حکم سے آتی ہے۔ جب تک اللہ جل شانہ کا حکم نہ ہو موت نہیں آ سکتی۔ تمہارا بیٹا زندہ ہے۔''

یہ جملہ سنتے ہی بیوہ ماں کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ اس کے بھائی کے چہرے پر بھی مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ فرط جذبات سے ماں کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلک اٹھے۔ قریب تھا کہ وہ عرفانی صاحب کے قدموں میں گر پڑتی کہ عرفانی صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا اور فرمایا۔

"بی بی! تمہارے بیٹے کو کچھ لوگوں نے اغوا کر کے ایک جگہ چھپا رکھا تھا۔ وہ اس سے کسی کاغذ پر دستخط کروانا چاہتے تھے مگر ہوتا وہی ہے جو اللہ جل شانہ کو منظور ہوتا ہے۔ تمہارا بیٹا ان لوگوں کی حراست سے نکل چکا ہے۔ وہ آج سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے اللہ کے حکم سے تمہارے پاس ہوگا۔ اب ہم چلتے ہیں۔"

عرفانی صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں بھی ان کے ساتھ ہی اٹھا۔ وہ لوگ عرفانی صاحب کے آگے پیچھے جا رہے تھے۔ بیوہ ماں تو عرفانی صاحب کو دعائیں دیتی نہیں تھکتی تھی۔ عرفانی صاحب نے صرف اتنا کہا۔ "بی بی! خدا کے حضور دو نفل شکرانے کے ضرور ادا کرنا اور غریبوں کو کھانا کھلانا۔"

عرفانی صاحب کمرے سے نکل کر گیٹ پر آئے۔ دونوں بہن بھائی مودب ہو کر پیچھے چل رہے تھے۔ بڑے بھائی نے کہا کہ وہ ابھی جا کر ٹیکسی لے آتا ہے۔

عرفانی صاحب مسکرائے، فرمایا۔

"بھائی! آپ تکلیف نہ کریں ہم سڑک پر سے ٹیکسی پکڑ لیں گے۔"

عرفانی صاحب مجھے اپنے ساتھ لئے وہاں سے چل پڑے۔ ہم سڑک پر آئے تو میں نے ایک خالی ٹیکسی کو ہاتھ دیا۔ ٹیکسی میں تشریف رکھنے کے بعد عرفانی صاحب نے فرمایا۔

"حمید صاحب! انسان کو چاہئے کہ وہ ہر وقت نیک عمل کرتا رہے۔ کوئی پتہ نہیں کس موقع پر کوئی نیک عمل کام آ جائے۔ یہ ہمیں کبھی نہیں بھولنا چاہئے کہ اللہ جل شانہ کی ذات بابرکات بڑی بے نیاز ہے۔"

مجھے یقین تھا کہ دکھیاری بیوہ ماں کا بیٹا سورج غروب ہونے سے پہلے ضرور گھر واپس آ جائے گا۔ مجھے یقین اس لئے تھا کہ یہ بات عرفانی صاحب نے کہی تھی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا عرفانی صاحب اس روز شام کو ریڈیو سٹیشن پر ہی رہے۔ وہ لڑکے کے ماموں کو تاکید فرما کر آئے تھے کہ جیسے ہی لڑکا گھر آئے مجھے ریڈیو سٹیشن پر ٹیلی فون کر کے خبر کر دیجئے گا۔ دوپہر کے بعد کچھ دیر عرفانی صاحب میرے کمرے میں بیٹھے رہے۔ میں نے ان کے لئے وہیں چائے منگوالی تھی۔ سردیوں کا موسم تھا۔ شام جلدی پڑ جاتی تھی۔ عرفانی صاحب نے گھڑی دیکھی اور فرمایا۔

"ڈیوٹی روم کے سامنے لابی میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ ٹیلیفون ڈیوٹی روم میں ہی آئے گا۔ ڈیوٹی روم کے سامنے لابی میں اس زمانے میں نئے نئے صوفے لگائے گئے تھے۔ میں نے ڈیوٹی افسر کو جا کر کہہ دیا کہ عرفانی صاحب کا کوئی فون آئے تو وہ باہر تشریف رکھتے ہیں۔ میں کچھ بے چینی سے محسوس کرنے لگا تھا۔ بادل چھائے ہوئے تھے جس کی وجہ سے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ سورج غروب ہوا ہے کہ نہیں۔

میں نے عرفانی صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کو دیکھ رہے تھے۔ اتنے میں ڈیوٹی افسر نے میری طرف نظریں اٹھائیں اور کہا۔

"عرفانی صاحب کا فون ہے۔"

عرفانی صاحب معمول کے مطابق بڑے پرسکون قدموں سے چلتے ہوئے ڈیوٹی روم میں تشریف لے گئے۔ ریسیور کان سے لگایا۔ میں مسلسل ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دل کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں۔ عرفانی صاحب فون پر بات کرتے ہوئے مسکرا رہے تھے۔ پھر انہوں نے ریسیور رکھ دیا۔ میرے قریب تشریف لائے اور نورانی تبسم کے ساتھ فرمایا۔

"اللہ جل شانہ نے کرم کر دیا ہے۔ بیٹا گھر واپس آ گیا ہے۔"

لاہور میں ٹیلی ویژن سٹیشن قائم ہوا تو عرفانی صاحب اس کے نیوز سیکشن سے وابستہ ہو گئے۔ یہ ٹیلی ویژن کے آغاز کا زمانہ تھا۔ مصلح الدین نیوز سیکشن کے انچارج تھے، محمد رفیق گورایہ، عرفانی صاحب کے شریک کار تھے۔ گورایہ صاحب راوی ہیں کہ انہوں نے کسی خبر پر بے جا اعتراض کیا اور ان کی زبان سے دو ایک ایسی باتیں نکل گئیں جو عرفانی صاحب کی کبیدگی خاطر کا باعث ہوئیں۔ مگر عرفانی صاحب نے جواب میں کچھ نہ کہا۔ حالانکہ انہیں معلوم تھا کہ نیوز ایڈیٹر کا موقف ناتجربہ کاری اور کم علمی پر منحصر ہے۔

گورایہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس سے اگلے ہی دن نیوز ایڈیٹر کی طبیعت سخت خراب ہو گئی۔ وہ گھر پر ہی رہے اور ایک آدمی دوڑایا کہ جس طرح سے بھی ہو، عرفانی صاحب کو ڈھونڈ کر لاؤ۔ میں ان سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ اس دوران عرفانی صاحب بھی ٹیلی ویژن سٹیشن پر تشریف لے آئے۔ عرفانی صاحب نے نیوز ایڈیٹر کا

احوال سنا تو گاڑی میں بیٹھ کر اس کے گھر پہنچے' دیکھا کہ سخت علیل ہیں اور بار بار عرفانی صاحب سے معافی مانگ رہے ہیں۔ عرفانی صاحب بڑی محبت اور انتہائی خوش اخلاقی سے پیش آئے اور فرمایا۔

آپ نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی لیکن آپ مصر ہیں تو میں معاف کرتا ہوں۔

پھر نیوز ایڈیٹر صاحب کے لئے خدا کے حضور دعا کی اور تھوڑی دیر بعد نیوز ایڈیٹر بالکل ٹھیک ہو گئے۔

اس زمانے میں عرفانی صاحب پاکستان ٹیلی ویژن کے نیوز سیکشن سے وابستہ ہونے کی وجہ سے ریڈیو اور ٹی وی کے ماحول میں ہی زیادہ وقت گزارتے تھے۔ لاہور ٹیلی ویژن کے دفاتر اور سٹوڈیو ہمارے ریڈیو پاکستان کی نئی عمارت کے بالکل سامنے ایک پرانی کوٹھی میں تھے۔ میں بھی ریڈیو سٹیشن سے نکل کر ٹیلی ویژن پر چلا جاتا اور عرفانی صاحب کو دیکھتا کہ وہ خبروں کا ترجمہ کر رہے ہیں' اور بڑے مصروف ہیں۔ نیوز روم سے الٹے پاؤں نکل آتا اور اپنے دوسرے دوستوں کے پاس آ کر بیٹھ جاتا۔ کبھی سرمد صہبائی کے کمرے میں اور کبھی مشہور شاعر مختار صدیقی کے کمرے میں بیٹھ کر وقت گزارتا۔ جب عرفانی صاحب نیوز بلیٹن تیار کروا دیتے اور انہیں کچھ دیر کیلئے فراغت ہو جاتی تو میں فوراً ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتا۔ وہ مجھے دیکھ کر حسب عادت بڑی خندہ پیشانی سے ملتے اور فرماتے۔

''آپ آئے تھے پھر دبے پاؤں واپس چلے گئے۔''

میں عرض کرتا۔ ''آپ مصروف تھے' محبت کھینچ لائی تھی' مصلحت واپس لے گئی۔'' عرفانی صاحب مسکرائے' فرمانے لگے

''آپ نے شعر کہہ دیا ہے۔''

اس زمانے میں عرفانی صاحب بھی شعر کہنے لگے تھے اور ان کی ایک غزل ''غنچہ شوق لگا ہے کھلنے'' بڑی مشہور ہوئی تھی۔ ان کی یہ غزل سب سے پہلے گلوکار رجب علی نے گائی تھی۔ اس کے بعد مہدی حسن نے اس کی نئی طرز بنا کر گائی اور وہ غزل ملک کے طول وعرض میں گونجنے لگی۔

ریڈیو ٹی وی پر آرٹسٹوں کا آنا جانا لگا ہی رہتا ہے اور ان آرٹسٹوں میں خواتین

گانے والیاں بھی شامل ہوتی ہیں۔ عرفانی صاحب گانے والی خواتین سے کبھی کوئی ربط نہیں رکھتے تھے۔ ان کی دنیا ہی کچھ اور تھی۔ ان کی دنیا میں ان عورتوں کا کوئی گزر نہیں تھا۔ ایسی بات نہیں تھی کہ عرفانی صاحب ان خواتین سے نفرت کرتے تھے۔ نہیں' ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ ان کے سلام کا جواب بڑے حسن اخلاق سے دیتے تھے مگر ان کے ساتھ کبھی مجلس نہیں کرتے تھے اور ان کی مجلس میں کبھی شریک بھی نہیں ہوتے تھے مگر یہ گانے والیاں عرفانی صاحب کا بہت احترام کرتی تھیں اور انہیں جھک کر سلام عرض کیا کرتی تھیں۔ ان کی غیر موجودگی میں بھی ان کا ذکر نہایت عزت واحترام سے کرتیں۔

عرفانی صاحب کی غزل ''غنچہ شوق لگا ہے کھلنے'' کا شہرہ ہوا تو ریڈیو پاکستان لاہور کی مشہور سنگر اور اس زمانے کی مقبول گلوکارہ آشا پوسلے نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ عرفانی صاحب کی کوئی غزل گانا چاہتی ہیں۔ عرفانی صاحب کو اس بارے میں ابھی کوئی علم نہیں تھا۔ یعنی ان سے کسی نے ابھی تک کوئی بات نہیں کی تھی۔ ایک دن ایسا ہوا کہ عرفانی صاحب ریڈیو سٹیشن کے احاطے میں داخل ہوئے ہی تھے کہ سامنے سے آشا پوسلے آ رہی تھی۔ اس نے عرفانی صاحب کو دیکھا تو وہیں سے تیز تیز چل کر سلام عرض کرتی عرفانی صاحب کے پاس آئی اور اپنے خالص بے باکانہ انداز میں مگر نہایت ادب سے کہا۔

''مرشد جی! مجھے بھی کوئی غزل عنایت کریں' میں بھی آپ کی غزل گا کر مشہور ہونا چاہتی ہوں۔''

عرفانی صاحب نے کہا۔

''بی بی میرا کلام عورتیں نہیں گا سکتیں۔''

آشا پوسلے تو پیچھے پڑ گئی۔

''مرشد جی! میں تو آپ کا کلام ضرور گاؤں گی' مجھے اجازت عطا کیجئے میں تو آپ کی غلام ہوں۔''

یہ بات عرفانی صاحب کے مسلک کے خلاف تھی' چنانچہ انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ آشا پوسلے بچوں کی طرح ضد کرنے لگی اور بچوں کی طرح ہی ان کے پیچھے پڑ گئی۔ عرفانی صاحب تیز تیز قدموں سے ریڈیو کی مسجد کی جانب چل پڑے۔ آشا

پوسلے بھی تیز تیز قدموں سے ان کے پیچھے چل پڑی۔ عرفانی صاحب نے جب دیکھا کہ خاتون ان کے پیچھے پیچھے چلی آ رہی ہیں تو وہ جلدی سے مسجد میں داخل ہو گئے اور نوافل کی نیت باندھ لی۔

عرفانی صاحب کی شخصیت حیاء داری' معصومیت اور سادہ مزاجی کا مثالی نمونہ تھی۔ ان کی زبان پر کبھی کوئی ایسا لفظ نہیں آتا تھا' جس سے کسی کی دل آزاری ہو یا وہ لفظ شائستگی اور تہذیب کے منافی ہو۔ ٹیلی ویژن کی فضا میں جگت بازی اکثر ہوتی رہتی ہے۔ ہر قسم کی لطیفے بازی ہوتی ہے۔ اول تو لوگ اس بات کا بڑا خیال رکھتے تھے کہ عرفانی صاحب کی موجودگی میں کوئی فضول قسم کی جگت بازی نہ کی جائے۔ سب کے دلوں میں عرفانی صاحب کے لئے بے حد احترام کے جذبات تھے۔ اگر اتفاق سے کوئی ناواقف آدمی کوئی ایسا لطیفہ سنانے لگتا جو آداب شائستگی کے خلاف ہو تو عرفانی صاحب بڑے آرام سے کنارہ کش ہو جاتے۔

مجھے عرفانی صاحب نے اپنے بچپن کے بڑے واقعات سنائے تھے۔ ایک دن وہ بڑے موڈ میں ہنس ہنس کر اپنی بچپن کی معصوم باتیں سنا رہے تھے۔ وہ دن مجھے آج بھی یاد ہے اور عرفانی صاحب کی بھولی بھالی سرخ و سپید مسکراتی ہوئی شکل اس وقت بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ جب انہوں نے مجھے سنایا کہ ان کی عمر چھ سات سال کی تھی اور انہوں نے ایک ٹیلے کے اوپر سے ندی میں چھلانگ لگائی تو کس طرح وہ ندی کی تہہ تک اترتے چلے گئے اور جب سر باہر نکالا تو بالوں میں درخت کی جھاڑی الجھی ہوئی تھی۔ پھر وہ خوب ہنسے تھے' میں بھی ان کے ساتھ خوب ہنسا تھا۔ میں نے ان کے سامنے کبھی قہقہہ نہیں لگایا تھا۔ حالانکہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے اپنے دوستوں کے ساتھ میں بلند قہقہے لگایا کرتا تھا مگر عرفانی صاحب کی قربت میں میں بڑا محتاط ہو جاتا تھا۔ یہ میری محبت اور میرے دل میں ان کا جو احترام تھا اس کا فطری تقاضا تھا۔

یہ ٹیلی ویژن کی ابتداء کا زمانہ تھا' عرفانی صاحب خبروں کا بلیٹن تیار کرنے میں انتہائی کاوش سے کام لیتے۔ انہیں نیوز کے ترجمے اور خبروں کی اصطلاحات کا بڑا تجربہ تھا۔ گورایہ صاحب فرماتے ہیں کہ عرفانی صاحب کی ترجمہ شدہ خبریں ویسی کی ویسی اور ایڈیٹنگ کے بغیر نشر ہوتی تھیں۔ خبروں کے علاوہ عرفانی صاحب ٹیلی ویژن کے دینی

پروگراموں اور مباحثوں میں بھی شریک ہوتے تھے۔

انہوں نے دینی پروگراموں کے معیار کو بہت بہتر بنایا۔ وہ ٹیلی ویژن پر تقریریں بھی نشر کرتے۔ دینی پروگراموں کی کمپیئرنگ بھی کرتے۔ یہ ٹیلی ویژن کے پرانے یعنی پہلے سٹوڈیوز کی بات ہے۔ یہاں بھی پروگرام جوں کے توں نشر ہوتے تھے۔ آج کی طرح پروگرام پہلے سے ریکارڈ نہیں ہوتے تھے۔ ایک دفعہ حضور اکرم ﷺ کی سیرت پاک پر کوئی پروگرام ٹیلی کاسٹ ہو رہا تھا۔ عرفانی صاحب نے گفتگو شروع کی جب حضور پاک ﷺ کا اسم مبارک زبان پر آیا تو عرفانی صاحب پر رقت طاری ہو گئی۔ وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگے۔ یہ رقت آمیز ایمان افروز منظر ملک کے کروڑوں ناظرین نے دیکھا اور یقیناً سب پر رقت طاری ہو گئی کیونکہ پروگرام براہ راست ٹیلی کاسٹ ہو رہا تھا۔

عرفانی صاحب حضور پاک سرکار دو عالم ﷺ کی محبت سے سرشار تھے۔ میں نے ایک عرصہ ان کے زیر سایہ گزارا ہے۔ میں نے کئی مرتبہ دیکھا کہ باتیں کرتے کرتے جب بھی حضور پاک ﷺ کا ذکر پاک آتا تو ان پر رقت طاری ہو جاتی' آنکھیں بھیگ جاتیں اور وہ سر جھکا کر خاموش ہو جاتے۔

ریڈیو پاکستان لاہور کے لائبریری روم میں وہ شام نہیں بھلا سکتا جب عرفانی صاحب نے مجھے قصیدہ بردہ شریف سنایا تھا اور قصیدہ بردہ شریف کے شاعر حضرت امام بصیری کے بارے میں گفتگو فرمائی تھی۔ وہ مبارک شام میری زندگی کی انمول شام تھی اور آج بھی وہ سارا منظر میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ جب میں عرفانی صاحب کے بالکل ساتھ والی کرسی پر ان کے قریب بیٹھا تھا اور وہ پہلے قصیدہ بردہ شریف کے عربی اشعار سناتے پھر ان کا ترجمہ کر کے سناتے جاتے تھے۔ میں کس قدر خوش قسمت ہوں کہ مجھے یہ اعزاز نصیب ہوا۔ یہاں میں اپنی پہلے والی بات دہراؤں گا کہ میرا حال تو بالکل ایسا تھا جیسے کسی بچے کو دنیا کا سب سے قیمتی ہیرا مل گیا ہو اور وہ اس کی قدر و قیمت سے واقف نہ ہو' مگر ہیرا پا کر بے حد خوش ضرور ہو۔

میں تو ایک گنہگار کم علم آدمی ہوں۔ عرفانی صاحب کی قدر و منزلت کا اندازہ لگا ہی نہیں سکتا تھا۔ ہاں اتنا تھا کہ میں عرفانی صاحب کی محبت میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہ بات

میں اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہہ رہا ہوں' میری ان سے محبت کا یہ عالم تھا کہ جب وہ میرے پاس ہوتے تھے تو میری سب سے بڑی خواہش یہی ہوتی تھی کہ وہاں اور کوئی آدمی نہ ہو۔ محبت میں یہ بھی خود غرضی تھی کہ میں چاہتا تھا کہ عرفانی صاحب بس مجھ سے ہی باتیں کرتے رہیں' لیکن چاند نکلتا ہے تو اس کی روشنی تو پھر سارے عالم پر پھیلتی ہے۔ عرفانی صاحب کے علم و عرفان کی روشنی چاروں طرف پھیلنے لگی تھی اور عقیدت مند دور و نزدیک سے جوق در جوق ان کی خدمت میں رشد و ہدایت کی شمع جلانے کیلئے حاضر ہونے لگے تھے۔ عجیب بات ہے کہ مجھے کسی سے کوئی رقابت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ جب لوگ عقیدت اور محبت کے ساتھ عرفانی صاحب کے سامنے بیٹھے ان کی باتیں سن رہے ہوتے تھے تو مجھے خوشی اور ایک قسم کا فخر محسوس ہوتا تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب عرفانی صاحب ریڈیو سٹیشن کے سامنے اور پرانے ٹیلی ویژن سٹیشن سے متصل چھپر ہوٹل میں تھوڑی دیر کیلئے آ کر بیٹھنے لگے تھے۔ یہاں ان کے عقیدتمند اور علم و عرفان کے متلاشی ان کی بصیرت اور ایمان افروز گفتگو سے فیض یاب ہوتے تھے۔ یہ میں 1964-65ء کی بات کر رہا ہوں۔ چھپر ہوٹل اس جگہ کو اس لئے کہا جاتا تھا کہ وہاں کافی زمین تھی' چار دیواری بھی بنی ہوئی تھی۔ ریڈیو سٹیشن کے بالکل سامنے اس کا دروازہ کھلتا تھا اور کسی صاحب نے ایک چھوٹا سا ریستوران کھول رکھا تھا۔ کھلی جگہ پر درختوں کے درمیان لکڑی کی پرانی کرسیاں اور میز پڑے رہتے تھے۔ لوگ چائے وغیرہ پیتے' دوپہر کو کھانا بھی کھاتے۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ چھپر کی چھت پڑی ہوئی تھی۔ اس چھپر کی وجہ سے اس کا نام چھپر ہوٹل پڑ گیا تھا۔ اس چھپر کے نیچے ایک لکڑی کی لمبی میز بچھی تھی۔ جس کی دونوں جانب لکڑی کے بنچ ہوتے تھے۔ یہاں بیٹھ کر عرفانی صاحب درس قرآن دیا کرتے تھے۔ میں وہاں آتا تو چپکے سے سب سے پیچھے بیٹھ جاتا اور عرفانی صاحب کی ایمان افروز باتیں سنتا اور مجھ پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی۔ وہ روشن روشن دن آج بھی اسی رنگ و نور کے ساتھ میری آنکھوں کے سامنے زندہ ہیں۔ میں عرفانی صاحب کے نورانی چہرے کو دیکھ رہا ہوں' ان کی آواز سن رہا ہوں۔ وہ چھپر ہوٹل اب وہاں نہیں رہا' اس کی جگہ سکول بن گیا ہے مگر میری چشم تصور میں وہ سارے مناظر پہلے دن کی طرح وہاں پر موجود ہیں اور میں انہیں اسی آب و تاب

کے ساتھ روشن اور زندہ پائندہ دیکھ رہا ہوں۔

ریڈیو ٹیلی ویژن کی کینٹین پہ حساب بھی چلتا ہے۔ یعنی آرٹسٹ لوگ چائے وغیرہ پیتے ہیں' کھانا کھاتے ہیں اور مہینے کی پہلی تاریخ کو بل ادا کر دیتے ہیں۔ ایسا تقریباً ہر دفتر کی کینٹین میں ہوتا ہے مگر میں نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ عرفانی صاحب بھی کینٹین والے سے ادھار نہیں کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ نقد چائے وغیرہ منگواتے' لڑکا چائے وغیرہ لے کر آتا تو اسی وقت صدری کی جیب سے پیسے نکال کر اسے دے دیتے۔ دوسری بات جو میں نے خاص طور پر دیکھی وہ یہ تھی کہ عرفانی صاحب کبھی کسی کے بارے میں بدگمانی کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ محفل میں اگر کوئی کسی کے بارے میں کچھ کہتا کہ وہ ایسا ہے' ویسا ہے تو عرفانی صاحب فوراً اسے ٹوک دیتے اور فرماتے کسی کی عدم موجودگی میں آپ کو اس قسم کے خیالات کا اظہار نہیں کرنا چاہئے۔ یہ بات آپ ان کی موجودگی میں کہتے تو بہتر تھا' ویسے بھی ہمیں ہر مسلمان کیلئے اپنے دل میں اچھا گمان رکھنا چاہئے' بدگمانی نہیں کرنی چاہئے۔

عرفانی صاحب شائستہ اور لطیف ظرافت کو پسند کرتے اور اس سے لطف اندوز بھی ہوتے تھے۔ خود بڑے اچھے شاعر تھے۔ شاعری کا بڑا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ اقبالؒ اور غالب کے فارسی کلام پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ عربی شعراء میں سے کئی ایک کا کلام انہیں زبانی یاد تھا۔ نعت دل کی گہرائیوں میں ڈوب کر کہتے تھے۔ ان کا دل پاک صاف تھا۔ دل کی بات زبان پر ہوتی تھی۔ سچی بات برملا فرما دیتے تھے۔ حق گوئی میں کبھی دنیاوی مصلحت کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ کسی کو مصیبت میں مبتلا دیکھتے تو ہر طرح سے اس کی مدد کرتے۔ شکستہ دلوں کی ہمت بندھاتے۔ ان کی تالیف قلوب کرتے' ان کے دلوں میں خدا کی محبت کا جذبہ پیدا کرتے اور اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ جس دل میں خدا کی محبت کا جذبہ بیدار ہو جائے اس پر انوار الٰہی کی بارش ہونے لگتی ہے اور وہ دنیا کے دکھوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔

وہ موسم برسات کا ایک خوشگوار دن تھا' آسمان پر سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہلکی ہلکی بونداباندی شروع ہو چکی تھی۔ بڑی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میں نئے ریڈیو سٹیشن کے برآمدے میں کھڑا سامنے سبزہ زار کے گھاس اور پھولوں کو دیکھ رہا تھا کہ

میری نگاہ گیٹ کی طرف گئی' کیا دیکھتا ہوں کہ عرفانی صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ اب میرے لئے برآمدے میں کھڑے رہنا ممکن نہیں تھا۔ میں جلدی سے سیڑھیاں اتر کر ان کی طرف بڑھا۔ عرفانی صاحب ہلکی بوندا باندی میں بڑے سکون سے چلے آ رہے تھے مجھے اپنی طرف آتے دیکھا تو مسکرائے اور فرمایا۔

''اسے کہتے ہیں باران رحمت۔''

میں نے کہا۔

''یہ رحمت آپ اپنے ساتھ لے کر آئے ہیں۔''

وہ ایک دم رک گئے تبسم فرمایا اور سر کو نفی میں ہلاتے ہوئے فرمایا۔

''نہیں یہ رحمت اللہ ہی کی ہے اور اسی کی طرف سے بندوں پر اترتی ہے۔''

میں نے کہا۔

''اس وقت چائے کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''سبحان اللہ۔''

عرفانی صاحب نے بے اختیار فرمایا اور ہم ریڈیو کی کینٹین کی طرف آ گئے۔

موسم اچھا ہو جانے کی وجہ سے کینٹین میں کافی رش تھا۔ میں نے مشورہ دیا کہ چائے اوپر میرے کمرے میں چل کر پی جائے۔ میرا کمرہ جس میں میرے علاوہ ایک اور پروڈیوسر بیٹھتا تھا' دوسری منزل میں تھا۔ جس کی کھڑکیاں ایبٹ روڈ کی طرف کھلتی تھیں۔

عرفانی صاحب نے میری تجویز کو پسند فرمایا اور ہم سیڑھیاں چڑھنے لگے۔

میں دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ خدا کرے میرا کمرہ خالی ہو تا کہ میں پوری یکسوئی سے عرفانی صاحب کی باتیں سن سکوں۔ خدا نے میری دعا قبول کر لی اور میرا کمرہ خالی تھا۔ کھڑکیاں کھلی تھیں جہاں سے بارش میں بھیگی ہوئی ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔ میں نے ایک آدمی کو راستے میں ہی چائے کیلئے دوڑا دیا تھا۔ ہم کھڑکیوں کے سامنے بیٹھے تھے۔ بارش بھی اب باقاعدہ شروع ہو گئی تھی۔ عرفانی صاحب کی نگاہیں کھڑکی سے باہر تھیں وہ بڑی مسرت کے ساتھ بارش کو دیکھ رہے تھے اور ان کے چہرے پر ہلکا ہلکا معصوم تبسم تھا' میری طرف دیکھے بغیر فرمایا:

''ہمارے علاقے میں جب بارشیں ہوتی ہیں تو زمین میں عجیب عجیب رنگ

کے پھول نکلتے ہیں۔ یہ خودرو پھول ہوتے ہیں جگہ جگہ ٹیلوں کے درمیان سبز کھیتوں کے مخملیں قالین بچھے ہوئے عجیب بہار دیتے ہیں۔''

اتنے میں چائے آ گئی۔ عرفانی صاحب نے خوش ہو کر فرمایا:

''مولانا چائے آپ بنائیں گے۔''

میں نے کہا:

''یہ تو میری خوش قسمتی ہو گی۔''

میں نے بڑے اہتمام سے چائے کی پیالی بنا کر عرفانی صاحب کے سامنے میز پر رکھی تو انہوں نے فرمایا۔

''علامہ اقبالؒ نے یہ شعر شاید ہمارے علاقے کی بہار کو دیکھ کر تحریر فرمایا تھا کہ:

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن

ہمارا علاقہ صحرائی تو نہیں ہے مگر وہاں صحرائی پھول ضرور کھلتے ہیں اور خاص طور پر برسات کے موسم میں۔ کمرے کی فضا بڑی خوشگوار ہو گئی تھی۔ بارش کی بوچھاڑ کھڑکی میں سے اندر آنے لگی تھیں۔ ہم کھڑکی سے ہٹ کر بیٹھے تھے' بارش ہم تک نہیں آ رہی تھی مگر بارش کی ٹھنڈک ہم تک ضرور پہنچ رہی تھی۔ چائے کے دوران حضرت علامہ اقبال کی شاعری پر باتیں ہونے لگیں' عرفانی صاحب نے فرمایا۔

''حضرت علامہ اقبال کے لئے شاعر کا لفظ بڑا چھوٹا لفظ ہے' شعر کو حضرت علامہ نے اپنے پیغام کا ذریعہ بنایا تھا۔''

عرفانی صاحب کچھ دیر کیلئے بالکل خاموش ہو گئے' بڑے سکون سے چائے پیتے رہے پھر میری طرف توجہ فرما کر فرمایا:

''آپ کو حضرت علامہ اقبال کی ایک فارسی نظم کے کچھ بند سناتا ہوں' یہ نظم ان کی کتاب مثنوی اسرار و رموز میں درج ہے۔ اس نظم میں انہوں نے مقام خودی کو بیان فرمایا ہے۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد عرفانی صاحب نے حضرت علامہ اقبال کی

فارسی مثنوی کے بند سنانے شروع کئے:

دل ز عشق او توانا می شود
خاک ہمدوش ثریا می شود
خاک نجد از فیض او چالاک شد
آمد اندر وجد بر افلاک شد

عرفانی صاحب مثنوی کے اس شعر

در دل مسلم مقام مصطفیٰ ﷺ است
آبروئے ما زنام مصطفیٰ ﷺ است

پر آئے تو ان پر رقت طاری ہو گئی۔ انہوں نے جیب سے رومال نکال کر چہرے پر رکھ لیا' آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ میری آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ جب ان کی طبیعت ذرا سنبھلی تو انہوں نے رومال سے اپنے آنسو پونچھے اور فرمایا۔

''حضرت علامہ کے مقام کو کسی کسی نے ہی شناخت کیا ہے۔''

باہر بارش ہو رہی تھی' بھیگی ہوئی ہواؤں میں ایبٹ روڈ اور ریڈیو پاکستان کے درخت جھوم رہے تھے۔ عرفانی صاحب دیر تک محویت کے عالم میں ان کی طرف دیکھتے رہے۔ خدا جانے وہ کیا دیکھ رہے تھے۔ انہیں کیا کچھ نظر آ رہا تھا' پھر میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا۔

''چائے مزید آنی چاہئے۔''

میں بڑا خوش ہوا' دوڑ کر کمرے سے نکلا' ملازم سے کہا' خود جا کر کینٹین سے بڑی اعلیٰ قسم کی چائے لاؤ۔ میں واپس کمرے میں آیا تو عرفانی صاحب بدستور مسکرا رہے تھے' کہنے لگے:

''ایسے موسم میں اس قسم کی فضاء کبھی کبھی ہی بنتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اور ایسی خوش قسمتی کا لمحہ بھی اس موسم میں کبھی کبھی ہی نصیب ہوتا ہے کہ مجھے آپ کا قرب نصیب ہو اور آپ کے لئے چائے بناؤں۔''

عرفانی صاحب نے ہنس کر فرمایا۔

''حمید صاحب! یہ آپ کی محبت ہے۔''

جب وہ یہ جملہ کہا کرتے تھے تو یقین کریں مجھے اپنی محبت سے بڑی محبت ہو جاتی تھی۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ کہاں میں اور کہاں جناب عرفانی صاحب کا مقام اعلیٰ۔ میں تو ان کی جوتیوں میں بھی بیٹھنے کے لائق نہیں تھا۔ یہ ان کی دریا دلی' ان کی کشادہ دلی اور فیضان تھا کہ انہوں نے مجھ گنہگار کے سر پر بھی محبت کا ہاتھ رکھ دیا ہوا تھا۔ اس کے بعد جب چائے کا دوسرا دور چلا تو جناب عرفانی صاحب نے مجھے حضرت علامہ صاحب کی تین رباعیات سنائیں جو مجھے آج بھی زبانی یاد ہیں:

حکیمی نا مسلمانی خودی کی
کلیمی رمز پنہانی خودی کی
تجھے گر فقر و شاہی کا بتا دوں
غریبی میں نگہبانی خودی کی

تیرا جوہر ہے نوری پاک ہے تو
فروغ دیدۂ افلاک ہے تو
تیرے صید زبوں افرشتہ و حور
کہ شاہین شہ لولاکؐ ہے تو

جمال عشق و مستی نے نوازی
جلال عشق و مستی بے نیازی
کمال عشق و مستی ظرف حیدرؓ
زوال عشق و مستی حرف رازی

پھر فرمایا۔

''ملک فرشتہ کو کہتے ہیں جس کی جمع ملائک یا ملائکہ ہے۔ اصل میں یہ چار لفظ ہیں یعنی ملک جمع ملائک یا ملائکہ

مَلِک بادشاہ جمع مُلوک

مُلک سلطنت جمع مَمالک

اور مِلک جائیداد جمع اَملاک

عربی تلفظ میں ان باتوں کا بڑا خیال رکھا جاتا ہے۔ ہمیں اردو میں بھی انہیں

استعمال کرتے اور بولتے وقت تلفظ کی تصحیح کا خیال رکھنا چاہئے کیونکہ الفاظ ہی ہمارے خیالات کے اظہار کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ خاص طور پر بولتے اور لکھتے وقت۔

کمرے کی فضا میں مجھے ایک خاص قسم کی خوشبو محسوس ہونے لگی تھی۔ ایک خاص کیفیت اس فضا پر طاری تھی کہ میرا کولیگ پروڈیوسر کمرے میں آ گیا۔ اس کے آنے سے فضا کا موڈ بالکل ہی بدل گیا۔ بالکل اسی طرح جب عرفانی صاحب نے ریڈیو پاکستان آنا کم بلکہ بہت ہی کم کر دیا تو میرے لئے ریڈیو کی فضا کا موڈ بھی بالکل بدل گیا۔ جناب عرفانی صاحب کا حلقہ احباب وسیع سے وسیع تر ہو گیا تھا۔ اب وہ کبھی کبھی ریڈیو سٹیشن تشریف لاتے تھے۔ ان کی یاد میرے دل کے ساتھ رہتی تھی۔

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ وہ جب بھی ریڈیو سٹیشن تشریف لاتے میں وہاں موجود ہوتا تھا۔ پروگرام کے سلسلے میں کہیں باہر بھی ہوتا تھا تو اس وقت طبیعت خود بخود ریڈیو سٹیشن کی طرف کھنچنے لگتی تھی۔ ان سے مل کر مجھے بڑی خوشی ہوتی۔ یوں محسوس ہوتا جیسے اندھیری رات میں چاند نکل آیا ہو۔ فرط جذبات سے میری آنکھوں میں آنسو بھی آ جاتے۔ آنسو اس وقت بھی میری پلکوں کے پاس آ کر رکے ہوئے ہیں' جب میں عرفانی صاحب کی یاد میں یہ مضمون قلمبند کر رہا ہوں۔ میری بساط ہی کیا ہے کہ میں جناب عرفانی صاحب پر کوئی مضمون لکھ سکوں۔ مجھ میں اتنی اہلیت کہاں کہ میں ان کی علمی اور روحانی عظمتوں کا احاطہ کر سکوں۔ یہ تو محبت ہے جس کے حوصلے پر میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں۔ یہ تو جناب عرفانی صاحب کی فراخ دلی اور حسن اخلاق تھا کہ انہوں نے مجھے' جو ان کی جوتیوں میں بیٹھنے کے لائق بھی نہیں تھا' اپنی محفل میں ساتھ بٹھا لیا تھا۔ میں نے عرفانی صاحب کی محبت کا ہاتھ تھام کر ''گلستان وفا'' کا یہ سفر شروع کیا تھا۔ ان کی محبت میں سرشار ہو کر ان کی باتیں قلمبند کرتے چلا تھا۔ اس سے زیادہ خوشی اور مسرت کی بات اور کیا ہو سکتی تھی کہ جب تک میں عرفانی صاحب کے بارے میں لکھتا رہا ان کی نورانی شکل میری آنکھوں کے سامنے رہی۔ میں انہیں چلتے پھرتے باتیں کرتے' چائے پیتے' مسکراتے دیکھتا رہا۔

میں کوئی عالم فاضل آدمی نہیں ہوں۔ میرے پاس صرف ضرورت کے مطابق ہی علم ہے۔ میں جناب عرفانی صاحب کے تبحر علمی کی گہرائیاں اور عظمتیں کیسے ماپ سکتا

ہوں میرے لئے اتنی خوشی اور اتنا اعزاز ہی بہت ہے کہ جناب عرفانی صاحب جس قافلہ عشق کے سالار تھے اور ہیں' میں اس قافلے میں شریک مسافروں کے پیچھے پیچھے چلنے والوں میں سے تھا اور ہوں۔ اس قافلے کی گرد راہ تھا اور گرد راہ ہوں۔ اب میں بھی کبھی کبھار ہی ریڈیو سٹیشن جاتا ہوں۔ جب بھی جاتا ہوں تو جناب عرفانی صاحب بہت یاد آتے ہیں۔ ان درختوں کو دیکھتا ہوں جن کی چھاؤں میں عرفانی صاحب بیٹھا کرتے تھے۔ اس مسجد کی محرابوں کو دیکھتا ہوں جہاں وہ نماز پڑھا کرتے تھے' باغ کے ان گلابوں کو دیکھتا ہوں جو اپنے پاس بیٹھے ہوئے عرفانی صاحب کو بڑی عقیدت سے دیکھا کرتے تھے' پھولوں کو سبھی دیکھتے ہیں مگر پھول کسی کسی کو دیکھتے ہیں۔ جب کبھی گلاب کے پھولوں والے تختے کے پاس گھاس پر بیٹھے عرفانی صاحب چائے پیتے ہوئے سرخ گلاب کو بڑی محبت سے دیکھا کرتے تھے تو مجھے محسوس ہوتا تھا کہ گلاب کے پھول بھی عرفانی صاحب کو دیکھ رہے ہیں اور دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں۔

☆......☆......☆

حفیظ جالندھری

ابھی پاکستان کا قیام عمل میں نہیں آیا تھا۔ میں گورنمنٹ ہائی سکول امرتسر میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ میرا ایک کلاس فیلو دوست ہوا کرتا تھا...... محمود...... اس کا مکان ہماری گلی ہی میں تھا۔ اس کی آواز بڑی اچھی تھی اور وہ حفیظ جالندھری کا شاہنامہ اسلام بڑے شوق سے ترنم کے ساتھ پڑھا کرتا تھا۔ یہ ترنم حفیظ جالندھری کا خاص ترنم تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ان کے شاہنامہ اسلام کی سارے برصغیر میں بڑی دھوم تھی۔ سیاسی جلسوں اور جلوسوں میں شاہنامہ اسلام کی نظمیں بڑے اہتمام کے ساتھ ترنم سے پڑھی جاتی تھیں۔ میں اور محمود اپنے محلے کے باہر جو باغ تھا وہاں جا کر بیٹھ جاتے۔ شاہنامہ اسلام کی کوئی جلد محمود گھر سے اپنے ساتھ لے آتا تھا۔ اس نے کتاب میں جگہ جگہ کاغذ رکھ کر اپنی پسند کی نظموں کے نشان لگا رکھے ہوتے تھے۔ وہ اپنی پسند کی کسی نظم والا صفحہ نکالتا اور بڑے پرسوز انداز میں ترنم کے ساتھ نظم پڑھنے لگتا۔ باغ میں ادھر ادھر بیٹھے ہوئے لوگ ہمارے قریب آ جاتے اور بڑی عقیدت کے ساتھ شاہنامہ اسلام سنتے۔ جب محمود نظم ختم کرتا تو لوگ اسے شاباش دیتے۔ محمود کا چہرہ اپنی تعریف سن کر سرخ ہو جاتا اور ہم اٹھ کر باغ کی دوسری طرف دوڑ لگا دیتے۔ مجھے شاہنامہ اسلام کی ایک نظم ''صحرا کی دعا'' بڑی پسند تھی اور میں یہ نظم فرمائش کر کے محمود سے سنا کرتا تھا۔ میں نے یہ نظم محمود سے اتنی بار سنی کہ مجھے نظم کے کچھ اشعار زبانی یاد ہو گئے جو آج بھی یاد ہیں۔ وہ اشعار یہ ہیں۔

یہ تشنہ لب جماعت جب یہاں پر رک گئی آ کر

دعا کی دامن صحرا نے دونوں ہاتھ پھیلا کر
کہ اے صحرا کو آتش ناک چہرہ بخشنے والے
رخ خورشید پر کرنوں کا سہرا بخشنے والے
خبر کیا تھی الٰہی ایک دن ایسا بھی آئے گا
کہ تیرا ساقی کوثر یہاں تشریف لائے گا
خبر ہوتی تو میں شبنم کے قطرے جمع کر رکھتا
چھپا کر ایک گوشے میں مصفا حوض بھر رکھتا
مرے سر پر سے گزرا نوح کے طوفان کا پانی
تاسف ہے کہ مجھ سے ہو گئی اس وقت نادانی

حفیظ جالندھری کے بارے میں ہم سنا کرتے تھے کہ وہ جالندھر میں رہتے ہیں۔ ایک دو بار وہ امرتسر بھی کسی جلسے میں شرکت کے لئے آئے مگر میں انہیں نہ دیکھ سکا۔ حفیظ صاحب کو میں نے پہلی بار قیام پاکستان کے بعد اس وقت دیکھا جب میں بھی ادب کے میدان میں قدم رکھ چکا تھا۔

یہاں میں حفیظ صاحب کے بارے میں گوپال متل کی کتاب ''لاہور کا جو ذکر کیا'' کا ایک اقتباس پیش کرنا چاہتا ہوں۔ گوپال متل اس زمانے کی اپنی یادوں کو قلم بند کرتے ہوئے حفیظ جالندھری کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''دوسری جنگ عظیم کے ساتھ ہی ادیبوں اور شاعروں کے لئے بہترین روزگار کے مواقع فراہم ہو گئے۔ انگریزی حکومت نے سانگ پبلسٹی کے نام سے شاعری اور موسیقی کے ذریعے جنگی پرچار کا محکمہ قائم کیا تو حفیظ جالندھری اس محکمے کے ڈائریکٹر بنے۔ یہ محکمہ مشاعرے بھی کراتا تھا اور جنگ کی حمایت میں گیت بھی لکھواتا تھا۔ اکثر و بیشتر شاعر حفیظ صاحب کے اس تقرر سے پہلے ان کے سخت خلاف تھے لیکن جیسے ہی وہ سانگ پبلسٹی کے ڈائریکٹر بنے، شاعروں کو ان کی ذات اور ان کے کلام میں ہر قسم کے محاسن نظر آنے لگے۔ یہ بات حفیظ جالندھری کے

حق میں جاتی ہے کہ انہوں نے کسی شاعر کے خلاف بغض سے کام نہیں لیا اور مشاعروں میں شرکت اور گیت لکھوانے کے سلسلے میں جس شاعر کو جو فائدہ پہنچا سکتے تھے اس سے انہوں نے دریغ نہیں کیا۔ مجھ سے اختلاف رائے کے باوجود وہ پہلے ہی کی طرح تپاک اور گرم جوشی سے ملتے رہے۔"

میں ایک بار پھر قیام پاکستان سے پہلے کے زمانے میں واپس جاتا ہوں۔ شاہنامہ اسلام کے علاوہ اس زمانے میں حفیظ جالندھری کی غزلوں اور ہلکے پھلکے اردو گیتوں کا بھی بڑا چرچا تھا۔ مجھے ان کا ایک گیت "لو پھر بسنت آئی" بہت پسند تھا اور میں اکثر گایا کرتا تھا۔ اس گیت کے ساتھ آج بھی ایک دل گداز منظر میری آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ یہ سردیوں کی بارش کے بعد ٹھنڈی یخ ہواؤں میں جھومتے سرسوں کے کھیتوں کا منظر ہے۔ سرسوں کے دھلے ہوئے پیلے پھول اپنی نازک ٹہنیوں پر جھوم رہے ہیں۔ انہیں دیکھ کر میرا چہرہ سمجھ نہ آنے والی مسرت سے سرخ ہو رہا ہے اور میں "لو پھر بسنت آئی" کا گیت گنگناتا بلکہ گاتا ہوا ان کے درمیان سے گزر رہا ہوں۔ کوئی کسان کسی طرف سے نکل کر سامنے آ جاتا ہے تو میں چپ ہو جاتا ہوں۔ سرسوں کے یہ کھیت حد نگاہ تک پھیلے ہوتے تھے۔ ان کے درمیان سے گزرتے ہوئے ایک عجیب سی مہک آیا کرتی تھی۔ یہ مہک میرے ساتھ چلتی تھی۔ سرسوں کے کسی زرد پھول پر شبنم کے رکے ہوئے موتی نظر آ جاتے تو میں قریب جا کر اسے غور سے دیکھتا۔ بڑا خوش ہوتا۔ اس ڈر سے پھول کو ہاتھ نہ لگاتا کہ شبنم کا موتی ٹوٹ جائے گا۔

قیام پاکستان کے بعد حفیظ صاحب سے مجھے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تو میں نے اپنی ان یادوں کا ان سے کبھی ذکر نہ کیا جو "لو پھر بسنت آئی" کے گیت سے وابستہ تھیں۔

حفیظ صاحب سے میری پہلی ملاقات کب ہوئی، یہ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔ میں نے 1948ء میں اپنا پہلا افسانہ لکھا اور اس کے ساتھ ہی میری پہلے سے لکھنے والے شاعروں اور ادیبوں سے دوستی ہو گئی۔ یہ میری نوعمری بلکہ شروع جوانی کا زمانہ تھا۔

ادب کے ترقی پسند حلقوں نے میری زیادہ پذیرائی کی۔ ترقی پسندوں کے نظریات سے مجھے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ کچھ دوستوں کی دوستی مجھے ان کے نظریات سے زیادہ عزیز تھی۔ ان میں شاعر ابن انشاء کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ حفیظ صاحب' ابن انشاء کو بہت عزیز رکھتے تھے اور اس کی عقل و دانش اور اردو زبان دانی سے بڑے متاثر تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ابن انشاء انتہائی معاملہ فہم، زیرک اور ذہین تھے۔ اردو زبان کے رموز سے آشنا تھے۔ مجھے یقین ہے کہ حفیظ صاحب سے میری پہلی ملاقات ابن انشاء کے توسط سے ہی ہوئی۔ پہلی چیز جو مجھے ان کی شخصیت میں سب سے نمایاں نظر آئی اور جس نے مجھے متاثر کیا وہ ان کی مسکراہٹ تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے کوئی لڑکا شرارت کرنے کے بعد مسکرا رہا ہو۔ حفیظ صاحب کی جس بات سے میں بہت گھبراتا تھا وہ ان کا میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر زور سے دباتا اور بات کرتے ہوئے بار بار مجھے اپنی طرف تھوڑا تھوڑا کھینچتے رہنا تھا۔ یہ ان کی شفقت اور محبت کا اظہار تھا، مگر میں اپنی خودغرضی کی حد سے بڑھی ہوئی نفاست پسندی کی وجہ سے مجبور تھا۔ حفیظ صاحب کے ہاتھ کی گرفت زنبور کی طرح مضبوط تھی۔ یہ ایک محنت کش مزدور کے ہاتھ تھے۔ انہوں نے زندگی میں بڑی مشقت کی تھی، بڑی جدوجہد کی تھی۔

یہ شروع شروع زمانے کی بات ہے۔ کراچی میں آل پاکستان رائٹرز گلڈ کی پہلی کانفرنس منعقد ہو رہی تھی۔ لاہور سے میں بھی اپنے ادیب شاعر دوستوں کے ساتھ کانفرنس میں شرکت کے لئے جا رہا تھا۔ یہ منظر مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ لاہور ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر 2 پر وہ ٹرین کھڑی تھی جس میں سوار ہو کر ہم کراچی جا رہے تھے۔ ایک ڈبے کے دروازے کے سامنے میں حفیظ صاحب کے پاس کھڑا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ دوسرے ڈبے کے دروازے میں ایک شاعر کھڑا ہماری طرف گھور کر دیکھ رہا تھا۔ اس شاعر کا بھی طویل نظمیں لکھنے میں بڑا شہرہ تھا۔ جب حفیظ صاحب ڈبے میں سوار ہو گئے اور میں وہاں سے ہٹا تو مذکورہ شاعر نے مجھے آواز دے کر بلایا اور کہا۔ "یہ تم کس کے پاس کھڑے تھے اوئے۔"

آدمی زندگی کے کسی بھی میدان میں جب اپنی خداداد قابلیت اور محنت سے

کوئی خاص مقام خاص کر لیتا ہے تو جہاں اس کے نئے نئے دوست اور اس سے محبت کرنے والے پیدا ہو جاتے ہیں وہاں دشمن بھی نکل آتے ہیں۔

حفیظ صاحب' شہرت اور فارغ البالی کے اس مقام پر تھے جہاں آدمی بہت کم اپنے دشمنوں کو خاطر میں لاتا ہے۔ انہیں حکومت کے ایوانوں سے لے کر غریب کی جھونپڑیوں تک ملک گیر مقبولیت حاصل تھی۔ ویسے بھی میں نے دیکھا ہے کہ وہ دشمنیاں پالنے والے آدمی نہیں تھے جب کوئی فائدہ پہنچانے کا وقت آتا تو وہ اپنے دشمنوں کو بھی فائدہ پہنچانے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ میری آنکھوں دیکھی بات ہے۔ ہم ڈھاکے میں تھے کہ ابن انشاء نے ان سے کسی شاعر کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ آپ سے بڑا جلتا ہے۔ اس پر حفیظ صاحب کے چہرے پر وہی دلکش شرارتی مسکراہٹ آ گئی۔ انہوں نے ابن انشاء کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے ذرا سا اپنے قریب کھینچا اور اپنے خاص دلگداز ترنم کے ساتھ اپنے گیت کا یہ مصرع پڑھا۔

بس درشن درشن میرا

حفیظ صاحب کے شاہنامہ اسلام والے ترنم کی بڑی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ جب وہ مشاعروں میں اپنے خاص ترنم میں اپنا کلام پڑھتے تو لوگوں پر ایک وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ میں نے اکثر شاعروں کو دیکھا ہے کہ ان کا ترنم تو بڑا اچھا ہوتا ہے، مگر انہیں لے تال کی بالکل سمجھ نہیں ہوتی اور سر کے اکار کا بھی علم نہیں ہوتا، مگر حفیظ صاحب کے ساتھ یہ بات نہیں تھی۔

حفیظ صاحب میرے مشاہدے کے مطابق بہت زیادہ سوچ سمجھ کر بہت کم خرچ کرتے تھے، بلکہ کبھی کبھی تو صرف سوچتے اور سمجھتے ہی تھے، خرچ نہیں کرتے تھے۔ یہ ان کی کفایت شعاری تھی۔ وہ فضول خرچ بالکل نہیں تھے۔ میں اور ابن انشاء جب بھی موقع ملتا ان سے زبردستی فضول خرچیاں کروا لیتے۔ اصل میں حفیظ صاحب ہم دونوں سے بڑا پیار کرتے تھے اور ہمیں کچھ نہیں کہتے تھے۔ ابن انشاء سے تو انہیں خاص لگاؤ تھا۔ بہت سی باتوں میں وہ ابن انشاء ہی سے مشورہ لیتے۔ وہ اس کو مجھ سے الگ کر کے پرے لے جاتے اور اس سے مشورہ کرنے لگتے۔ بعد میں ابن انشاء اکثر و بیشتر مجھے بتا

دیا کرتے تھے کہ حفیظ صاحب کیا مشورہ لے رہے تھے۔ مشورے صرف شعر و شاعری کے متعلق ہی ہوا کرتے تھے۔

میری اور حفیظ صاحب کی عمر میں بڑا فرق تھا اور میں ان کے ایک مداح کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ ان کی محبت تھی کہ وہ مجھ سے بڑی شفقت کا اظہار کرتے اور بے تکلف بھی ہو جاتے۔ میں اپنے مضمون میں ان کی دلچسپ شخصیت کی کچھ باتیں اور ان کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات کی کچھ یادیں ہی پیش کر سکتا ہوں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ حفیظ صاحب سے متعلق مجھے اپنی یہ یادیں بڑی عزیز ہیں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب جناب قدرت اللہ شہاب، صدر ایوب خان کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے۔ اس زمانے میں جمہوریت نام کی ایک ریل گاڑی چلی تھی جس میں ملک کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کو بٹھا کر ملک کے دور دراز گوشوں کی سیر کرائی گئی تھی۔ مقصد یہ تھا کے پاکستان کے ادیبوں اور شاعروں کو وطن عزیز کی ثقافت اور سوشل زندگی سے مزید روشناس کرایا جائے۔ ایسی ہی ایک پاک جمہوریت ٹرین اس زمانے میں مشرقی پاکستان میں بھی چلائی گئی۔ یہاں سے جو ادیب مشرقی پاکستان گئے ان میں لاہور سے میں، ابن انشاء اور اشفاق احمد کراچی پہنچے۔ وہاں سے ابراہیم جلیس بھی ہمارے ساتھ مل گئے۔ ڈھاکے جانے کے لئے کراچی سے ہوائی جہاز میں سوار ہونا پڑتا تھا۔ کراچی ایئرپورٹ پر جمیل الدین عالی کے علاوہ حفیظ صاحب بھی موجود تھے۔ کچھ وقت لاؤنج میں چائے پیتے اور باتیں کرتے ہوئے گزارا۔ پھر شاید آدھی رات کے بعد جہاز میں سوار ہو گئے۔ یہ مجھے یاد ہے' یہ ٹرائیڈنٹ جہاز تھا۔ جہاز میں سوار ہونے سے پہلے لاؤنج میں ہی ایک صاحب ہماری لائف انشورنس کرنے آ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ اگر ہم لائف انشورنس کی پالیسی خرید لیں تو جہاز کو حادثہ پیش آنے اور اس حادثے میں ہمارے ہلاک ہو جانے کی صورت میں ہمارے لواحقین کو لاکھ یا شاید ڈیڑھ لاکھ روپیہ ملے گا۔ ابن انشاء نے ان صاحب سے کہا۔

''ہم صرف ایک شرط پر یہ پالیسی خرید سکتے ہیں۔''

انشورنس ایجنٹ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ''فرمایئے، کون سی شرط؟''

ابن انشاء بولے۔ "آپ ہمیں یقین دلا دیں کہ یہ جہاز حادثے کا شکار ہو جائے گا۔"

حفیظ صاحب قریب ہی کرسی پر بیٹھے تھے۔ کہنے لگے۔ "انشاء جی! خدا سے خیر مانگو۔" اس کے بعد نوجوان انشورنس ایجنٹ کی طرف دیکھ کر فرمایا۔

"جاؤ بھائی تم کہاں پھنس گئے ہو۔"

اتنے میں سپیکر پر اعلان ہوا کہ ڈھاکہ جانے والی فلائٹ تیار ہے، مسافروں سے گزارش ہے کہ وہ جہاز پر سوار ہو جائیں۔ ہم سب ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کرتے اٹھے اور دروازے کی طرف بڑھے۔

مجھے جب ہوائی جہاز میں سفر کرنے کا موقع ملتا ہے تو میری ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ کھڑکی کے ساتھ والی سیٹ پر جگہ ملے۔ یہاں بھی میں نے یہی انتظام کیا تھا۔ میری ساتھ والی سیٹ پر ابن انشاء تھے اور اگلی قطار کی درمیانی سیٹ پر حفیظ صاحب بیٹھے تھے۔ جمیل الدین عالی، اشفاق احمد اور ابراہیم جلیس دائیں جانب کی نشستوں پر بیٹھے تھے۔ عالی مجھے کئی بار کہہ چکا تھا کہ ڈھاکے پہنچ کر تمہیں اتنا سبزہ ملے گا کہ تم لنکا، سیلون کو بھول جاؤ گے۔ ٹرائیڈنٹ طیاروں کی رفتار جیٹ کے مقابلے میں سست ہوا کرتی تھی۔ جہاز نے ٹیک آف کیا اور اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گیا۔ حفیظ صاحب اگلی سیٹ پر بیٹھے تھے، مگر باتیں پچھلی سیٹ پر میرے ساتھ بیٹھے ابن انشاء سے کر رہے تھے۔ کبھی کبھی وہ پیچھے جھانک کر ہمیں دیکھتے اور خیر خیریت بھی پوچھ لیتے۔

"کیوں بھئی ٹھیک ٹھاک ہو نا؟"

ابن انشاء نے شرارت سے مسکراتے ہوئے حفیظ صاحب سے کہا۔

"حفیظ صاحب! آپ کے ساتھ والی سیٹوں پر جو مسافر بیٹھے ہیں۔ آخر ان کا بھی کچھ حق ہے' ان سے بھی باتیں کریں۔"

سفر ہنسی مذاق کی باتوں اور ابراہیم جلیس کی دلچسپ لطیفہ بازیوں میں کٹ گیا۔ جب جہاز ڈھاکہ لینڈ کر رہا تھا، اس وقت وہاں پو پھٹ رہی تھی۔ ایئرپورٹ سے باہر آ کر گاڑیوں میں سوار ہو گئے۔ ہمیں ڈھاکہ کے ایم پی اے ہوسٹل میں ٹھہرایا گیا تھا۔

ایک کشادہ کمرہ تھا جس میں دیوار کے ساتھ لکڑی کے تختوں والے تین پلنگ بچھے تھے۔ ان پر مچھر دانیاں ڈال کر لپیٹ دی گئی تھیں۔ تختوں پر گدے بچھے تھے۔ ایک پلنگ پر میں نے، دوسرے پر ابن انشاء نے اور تیسرے پر ابراہیم جلیس نے قبضہ کر لیا۔ دن نکلنے ہی والا تھا۔ سونا کسے تھا۔ لطیفہ بازی شروع ہو گئی۔ ایک بار جو میں زور سے قہقہہ لگاتے ہوئے اچھلا تو پلنگ کا تختہ ٹوٹ گیا اور میں نیچے گر پڑا۔ ابراہیم جلیس بولا۔

"یار دیکھنا چاہئے، کہیں میرا پلنگ بھی قہقہہ لگانے سے ٹوٹ تو نہیں جائے گا۔"

یہ کہہ کر جلیس اچھل کر گرا تو یقین کریں کہ اس کا پلنگ بھی ٹوٹ گیا۔ ہنس ہنس کر ہمارے پیٹ میں بل پڑ رہے تھے۔ ابن انشاء کی عقلمندی حسب معمول اس کے کام آئی۔ وہ قہقہہ لگانے سے پہلے پلنگ سے نیچے اتر آتا تھا۔ میں نے جلیس سے کہا۔

"چلو عالی صاحب سے جا کر کہتے ہیں کہ ہمارے لئے دوسرے پلنگوں کا انتظام کیا جائے۔"

جمیل الدین عالی ہمارے کمرے سے دو تین کمرے چھوڑ کر آگے تھے، جا کر دیکھا تو وہ بھی ٹوٹے ہوئے پلنگ پر حیرت کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔ کہنے لگے۔

"بھائی کیا کریں؟ یہ پلنگ ہی ایسے ہیں۔ ابھی کسی طرح گزارا کر لو۔ دوپہر کو بدلوانے کی کوشش کریں گے۔"

ہم جانے لگے تو عالی نے کہا۔ "کونے والے کمرے میں حفیظ صاحب ہیں، جا کر ان کی بھی خیر خیریت دریافت کر لو۔"

ہم حفیظ صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے تو وہ پلنگ پر بیٹھے سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ ان کا پلنگ صحیح سلامت تھا۔ میں نے کہا۔ "حفیظ صاحب آپ کے پلنگ کا تختہ بدلنا ہے۔"

حفیظ صاحب نے گردن ٹیڑھی کر کے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کیوں اوئے شیطانو! کیا بات ہے؟"

جلیس نے اپنی ہنسی بڑی مشکل سے قابو میں کرتے ہوئے کہا۔ "حفیظ

صاحب! بات یہ ہے کہ ہوسٹل کے سارے پلنگوں کے تختے بدلے جا رہے ہیں۔ عالی صاحب نے بتایا ہے کہ ان تختوں کی درازوں میں بڑے بڑے کھٹمل ہیں۔"

حفیظ صاحب اسی طرح مسکراتے ہوئے بولے۔

"جب کھٹمل کاٹیں گے تو دیکھ لوں گا ابھی تم لوگ جاؤ اور مجھے آرام کرنے دو۔"

میں نے پلنگ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔"حفیظ صاحب یہاں کے کھٹمل بڑے زہریلے ہوتے ہیں۔ ان کے کاٹنے سے بخار چڑھ جاتا ہے۔ آپ ذرا اٹھیے، ہم تختوں کو جھاڑ پھٹک کر دیکھتے ہیں۔"

حفیظ صاحب پلنگ سے اتر آئے۔ ہم نے گدے کو اٹھایا اور خالی تختے پر زور زور سے مکے مارنے شروع کر دیئے۔ تختے واقعی بڑے نازک تھے۔ حفیظ صاحب کے پلنگ کا تختہ توڑ کر ہم باہر کو بھاگے۔ حفیظ صاحب کی آواز ہمیں پیچھے سنائی دے رہی تھی۔

"ٹھہر جاؤ خبیثو!"

ہم نے کمرے میں جاتے ہی ابن انشاء کو ہنس ہنس کر دوہرے ہوتے ہوئے بتایا کہ ہم حفیظ صاحب کے پلنگ کا تختہ توڑ آئے ہیں۔ ابن انشاء کا چہرہ ایک دم بدل گیا۔

"اب کیا کرنا چاہتے ہو؟"

میں نے اور جلیس نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر ابن انشاء کے پلنگ پر حملہ کر دیا۔ اسے زبردستی اٹھا کر کرسی پر بٹھایا اور پھر اس کے پلنگ پر چڑھ گئے۔ تھوڑی سی اچھل کود کے بعد ابن انشاء کے پلنگ کا تختہ بھی ٹوٹ کر فرش کے ساتھ جا لگا تھا۔

دوسرے دن ڈھاکہ کے کملا پور ریلوے سٹیشن سے پاک جمہوریت ٹرین کا سفر شروع ہوا گیا۔ یہ بڑا یادگار سفر تھا۔ جہاں آگے دریا آ جاتا وہاں ہم سٹیمر پر سوار ہو جاتے۔ دریا کا سفر ختم ہوتا تو آگے پھر ایک ٹرین ہمیں اٹھا لیتی۔ اس طرح ہم نے اس زمانے کے سارے مشرقی پاکستان کی سیر کی۔ ایک ایک شہر دیکھا۔ وہاں کے لوگوں سے

ملے۔ ادیبوں، شاعروں، دانشوروں اور صحافیوں سے ملاقاتیں کیں۔ حفیظ صاحب ہمارے ساتھ تھے۔ اس سفر میں مجھے انہیں بڑا قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ میں نے محسوس کیا کہ جیسے وہ دور سے دکھائی دیتے تھے ویسے ہی قریب سے نظر آتے تھے۔

رات کے وقت ہماری ٹرین کسی سٹیشن پر رکی تو ہمارے ایک بڑے معزز اور وضع دار بزرگ شاعر ہمارے ڈبے میں آ گئے۔ ہم چار سفر کر رہے تھے، یعنی ایک میں، ایک ابن انشاء، ایک ابراہیم جلیس اور ایک ہم نے اپنی پسند کا ایک بے ضرر اور خاموش طبع دانشور اپنے ساتھ رکھ لیا تھا کیونکہ وہ چار آدمیوں کا ڈبہ تھا۔ وضع دار بزرگ شاعر بڑے پریشان دکھائی دیتے تھے۔ ہم نے پریشانی کی وجہ پوچھی تو سرد آہ بھر کر بولے۔

"حفیظ جالندھری۔"

ہم بڑے حیران ہوئے۔ ابن انشاء زیر لب مسکرا رہے تھے۔ انہوں نے کہا۔

"حفیظ صاحب نے کہیں آپ کو زدوکوب تو نہیں کیا۔"

وہ صاحب بولے۔"اگر زدوکوب کرتے تو مجھے بڑی خوشی ہوتی۔"

جلیس صاحب نے پوچھا۔"تو پھر آخر آپ پریشان کس بات سے ہیں؟"

انہوں نے فرمایا۔"میں اور حفیظ صاحب جس کوپے میں سفر کر رہے ہیں اس میں صرف دو ہی نشستیں ہیں۔ ایک اوپر یعنی برتھ اور ایک اس کے نیچے والی سیٹ ہے۔ نیچے والی سیٹ پر میں نے اپنا بستر لگایا ہوا تھا۔ حفیظ صاحب اوپر برتھ پر سوتے ہیں۔"

"تو اس میں پریشانی کی کون سی بات ہے؟" ابن انشاء نے شرارتی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

وہ صاحب بولے۔"بات یہ ہے میرے عزیزو کہ حفیظ صاحب ہر پانچ منٹ کے بعد اتنی زور سے پہلو بدلتے ہیں کہ ایک دھماکے کی آواز آتی ہے اور میں ڈر کر اٹھ بیٹھتا ہوں۔ مجھے اپنے ڈبے میں تھوڑی سی جگہ عنایت فرما دیجئے۔ میں فرش پر بستر لگا لوں گا۔"

اس کے بعد ہم نے کیا کیا؟ اس کو جانے دیں۔ بہرحال ہم نے ان صاحب کو اپنے ڈبے میں جگہ بھی نہیں دی اور برتھ کے دھماکوں سے بھی بچا لیا۔

اس طویل سیاحت کے بعد ہم ڈھاکہ واپس آئے تو معلوم ہوا کہ ابھی ہمیں یہاں تین روز تک قیام کرنا ہوگا۔ ایم پی اے ہوسٹل میں ہمیں پرانے کمرے ہی ملے، مگر پلنگ بدل دیئے گئے تھے۔ جمیل الدین عالی خاص طور پر ہمارے پاس آئے اور کہا۔

''اب تم لوگ خرمستیاں نہیں کرو گے۔ یہ پلنگ ٹوٹے تو پھر تمہیں فرش پر ہی سونا پڑے گا۔''

دوسرے دن ہم لوگ ناشتے سے فارغ ہو کر کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ابن انشاء دیوار پر لگے ہوئے شیشے کے سامنے کھڑا اپنی سوجی ہوئی ڈاڑھ میں دوائی لگا رہا تھا کہ حفیظ صاحب تشریف لائے۔ آتے ہی کہا۔

''تم لوگوں نے ڈھاکہ کی پوری سیر نہیں کی ہو گی۔ چلو، تمہیں ڈھاکہ کی سیر کراتا ہوں۔''

ابن انشاء بولے۔'' آپ پیدل چلا چلا کر ہمیں مار ڈالیں گے۔''

حفیظ صاحب نے گردن ٹیڑھی کر کے کہا۔'' انشاء جی! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ اوئے تم جوان جہان ہو۔ سیر کا مزا تو پیدل چل کر ہی آتا ہے۔ اچھا چلو جہاں ضرورت پڑے گی وہاں سواری کرالیں گے۔''

لیکن راستے میں انہوں نے خود کوئی رکشا ٹیکسی لی نہ ہمیں لینے دی۔ وہ چلتے چلتے اچانک کسی دکان کا بورڈ دیکھ کر رک جاتے اور وہیں کھڑے کھڑے فرماتے۔

''میڈ اِن پاکستان، نیشنل۔ چلو اندر چل کر دیکھتے ہیں۔''

دکان دار بڑا خوش ہوتا کہ گاہک آئے ہیں۔ وہ جگہ جگہ سے چیزیں نکال کر دکھاتا۔ حفیظ صاحب ان چیزوں کو دیکھ کر خوش ہوتے اور فخر سے گردن اٹھا کر ہمیں فرماتے۔

''پاکستان میں کیا کچھ نہیں بن رہا!''

اور ہم کوئی چیز خریدے بغیر دکان دار کو مایوسی کی حالت میں چھوڑ کر دکان سے باہر نکل آتے۔

پیدل چل چل کر واقعی ہمارا برا حال ہو گیا تھا، مگر حفیظ صاحب لوہے کی لٹھ کی

مانند چلتے چلے جا رہے تھے۔ ابن انشاء نے ذرا پیچھے ہو کر مجھ سے کہا۔'' حفیظ صاحب سے بدلہ ضرور لینا ہے۔''

میں نے پوچھا۔'' کیا کرو گے؟''

وہ کہنے لگے۔'' کسی طریقے سے ان کے زیادہ سے زیادہ پیسے خرچوانے ہیں، مگر میری ڈاڑھ سوجی ہوئی ہے۔ میں صرف کیلے ہی کھا سکتا ہوں۔''

اس وقت ہم دریائے بوڑھی گنگا کی گھاٹ والی مارکیٹ میں پہنچ چکے تھے۔ حفیظ صاحب نے ایک دکان کے باہر کیلے کے گچھے دیکھ کر کہا۔

''واہ کیا خوبصورت کیلے ہیں۔''

میں نے کہا۔''ہمیں کیلے کھلائیں۔''

حفیظ صاحب نے اچکن کی جیب پر ہاتھ مارا اور فرمایا۔

''کھاؤ، خوب کھاؤ۔ نیشنل، نیشنل!''

ہم نے وہیں بیٹھ کر کیلے کھانا شروع کر دیئے۔ وہ سستے بھی بہت تھے۔ حفیظ صاحب بڑے راضی ہو کر ہمیں کیلے کھلا رہے تھے۔ ہاں انہوں نے اتنی احتیاط ضرور کی تھی کہ خود کوئی کیلا نہیں کھایا تھا۔ اگر کھایا بھی تو صرف ایک آدھ۔ بس وہ ہمیں کھاتے دیکھ کر بڑی شفقت سے مسکراتے رہے۔

میں آخری بار حفیظ صاحب سے ان کے گھر واقع ماڈل ٹاؤن میں ملا۔ میں ریڈیو پاکستان لاہور سے وابستہ تھا۔ اپنے ایک پروگرام کے سلسلے میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ انہوں نے مجھے اوپر بلوالیا۔ وہ کوٹھی کی دوسری منزل پر تھے۔ چاروں طرف کتابیں ہی کتابیں تھیں۔ کمرے کی حالت بڑی شکستہ تھی۔ حفیظ صاحب دری کے فرش پر پرانا سا گاؤ تکیہ لگائے بیٹھے تھے۔ درمیان میں کوئلے کی بجھی ہوئی انگیٹھی، کیتلی اور دو تین پیالیاں پڑی تھیں۔ وہ بہت کمزور ہو گئے تھے۔ اپنی خاص شگفتہ مسکراہٹ اور پرخلوص شفقت کے ساتھ ملے۔ سب کا حال احوال پوچھا۔ میں ان کے پاس دری پر بڑے ادب سے بیٹھا تھا۔ باہر دوسری منزل کا برآمدہ نظر آ رہا تھا۔ وہاں ایک بڑے صندوق پر کتابیں ہی کتابیں اور فائلیں پڑی تھیں۔ پاس ہی ایک بوسیدہ سا صوفہ تھا۔

صوفے پر بھی ایک طرف پرانی کتابوں کا ڈھیر لگا تھا۔ وہاں کوئی شے ایسی نہ تھی جس پر گرد نہ پڑی ہو۔ ان کی صحت ٹھیک نہیں تھی، مگر ان کی زندہ دلی اور طبعی شگفتگی اسی آب و تاب کے ساتھ قائم تھی۔ چہرے پر وہی شرارتی دل آویز مسکراہٹ تھی۔ دوستوں کا نام لے لے کر پوچھا۔ ''وہ کہاں ہے؟...... اس سے کہو میں لاہور ہی میں ہوں۔'' پھر مجھے ساتھ لے کر برآمدے میں آ گئے۔ کچھ پرانی کتابیں اور بڑے نایاب قسم کے مسودے دکھانے لگے۔ میں کچھ دیر ان کی خدمت میں بیٹھا رہا۔ پھر ان سے اجازت لی اور سیڑھیاں اتر کر صحن میں آ گیا جہاں ریڈیو پاکستان کی گاڑی کھڑی تھی۔ حفیظ صاحب کے گھر سے لے کر ریڈیو پاکستان کے گیٹ تک میں بہت کچھ سوچتا رہا۔ مجھے بہت کچھ یاد آتا رہا۔

☆......☆......☆

ایوان ادب کے ستون مولانا تاجور نجیب آبادی

اردو ادب کی جن قد آور شخصیات نے اردو تنقید و تحقیق پر وطن عزیز کے ابتدائی عہد میں قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔ ان میں ایک نمایاں نام شمس العلماء مولانا تاجور نجیب آبادی کا بھی ہے۔ پرانی نسل کے بزرگ محفل ہستی سے اٹھتے چلے جا رہے ہیں۔ نئی نسل کے نوجوان شاید ہی ان شخصیات سے اور ان کی ادبی خدمات سے آشنا ہوں۔ اس خیال سے میں کچھ ذکر مولانا تاجور صاحب کا کرنا چاہتا ہوں جن کی نیاز مندی میں رہنے کا مجھے بھی تھوڑا سا موقع ملا تھا۔

شمس العلماء احسان اللہ خان تاجور نجیب آبادی 1894ء میں نینی تال میں پیدا ہوئے۔ آبائی وطن نجیب آباد ضلع بجنور تھا۔ دارالعلوم دیوبند سے انہوں نے درس نظامی کی تکمیل کی اور مزید تعلیم کے لئے 1914ء میں لاہور آ گئے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ لاہور کے اورینٹل کالج سے انہوں نے مولوی فاضل اور منشی فاضل کی اسناد حاصل کیں۔ 1921ء میں دیال سنگھ کالج لاہور میں اردو اور فارسی کے استاد مقرر ہوئے۔ اس کے بعد وہ تمام عمر اس کالج میں تعلیم دیتے رہے۔ تاجور صاحب کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوا۔ اس صدی کی تیسری دہائی میں ان کا شمار اپنے عہد کے ممتاز شعرا میں ہونے لگا۔ شاعری کے ساتھ ساتھ تنقید و تحقیق اور طنز و مزاح میں بھی انہوں نے قابل قدر کارنامے انجام دیئے۔

تاجور صاحب نے تقریباً نصف صدی تک اردو زبان و ادب کی خدمت کی۔ وہ ان چند اہل علم میں سے تھے جنہوں نے اردو کی نشر و اشاعت میں علمی، عملی، دونوں سطحوں پر کام کیا۔ وہ ''مخزن'' اور ''ہمایوں'' جیسے اہم ادبی رسالوں کے مدیر رہے۔

1929ء میں ''ادبی دنیا'' اور ''شاہکار'' جیسے بلند پایہ رسائل جاری کیے۔ ان رسائل کے ذریعے تاجور صاحب نے ایک طرف بے شمار نئے ادیبوں کو منظر عام پر آنے کا موقع دیا دوسری طرف اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج میں گراں قدر کام کیا۔ 1925ء میں انہوں نے ''اردو مرکز'' کے نام سے ایک علمی ادارہ قائم کیا۔ اس میں کام کرنے کے لئے انہوں نے اصغر گونڈوی، جگر مراد آبادی، یاس یگانہ جیسے ممتاز شعراء کو لاہور میں یکجا کیا۔ ان کے تعاون سے متعدد اہم کتابیں شائع ہوئیں۔ اس ادارے کا اصل کارنامہ اردو کلاسیکی شاعری کے انتخابات ہیں۔ ان انتخابات سے نئی نسل کو اپنے شعری سرمائے کے بہترین حصوں سے روشناس ہونے کا موقع ملا۔ اس صدی کی تیسری دہائی ہی میں تاجور صاحب نے ''انجمن ارباب علم'' کے نام سے سر شیخ عبدالقادر کی سرپرستی میں ایک ادبی انجمن قائم کی۔ اس انجمن کے زیراہتمام مشاعرے بھی ہوتے تھے اور علمی ادبی مجالس بھی منعقد ہوتی تھیں۔ اس کی شاخیں پنجاب کے کئی اضلاع میں قائم کی گئیں۔ یہ انجمن پنجاب میں اردو کی ترویج کا ایک بڑا ذریعہ ثابت ہوئی اور نوجوان نسل کی ادبی تربیت میں اس نے بہت اہم کردار ادا کیا۔

تاجور صاحب اپنے عہد کے مستند علماء ادب میں سے تھے جس کے اعتراف میں حکومت وقت نے 1940ء میں انہیں شمس العلماء کا خطاب دیا۔ کالج کے شاگردوں سے قطع نظر شاعری میں بھی ان کے بے شمار شاگرد تھے جن میں سے بعض نے بہت نام پیدا کیا۔ مثلاً جن میں سید عابد علی عابد، جگن ناتھ آزاد، عبدالحمید عدم، احسان دانش شامل ہیں۔ تاجور نے اردو زبان کی خدمت گزاری میں بابائے اردو مولوی عبدالحق اور سر شیخ عبدالقادر کی طرح اس وقت نمایاں کام کیا جب پنجاب میں ہندو اخباروں کے تعاون سے ہندی زبان کی نشر واشاعت کے لئے کئی ایک تحریکیں چل رہی تھیں۔ علامہ تاجور کا انتقال 31 جنوری 1951ء کو ہوا۔ تاجور صاحب ادیب گر تھے۔ ان کی توجہ سے اردو کے بے شمار ادیبوں کی تصانیف شائع ہوئیں لیکن افسوس کہ ان کی اپنی تحریریں کتابی صورت میں مرتب نہ ہو سکیں۔

تاجور صاحب جن دنوں ''شاہکار'' رسالے کے چیف ایڈیٹر تھے ان دنوں کچھ وقت کے لئے مجھے بھی ان کی نیازمندی میں رہنے کا موقع نصیب ہوا تھا۔ مجھ سے پہلے

گوپال متل صاحب علامہ صاحب کی سرپرستی میں رسالہ ''شاہکار'' سے وابستہ رہ چکے تھے۔ گوپال متل نے قیام پاکستان کے بعد ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام ''لاہور کا جو ذکر کیا'' ہے۔ لاہور میں بسر کئے ایام کے بارے میں لکھتے ہوئے وہ ان دنوں کا بھی ذکر کرتے ہیں جو تاجور صاحب کے زیر سایہ گزرے گوپال متل لکھتے ہیں۔

''مولانا تاجور کا سلوک میرے ساتھ بہت مشفقانہ تھا۔ انہوں نے قارئین شاہکار سے میرا تعارف بہت اچھے لفظوں میں کرایا اور میری نثر اور میری شاعری کی دل کھول کر تعریف کی۔ صرف یہی نہیں بلکہ ایک مرتبہ انہوں نے میرے ایک شعر ؎

مجھے زندگی کی دعا دینے والے
ہنسی آ رہی ہے تیری سادگی پر

پر اچھا خاصا مضمون لکھ دیا۔ میرا یہ شعر زبان زد خاص و عام ہے اور میرا خیال ہے کہ اس کی مقبولیت میں مولانا تاجور کی تحریر کو بڑا دخل ہے۔ مولانا تاجور کا دل علاقائی تعصب سے بالکل پاک تھا۔ پنجاب میں اردو کے فروغ میں ان کا حصہ شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد کے بعد غالباً سب سے زیادہ ہے۔ جب بھی کوئی اہم ادیب ان سے ملنے آتا تو وہ مجھے بلا لیتے تھے اور شام کے وقت میں کئی بار ان سے ملنے چلا جاتا تھا۔ اگر میں یہ اعتراف نہ کروں تو بہت بڑی ناشکر گزاری ہو گی کہ میرے ادبی ذوق کی نشوونما میں ان صحبتوں کا بڑا دخل ہے۔ مولانا تاجور دھڑلے کے آدمی تھے انہوں نے اپنی زندگی میں کئی کارنامے انجام دیئے۔ انہوں نے اردو مرکز کی بنیاد ڈالی جس کے پیش نظر اردو ادب کے فروغ و اشاعت کا اہم پروگرام تھا اور اس اہم کام کو انجام دینے میں مولانا اردو کے نامور ترین ادیبوں اور شاعروں کا تعاون حاصل کرنے ہی میں کامیاب نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے سرمائے کا انتظام بھی کر لیا۔ ''ادبی دنیا'' اور ''شاہکار'' کا اجرا بجائے خود تاریخی اقدام ہے۔'''' لاہور کا جو ذکر کیا'' صفحہ 22, 21۔

یادوں کا مسافر ہوں اپنی یادوں کو ساتھ لے کر زمانہ حال کے نشیب و فراز سے گزر رہا ہوں۔ جب بھی لاہور میں گزارے ہوئے پرانے زمانے کو یاد کرتا ہوں تو مولانا تاجور صاحب کی شفقت و محبت بہت یاد آتی ہے۔ کئی بار دل چاہا کہ ان کا ذکر کروں۔ ان کے بارے میں جتنا کچھ لکھ سکتا ہوں لکھوں لیکن مجھے ان کی کوئی تصویر نہیں مل رہی تھی۔ بس یونہی ایک خیال سا دل میں بیٹھ گیا تھا کہ مولانا کا ذکر ان کی تصویر کے ساتھ ہونا چاہئے۔ میرا ایک معمول سا بن گیا ہے کہ جب میں روزنامہ نوائے وقت سے نکلتا ہوں تو نشر و اشاعت کے مشہور ادارے فیروز سنز کا ایک چکر ضرور لگاتا ہوں۔ ایک تو وہاں شیلف میں لگی ہوئی انگریزی اردو ادب کی کتابیں اور دوسری خواجہ الطاف احمد کی محبت مجھے اپنی طرف کھینچتی ہے۔ خواجہ الطاف احمد میرے محسن بھی ہیں اور امرتسری بھی ہیں۔ بڑی محبت سے چائے بنوا کر پلاتے ہیں۔ پچھلے دنوں میں ان کے پاس بیٹھا تھا کہ میں نے مولانا تاجور صاحب کا ذکر کیا اور کہا کہ مجھے ان کی تصویر نہیں مل رہی۔ انہوں نے بتایا کہ مولانا تاجور کے صاحب زادے ارشد درانی لاہور میں ہی ہوتے ہیں۔ شاید ان سے مولانا کی کوئی تصویر مل جائے۔ انہوں نے مجھے ارشد صاحب کا ایڈریس دیا۔ میں نے انہیں خط لکھا اور انہوں نے کمال مہربانی سے مجھے مولانا تاجور کی ایک تصویر بھیج دی۔ ساتھ ہی انہوں نے اپنی ایک چھوٹی سی آزاد نظم بھی لکھ بھیجی جو انہوں نے تاجور صاحب کی یاد میں کہی تھی۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

عروس ادب کی آنکھیں بلور کی ہیں
شفاف پتھریلی
ملک، محلے، شکست و ریخت کا شکار ہو گئے
ملبے کے نیچے نم آلود مٹی ابھی ہے
وہ یہیں سویا پڑا ہے
میرے شہر کی چنچل خوشبو میں
ایک مہک اس کی بھی ہے
یہیں تاجور نجیب آبادی جانے کتنی دہائیوں سے
چپ سادھے ہوئے ہے

آ! اس کی لحد کے کتبے پر
تاجور لاہوری رقم کر دیں
عروس ادب کی آنکھیں بلور کی ہیں
شفاف پتھریلی
تاجور میں اور عیب لاکھ ہوں
بے وفا نہیں

جن دنوں مولانا تاجور لاہور میں رسالہ ''شاہکار'' کے چیف ایڈیٹر اور سرپرست تھے وہ میری آوارہ گردیوں کا زمانہ تھا اور امرتسر سے لاہور آنا جانا رہتا تھا۔ یہ قیام پاکستان سے کچھ پہلے کی بات ہے میں نے ابھی میٹرک کا امتحان پاس نہیں کیا تھا۔ جنوبی ایشیا کے سمندروں اور جنگلوں اور شہروں کی آوارہ گردی سے کچھ روز پہلے واپس آیا تھا اور گھر والوں سے مار وغیرہ کھا کر دوبارہ ان ہی جنگلوں اور سمندروں کی طرف پرواز کرنے کے لئے پر تول رہا تھا۔ لاہور سے محبت تھی۔ لاہور میں بڑی ہمشیرہ صاحبہ کا گھر بھی تھا۔ اس لئے گھر سے بھاگ کر سیدھا لاہور آ جاتا تھا۔ ادب کے ساتھ بچپن ہی سے لگاؤ ہو گیا تھا۔ اردو انگریزی فلمیں دیکھنا اور اپنی ناکام محبتوں کے خیال میں لاہور کی سڑکوں پر اداس اداس پھرنا...... بس یہی میرا کام تھا۔ افسانے لکھنے کا کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا۔ افسانے پڑھنے کا بہت شوق تھا اور منٹو، کرشن چندر، بیدی اور قرۃ العین اور احمد ندیم قاسمی میرے پسندیدہ ادیب تھے۔ ایک روز اسی عالم اداسی میں پرانی میوہ منڈی کی گلیوں میں پھرتے پھراتے ایک مکان کے باہر ماہنامہ ''شاہکار'' کا بورڈ لگا ہوا دیکھا۔ یہ اس عہد کے مشہور ادبی رسالوں میں سے تھا اور میں ''شاہکار'' میں شائع ہونے والے افسانے اور نظمیں بڑے شوق سے پڑھا کرتا تھا۔ ان دنوں شاہکار کے حلقہ ادارت میں شیر محمد اختر اور راج بلدیو راج بھی شامل تھے۔ اختر صاحب سے لاہور میں کبھی کبھی میری نیازمندانہ سلام دعا ہو جاتی تھی۔

''شاہکار'' کا دفتر مکان کے دیوان خانے میں تھا۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ شیر محمد اختر صاحب پر میری نظر پڑ گئی۔ میں اندر چلا گیا اور اختر صاحب کے پاس بیٹھ گیا۔ اس روز تھوڑی دیر بیٹھ کر واپس آ گیا۔ دوسرے روز پھر گیا۔ اسی طرح تین چار

روز جاتا رہا۔ اختر صاحب نے میرا ادبی ذوق دیکھ کر کہا کہ تم ہمارے پاس کیوں نہیں آ جاتے۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ مجھے پچھلے کمرے میں یہ کہہ کر لے گئے کہ چلو تمہیں مولانا صاحب سے ملاتا ہوں۔ دفتر کے عقب میں چھوٹا کمرہ تھا جہاں مولانا تاجور نجیب آبادی تشریف فرما تھے۔ معلوم ہوا کہ اختر صاحب اس سے پہلے مولانا صاحب سے میرا ذکر کر چکے تھے۔ انہوں نے مولانا سے کہا۔

"مولانا صاحب! یہی وہ نوجوان ہے جس کا میں آپ سے ذکر کر رہا تھا۔ اسے ادب سے بڑا لگاؤ ہے۔ آپ کے زیر سایہ رہ کر اس کا ذوق مزید نکھر جائے گا۔"

مولانا کے معصوم چہرے پر ہلکا سا تبسم نمودار ہوا اور میری طرف دیکھ کر کہا۔

"ٹھیک ہے اسے کہو کام شروع کرے۔"

اور میں نے اسی دن سے کام شروع کر دیا۔ کام کیا تھا باہر سے جو افسانوں کے مسودے آتے تھے انہیں بڑی ترتیب سے ایک فائل میں لگا کر مولانا صاحب کی خدمت میں پیش کر دیتا تھا۔ وہیں شاعر راج بلدیو راج سے بھی ملاقات ہوئی جو بھاٹی دروازے سے آتا تھا اور رسالے میں اختر صاحب کا اسسٹنٹ تھا۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ راج بلدیو راج باہر سے آئے ہوئے ایک افسانے کا ایک ٹکڑا پڑھ کر مولانا کو سنا رہا تھا۔ میں بھی قریب ہی بیٹھا تھا۔ اس میں ایک جملہ آیا جس پر مولانا نے ٹوک کر کہا۔ "یہ اچھا نہیں لگتا یہاں کوئی برمحل جملہ ہونا چاہئے۔"

میرے ذہن میں ایک فقرہ آ گیا۔ میں نے فوراً بتا دیا۔ آج بھی وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ مولانا میرا جملہ سن کر بولے۔ "واہ! بلدیو راج! کاٹ کر یہ جملہ لکھ دو۔"

اس کے بعد مولانا مجھ پر پہلے سے زیادہ شفقت فرمانے لگے۔ وہ مجھے کہا کرتے کہ میاں تم افسانے لکھنا شروع کر دو ہم چھاپیں گے۔ مولانا صاحب کی زیر صدارت "شاہکار" میں کسی افسانے کا شائع ہونا بڑے اعزاز کی بات تھی۔ اس سے میری بے حد حوصلہ افزائی بھی ہوئی تھی۔ لیکن مجھے ان دنوں اپنی محبت کی ناکامیوں یا ناکام محبتوں ہی سے فرصت نہیں تھی یا شاید میرے شہد کے چھتے میں ابھی اتنا شہد تیار نہیں ہوا تھا کہ میں اسے مارکیٹ میں لا کر فروخت کر سکتا۔ یا شاید ابھی میرے امرتسری تنور کا

وہ تاؤ نہیں بنا تھا کہ اس میں سے بادامی رنگ کے خوشبودار کلچے باہر نکلتے۔ ابھی تک دو تاؤ کی کسر باقی تھی۔ ابھی کچھ اور صحرا میرے سامنے تھے جن کی مجھے خاک چھاننی تھی۔ ابھی کچھ اور اجنبی' خوبصورت چہرے مجھے ان دیکھے شہروں کی طرف بلا رہے تھے۔ ابھی کچھ اور گھنے جنگلوں کی تیز بارشوں میں بھیگنا تھا۔ سند باد جہازی کے ابھی کچھ اور سفر باقی تھے۔ ابھی کچھ اور راتیں دور دراز شہروں کے پرانے قلعوں کی سنسان راہ داریوں میں بیٹھ کر ان پراسرار شہزادیوں کا انتظار کرنا تھا جو خواب ایسی خوشبوؤں میں لپٹی اپنے ریشمی ملبوس کو سنبھالتی کبھی ان راہ داریوں سے گزرا کرتی تھیں لیکن جو اب ماضی کے تاریک اوراق میں گم ہو چکی تھیں۔ ابھی بڑی دربدری کرنی تھی۔ ابھی بڑے خواب دیکھنے تھے۔

ایک آواز مجھے صبح و شام بلایا کرتی تھی۔

سنو! سنو!
جنگل میں کوئی
گیت سہانے گاتا ہے
تیرا ساجن سانجھ سویرے
اپنے پاس بلاتا ہے

مولانا تاجور صاحب کی رہائش "شاہکار" کے آفس کے قریب ہی تھی۔ چوک فلیمنگ روڈ سے لاہور ہوٹل کی طرف جائیں تو جہاں بازار دو سڑکوں میں بٹ جاتا ہے وہیں دائیں جانب اندر کو ایک چوڑی سی گلی جاتی تھی۔ اس گلی میں ذرا آگے جا کر بائیں جانب مولانا صاحب کا کوٹھی نما مکان تھا۔ مکان کے آگے کشادہ صحن تھا ایک برآمدہ تھا۔

ایک روز شیر محمد اختر صاحب نے مجھے کچھ کاغذات دے کر مولانا صاحب کے گھر بھیجا کہ یہ انہیں دکھا لاؤ۔ میں ان کے مکان میں داخل ہوا تو مولانا صاحب برآمدے میں آرام کرسی پر تشریف فرما تھے۔ آگے ایک چھوٹی سی میز پر دو تین کتابیں اور ایک فائل پڑی تھی۔ ان کی بائیں جانب کرسی پر ایک کوٹ پتلون پہنے گندمی رنگت والے صاحب بیٹھے انہیں کوئی مسودہ پڑھ کر سنا رہے تھے۔ میں سلام کر کے ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ کوٹ پتلون والے صاحب گہرے انہماک سے مسودہ پڑھ رہے تھے کچھ دیر کے بعد مولانا صاحب نے اپنے مخصوص سرگوشی نما دھیمے لہجے میں کہا۔ "آپ نے بہت

اچھا ترجمہ کیا ہے۔ پھر بھی مسودہ میرے پاس چھوڑ جائیں میں ایک نظر دیکھ لوں گا۔"

وہ صاحب بڑے ممنون ہوئے۔ دونوں ہاتھوں سے مولانا صاحب کے گھٹنوں کو چھوا اور بڑے ادب سے سلام کر کے رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد مولانا مجھ سے فرمانے لگے۔

"یہ محمد ہادی تھے۔ آج کل آسام میں ڈپٹی کمشنر لگے ہیں۔ انہوں نے گوئٹے کی ایک کتاب کا ترجمہ کیا ہے وہ مجھے سنا رہے تھے بڑے محنتی ہیں۔"

میں جو کاغذات لایا تھا وہ ان کی خدمت میں پیش کئے۔ وہ انہیں دیکھتے بھی جاتے تھے اور ساتھ ساتھ دھیمی آواز میں کہتے بھی جاتے تھے۔

"تم بھی محنت کرنا، محنت سے کبھی جی نہ چرانا، محنت کرنے والے کو اللہ میاں ضرور کامیابی عطا فرماتا ہے......"

پاکستان بن جانے کے چھ سال بعد کراچی کے ایک اشاعتی ادارے نے محمد ہادی حسین صاحب کی وہ کتاب شائع کی جس کا مسودہ وہ مولانا تاجور صاحب کے پاس نظر ثانی کے لئے لائے تھے۔ یہ گوئٹے کے ناول The Sorrows of Young Worther (دی سارروز آف ینگ ورتھر) کا اردو ترجمہ تھا۔ جس کا نام ہادی حسین صاحب نے "دل ناداں" رکھا تھا۔ میں اس جرمن ناول کا انگریزی ترجمہ پڑھ چکا تھا۔ جب ہادی صاحب کا اردو ترجمہ پڑھا تو دوبارہ انگریزی ترجمہ پڑھنے کی کبھی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ ناول کے آخر میں خاص طور پر اوسین کی طویل نظم کا ترجمہ ہادی صاحب نے اسی جذباتی پیرائے میں کیا ہے جس کا نظم تقاضا کرتی تھی۔ کچھ عرصے بعد علامہ تاجور نجیب آبادی فلیمنگ روڈ والی گلی کے مکان سے نقل مکانی کر کے دیال سنگھ کالج کی لائبریری کی دوسری منزل پر آ کر رہنے لگے تھے۔ کبھی کبھی میں ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتا تھا۔ اسی شفقت اور محبت کا اظہار کرتے تھے۔ ایک روز کہنے لگے۔

"دیکھو تم نے محنت کی اور کامیاب ہو گئے بس محنت سے کبھی جی نہ چرانا۔"

مولانا تاجور صاحب بڑے بھولے بھالے اور معصوم انسان تھے۔ سیاست اور سیاست کے جوڑ توڑ بالکل نہیں جانتے تھے۔ کسی کو نقصان پہنچانے کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ ایسے لوگوں کو دنیا ہمیشہ نقصان پہنچاتی ہے لیکن تاجور صاحب نے اس بات کا

بھی کبھی کسی کے آگے گلہ نہ کیا اور ہمیشہ راضی بہ رضا رہے اور ادب کی خدمت کرتے رہے اور محنت اور خدمت کرتے ہوئے ایک روز اللہ کو پیارے ہو گئے۔

آؤ اس لحد کے کتبے پر
تاجور لاہوری رقم کر دیں
عروس ادب کی آنکھیں بلور کی ہیں
شفاف پتھریلی
تاجور میں اور عیب لاکھوں ہوں
بے وفا نہیں

☆.....☆.....☆

عبدالرحمان چغتائی سے ملاقات

لاہور کے آسمان نے داتا کی نگری میں ایسے ایسے باکمال فنکاروں، موسیقاروں اور دانشوروں کو گلی کوچوں اور بازاروں میں چلتے پھرتے دیکھا ہے کہ جن میں سے کسی ایک کا ثانی ملنا مشکل ہے۔ علماء کرام اور دانشوروں کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ یہاں میں لاہور کے کچھ عظیم فنکاروں اور موسیقاروں کا تذکرہ کرنا چاہوں گا۔ ان میں سے کچھ کو میں نے اپنی آنکھوں سے چلتے پھرتے باتیں کرتے دیکھا ہے۔ کچھ میری ہوش سے پہلے کے ہیں۔ ان کا ذکر میں ان کی زبانی آپ کو سناؤں گا۔ جو انہیں جانتے تھے اور ان کے فن سے بخوبی واقف تھے۔ ریڈیو پاکستان سے منسلک ہونے کی وجہ سے مجھے بعض نامور فنکاروں کو قریب سے دیکھنے اور ان کی باتیں سننے کا موقع ملا۔ سب سے پہلے میں لاہور بلکہ مشرق کے عظیم مصور عبدالرحمان چغتائی کا ذکر کروں گا۔ چغتائی صاحب کو پہلی بار میں نے غالباً 1949ء میں دیکھا یا ہوسکتا ہے اس سے ایک دو سال بعد دیکھا ہو۔ لیکن ان کے فن کی عظمت سے میں واقف تھا۔ وہ افسانے بھی لکھتے رہے تھے اور میں ان کے افسانے جہازی سائز کے رسالے ''ادبی دنیا'' میں امرتسر کی لائبریری میں بیٹھ کر پڑھا کرتا تھا مگر سب سے زیادہ متاثر میں ان کی تصویروں سے ہوا تھا۔ ان کی لکیر بڑی زندہ اور بولتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ وہ دیوان غالب کو مرقع چغتائی کے نام سے مصور کر چکے تھے۔ یہ بھی بڑے کمال کی تصویریں تھیں اور ہر تصویر میں غالب کے متعلقہ شعر کے موڈ کو پوری طرح قابو میں کیا گیا تھا۔ لاہور میں 1947ء میں آ کر جب میں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا تو میری شناسائی ادبی حلقوں سے ہوگئی۔ لاہور میں ناشرین کے دو بڑے مستند ادبی ادارے تھے۔ ایک مکتبہ اردو اور دوسرا نیا ادارہ۔ ان کے

علاوہ مکتبہ جدید بھی قائم ہو گیا تھا۔ مکتبہ اردو کی طرف سے ''ادب لطیف'' رسالہ نکلتا تھا اور نیا ادارہ کی طرف سے رسالہ ''سویرا'' شائع ہوتا تھا۔ نیا ادارہ کے مالک چودھری نذیر احمد طباعت اور شعروادب کا بڑا اعلیٰ اور معیاری ذوق رکھتے تھے۔ اپنی خوش مذاقی اور فراخدلی کے باعث ادیبوں کے ساتھ بھی ان کے تعلقات بڑے اچھے تھے۔ ہمارے ساتھ وہ اکثر لاہور کے گلی کوچوں میں گھومتے پھرتے اور چائے خانوں میں بیٹھ کر چائے بھی پیتے۔ ادیبوں سے ان کی دوستی تھی۔ وہ ان پبلشروں میں سے تھے جنہوں نے پاکستان میں اردو کی اعلیٰ ترین کتابیں چھاپیں اور اس فن کو آغاز ہی میں ایک معیاری راہ پر ڈالا۔ میرے افسانوں کی پہلی کتاب ''منزل منزل'' (بلکہ میری پہلی کتاب) چودھری نذیر صاحب نے ہی چھاپی۔ اس زمانے میں کتابیں لتھو پر چھپتی تھیں۔ مگر چودھری نذیر احمد کی لتھو پر چھاپی ہوئی ادبی کتابیں سارے ملک کے اہل ذوق سے داد وصول کرتی تھیں۔ آج اگر آپ چودھری صاحب کی لتھو پر چھپی ہوئی کتابیں دیکھیں تو وہ آف سیٹ پر چھپی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

چودھری صاحب کا ارادہ تھا کہ میری کتاب کا سرورق چغتائی صاحب سے بنوایا جائے مگر کچھ ایسا اتفاق ہو گیا کہ چغتائی صاحب کسی اہم کام میں بے حد مصروف تھے۔ میں ذکر چغتائی صاحب سے اپنی پہلی ملاقات کا کر رہا تھا۔ نیا ادارہ کے مالک چودھری نذیر مجھے ساتھ لے کر عبدالرحمان چغتائی صاحب کے گھر گئے۔ مجھے یاد ہے یہ گھر بھاٹی اور ٹیکسالی دروازے کے درمیان راوی روڈ پر میسی قبرستان کی ایک بغلی گلی میں تھا۔ چغتائی صاحب کے کمرے میں کتنے ہی کینوس ادھر ادھر پڑے تھے اور وہ کھرل میں کوئی رنگ پیس رہے تھے۔ بس اس سے آگے مجھے کچھ یاد نہیں رہا کہ چودھری نذیر احمد نے اس عظیم مصور سے کیا باتیں کیں اور انہوں نے کیا جواب دیا۔ چغتائی صاحب کی مونچھیں ہٹلر کی طرح تھیں اور چہرے کے خدوخال مضبوط تھے۔ واپسی پر چودھری صاحب نے مجھے بتایا کہ چغتائی بے حد محنت کرتے ہیں۔ محنت ہی سے کسی فن میں گہرائی آتی ہے۔ چودھری صاحب کی ادب اور فن پر اور زندگی کے بعض دوسرے حقائق پر اس قسم کی تجربہ کارانہ اور دانش مندی کی باتیں میرے لئے بڑی مشعل راہ ثابت ہوئیں اور اس کیلئے میں ان کا آج بھی ممنون احسان ہوں۔ بہرحال اس کے بعد چغتائی صاحب کو

میں اکثر دیکھتا، کبھی ''سویرا'' اور کبھی مکتبہ اردو کے دفتر میں اور کبھی کسی ادبی مجلس میں، وہ زیادہ باتیں نہیں کرتے تھے۔ اکثر انگریزی سوٹ میں ملبوس ہوتے اور ان کے سر پر قراقلی ٹوپی ہوتی تھی۔ چہرے پر دانشوروں ایسی متانت چھائی ہوتی۔

تاج الدین زریں رقم کی بیٹھک لوہاری کے اندر مٹی کے برتنوں کی ایک دکان کے اوپر ہوتی تھی۔ یہاں بھی میں چودھری نذیر کے ساتھ ہی گیا اور تاج الدین زریں رقم کے پہلی بار نیاز حاصل ہوئے۔ ایسے خوش نویس زمانہ بڑی دیر کے بعد پیدا کرتا ہے۔ اونچے لمبے خوش شکل بھرپور جوان، شگفتہ باتیں، بلند آہنگ آواز، فن میں یکتا، فن خوش نویسی کی تدریس اور اس فن کے نومشقوں کے واسطے اب ت کا قاعدہ لکھا جو آج بھی خوش نویس طلباء کی رہنمائی کرتا ہے۔ میں اس فن کی گہرائیوں سے واقف نہیں ہوں مگر لفظ کے حسن کا مجھ پر بے پناہ اثر ہوتا ہے۔ زریں رقم مسطر پر لفظوں کی صورت میں موتی پروتے تھے۔ خداداد صلاحیت کے مالک تھے۔ بڑی جلدی ہم سے جدا ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین۔

سید محمد یوسف سدیدی بھی ہم سے جدا ہو گئے۔ فلک نے ایسا خوش رقم بلکہ پاکیزہ رقم خوش نویس بھی کم دیکھا ہو گا۔ جیسا خوبصورت لکھتے تھے ویسے ہی خود بھی خوبصورت تھے۔ مجھے یاد ہے، شروع شروع میں جب امروز کو حسرت صاحب ایڈیٹ کیا کرتے تھے تو میں ایک روز یوسف صاحب کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ وہ پھٹے سے ٹیک لگائے اخبار کی کوئی بڑی سرخی لکھ رہے تھے۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''حافظ صاحب! آپ بڑے خوبصورت ہیں اور لکھتے بھی خوبصورت ہیں''۔

یوسف صاحب شرما گئے۔ بڑے کم گو اور شرمیلے تھے مگر کیا حسن اور بلاغت دی تھی اللہ نے ان کے قلم کو۔ ان کا قلم کاغذ پر یوں متوازن اور بھرپور چلا جاتا کہ محسوس ہوتا یوسف صاحب کے قلم سے روشنائی نہیں نکل رہی بلکہ پورے کا پورا لفظ اپنی حسین ترین مکمل صورت میں نکل کر کاغذ پر نقش ہوتا چلا جا رہا ہے۔ سعودی عرب میں کار کے ایک حادثے میں زخمی ہو کر جب وہ ہسپتال میں پڑے تو یہاں سبھی ان کی صحت یابی کیلئے اللہ تعالیٰ سے دعا گو تھے لیکن موت کا تو ایک وقت معین ہوتا ہے۔ اسے کون ٹال سکتا

ہے۔

گوجرانوالہ کے محمد حسین صاحب اپنے فن کے یکتائے زمانہ خوش نویس ہیں۔ مکتبہ اردو نیا ادارہ کے شعری مجموعوں کی تقریباً ساری کتابت انہی کے خط زرنگار کی مرہون منت ہے۔ میری پہلی کتاب ''منزل منزل'' کے دونوں الفاظ انہوں نے ہی لکھے تھے اور کیا زندہ جاوید الفاظ لکھ دیئے تھے کہ جو سرورق دیکھتا، دیکھتا ہی رہ جاتا۔ محمد حسین صاحب زیادہ تر نظم لکھتے اور سرخیاں۔ ان جیسا باکمال خوش نویس اب کہاں ملے گا۔ مجھے یاد ہے ہم ''سویرا'' کے دفتر میں بیٹھے تھے۔ یہ 49-1948ء کی بات ہو گی۔ محمد حسین صاحب بھی موجود تھے۔ چودھری نذیر صاحب نے انہیں میری کتاب کا عنوان لکھ کر دیا اور کہا۔ ''بس تم نے یہی دو لفظ لکھنے ہیں اور یہی اس کتاب کا سرورق ہو گا''۔ محمد حسین صاحب مسکرا رہے تھے۔ کاغذ پر لکھے ہوئے منزل منزل کے الفاظ پڑھ کر سر کو اثبات کے انداز میں ہلایا اور کہا۔

''گاؤں جا کر لکھوں گا''۔

شاید ہفتہ دس دن کے بعد وہ لاہور آئے تو مطلوبہ الفاظ لکھ کر ساتھ لائے تھے۔ منزل منزل کے کتابت شدہ الفاظ کاغذ پر بڑے سانس لیتے محسوس ہو رہے تھے۔ محمد شفیع خوش نویس تھا۔ مکتبہ اردو اور نیا ادارہ کی اکثر نثری کتابوں کی کتابت اسی نے کی ہوئی ہے۔ کس قدر بے مثال خوش نویس تھا۔ کس کس کا ذکر کروں۔ اس میدان میں ایک سے ایک بڑھ کر تھا۔ اب یہ فن بھی گوشہ نشین ہو گیا ہے۔ کیونکہ کتابیں کمپوز ہونے لگی ہیں۔ یہ کام اب مشینیں سرانجام دینے لگی ہیں۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ یہ نشیب و فراز آتے ہی رہتے ہیں۔ زمانہ آگے بڑھتا رہتا ہے۔ جس فن کی زمانے کو ضرورت ہوتی ہے وہ شکل بدل کر زمانے کے ساتھ وابستہ رہتا ہے۔

میں نے ریڈیو پاکستان سے اپنی وابستگی اور کچھ بے مثال فنکاروں کا ذکر شروع میں کیا تھا کہ جن کو قریب سے دیکھنے کا مجھے موقع ملا۔ کثیر تعداد ایسے فنکاروں کی تھی جن کا قافلہ میرے سفر شروع ہونے سے پہلے گزر چکا تھا۔ ان کا ذکر میں ان اساتذہ کے حوالے سے بیان کروں گا جو ان سے مل چکے تھے اور جوان فنکاروں کی فنی گہرائیوں سے بھی واقف تھے۔ بہتر ہو گا کہ پہلے میں گزرے ہوئے قافلے کے فنکاروں کا ذکر

کروں۔ محترم سراج نظامی لاہور کے جانے پہچانے ادیب' صحافی اور دانشور تھے۔ اپنے ایک مضمون میں لاہور کے کچھ نابغۂ روزگار فنکاروں کا تذکرہ انہوں نے بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ لاہور کے نامور کلاسیکل موسیقار استاد کالے خان کے بارے میں وہ لکھتے ہیں ''آپ پنجاب کے مردم خیز خطے قصور کے کاونت خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ استاد کالے خان کا رنگ بہت سیاہ تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی اور تن و توش پہلوانوں ایسا تھا۔ چہرے پر بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ انہیں کالے خاں کے نام سے پکارا جاتا۔ طبیعت عجیب پائی تھی۔ ہمیشہ کھوئے کھوئے سے رہتے تھے۔ عام لوگوں میں اس بات کا بڑا چرچا تھا کہ ایک مرتبہ اپنے استاد فتح علی خاں سے مل کر گانے لگے تو مقابلے پر اتر آئے۔ فتح علی نے شاگرد کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''جارے پگلے!'' بس اسی دن سے ان کی طبیعت میں ایک جنون کی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔

کالے خاں نے پنجاب اور ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور استادوں سے داد وصول کی۔ آپ خیال یا ترانہ گاتے اور تانیں مارتے تو یوں لگتا جیسے کوئی شیر دھاڑ رہا ہے۔ مجھے (محترم سراج نظامی) اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بار کالے خاں بھاٹی دروازہ گا رہے تھے۔ میں ان دنوں اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ میں پڑھتا تھا۔ مجھے ان کی تانیں بھاٹی گیٹ سکول کی گراؤنڈ میں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

کالے خان حویلی میاں خان کے سامنے کٹڑہ نادر شاہ میں رہا کرتے تھے۔

ایک دن کالے خاں نے خوب گھی اور مسالے ڈال کر گوشت بھونا اور دیگچی کو الماری میں رکھ کر تالا لگا دیا۔ اتفاق سے پولیس کسی چوری کی تفتیش کے سلسلے میں محلے میں آ گئی۔ انہوں نے جو دیکھا کہ ایک کوٹھڑی میں ایک کالا کلوٹا پہلوان لنگوٹ باندھے بیٹھا ہے تو انہوں نے شبہ میں ان کی کوٹھڑی کی بھی تلاشی لینی چاہی۔ کالے خاں اچھل کر کھڑے ہو گئے اور الماری کے ساتھ پشت لگا کر بولے۔ ''الماری کے سوا ہر جگہ کی تلاشی لے لو'۔

پولیس والوں کا شبہ یقین میں بدل گیا اور سپاہی الماری کی تلاشی لینے پر مصر ہوئے لیکن جب تلاشی لی گئی تو اس میں سے بھنے ہوئے گوشت والی دیگچی کے سوا اور کچھ نہ نکلا۔ پولیس والے ہنسنے لگے۔ کالے خان نے کہا۔

''اب یہ گوشت تم ہی لے جاؤ۔ میں نہیں کھاؤں گا۔ اسے نظر لگ گئی ہے''۔

کالے خاں کا معمول تھا کہ ہر روز گوشت بھونتے' تیل' صابن اور لنگوٹ ایک چھتری میں ڈالتے اور ٹکسالی دروازہ کے باہر کارپوریشن کے باغ میں پہنچ جاتے۔ چھتری زمین پر گاڑ دیتے لنگوٹ کستے' تیل ملتے اور پھر دونوں ہاتھوں کے نیچے دو اینٹیں رکھ کر ڈنڈ مارتے۔ ساتھ ساتھ تانیں بھی مارتے جاتے۔ کسرت کے بعد نہر میں نہاتے' گوشت کھاتے اور واپس چل پڑتے ایک مرتبہ اسی حالت میں آ رہے تھے کہ کسی نے انہیں اپنے پاس بٹھا لیا اور پردیپکی راگ سنانے کی فرمائش کی۔ کالے خاں کہنے لگے یہ کون سا راگ ہے؟ پھر چند سیکنڈ کے بعد کہا۔

''لو بھئی پردیپکی راگ آ گیا ہے۔''

پھر جو راگ شروع کیا تو ایک سماں بندھ گیا۔

ایک دفعہ لاہور کے ایک مشہور ڈیرہ دار نے موسیقی کی محفل منعقد کی اور کالے خان کو بھی گانے کی دعوت دی۔ قصور کے نامور سارنگی نواز استاد غلام محمد سے کالے خاں کی بول چال نہیں تھی۔ لوگوں نے خواہش کی کہ کالے خاں گائیں اور استاد غلام محمد سارنگی نواز ان کے ساتھ سنگت کریں۔ جن لوگوں نے یہ محفل دیکھی ہے اور کالے خاں کا گانا اور غلام محمد کی سارنگی سنی ہے وہ آج بھی سر دھنتے ہیں۔ دونوں فنکاروں نے اپنے فن کا پورا زور صرف کر دیا۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ دونوں فنکار رونے لگے اور روتے روتے ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔ یوں دونوں کی صلح ہو گئی۔

کالے خاں کی وفات سے چند روز پہلے کا واقعہ ہے کہ انہوں نے لکھنؤ میں گانا سنایا جہاں سے کافی انعام ملا۔ کالے خاں سیدھے دریائے گومتی پر پہنچے۔ پچاس روپے دریا میں پھینک کر کہا۔

''اے خواجہ خضر! یہ تیری نذر ہیں۔''

اس کے بعد لکھنؤ کے ایک بازار میں سیدھے اصغر علی محمد علی عطر فروشوں کی مشہور دکان پر پہنچے اور آدھی سے زیادہ رقم کا عطر خرید لیا۔ وہیں کھڑے کھڑے تھوڑا سا عطر اپنے کپڑوں پر لگایا اور باقی سارا عطر اپنی بڑی بڑی مونچھوں پر مل دیا۔ عطر والوں

نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''خان صاحب یہ کیا کیا آپ نے؟'' کالے خاں نے کہا۔

''بھیا! یہ کپڑے تو یہیں رہ جائیں گے۔ مونچھیں تو قبر میں بھی ساتھ جائیں گی۔''

اس کے کچھ روز بعد کالے خاں کا انتقال ہو گیا۔

محترم سراج نظامی صاحب پٹیالہ گھرانے کے نامور موسیقار استاد عاشق علی خاں کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ''عاشق علی خان پٹیالے کے مشہور موسیقار فتح علی خاں کے بیٹے تھے۔ ابھی چھوٹے ہی تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور لاہور چلے آئے۔ یہاں کسمپرسی کے عالم میں رہنے لگے۔ انہوں نے اپنے ماموں سے گانے کی تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی اور دیکھتے ہی دیکھتے عاشق علی خاں اپنے زمانے کے نامور گویے بن گئے۔ ہندوستان میں جس طرف گئے اپنے فن کا لوہا منوایا۔ ایک مرتبہ کلکتے میں ایک میوزک کانفرنس میں طلبلہ نواز احمد جان تھرکوا نے سنگت کرنے سے پہلے پوچھا! کون سا تال بجاؤں''۔ عاشق علی خاں نے کہا جونسا آپ کا جی چاہے۔ پھر جو گانا شروع کیا۔ تانیں اڑائی اور گر پکڑنا شروع کیا تو سامعین کا یہ حال تھا کہ کرسیوں سے اچھل اچھل پڑتے تھے۔ طبیعت میں لاابالی پن اور وارفتگی تھی۔ اس زمانے میں لاکھوں روپے کمائے مگر ایک کوڑی بھی نہ بچائی۔ شادی ساری عمر نہیں کی۔ اللہ توکل رہتے تھے جو ملا صبر شکر کر کے کھا لیتے۔ جہاں سے گانے کے روپے ملتے وہیں مستحق لوگوں میں بانٹ کر دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوتے۔ خوش لباس تھے۔ انگریزی سوٹ بڑے شوق سے پہنتے تھے۔ ان کے شاگرد حسن لطیف کا بیان ہے کہ ایک بار گھر سے گرم انگریزی سوٹ پہن کر نکلے۔ تھوڑی دیر بعد واپس اس حالت میں گھر میں داخل ہوئے کہ جسم پر صرف جانگیہ ہی تھا۔ حسن لطیف نے پوچھا خان صاحب سوٹ کہاں چلا گیا۔ عاشق علی خان نے کہا۔

''سڑک پر ایک ننگا فقیر سردی میں ٹھٹھر رہا تھا اسے دے دیا ہے۔''

اتنا بڑا گویا ہونے کے باوجود عاشق علی خاں میں غرور نام کو نہ تھا۔ بچوں کی طرح بھولی بھالی باتیں کیا کرتے تھے۔ میں نے (صاحب مضمون) عاشق علی خاں کو صرف ایک بار ہی دیکھا ہے۔ دبلے پتلے' گہرا سانولا رنگ' سر پر قراقلی کی ٹوپی' سفید شارک سکن کا سوٹ' کالے بوٹ' سر کو کسی دھن میں ادھر ادھر ہلاتے ایک بازار میں

سے نکل کر گلی میں داخل ہو رہے تھے۔

محترم سراج نظامی صاحب استاد عبدالوحید خاں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ قصبہ کیرانہ کے باشندے تھے۔ ان کا گھرانہ موسیقی کا بڑا گھرانہ تھا۔ جن میں بندے علی خاں بین کار اور عبدالکریم خاں ایسے مشہور موسیقار ہو گزرے ہیں۔ آپ موسیقی کے استاد تھے۔ کانوں سے تھوڑے بہرے تھے جس کی وجہ سے انہیں بہرے خاں بھی کہا جاتا تھا۔ استادی کا یہ عالم تھا کہ جب کبھی ان کی بات ہوتی تو لوگ کان پکڑ لیتے اور کہتے ''ہاں! وہ بہرا'' انہوں نے بڑی بڑی ریاستوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور داد پائی۔ حقیقت یہ ہے کہ جتنا صحیح راگ وہ گاتے تھے اور کوئی نہ گاتا تھا۔ خود کہا کرتے تھے کہ میرے بعد صرف اللہ دتہ کی موسیقی کا ہی لطف آ سکتا ہے۔ خان صاحب عبدالوحید خان لاہور میں مقیم ہو گئے تھے کیونکہ وہ ایک بزرگ نفیر عالم صاحب کے مرید ہو گئے تھے۔ مرشد کے جیتے جی ان کا مزار باغبانپورہ کے قریب بنوا دیا تھا۔ جب ان کا انتقال ہوا تو انہیں وہیں دفن کیا اور پھر اپنے وطن چلے گئے۔

خان صاحب عبدالوحید خاں بمبئی میں کافی عرصہ رہے اور وہاں بھی اپنی مہارت کا سکہ جمایا آل انڈیا ریڈیو کے مختلف اسٹیشنوں سے کلاسیکی موسیقی نشر کی۔ خاں صاحب کا دستور تھا کہ جب گانے لگتے تو ''یا اللہ'' کے الاپ سے راگ شروع کرتے۔ آل انڈیا ریڈیو والوں نے اعتراض بھی کیا مگر انہوں نے اپنی عادت نہ بدلی اور ہر راگ ''یا اللہ'' کے الاپ سے ہی شروع کرتے رہے۔ ان کے شاگردوں میں فیروز نظامی' بھائی لال' وحیدہ خانم اور اختری بائی فیض آبادی بہت مشہور ہیں۔

خواجہ خورشید انور لاہور کے شہرہ آفاق بیرسٹر خواجہ فیروزالدین کے صاحبزادے تھے۔ ان کا شمار شوقیہ موسیقاروں میں ہوتا تھا۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیم پائی اور ایم اے کی ڈگری لی۔ بچپن ہی سے موسیقی سے لگاؤ تھا۔ کالج کی زندگی میں ہی گانے لگے تھے۔ پھر بمبئی چلے گئے۔ جہاں کئی فلموں کی کامیاب موسیقی دی۔ پاکستان بننے کے بعد لاہور آ گئے اور یہاں فلم کڑمائی' جھومر' انتظار اور کوئل کی موسیقی دی۔ جن کے گانے بے حد مقبول ہوئے۔ ان کا ایک مخصوص رنگ تھا جس کی وجہ سے وہ فوراً پہچان لیے جاتے تھے۔

حیدر بخش فلو سے خاں کے تذکرے میں سراج نظامی لکھتے ہیں کہ یہ بھی خطہ قصور کے مطربوں سے تعلق رکھتے تھے اور نہایت ماہر سارنگی نواز تھے۔ انہوں نے کچھ عرصہ گراموفون کمپنیوں اور تھیٹروں میں بھی اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ پھر عنایت بائی ڈھیرو والی کے ساتھ سنگت کرنے لگے۔ فلموں میں بھی سارنگی بجائی۔ آخر میں ریڈیو پاکستان لاہور سے منسلک ہوگئے۔ بے حد شریف، کم زبان اور مرنجاں مرنج انسان تھے۔ سانولا رنگ، کیم شیم جسم، دراز قد، موٹے موٹے نقش، ململ کا کھلی آستین والا کرتہ، بچے سفید تہمد، ہاتھ میں بٹیر، خراماں خراماں چلتے اور پھونک پھونک کر قدم رکھتے تھے۔ اچھے خاصے پہلوان معلوم ہوتے تھے۔ کوئی ناواقف ان کو دیکھ کر یہ خیال بھی نہیں کرسکتا تھا کہ یہ موسیقی سے تعلق رکھتے ہیں۔ کھاتے بھی بہت تھے۔ ان کی بسیار خوری کے متعلق ایک لطیفہ مشہور ہے۔ موری دروازے کے باہر چنگڑ محلے میں ایک ہندو ہوٹل تھا۔ ہوٹل والوں کی شامت آئی کہ انہوں نے ہوٹل کے باہر لکھ کر لگا دیا۔ ''سالن لیجئے چپاتیاں مفت۔''

ایک دن استاد فلو سے خان وہاں جا پہنچے۔ دو تین قسم کے سالن کا آرڈر دیا اور کھانے بیٹھ گئے۔ چپاتیاں آنے لگیں دو، چار، آٹھ، دس ہوٹل کا بیرا جب بھی پوچھتا کہ اور لاؤں تو وہ کہتے ہاں بھائی لیتے آؤ۔ ہوٹل والے اپنے اعلان کی وجہ سے مجبور تھے۔ روٹیاں دیتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ گندھا ہوا آٹا ختم ہوگیا اور ہوٹل والے استاد کے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوگئے۔ چند روز کے بعد استاد فلو سے خاں کی طبیعت نے پھر جوش مارا اور پھر اسی ہوٹل میں جا دھمکے لیکن سخت مایوس ہوئے کیونکہ ہوٹل والوں نے چپاتیاں مفت والا بورڈ اتار کر پھینک دیا تھا۔

اس تن و توش کے باوجود استاد فلو سے خان بڑے نازک مزاج تھے۔ ایک دفعہ بیمار پڑ گئے۔ بیوی نے ڈاکٹر سے مشورہ کرنے کو کہا۔ رضا مرزا کا مطلب پاس ہی تھا مگر استاد فلو سے خان کو وہاں جانے کا حوصلہ نہ ہوا۔ کہا کہ ڈاکٹر صاحب کو یہیں بلا لو۔ ڈاکٹر صاحب آ گئے۔ انہوں نے استاد کا اچھی طرح سے معائنہ کرنے کے بعد ٹیکہ تجویز کیا۔ استاد بہت گھبرائے لجاجت سے کہا۔

''ڈاکٹر صاحب کوئی اور دوائی تجویز کر دیں۔''

ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔

''ٹیکے میں کیا قباحت ہے؟ جلدی اچھے ہو جائیں گے۔''

استاد فلو سے خان نے عاجزی سے کہا۔

''ڈاکٹر صاحب مجھے ٹیکہ نہ لگائیں میں مر جاؤں گا۔''

ڈاکٹر نے سُنی ان سنی کرتے ہوئے ٹیکے کا سامان نکالنا شروع کر دیا۔ استاد نے نہایت حسرت بھری نظروں سے بیوی کی طرف دیکھا اور کہا۔

''کیا مجھے اپنے سامنے ہی مروا دو گی۔''

لاہور ریڈیو والوں نے ایک بار ان سے انٹرویو لیا اور پوچھا۔

''استاد جی! آپ کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟''

استاد نے برجستہ جواب دیا۔

''میں تو یہ چاہتا ہوں جی کہ اللہ دے اور بندہ کھائے۔''

بابا علی بخش نے سارنگی نوازی کے رموز اپنے بزرگوں سے حاصل کیے۔ نوجوانی میں لاہور چلے آئے۔ کوچہ لٹھ ماراں اندرون موچی دروازہ میں رہائش اختیار کی۔ سانولا رنگ، دراز قامت، تیز نقش، ڈاڑھی مہندی سے رنگی ہوئی ہوتی۔ بڑے بڑے استادوں کے ساتھ سنگت کی۔ صوم وصلوٰۃ کے بڑے پابند تھے۔ زیارات عراق وعرب، نجف اشرف اور کربلائے معلیٰ سے مشرف ہونے کے بعد صرف مجالس میں سوز خوانی کرتے تھے۔ قیام پاکستان سے پہلے ایک سو پانچ برس کی عمر پا کر انتقال کیا اور قبرستان مومن پورہ لاہور میں مدفون ہوئے۔

استاد بڈھے خان کا تعلق بھی قصور کے خاندان سے تھا۔ لاہور کے موچی دروازے کے اندر رہتے تھے۔ دہلی والے کالے خان کے شاگرد تھے۔ اپنے فن کے ماہر تھے۔ بڑے وضعدار اور بامذاق تھے۔ لاہور کے رئیسوں میں ان کی بڑی عزت ومنزلت تھی۔ بے حد خوش عقیدہ تھے۔ محرم کا چاند دیکھتے ہی جوتی اور پگڑی اتار دیتے اور امام حسین کے سوئم کے بعد پھر پہنتے۔ نویں محرم کو ہر سال بڑی باقاعدگی سے نیاز دیتے۔ ان کا انتقال 1941ء میں ہوا اور قبرستان میانی صاحب میں مدفون ہوئے۔

سراج نظامی صاحب آگے چل کر ایک قوال کا ذکر یوں کرتے ہیں۔ علی بخش خان لاہور کے بڑے پرانے قوالوں میں سے تھے۔ سانولا رنگ بھاری جسم، ساری عمر

داتا گنج بخش کے مزار پر قوالی کرتے رہے۔ اردو، فارسی، پنجابی کلام بڑی خوش اسلوبی اور صحت سے سناتے تھے۔ قوالی کے ساتھ طبورہ یا ستار بجاتے تھے۔ طبیعت بڑی شگفتہ تھی۔ بذلہ سنجی میں بے مثال تھے۔ ایک مرتبہ قلعہ گوجر سنگھ کی ایک محفل میں قوالی کرنے گئے۔ وہاں ایک جعلی پیر صاحب جو بورے والا کے قصاب تھے پہلے سے بیٹھے تھے۔ علی بخش خان نے قوالی شروع کی تو جعلی پیر نے دائیں بائیں اپنے مریدوں پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر حال کھیلنا شروع کر دیا۔ علی بخش خان اپنے معمول کے مطابق قوالی کرتا رہا۔ اچانک جعلی پیر نے کڑک کر پوچھا؟ کیا ہو رہا ہے۔

علی بخش خان نے کہا۔

"قوالی ہو رہی ہے۔"

جعلی پیر نے پوچھا۔

"تم کون ہو؟"

علی بخش نے جواب دیا۔

"داتا کا قوال ہوں۔"

جعلی پیر نے کڑک کر پوچھا۔

"میں کون ہوں؟"

علی بخش نے برجستہ جواب دیا۔

"بورے والا کا قصائی۔"

یہ سنتے ہی پیر صاحب کا حال اتر گیا اور محفل کشت زعفران بن گئی۔ ماسٹر صادق علی بفضل تعالیٰ حیات ہیں اور ملک کے سب سے زیادہ ذہین اور مشاق پیانو نواز ہیں۔ محترم سراج نظامی نے بھی ان پر کچھ سطریں لکھی ہیں اور میں بھی ماسٹر صاحب کو بخوبی جانتا ہوں۔ وہ بھی مجھے عزیز رکھتے ہیں۔ میں ریڈیو کی کینٹین پر جاؤں اور ماسٹر صاحب وہاں موجود ہوں تو میری ذرا سی آواز پر پہچان جاتے ہیں اور بے اختیار پکار اٹھتے ہیں۔

"حمید صاحب آئے ہیں۔"

ماسٹر صادق نابینا ہیں مگر قدرت نے بلا کا حافظہ دیا ہے۔ میاں امام الدین

ڈھونکل والے کے صاحبزادے ہیں۔ پہلے طبلہ نواز تھے اور اس میں بھی بڑی مہارت پیدا کی۔ اب پیانو اور اکارڈین بجاتے ہیں۔ سروں پر انگلیاں بڑی روانی سے چلتی ہیں۔ بڑے رسیلے اور سریلے ہیں۔ خدا خوفی اور دل گدازی طبیعت میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ طبیعت میں شگفتگی بھی بہت ہے۔ اپنے دوستوں سے بڑی محبت کے ساتھ ملتے ہیں۔ ان کے اخلاق کی ہر کوئی تعریف کرتا ہے۔

لاہور کا کون ایسا شخص ہوگا جو ماسٹر سونی کے نام سے واقف نہ ہوگا۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے جب برات کے ساتھ باجے کا رواج تھا تو تقریباً ہر دوسری بارات میں ماسٹر سونی کا بینڈ ہوتا تھا۔ ماسٹر سونی کو میں نے بھی دیکھا ہے اور انہیں سنا بھی ہے۔ بقول سراج نظامی ماسٹر سونی لاہور میں ہی پیدا ہوئے۔ دس برس کی عمر میں اللہ دتا نقارچی کی شاگردی اختیار کی۔ ان سے لے اور تال کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے بھائی محمد دین سے کلارنٹ سیکھی۔ پھر میاں علم دین اور توکل خان سے استادی موسیقی کی تعلیم حاصل کی اور ہز ماسٹرز وائس گراموفون کمپنی میں ملازم ہو گئے۔ اس کے علاوہ انہوں نے لاہور میں تیار ہونے والی کئی فلموں میں کلارنٹ بجائی۔ کئی کانفرنسوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور داد حاصل کی۔ لاہور میں آپ کا براس بینڈ مشہور ہے۔ جب آپ کوئی فلمی دھن بجاتے ہوئے کلاسیکل موسیقی کی تانیں بکھیرتے ہیں تو لوگوں کے سر ہل جاتے ہیں۔ کلارنٹ نوازی میں امرتسر کے عالمگیر صاحب کا بھی کوئی جواب نہیں تھا۔ قیام پاکستان کے بعد عالمگیر لاہور آ گئے تھے۔ میں نے بچپن اور لڑکپن میں عالمگیر کو امرتسر میں برات کے ساتھ کلارنٹ بجاتے اور لوگوں کو داد دیتے سنا ہے۔ انہیں سن کر بقول سراج نظامی دل پر وجد طاری ہو جاتا۔ کلارنٹ میں پکے راگ اس خوش اسلوبی سے بجاتے کہ لگتا کہ کوئی استاد گویا گا رہا ہے۔ اس وقت لاہور میں ماسٹر صادق علی مانڈو پاکستان کے صف اول کے فنکار ہیں۔ ایک مدت سے مانڈو صاحب ریڈیو پاکستان لاہور سے وابستہ ہیں۔ اگرچہ سرکاری نوکری سے ریٹائرڈ ہو گئے ہیں مگر ریڈیو کی طرف سے انہیں کنٹریکٹ مل جاتا ہے جس کی وجہ سے ان بزرگ فنکاروں کا چہرہ ریڈیو اسٹیشن پر دکھائی دے جاتا ہے۔ یہ بھی غنیمت ہے۔ مانڈو صاحب عمر رسیدہ ہو گئے ہیں مگر طبیعت میں بلا کی شوخی اور شگفتگی ہے۔ موقع محل کے مطابق بڑی خوب صورت بات کر

جاتے ہیں۔ ایک بار لاہور ریڈیو اسٹیشن پر کوئی میوزک کانفرنس ہونے والی تھی۔ سٹیشن ڈائریکٹر بڑی پریشانی کے عالم میں تھے۔ مانڈو صاحب کے پاس فنکاروں کو جمع کرنے کی ذمہ داری تھی۔ اسٹیشن ڈائریکٹران کے پاس آئے اور پوچھا۔

''مانڈو جی! ملکہ موسیقی آ گئی ہیں کیا؟''

مانڈو صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا۔

''ملکہ موسیقی بھی آ گئی ہیں۔ ملکہ غزل بھی آ گئی ہیں۔ ملکہ ترنم نور جہاں بھی آ گئی ہیں۔ بس اب صرف ملکہ الزبتھ کا انتظار ہے۔''

☆......☆......☆

سعادت حسن منٹو کی یادیں

سعادت حسن منٹو اردو ادب کا عظیم افسانہ نگار ہے۔ قیام پاکستان کے کچھ عرصے بعد منٹو بمبئی سے ہجرت کر کے لاہور آ گئے تھے۔ مجھے ان کی صحبت میں بیٹھنے کا اکثر و بیشتر موقع ملتا رہا۔ منٹو بہت کم کسی کو افسانہ نگار مانتے تھے لیکن مجھے وہ افسانہ نگار کہتے تھے۔ چنانچہ جب انہوں نے محمد حسن عسکری کے ساتھ مل کر ادبی رسالے ''اردو ادب'' کی ادارت سنبھالی تو مجھے خاص طور پر کہا تھا کہ میں اپنا کوئی تازہ افسانہ چودھری بشیر احمد کو پہنچا دوں۔ یہ میرے لئے بڑا اعزاز تھا کہ منٹو صاحب نے خود مجھ سے افسانے کے بارے میں کہا تھا۔ میں نے منٹو صاحب کو قیام پاکستان کے بعد ہر موڈ میں دیکھا اور ان کے آخری ایام کے نشیب و فراز کا بھی گواہ ہوں۔ اس وجہ سے میں اپنے کالم میں اکثر ان کی شخصیت کے بارے میں لکھتا رہتا ہوں۔

مجھے قارئین کرام کے وقتاً فوقتاً ایسے خطوط ملتے رہتے ہیں جن میں انہوں نے منٹو کی شخصیت اور فن کے بارے میں مجھ سے بہت کچھ پوچھا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے لوگ اردو کے اور خاص طور پر پاکستان کے اس عظیم افسانہ نگار کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتے ہیں۔ ان قارئین میں ایسے حضرات بھی ہوتے ہیں جو منٹو کی شخصیت اور اس کے فن پر تحقیقی کام کر رہے ہیں۔ بات یہ ہے کہ مجھ میں اتنی قابلیت نہیں ہے کہ میں منٹو کے فن کے بارے میں کوئی حکم لگا سکوں۔ جہاں تک منٹو صاحب کی شخصیت کا تعلق ہے میں اتنا ہی عرض کروں گا کہ وہ مجھ سے سینئر رائٹر تھے اور جب میں نے لکھنا شروع کیا تو منٹو برصغیر پاک و ہند کے صف اول کے افسانہ نگار کا مقام حاصل کر چکے تھے۔ وہ مجھ سے عمر میں بھی بڑے تھے اور میری ان سے ملاقات بھی اس وقت ہوئی

جب وہ اپنی زندگی کے آخری دور میں سے گزر رہے تھے اور پھر میں ان کا دوست بھی نہیں تھا۔ یہ منٹو صاحب کی شفقت تھی کہ وہ مجھے اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ چنانچہ مجھے منٹو صاحب کو ہر رنگ اور ہر موڈ میں دیکھنے کا موقع ملتا رہتا تھا۔ اس کے باوجود میں منٹو صاحب سے دوستی اور ان کی شخصیت پر حرف آخر کہنے کا خود کو مجاز نہیں سمجھتا۔

سعادت حسن منٹو کے فن اور ان کی شخصیت پر کچھ کتابیں ضرور شائع ہوئی ہیں۔ ان میں صرف ابوسعید قریشی کی منٹو پر لکھی گئی کتاب کو میں مستند سمجھتا ہوں کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ ابوسعید قریشی، منٹو صاحب کے قریبی دوست تھے۔ اس کے باوجود ابو سعید قریشی صاحب کی کتاب منٹو کی شخصیت اور اس کے فن کا پوری طرح احاطہ کرتی دکھائی نہیں دیتی۔ باقی کتابیں ایسے اصحاب نے لکھی ہیں جو نہ تو منٹو کے قریب رہے تھے اور نہ ان سے دوستی کا ہی دعویٰ کر سکتے ہیں۔ یہ بڑی خوش قسمتی کی بات ہے کہ سعادت حسن منٹو کے فن اور اس کی شخصیت پر ایک ایسے شخص نے ترنگ میں آ کر ایک مضمون لکھ ڈالا جس کے بارے میں منٹو صاحب نے اپنے خط میں خود لکھا ہے کہ حسن عباس تم ایک ہی میرے دوست اور میرے راز دار ہو۔ مجھے لڑکپن سے لے کر اب تک اندر باہر سے جانتے ہو۔ تم سے میری کوئی بات چھپی ہوئی نہیں ہے۔

منٹو کے اس رازدار اور قریبی دوست کا نام حسن عباس تھا۔ اب میں اپنے لڑکپن کے زمانے میں جاتا ہوں۔ حسن عباس امرتسر کے ایک صاحب ثروت کشمیری گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ ہمارے محلے میں ہی ایک پکی گلی ہوا کرتی تھی۔ حسن عباس کا مکان اس گلی میں تھا۔ اس گلی کو کوچہ حقاقاں بھی کہا جاتا تھا۔ حسن عباس کا چھوٹا بھائی حامد حسن میرا کلاس فیلو تھا۔ میں ان دنوں شاید ساتویں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ دونوں بھائی سرخ و سپید اور بڑے خوبصورت تھے۔ حامد حسن زیادہ خوبصورت تھا۔ میں اکثر حامد حسن کے گھر جایا کرتا تھا۔ وہاں مجھے کئی بار حسن عباس کو دیکھنے کا موقع ملا۔ درمیانہ قد، متناسب جسم، بوسکی کی قمیض اور سفید لٹھے کی شلوار۔ سردیوں میں کشمیرے کا گرم کوٹ پہنا ہوتا اور کبھی کبھی کوٹ کی بجائے کشمیری شال کی جسے ہم لوگ فرد کہا کرتے تھے بکل ماری ہوتی۔ گورے چہرے پر خون کی سرخی جھلکتی رہتی تھی۔ حامد حسن کا کہنا ہے اور خود منٹو صاحب نے بھی ایک مضمون میں ذکر کیا ہے کہ وہ حسن عباس سے ملنے اس

کے گھر جاتے تھے اور کبھی گلی میں ہی حسن عباس کو بلا لیتے تھے کیونکہ حسن عباس کے والد صاحب اس کا منٹو صاحب سے ملنا پسند نہیں کرتے تھے۔

سعادت حسن منٹو کا مکان ہمارے ساتھ والے محلے میں تھا۔ بیچ میں صرف ہال بازار آتا تھا۔ جس گلی میں منٹو کا مکان تھا اس کا نام کوچہ وکیلاں تھا اور یہ تنگ اور نیم روشن گلی منٹو کے مکان پر جا کر بند ہو جاتی تھی۔ منٹو صاحب کے سامنے والا مکان معروف شاعر اور نقاد عارف عبدالمتین کا تھا جس سے میری اور احمد راہی کی بڑی دوستی تھی اور ہم اکثر عارف عبدالمتین سے ملنے اس کے مکان پر جایا کرتے تھے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب منٹو صاحب امرتسر چھوڑ کر بمبئی جا چکے تھے۔ ہال بازار امرتسر کے جس شیراز ہوٹل میں منٹو اور باری علیگ بیٹھا کرتے تھے۔ وہ ہوٹل بھی تقریباً اجڑ چکا تھا۔

میں نے ابھی لکھنا لکھانا شروع نہیں کیا تھا لیکن میرے سارے دوستوں کا تعلق شعر و ادب سے تھا۔ جن میں سیف الدین سیف، ظہیر کاشمیری، احمد راہی اور عارف عبدالمتین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ہمارے محلے کی ایک تنگ سی گلی میں ایک کامریڈ ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ ہم اس ہوٹل میں بیٹھا کرتے تھے۔ ہم سعادت حسن منٹو کے افسانے بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ ادبی دنیا اور ادب لطیف میں حسن عباس کا کوئی افسانہ بھی دیکھنے میں آ جاتا تھا۔ حسن عباس بھی بہت اچھا لکھتا تھا۔ یہ پاکستان بننے سے کچھ سال پہلے کی بات ہے۔ میرا لاہور میں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ہمارے کچھ رشتے دار بھی لاہور میں رہتے تھے اور میری بڑی ہمشیرہ بھی لاہور میں ہی آباد تھی۔ دوسری بات یہ تھی کہ مجھے لاہور سے محبت تھی۔ جب بھی گھر سے نکلتے یا بمبئی بھاگنے لگتا تو سب سے پہلے لاہور بڑی آپا کے ہاں جاتا اور اسے کہہ دیتا کہ والد صاحب نے کل پھر مجھے سکول سے بھاگنے کی وجہ سے پیٹا ہے اس لئے اب میں ایک بار پھر گھر سے بھاگ رہا ہوں اور میں لاہور ہی سے کبھی فرنٹیئر میل اور کبھی ہوڑہ ایکسپریس میں بیٹھ کر بمبئی یا کلکتے کی طرف روانہ ہو جاتا۔ کبھی کبھی میں، احمد راہی اور سیف صاحب اکٹھے ہی لاہور آتے۔ ان دنوں موچی دروازے کے باہر جو گھاٹی گوالمنڈی کی طرف اترتی ہے وہاں شروع میں ہی منزل ہوٹل کے نام سے ایک ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ ایک بار سیف صاحب مجھے اپنے ساتھ

منزل ہوٹل لے گئے۔ وہاں منٹو صاحب سے تو ملاقات نہ ہو سکی لیکن باری علیگ صاحب اور حسن عباس صاحب وہاں موجود تھے۔ میں دنیائے ادب میں ابھی گمنام تھا مگر سیف الدین اپنی شاعری کی وجہ سے کافی مشہور ہو چکے تھے۔ حسن عباس کو میں نے فوراً پہچان لیا۔ وہ کونے والی میز پر بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ شاید سیف صاحب نے ان سے پوچھا کہ عباس صاحب کیا لکھ رہے ہیں۔ حسن عباس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ایک افسانہ تھوڑا سا رہ گیا ہے۔ اسے ختم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

اس کے بعد درمیان میں کئی سالوں کا وقفہ آ گیا اور حسن عباس سے میری ملاقات نہ ہو سکی۔ پاکستان بن گیا۔ میں نے کہانیاں لکھنی شروع کر دیں۔ لوگ مجھے جاننے پہچاننے لگے۔ لاہور میں نوائے وقت والی بلڈنگ کے پہلو میں ایک بلڈنگ ہے۔ وہاں سیارہ ڈائجسٹ کا دفتر ہوتا تھا۔ مقبول جہانگیر اس رسالے کے ایڈیٹر تھے۔ میری ان سے دوستی تھی اور میں ان سے ملنے سیارہ ڈائجسٹ کے دفتر جایا کرتا تھا۔ مقبول جہانگیر خود بھی بہت اچھا لکھتا تھا اور اس کا اسلوب نگارش مجھے بے حد پسند تھا۔ مقبول جہانگیر کے کمرے میں ہی مجھے نواب مشتاق احمد خان اور شارح غالب' شعر و ادب کے مشہور محقق ابو نعیم مولانا عبدالحکیم خان نشتر جالندھری سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا۔ نشتر جالندھری صاحب کی "روح غالب" مرزا غالب کی شرحوں میں ایک ممتاز اور مستند مقام کی حامل ہے۔ "سیارہ ڈائجسٹ" کے بڑے ہال کمرے میں پارٹیشنیں کر کے چھوٹے چھوٹے کمرے بنا دیئے گئے تھے۔

ایک روز میں مقبول جہانگیر سے ملنے اس کے دفتر گیا تو مقبول جہانگیر کے کمرے سے جو پہلا چھوٹا سا کمرہ تھا اس کا دروازہ کھلا تھا۔ میری نظر اندر پڑ گئی۔ میں وہیں حیرت زدہ سا ہو کر رک گیا۔ پارٹیشن والے اس چھوٹے سے کمرے میں، میں نے حسن عباس کو دیکھا کہ میز پر سر جھکائے کچھ لکھ رہا ہے۔ میں نے مقبول جہانگیر کے پاس آتے ہی اس سے پوچھا۔

"یہ تمہارے ساتھ والے کمرے میں کون بیٹھا لکھ رہا ہے۔"

میں نے حسن عباس کو پہلی نظر میں ہی پہچان لیا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ مقبول

جہانگیر کو کہاں علم ہو گا کہ حسن عباس کون ہے۔ مقبول جہانگیر اپنے مخصوص لہجے میں مسکراتے ہوئے بولا۔ "بھائی یہ ایک صاحب ہیں۔ یہاں کام کی تلاش میں آئے تھے۔ کہہ رہے تھے کوئی ترجمے کا کام ہو تو میں حاضر ہوں۔ آدمی مجھے معقول لگا۔ میں نے ایک مضمون ترجمے کے لئے دے دیا۔ انہوں نے بیٹھے بیٹھے ترجمہ کر دیا اور بڑی خوبصورت اردو زبان میں ترجمہ کیا۔ پیسے لے کر چلے گئے۔ دوسرے تیسرے روز پھر آئے۔ میں نے انہیں ایک اور مضمون ترجمہ کرنے کے لئے دے دیا۔ بھائی یہ تو بڑے ادبی انداز میں انگریزی کہانیوں اور مضامین کا ترجمہ کرتا ہے۔ ان ذات شریف کا نام حسن عباس ہے۔"

میں نے اسے کہا۔ "خدا کا نام لو مقبول جہانگیر۔ جو آدمی ہیرے تراشنے کے فن میں ماہر ہے اس سے لکڑیاں کٹوانے کا کام کیوں لے رہے ہو؟"

وہ میرا منہ تکنے لگا۔ جب میں نے اسے حسن عباس کے بارے میں تفصیل سے بتایا تو حیرت سے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ میں نے کہا۔

"حسن عباس سے کوئی کام لینا ہے تو اس سے سعادت حسن منٹو کے بارے میں کچھ لکھواؤ۔ یہ منٹو کے بارے میں جو کچھ لکھے گا وہ منٹو کے فن اور شخصیت کے متعلق حرف آخر ہو گا۔"

اس کے بعد میں اور مقبول جہانگیر اٹھ کر ساتھ والے کمرے میں گئے۔ حسن عباس نے مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ اٹھ کر مجھے گلے لگا لیا۔ ایک طویل مدت کے بعد اس نے مجھے دیکھا تھا۔ کہنے لگا۔

"یار اب تو تم بہت اچھی کہانیاں لکھنے لگے ہو۔"

پھر مقبول جہانگیر کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

"مقبول جہانگیر صاحب! یہ سکول میں پڑھتا تھا جب ہمارے امرتسر والے گھر میں آیا کرتا تھا۔"

حسن عباس زیادہ نہیں بدلا تھا۔ سرخ و سفید رنگ ویسے کا ویسا تھا۔ صرف جسم تھوڑا دبلا ہو گیا تھا۔ پان اس کے منہ میں تھا۔ ہونٹ سرخ ہو رہے تھے۔ بائیں ہاتھ کی

انگلیوں میں سگریٹ سلگ رہا تھا۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا اور وہ امرتسر کی باتیں کرنے لگا۔

مقبول جہانگیر نے میرے مشورے پر عمل کیا اور حسن عباس کو سعادت حسن منٹو کے بارے میں کوئی مضمون لکھنے کی فرمائش کی۔ حسن عباس ہنسنے لگا۔ سگریٹ کا لمبا کش لے کر بولا۔

''اب اگر آپ کو میرا پتہ چل ہی گیا ہے تو ٹھیک ہے۔ میں آپ کو منٹو پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھ کر دوں گا۔ میرے پاس اس کے خط بھی ہیں جو اس نے مجھے بمبئی سے لکھے تھے۔''

پھر حسن عباس نے منٹو پر وہ معرکہ آرا مضمون لکھ کر دیا جسے پڑھے بغیر میں سمجھتا ہوں کہ اردو کے عظیم افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کے فن اور خاص طور پر اس کی شخصیت پر کی گئی کوئی تحقیق مکمل اور مستند نہیں کہلائی جا سکتی۔ کیونکہ جتنا حسن عباس منٹو کی شخصیت کے نشیب و فراز سے واقف تھا اتنا کوئی دوسرا شخص واقف نہیں تھا۔ کچھ دنوں کے بعد حسن عباس کا کراچی میں انتقال ہو گیا۔ یہ افسوس ناک خبر سننے کے بعد مقبول جہانگیر مجھ سے کہنے لگا۔

''بھائی! مرنا تو ایک نہ ایک دن سب کو ہے۔ مگر مجھے اس بات کی تسلی ہے کہ میں نے حسن عباس صاحب سے منٹو صاحب پر وہ مضمون لکھوا لیا ہے جو دوسرا کوئی شخص نہیں لکھ سکتا تھا۔''

اس مضمون کی ایک کاپی میں نے اس دن سے اپنے پاس رکھ لی تھی۔ اس کے کچھ اقتباس میں نے منٹو کے حوالے سے اپنے کالم میں شائع بھی کئے تھے۔ گزشتہ دو ایک مہینوں سے مجھے منٹو کے مداحین اور منٹو پر تحقیقی کام کرنے والوں کی جانب سے خطوط موصول ہوتے رہے ہیں اور مجھ سے اردو کے اس عظیم افسانہ نگار کی شخصیت کے بارے میں پوچھا جاتا ہے۔ چنانچہ اپنے ان قارئین کرام اور منٹو پر تحقیقی مقالہ لکھنے والوں کے استفادے کے پیش نظر منٹو پر لکھے گئے حسن عباس کے اس معرکہ آراء مضمون کو دوبارہ پیش کر رہا ہوں۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے اس مضمون کی صرف ایک ہی کاپی میرے

پاس رہ گئی ہے جسے میں نے سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ سعادت حسن منٹو کی شخصیت کے تمام اسرار و رموز کو جاننے اور سمجھنے والا اس کا ایک ہی لنگوٹیا یار حسن عباس تھا جو اس پر مضمون لکھ کر اپنا حق ادا کر گیا ہے۔ حسن عباس بھی اللہ کو پیارا ہو گیا۔ آپ اس مضمون کو پڑھیئے اور دیکھئے کہ یہ حق حسن عباس نے کس خوبی سے ادا کیا ہے۔

کچھ سعادت حسن منٹو کے بارے میں (از حسن عباس)

سعادت حسن منٹو سے میری دوستی گویا بیک وقت دو متضاد شخصیتوں سے نباہنے کا مسئلہ تھا۔ دونوں میں صرف اتنا فرق تھا جیسے ایک ہوائی...... آگ لگنے سے پہلے اور اس کے فوراً بعد جب وہ لپکتے شعلے کی صورت میں خلاؤں میں پرواز کر جاتی ہے۔ منٹو، سعادت حسن کے دماغ کی شریانوں کو چوستا، اس کی گود میں مچلتا ہوا پروان چڑھا اور ہوش سنبھالتے ہی اس نے سعادت کے منہ میں اپنے افکار کی چوسنی دے کر اسے ایک حد تک خاموش کر دیا۔ لیکن پس پردہ سعادت حسن کی سکڑتی ہوئی شرافت اور منٹو کی پھیلتی ہوئی منہ پھٹ انا میں ایک ناگزیر تکرار شروع ہو گئی جو خوشگواری اور تلخی کے ملے جلے جذبات میں گندھی ہوئی تادم آخر فیصلہ طلب رہی۔ مجھے یہ کہنے میں کچھ عار نہیں کہ سعادت حسن کی دبی ہوئی آواز نے غیر شعوری طور پر اس منٹو کو جنم دیا جو دفعتہً روایتی ادب کی چوکھٹ پر ایک آتشیں ہیولے کی طرح نمودار ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے گونگے اور بہرے ادب کے پجاریوں کے جامد اذہان ایک انجانے خوف سے پگھلنے لگے۔ عزت نفس کے موہوم نشے میں سرشار بہو بیٹیوں کا روپ دھارنے والے منقار زیر پر قسم کے ادیب جو ہنوز گیسوئے ادب کی رسمی کنگھی چوٹی کے سہارے زندہ تھے، اسکی بکھرتی ہوئی گھنیری زلفوں کی تاب نہ لا کر ادب کی پاکیزگی اور طہارت کی دہائی دیتے ہوئے چھپ چھپ کر اپنے گریبانوں میں جھانکنے لگے۔ اس امید پر کہ شاید انہیں کوئی چھپی ہوئی شاطر مشاطہ نظر آ جائے جو پھر سے ان آفت زدہ گیسوؤں کو کلاسیکی انداز میں سنوار سکے۔ سعادت حسن سے قطع نظر مجھے منٹو سے بھی والہانہ لگاؤ تھا لیکن اس میں کسی قسم کی عقیدت کو کوئی دخل نہ تھا۔

سعادت حسن منٹو اپنے جذبات کی خوشگوار حدود کو سمیٹنے سے ذرا پہلے اس کے ذہنی اور قلبی تاثرات کو زبردستی جھٹک دینے کا گر جانتا تھا تاکہ اس کی انا کا بول بالا رہے۔ اس کی نظر میں معدے کی بھوک یا فطری جذبات کے تقاضے بنیادی طور پر ایک دوسرے سے قطعی مشابہ ہیں اور ذاتی تسکین کی تگ و دو اور آرزو کی بے ساختگی کی تہہ میں ایک ہی جذبہ کارفرما ہے۔ مجھے بہرحال اس نظریے سے گہرا اختلاف تھا کیونکہ میرے نزدیک عملی طور پر ایک کا تعلق زندگی کی آئے دن کی کشمکش سے تھا' جو فطرت کی طرف سے ودیعت کی گئی ہے اور دوسرے کا واسطہ دل کی اس ان کہی واردات سے جو بسا اوقات فرار کی راہ بھی اختیار کر لیتی ہے۔ ایک خودمختار فعل ہے جس میں فریق ثانی بالکل بے بس ہوتا ہے لیکن آرزوؤں کے تیز دھارے پر بہہ کر جذبات کے منجدھار میں گھڑی دو گھڑی ٹھہرنے کے لئے کسی جیتے جاگتے ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے۔ خمار گندم اور شے ہے اور نترے ہوئے چہرے کچھ اور' اگرچہ اس نکھار میں جسمانی خودغرضی کو بڑا دخل ہے۔

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ کروڑوں برس گزرنے پر بھی اولاد آدم کی بنیادی ضروریات کا محور وہی ایک بھوک ہے جسکا بھیانک سایہ روز ازل سے کسی پیر تسمہ پا کی طرح اس کے کندھوں پر سوار ہے اور وہ محض تسکین کی تلاش میں جنگلوں، صحراؤں، بیابانوں اور گلی کوچوں میں بھٹکتی پھرتی ہے۔ اس اعتبار سے پتھر کے زمانے کے وحشی انسان اور موجودہ تہذیب یافتہ نوع انسانی میں کچھ فرق نہیں سوائے اس کے کہ تسکین کے انداز بدلتے رہتے ہیں۔ بھوک کے سائے روز بروز لمبے ہوتے جاتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ہماری مشتعل آرزوؤں اور تمناؤں کے دائرے وسیع سے وسیع تر ہوتے جا رہے ہیں۔ اس دکھتی ہوئی رگ کو سہلانے کی تگ و دو میں آج ہم اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں بھوک کی ہمہ گیری نے ایک وحشت کی صورت اختیار کر کے ہماری فطری اقدار اور نزاکتوں پر شب خون مار کر ہماری روحوں کو اپاہج کر دیا ہے۔ لیکن ان دونوں کو آپس میں کچھ اس طرح مدغم کر دینا کہ کچھ فرق باقی نہ رہے ٹھیک نہیں۔ اس نازک مرحلے پر منٹو کی شرابور زندگی کی فکری دیانت اور محسوسات کی تنظیم و تربیت آڑے آئی۔

اس کے افسانوں میں ایسے ذہنی کچوکے موجود ہیں جو غیر شعوری طور پر آپ کے احساس کی تہوں میں گھس کر آپ کے رگ و پے میں ایک جھرجھری سی پیدا کر دیتے ہیں۔ ایک بار میرے جی میں آئی کہ اس بارے میں اس کے بنیادی نظریات کے متعلق دوٹوک بات کروں۔ چنانچہ 1951ء میں' میں نے ایک خط کے ذریعے اپنے اس بے ضرر ارادے کا برملا اظہار کرتے ہوئے اسے جان بوجھ کر ٹٹولنے کی کوشش کی۔ ذرا آپ بھی اس کا ردعمل ملاحظہ فرمایئے۔ (پہلا خط دیکھئے) اس خط کے مضمرات کی صحیح نوعیت معلوم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ منٹو کے ابتدائی دور اور متعلقہ ماحول کی چند جھلکیاں پیش کی جائیں۔

یہ کوئی اڑتیس برس ادھر کی بات ہے۔ ایک دبلے پتلے چھریرے بدن کے لڑکے نے مسلم ہائی سکول امرتسر میں ایک اودھم سا مچا رکھا تھا۔ اس کے ہم جماعت جب اسے "ٹومی" کہہ کر پکارتے (جو لفظ منٹو کی انتہائی بگڑی ہوئی شکل ہے) تو اس کی کشتی نما آنکھوں سے کھٹی میٹھی شرارتیں جھلکیاں لیتی نظر آتیں۔ گورا چٹا رنگ، ذرا کھلتی ہوئی پیشانی، کتابی چہرہ، باچھیں کھلی ہوئی سی، ناک کی پھنگی پر تل کا نشان (اگرچہ وہ ناک پر کبھی مکھی بھی بیٹھنے نہیں دیتا تھا) وہ اکثر سفید پتلون نما پاجامہ قمیض یا کھدر کا کرتا پہنے اپنے نئی سائیکل اور مووی کیمرہ لئے سکول کے آس پاس پھرتا رہتا۔ وہ سکول کے متعلق نت نئی خبریں ایجاد کرتا اور موٹے موٹے شلجم کے ٹکڑوں پر کاپنگ پنسل سے لکھے ہوئے الٹے حروف کو کسی محلول کی مدد سے کاغذ کے پرزوں پر چھاپ کر علی الصبح نوٹس بورڈ پر چسپاں کر دیتا۔ موقع پاتا تو ایک پرزہ ہیڈ ماسٹر کی جیب میں بھی ڈال دیتا۔ اس کی حرکتوں سے سکول کی چاردیواری میں اکثر ایک ہنگامہ سا برپا رہتا۔ ایک اتفاقی ملاقات میں ہم دونوں باتوں باتوں میں آپس میں گھل مل گئے اور محض اس کی خاطر میں اپنا سکول تبدیل کر کے اس کا ہم جماعت بن گیا۔ وہ میٹرک کے امتحان میں تین دفعہ فیل ہو چکا تھا لیکن جوں توں کر کے ہم دونوں نے میٹرک پاس کر لیا اور ہندو سبھا کالج میں ایف اے میں داخل ہو گئے۔ اسے ہالی وڈ کی اداکارہ گریٹا گاربو اور خاص کر مارلین ڈیٹرش سے ان کی فنکارانہ صلاحیتوں کی وجہ سے والہانہ عقیدت تھی۔

وہ لون چینی اور بورس کارلوف کا بھی سخت مداح تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اداکار جیتی جاگتی زندگی کو شیشے میں اتارنا خوب جانتے تھے۔ اس کا سیلولائیڈ کی ان طلسمی صورتوں سے لگاؤ کچھ دیرپا ثابت نہ ہوا اور اشتراکی ادیب باری علیگ کی رفاقت کی وجہ سے وہ دفعتاً ادب کی طرف متوجہ ہوا اور ایک بوسیدہ کوچ پر لیٹے لیٹے اس نے دنوں میں وکٹر ہیوگو، فلابیئر، موپساں، ترگنیف، میکسم گورکی، دوستوسکی، چیخوف اور دوسرے شہرہ آفاق مفکروں کی تخلیقات کا بخوبی مطالعہ کرلیا۔ اب اس کے اندر غور وفکر کا ایک نہ بجھنے والا الاؤ روشن ہونے لگا جس میں پگھل پگھل کر اسے ایک دن کندن بن جانا تھا۔

یہ 1933ء کا زمانہ ہے!

اردو ادب میں نئے رجحانات کا آغاز ہو چکا تھا اور آہستہ آہستہ ایک ایسا طبقہ ابھرنے لگا جس کے ذہن میں روسی اور فرانسیسی افکار کے انقلابی تاثرات سے نئے نئے خیالات پرورش پانے لگے۔ یہ پڑھے لکھے لوگ تھے جن کا تعلق زیادہ تر متوسط طبقے سے تھا‘ جو زندگی کی کڑواہٹ کو محسوس کرتے ہوئے بھی اسے تھوکنے سے گریزاں تھا۔ زندگی کی بجھتی ہوئی راکھ کو کرید کرید کر چند نیم روشن چنگاریاں تو ہاتھ لگ گئیں لیکن انہیں شعلوں میں تبدیل کرنے کی ہمت کہاں! وہ تلخیوں کے تیز دھارے پر بہے جا رہے تھے۔ مگر سنبھالے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ وہ اقتصادی بدحالی اور معاشرتی پسماندگی کے دو پاٹوں کے درمیان پسے جا رہے تھے اور آسودگی محض ایک خواب! ذہن کے اس اچانک کایا پلٹ کا اردو ادب پر اثر ناگزیر تھا۔ خانہ ساز رومان اور عشق و محبت کے فسانے جھوم جھوم کر بیان کرنے والے اس بات کو پا گئے کہ نان جویں سے محروم عوام کے لئے ان کی باتیں محض فریب کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اردو کا ادیب مصنوعی زلف کی شعبدہ گری سے نکل کر اب کانٹوں کی وادی میں تھا۔ جہاں اسے اپنے بھائیوں کی اکثریت آبلہ پا دکھائی دی۔ اس کے احساس کو زبردست ٹھیس لگی اور بغاوت کی وہ چنگاری جو اس کی سرشت میں رومان کی راکھ تلے دبی تھی ایکا ایکی روشن ہونے لگی۔ رومانی اور عشقیہ قصے کہانیوں کی تہہ میں زندگی سے فرار کا جذبہ تلملا رہا تھا۔ حالانکہ ادب

کو ضرورت ہے زندگی کی...... زندگی جیسی کہ ہے نہ کہ جیسی ہونا چاہئے...... اور زندگی کو ادب کی، ہماری زندگی، انفرادی اور اجتماعی، تاریکیوں میں گم ہے۔ جس طرح گھپ اندھیرے میں محض ایک شمع کی دھندلی روشنی سے تاریکی کی شدت کو مؤثر طور پر کم نہیں کیا جا سکتا۔ ٹھیک اسی طرح وہ ادب جو زندگی سے فرار کا قائل ہے، گھناؤنے ماحول کی تلخیوں میں آسودگی کی روح نہیں پھونک سکتا۔ اردو ادب میں جن حضرات نے اس نظریے کی پرورش کی ان میں منٹو کا نام پیش پیش ہے۔ منٹو وکٹر ہیوگو سے سخت متاثر تھا۔ انہی دنوں اس کے ایک ناول کا ترجمہ ''سرگزشت اسیر'' کے نام سے چھپ چکا تھا۔ اس نے اپنا پہلا طبع زاد افسانہ ''تماشا'' بھی لکھا جو جلیانوالہ باغ کے خونی حادثے سے متعلق تھا اور اسی طرح وہ ادبی دنیا سے متعارف ہو گیا۔ ہم دونوں نے مل کر آسکر وائلڈ کے انقلاب روس سے متعلق مشہور ڈرامے ''ویرا'' کا ترجمہ شائع کیا اور امرتسر کے بازاروں میں شہ سرخیوں سے مزین بڑے بڑے پوسٹر لگا دیئے۔

''زاریت کے تابوت میں آخری کیل''

یہ وہ زمانہ تھا جب بنگال میں دہشت پسندوں کی سرگرمیاں بڑے زوروں پر تھیں۔ بھگت سنگھ، دت اور چودھری شیر جنگ اس تحریک کے کرتا دھرتا تھے۔ پنجاب اسمبلی میں بم کے اچانک دھماکے نے صورت حال کو اور بھی بگاڑ دیا تھا۔ ہمارے پوسٹر کے منظر عام پر آتے ہی سی آئی ڈی فوراً حرکت میں آ گئی اور ہماری تلاش میں منٹو کے گھر کا رخ کیا۔ اتفاق سے ان دنوں اس کے بہنوئی خواجہ عبدالحمید انسپکٹر پولیس رخصت پر آئے ہوئے تھے اور اسی کوچے میں رہائش پذیر تھے۔ وہ پولیس والوں سے ہماری ''دہشت پسندی'' کا ماجرا سن کر بے اختیار ہنس دیئے اور کہا کہ یہ تو محض چند سر پھرے نوجوانوں کا ٹولہ ہے جو یونہی خون کی گرمی کی وجہ سے ذرا سنسنی خیز ہو گیا ہے۔ ورنہ سب کے سب سو فیصد بالکل بے ضرر ہیں۔ انہوں نے ہمارے آئندہ کردار کی پوری ذمہ داری لی۔ لیکن ابھی یہ قصہ پوری طرح تھمنے نہ پایا تھا کہ اشتراکی ادیب باری علیگ نے جو دارالاحمر (منٹو کے گول کمرے کا نام) میں مقیم تھے، ایک نیا شگوفہ چھوڑا۔ انہوں نے چپکے سے اپنے ہفتہ وار جریدے ''خلق'' کا پہلا شمارہ شائع کیا جس کا اداریہ ''ارسطو سے

کارل مارکس تک" تحریر کر کے حالات کو اور بھی غیر معتدل بنا دیا کیونکہ اس وقت مارکسزم کے نظریے کی تعلیم ایک خطرناک جرم سے کسی طرح کم نہ سمجھی جاتی تھی۔ باری صاحب تو راتوں رات رفو چکر ہو گئے اور "خلق" اپنی ابتدائی رونمائی کے بعد ہمیشہ کے لئے ناپید ہو گیا۔

ہمارے لئے یہ صورت حال سخت تکلیف دہ تھی اور خواہ مخواہ کے ذہنی انتشار سے بچنے کے لئے ہم دونوں مارلین ڈیٹرش کا نیا فلم دیکھنے کے لئے لاہور جا پہنچے۔ مصروفیات کچھ ایسی رہیں کہ امرتسر جانے والی آخری گاڑی چھوٹ گئی۔ دسمبر کی یخ بستہ رات ہم ٹھٹھرتے ہوئے یونہی سڑکوں پر آوارہ پھرتے رہے۔ کوئی ایک بجے رات کا عمل ہوگا۔ ہم سٹیشن پر شیڈ میں ایک طرف کھڑی گاڑی کے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں گھس کر دنیا و مافیہا سے بے خبر لمبی تان کر سو گئے۔ پچھلے پہر کھٹ کھٹ کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ بادل نخواستہ دروازہ کھولا تو ایک باوردی پولیس والا موجود پایا۔ میں نے سعادت کے کندھے کو جھنجھوڑا تو وہ بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ قریب تھا کہ ہم دونوں گرفتار کر لئے جاتے لیکن اس نیک دل انسان نے ہماری اس حرکت کے پس منظر کی وضاحت سن کر ہمیں فوراً سٹیشن کی حدود سے باہر نکل جانے کی تلقین کی کیونکہ پولیس دہشت پسندوں کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مار رہی تھی۔ ہماری عجب حالت تھی۔ جیب میں اتنے پیسے نہ تھے کہ کسی ہوٹل میں قیام کر سکتے اور نہ ہی جسمانی حالت ایسی تھی کہ اس کڑاکے کی سردی کو آسانی سے برداشت کیا جا سکے۔ سٹیشن سے نکلتے ہی سعادت نے ایک قریبی بوتھ سے کسی ملنے والے کو ٹیلی فون کرنا چاہا اور کوئی جواب نہ پا کر ایک زبردست جھٹکے سے ریسیور کا برقی تار توڑ کر اسے ہاتھ میں لہراتا ہوا باہر نکل آیا۔ اس کے خیال میں ریسیور ناقص تھا اور یہ مدتوں دارالاحمر کے کارنس پر پڑا اس حماقت کی یاد دلاتا رہا۔

ایف اے کے فائنل امتحان کے دن تھے۔ پرچہ شروع ہونے میں کوئی آدھ گھنٹہ باقی تھا۔ ہم ہندو سبھا کالج کے سامنے رام لعل پان والے کی دکان کے عقبی حصے میں تاش کھیلنے لگ گئے اور اس درجہ منہمک ہوئے کہ پرچہ دینے کا خیال بھی نہ آیا۔ چنانچہ باقی امتحان بھی اسی شوریدہ سری اور غفلت شعاری کی بھینٹ چڑھ گیا۔ ہم دونوں

عین توقع کے مطابق فیل ہو گئے اور ایم اے او کالج میں فیل شدہ طلبہ کی کلاس میں داخلہ لے لیا۔ اب ہماری ادبی سرگرمیاں رنگ لانے لگیں۔ مولانا حامد علی خان کے تعاون سے "ہمایوں" کے روسی اور فرانسیسی ادب نمبر مرتب کئے اور لگے ہاتھوں کالج میگزین کے اجراء کا بھی بندوبست کر لیا جس کا سال بھر میں صرف ایک ہی پرچہ شائع ہو سکا۔ ہمارے اساتذہ میں صاحبزادہ محمود الظفر (انگارے والی رشیدہ جہاں کے شوہر) اور ڈاکٹر آر ڈی خان جیسے ماہر تعلیم تھے۔ جن کی توجہ سے میں تو پاس ہو گیا لیکن سعادت فیل ہو کر ابو سعید قریشی کے ساتھ علی گڑھ یونیورسٹی میں داخل ہو گیا۔ جہاں سے اسے صرف اس بنا پر نکال دیا گیا کہ اسے دق کا عارضہ لاحق تھا۔ ان دنوں وہ سینے کے شدید درد میں مبتلا تھا اور اسے اندر ہی اندر گھل دینے کے لئے ٹنکچر آیوڈین سے اپنا سینہ پینٹ کرتا رہتا۔ وہ فطرتاً اذیت پسند تھا، لیکن ایذارسانی صرف اپنی ہی ذات تک محدود تھی۔ جب کھانسی ذرا شدت اختیار کرتی تو وہ سینے پر دو ایک کے مار کر سر جھٹکتا ہوا کہتا۔

"اب بس......"

اور پھر ایک خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کے منہ سے بے اختیار یہ الفاظ نکل جاتے۔

"یار یہ بڑی بکواس بن گئی ہے۔"

اس نے تبدیلی آب و ہوا کے لئے کشمیر کا رخ کیا لیکن بٹوت، جموں اور کشمیر کے درمیان ایک گاؤں میں باد نسیم کے ایک مجسم جھونکے کی تاب نہ لا کر وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ غم دوراں کے ستائے ہوئے انسان کی روح کے بے آواز ساز سے بے اختیار نغمے پھوٹنے لگے جن کی بازگشت اس کے متعدد افسانوں مثلاً "بیگو" اور "لالٹین کا اشارہ" وغیرہ میں سنائی دیتی ہے۔

کیا سعادت حسن منٹو نے کبھی عشق بھی کیا؟ میں اس بارے میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ منٹو کو تو اس کی انا نے (جو حسن اتفاق سے بڑی حد تک اس کی انا بن بیٹھی تھی) کبھی اس بات کی اجازت نہ دیتی۔ البتہ سعادت حسن کا معاملہ ذرا مشکوک سا ہے۔ کیونکہ کالج کے زمانے میں وہ زلف پریشان اور دیدہ گریاں کا تھوڑا بہت قائل دکھائی دیتا تھا۔ مجھے یاد ہے کبھی کبھار دارالاحمر میں وہ اپنی میز کی نچلی دراز سے گتے کی

ایک چھوٹی سی ڈبیا نکالتا اور اسے آنکھ جھپکتے میں بند کرتے ہوئے کہتا۔ ''خواجہ! میں تباہ ہو گیا ہوں'' اور پھر وہ اپنی مخصوص لے میں یہ شعر پڑھتا۔

دل میں اک درد اٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے
بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانئے کیا یاد آیا

اگرچہ میں اس کی غیر حاضری میں بھی کئی بار گھنٹوں اس کمرے میں تنہا موجود رہا مگر میں نے کبھی وہ دراز کھول کر اس تصویر کو دیکھنے کی کوشش نہ کی۔ البتہ ایک دن جب باتوں باتوں میں ذرا سنجیدگی سے اس بارے میں دریافت کیا تو اس نے کہا۔

''عباس! یاد رکھو، ہر انسان ایک آدھ راز ضرور اپنے ساتھ قبر میں لے جاتا ہے۔ بلکہ میری زندگی میں بعض باتیں تو ایسی ہیں جنہیں میں خود اپنے آپ سے بھی چھپانے کی کوشش کرتا ہوں۔''

میرے نزدیک اس کا یہ جملہ اس موضوع پر حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔

منٹو نے بڑے تلخ ماحول میں اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ روزنامہ ''مساوات'' امرتسر اور ''پارس'' لاہور میں کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد بمبئی سے واپسی پر اس نے ہفتہ وار ''مصور'' بمبئی کے مالک مسٹر نذیر کے کہنے پر پرچے کی ادارت سنبھال لی۔ تنخواہ چالیس روپے ماہوار مقرر ہوئی۔ ''مصور'' کے دفتر میں شب بسری کے عوض دو روپے بطور کرایہ کٹ جاتے تھے۔ کچھ دنوں بعد جب وہ ''فلم سٹی'' میں اسی روپے ماہوار پر ملازم ہو گیا تو اس نے ایک بڑی غلیظ چالی میں نو روپے ماہوار پر ایک کھولی کرایہ پر لے لی جس کی چھت سے بقول اس کے ''کھٹمل بارش کے قطروں کی طرح گرتے تھے'' ایک شب ''فلم سٹی'' سے واپسی پر اس نے دیکھا کہ وہاں کوئی اور شخص لمبی تان کر سویا ہوا ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ سارا دن یہیں پڑا رہتا ہے اور سرِ شام اپنے کام پر چلا جاتا ہے۔ اس دن اتفاقاً زیادہ پی جانے کی وجہ سے اس کی آنکھ بروقت نہ کھل سکی۔ منٹو یہ سن کر بہت محظوظ ہوا۔ ایک دفعہ ایک دیمک زدہ خاتون کے لئے ضروری انجکشن خرید لینے کی وجہ سے وہ اس کھولی کا کرایہ مقررہ تاریخ پر ادا نہ کر سکا۔ اس کا افسانہ ''نعرہ'' سیٹھ کی بورژوا ذہنیت اور اس کے عمل کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔ دراصل زندگی کی اس روکھی پھیکی مگر خونِ جگر سے عبارت جدوجہد میں اس کے اعصاب چٹخنے لگے تھے اور مسلسل ذہنی

کشیدگی کی وجہ سے اس کے تیور میں بھی وہ دم خم نہیں رہا تھا۔ وہ ان دنوں زندگی گزار نہیں رہا تھا، بھگت رہا تھا۔

منٹو ایوانِ حیات کی غلام گردشوں کا چکر لگاتے لگاتے تھک گیا تھا۔ لیکن اس کی قوت ارادی ہر بار اس کے اندر احساس کی ایک نئی روح پھونک دیتی۔ ایک ایسی کرن جو اس کے دل و دماغ کو جگمگا دیتی اور وہ تازہ دم ہو کر زندگی کی کٹھن وادی میں عزم و استقلال کے دوش پر رواں دواں نظر آتا۔ وہ اپنی مٹتی ہوئی آرزوؤں کی دہلیز پر دھرنا دے کر بیٹھ گیا۔ اسے کسی چارہ گر کی تلاش نہ تھی کیونکہ وہ یہ جان چکا تھا کہ اس دکھ درد سے بھرپور دنیا میں شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں۔ اس کے نرم و نازک جذبات کے آئینے کو ٹھیس لگ گئی تھی اور ذہنی ریگزاروں میں اپنی ٹوٹی ہوئی شخصیت سمیٹتا ہوا معاشرے کے منفی شعور سے ٹکرا کر کوئی مثبت نتیجہ اخذ کرنا چاہتا تھا۔ انہی دنوں اس کی والدہ جو بمبئی آ کر اپنی لڑکی کے پاس قیام پذیر تھیں، اپنے چہیتے بیٹے کو اس غلیظ کھولی میں ملنے آئیں تو اس کی حالت دیکھ کر ان کی ممتا پگھل کر آنکھوں میں امڈ آئی۔ انہوں نے ڈبڈبائی ہوئی نظروں سے اپنے لاڈلے کو دیکھا اور نجانے کیا سوچ کر ایک نہایت معزز کشمیری گھرانے میں اس کی شادی کا بندوبست کر دیا۔ چند دنوں میں نکاح کی رسم ادا کر دی گئی لیکن رخصتی تقریباً دس مہینے بعد عمل میں آئی۔ اس کا کچھ حال دولہا میاں کی زبانی سنئے۔

''ایجاب و قبول کی رسم ختم ہوئی تو میری جان میں جان آئی۔ ٹانگ سیدھی کی۔ درد کے کئی اور گھونٹ پئے۔ مبارکبادیں وصول کیں اور لنگڑاتا لنگڑاتا اپنے گھر پہنچا۔ مٹی کے تیل کا لیمپ روشن کیا اور کھٹملوں بھری کھاٹ پر دراز ہو کر سوچنے لگا کہ آیا سچ مچ میرا نکاح ہو گیا ہے...... برات کی تیاریاں کر رہا ہوں لیکن جیب میں صرف ساڑھے چار آنے ہیں۔ چار آنے میں سگریٹ کی ڈبیا آ جائے گی۔ دو پیسے کی ماچس...... چلو قصہ پاک...... شام تک میں نے ساری ڈبیا پھونک ڈالی۔ اب میری جیب میں صرف ایک ماچس تھی۔ وہ بھی آدھی......''

1939ء میں شادی کے کچھ دن بعد منٹو امرتسر آیا اور مجھے ساتھ بمبئی لے گیا۔ میں چند ماہ رہ کر لوٹ آیا۔ ان دنوں اس کی آمدنی کا ذریعہ ریڈیائی ڈرامے تھے یا

"مصور" کی ادارت۔ حالت دگرگوں تھی لیکن آپا صفیہ (بیگم منٹو) کے سگھڑاپے اور ہمہ وقت دلجوئی کی وجہ سے حالات سنورنے لگے تھے۔ اس کے بعد دو ایک بار لاہور میں ملاقات ہوئی اور کچھ عرصہ گزرنے پر وہ بمبئی چھوڑ کر آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازم ہو گیا لیکن اپنی لاابالی طبیعت کی وجہ سے مستعفی ہو کر واپس بمبئی چلا گیا اور مختلف فلم کمپنیوں سے ہوتا ہوا 1946ء میں "فلمستان" لمیٹڈ میں ایک معقول مشاہرے پر ملازم ہو گیا۔ میں بھی اس کے بلاوے پر وہیں پہنچ گیا۔ ان دنوں "آٹھ دن" فلم زیر تکمیل تھی جس کی نہ صرف کہانی' منظر نامہ اور مکالمے اس نے تحریر کئے تھے بلکہ خود ایک پاگل کا کردار بھی کیا تھا۔ ہم دونوں روزانہ "فلمستان" (گورے گاؤں) الیکٹرک ٹرین سے آتے جاتے تھے۔ منٹو اپنی لمبی ٹانگیں سامنے والی سیٹ پر پھیلا کر بیٹھتا۔ یہ اس کا معمول تھا۔ ایک دن اتفاق سے ٹکٹ چیکر آن نکلا اور منٹو سے اپنی ٹانگیں ہٹانے کو کہا۔ وہ ذرا تنک کر بولا۔ "یہ ٹانگیں اسی طرح پھیلی رہیں گی۔ آپ چاہیں تو انہیں چارج کر لیں کیونکہ انہوں نے میرے پاؤں کے ساتھ مل کر واقعی پوری سیٹ روک رکھی ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ آپ کو اپنے میمو پر "مسٹر منٹو" کی بجائے صرف "مسٹر منٹو کی ٹانگیں" لکھنا ہو گا کیونکہ میرے پاس تو اپنا ٹکٹ موجود ہے۔ اس وقت مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی ساری انا ایکا ایکی اس کے دماغ سے پھسل کر ان دونوں پتلی پتلی ٹانگوں میں گھس گئی ہے۔ اسی اثناء میں منٹو نے بیگ کھول کر اپنا طلسمی کھیل دہرایا تو ٹکٹ چیکر کی رال ٹپکنے لگی اور یوں یہ مسئلہ خود بخود حل ہو گیا۔

ان دنوں ملک بھر میں فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بھڑک اٹھی تھی اور چار سو افراد کے قتل عام کا میلہ سا لگ رہا تھا۔ انسان اپنی اعلیٰ اقدار اور نرم و نازک جذبات سے ناطہ توڑ چکا تھا۔ ہم دونوں سر شام گھر پہنچ جاتے لیکن جونہی کرفیو کا بگل بجتا منٹو کہتا۔

"آؤ بھئی کرفیو توڑیں۔"

اس کے نزدیک کرفیو توڑنا بالکل ایسا ہی تھا جیسے واضح ہدایات کے باوجود لوگ گیلے روغن کو ضرور ہاتھ لگاتے ہیں، پھول توڑتے ہیں اور مخملیں گھاس پر چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ دراصل اس نے ان پہرے داروں سے ذرا راہ و رسم پیدا کر لی تھی اور وہ ہمیں بخوشی پچاس قدم پرے "موہنی لاج" تک جانے اور واپس آنے کی اجازت دے

دیتے تھے۔ یہ جگہ بھی ان مقامات میں سے تھی جسے گردش دوراں بھی متاثر نہ کر سکی اور مزید تفصیل کی اس لئے گنجائش نہیں کیونکہ اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں۔

منٹو سے میری آخری ملاقات اکتوبر 1952ء میں ہوئی جب وہ "کالی شلوار" کے مقدمے کے سلسلے میں کراچی آیا اور خلاف توقع صرف پچیس روپے جرمانہ ادا کر کے اس کی جان چھوٹ گئی۔ نصیر انور بھی ساتھ تھا۔ شام کو مرینا ہوٹل میں خوب محفل جمی۔ اتفاق سے چراغ حسن حسرت صاحب بھی موجود تھے۔ جس سے محفل اور بھی چمک گئی۔ باتوں باتوں میں منٹو نے اپنی زیر ترتیب کتاب "ناخن کا قرض" کا ذکر کیا جس کے متعلق وہ مجھے ضروری خط بھی لکھ چکا تھا جو اس کے جذبہ خود بینی کو اجاگر کرتا ہے۔

ذوق نے سچ ہی تو کہا ہے کہ کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا مسیحا و خضر کی ملاقات سے بہتر ہے۔ منٹو بھی ایک تحفہ روزگار تھا۔ آن میں کچھ، آن میں کچھ۔ میری طرف دیکھتے ہی وہ سراپا سعادت حسن بن جاتا لیکن منہ پھیرتے ہی منٹو کی طرح چہکنے لگتا۔ شاید اسی وقت اسے اپنے نہاں خانہ دل سے کسی خوش گفتار طوطی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ جذبات کے اتار چڑھاؤ سے ہر لحظہ گرمی محفل میں اضافہ ہو رہا تھا۔ شعر و شاعری اور پر لطف نوک جھونک نے ایک رنگین سماں پیدا کر دیا تھا۔ منٹو نے جب اچانک حسرت صاحب کی طرف رجوع کیا تو وہ بے اختیار بول اٹھے۔ "میں تو یہ کہوں گا کہ منٹو بڑا ڈاکو ہے جو دلوں میں سیند لگاتا ہے۔" اور اس جملے کے ساتھ ہی مجھے منٹو کی دعا کے وہ الفاظ یاد آ گئے جو ہمیشہ کے لئے ایک گنبد کی صدا بن کر رہ گئے ہیں۔

"اے خدا...... اے رب العالمین...... تو سعادت حسن منٹو کو اس دنیا سے اٹھا لے...... نور میں وہ اپنی آنکھیں نہیں کھولتا لیکن اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے۔ گھریلو عورتوں کی طرف وہ آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا لیکن بیسواؤں سے گھل مل کر باتیں کرتا ہے...... جہاں رونا ہے وہاں ہنستا ہے' جہاں ہنستا ہے وہاں روتا ہے۔ کوئلوں کی دلالی میں جو اپنا منہ کالا کرتے ہیں ان کی کالک صاف کر کے ہمیں دکھاتا ہے...... اس شرانگیز، نجس پسند اور شریر انسان کو اس دنیا سے اٹھا لے جس میں وہ

بدکرداروں اور بداطواروں کے نامہ اعمال کی سیاہیاں مٹانے میں معروف ہے۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ منٹو نے ایسے جیتے جاگتے کردار تخلیق کئے جن کا تعلق صرف ہماری زمین سے ہے۔ وہ کوئی آسمان کے ٹوٹے ہوئے تارے نہیں۔ وہ انہی صاف ستھری تارکول بچھی سڑکوں، گلیوں اور بازاروں میں اپنی زندگی کا بوجھ اٹھائے پھرتے ہیں۔ وہ ہر اس شے کا جسے وہ دیکھتے یا سنتے یا محسوس کرتے ہیں ذکر کرتے ہیں۔ کبھی ہم ان کی باتیں سن کر محظوظ ہوتے ہیں، کبھی سر پیٹ لیتے ہیں، جھنجھلا اٹھتے ہیں۔ وہ شدت سے محبت اور نفرت کرنا جانتے ہیں۔

منٹو کے ہاں بہاروں کی رنگینی اور شگفتگی نہیں۔ صرف پت جھڑ ہے۔ جہاں شورش دوراں سے مرجھائے ہوئے چہرے، لڑھکتی، لڑکھڑاتی اور کھڑکھڑاتی ہوئی خشک پتیوں کی طرح آوارہ دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی وہ لطافتوں کا ذکر کرتے ہوئے ایکا ایکی کچھ اس طرح دل برداشتہ ہو جاتا ہے جیسے صاف ستھرے آسمان پر اچانک کسی گوشے سے کالی گھٹا آ نکلے۔ وہ اپنے گرد و پیش کے تاریک سایوں کو جو ہر لحظہ لمبے ہوئے جاتے ہیں شکست دینے کے لئے اپنی جدت تخیل سے روشنی کی کرن پیدا کر لیتا ہے۔ جس طرح کوئی بیا پتوں کی اوٹ میں چھپے ہوئے تاریک گھونسلے کو روشن کرنے کے لئے چکنی مٹی سے ٹمٹماتا ہوا جگنو چپکا لیتا ہے۔ منٹو کی طبیعت میں طنز و مزاح کا عنصر بھی موجود تھا جس کی دلچسپ جھلکیاں "چچا سام کے نام" خطوط میں موجود ہیں۔ اس نے "اعداد کے ساتھ ادب اور زندگی کی چھیڑ" کے عنوان سے ایک ہلکا پھلکا مزاحیہ خاکہ بھی تحریر کیا تھا جسے پڑھ کر میں نے خود اس کی زندگی میں ذرا جھانک کر دیکھا تو مجھے معلوم ہوا کہ تین کے عدد کو اس سے گہری نسبت ہے اور یہ بری طرح اس کے ساتھ چپک کر رہ گیا ہے۔ ذرا آپ بھی ملاحظہ فرمایئے!

"میری زندگی میں تین بڑے حادثے ہیں۔ پہلا میری پیدائش کا جس کی تفصیلات کا مجھے کوئی علم نہیں۔ دوسرا میری شادی کا، تیسرا میرے افسانہ نگار بن جانے کا...... میں زندگی میں صرف تین مرتبہ بے ہوش ہوا ہوں، سب سے پہلے اپنے نکاح پر سید فضل شاہ مرحوم کو دعوت شرکت دینے پر، دوسری مرتبہ اپنی والدہ کی اچانک موت پر،

پھر اپنے لڑکے کی وفات پر......"

اس کے نام میں تین نقطے ہیں اور پورا نام تین الفاظ پر مشتمل ہے، میٹرک کے امتحان میں تین دفعہ فیل ہوا اور جب پاس ہوا تو تیسرے درجے میں۔ اپنی علالت کے دوران ثبوت میں تین مہینے قیام کیا۔ جگر کی بیماری کی وجہ سے تین مہینے ہسپتال میں رہا۔ اس کے تین افسانے "بو"، "ٹھنڈا گوشت" اور "کالی شلوار" قانون کی زد میں آئے۔ اس کے تین سوتیلے بھائی تھے اور لڑکیاں بھی تین، اس کے دوست بھی صرف تین تھے۔ حسن عباس، ابوسعید قریشی اور باری۔ بیگم منٹو اپنے سمیت تین بہنیں، تین بھائی ہیں۔ وفات کے وقت اس کی عمر 43 سال تھی۔ منٹو کو غالب سے گہری عقیدت تھی۔ وہ حقیقی معنوں میں اس کا پرستار تھا اور اس کے مختلف عنوان مثلاً لذت سنگ، زحمت مہر درخشاں، ناخن کا قرض اور جیب کفن وغیرہ اسی کے کلام سے مستعار ہیں۔ اس نے اس کے بھانجے کی یاد میں اپنے لڑکے کا نام عارف رکھا لیکن وہ معصوم قیامت کو ملنے کا وعدہ کئے بغیر اس جہان فانی سے یوں اٹھ گیا جیسے ایکا ایکی کسی پھول سے اس کی خوشبو اڑ جائے۔ منٹو حقیقت پسند تھا۔ اس کا کہنا کہ "جو دن گزر چکے ہیں ان کی یاد میرے نزدیک ہمیشہ فضول رہی ہے۔ مجھے ہمیشہ "آج" کی غرض رہی ہے گزری ہوئی کل یا آنے والی کل کے متعلق میں نے کبھی نہیں سوچا جو ہونا تھا ہو گیا، جو ہونے والا ہے ہو جائے گا۔" اس کی حقیقت پسندی کی انمٹ دلیل ہے۔

اسے زندہ رہنے کے لئے روشنی کی ضرورت تھی۔ اس نے اتھاہ تاریکیوں میں ڈوب کر چند کرنیں تلاش کیں جنہوں نے اس کے ذہن اس کی روح کو جگمگایا لیکن بدلے ہوئے ماحول کے گھپ اندھیرے میں اسے اپنا راستہ بجھائی نہ دے سکا۔ "میرے لئے یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ میں ابھی تک خود کو اپنے ملک میں جسے پاکستان کہتے ہیں جو مجھے بہت عزیز ہے اپنا صحیح مقام تلاش نہیں کر سکا۔ یہی وجہ ہے کہ میری روح بے چین رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں کبھی پاگل خانے میں اور کبھی ہسپتال میں ہوتا ہوں۔"

آہستہ آہستہ ہسپتال اور پاگل خانے کی دیواریں آپس میں ملنے لگیں۔ وہ جام و سبو کے سہارے کسی چور دروازے کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ لیکن بالآخر اسے بھی سقراط کی طرح اپنے ہاتھوں زہر پینا پڑا۔ یک لخت نہیں، روز بروز قطرہ قطرہ جو اس کے

رگ و ریشے، اس کے سازِ حیات کے ٹوٹتے ہوئے تاروں میں آہستہ آہستہ سرایت کرتا گیا اور اس کی ٹھوس قوت ارادی بھی اس کے مہلک اثرات کو جذب نہ کر سکی۔ اس کی شخصیت کے عناصر ترکیبی کا باہمی ربط لمحہ بہ لمحہ ٹوٹتا جا رہا تھا اور اس کی بے چین روح اس کے ڈھلتے ہوئے قالب کو آخری سلام کہنے کے لئے پر تول رہی تھی۔

کہتے ہیں سقراط زہر پیتے وقت پرسکون تھا۔ منٹو بھی ایک پرسکون موت کا خواہاں تھا۔ اس نے مرنے سے کچھ دیر پہلے اپنے معصوم بچوں کو روزمرہ کی طرح سکول بھیج دیا۔ ہمسایوں کو بھی اس نازک مرحلے پر قریب آنے سے روک دیا لیکن مرتے وقت اس کی آنکھ سے ایک بھی آنسو نہ نکل سکا۔ شاید اس لئے کہ اس کا سراپا جیتے جی تابوت بن چکا تھا اور وہ اسے اپنی مرضی کے خلاف، اپنے روٹھے ہوئے کندھوں پر اٹھائے پھرتا تھا، جس سے ماحول کی مجرمانہ بے حسی کی تصویر آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ وہ اپنے وقت سے پہلے پیدا ہوا اور تاب انتظار کی کشمکش سے بے نیاز ہو کر بے وقت موت کو بھی زیر لب خوش آمدید کہنے پر راضی ہو گیا۔

سعادت حسن مر گیا۔ منٹو زندہ رہا۔

آپ نے حسن عباس کا مضمون پڑھ کر اندازہ کر لیا ہوگا کہ یہ مضمون اگر کوئی لکھ سکتا تھا تو صرف حسن عباس ہی لکھ سکتا تھا جس سے متعلق منٹو نے خود ایک خط میں لکھا تھا کہ جتنا تم مجھے سمجھتے ہو اور جانتے ہو دوسرا کوئی نہیں جانتا۔ اب میں قارئین اور خاص طور پر منٹو کے مداحین اور ان اصحاب کے لئے جو منٹو پر تحقیقی کام کر رہے ہیں، لاہور میں گزارے ہوئے منٹو کے آخری ایام کا مختصراً ذکر کروں گا جن کا میں عینی شاہد ہوں تاکہ یہ حقائق بھی ریکارڈ پر آ جائیں۔ سعادت حسن منٹو کو اپنی آخری عمر میں حصول معاش کے لئے بڑی سخت محنت کرنی پڑی۔ میں ان دنوں روزنامہ ''آفاق'' سے منسلک تھا، جس کا دفتر مال روڈ پر ریگل سینما کے قریب ہی تھا۔ منٹو صاحب لکشمی مینشن میں رہتے تھے۔ یہ صاف ستھرے فلیٹوں والی آبادی بیڈن روڈ اور مال روڈ کے سنگم پر اندر کی جانب واقع ہے۔ منٹو صاحب اپنا لکھا ہوا کوئی افسانہ لے کر آفاق کے دفتر میں آتے اور افسانہ دے کر اس کا معاوضہ لے کر خاموشی سے واپس چلے جاتے تھے۔ یہ معاوضہ جہاں تک مجھے یاد ہے پندرہ بیس روپے سے زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ ان کا افسانہ آفاق کے

سنڈے ایڈیشن میں چھپتا۔ ایک دفعہ دوپہر کے وقت میں ایک روڈ پر رسالہ ''نقوش'' کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ سید وقار عظیم صاحب اور ڈاکٹر عبادت بریلوی بھی اس وقت وہاں موجود تھے۔ منٹو صاحب کا تانگہ دفتر کے سامنے آ کر رکا۔ منٹو صاحب تانگے سے اترے۔ اندر آئے، اپنے تازہ لکھے ہوئے دو یا شاید تین افسانوں کے مسودے ''نقوش'' کے ایڈیٹر محمد طفیل صاحب کو دیئے۔ افسانوں کا معمولی سا معاوضہ وصول کیا اور خاموشی سے جس طرح آئے تھے اسی طرح دکان نما دفتر سے نکل کر تانگے میں بیٹھے اور تانگہ آگے چل دیا۔ ان ایام میں وہ اکثر تانگے پر آتے جاتے دیکھے جاتے تھے۔ بہت کم کسی سے ملتے تھے۔ زیادہ وقت اپنے گھر پر ہی گزارتے تھے۔ وہ چائنیز لنچ ہوم میں ایک شام کو ریستوران کی ڈائننگ ٹیبل پر اپنے کچھ غیر ادبی قسم کے مداحوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم لوگ دیوار کے ساتھ لگے صوفوں پر بیٹھے چائے وغیرہ پی رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے کہ ایک دم سے منٹو صاحب کا ایک آدمی سے جھگڑا شروع ہو گیا۔ بات ہاتھا پائی تک پہنچنے والی تھی کہ ہم لوگ دوڑ کر وہاں پہنچ گئے اور بات رفع دفع ہو گئی۔

اس کے بعد منٹو صاحب کو میں نے دوبارہ چینی لنچ ہوم میں بھی نہیں دیکھا۔

منٹو صاحب کی صحت گرنے لگی تھی۔ ایک دن میں اور احمد راہی ان کی مزاج پرسی کے لئے ان کے گھر لکشمی مینشن گئے۔ منٹو صاحب صوفے کے کونے میں پاؤں اوپر اٹھا کر بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ وہ پہلے سے کمزور ہو گئے تھے۔ چہرے کا رنگ بھی جو سرخ و سفید ہوتا تھا زرد پڑ گیا تھا۔ لکھتے لکھتے انہوں نے نظر اٹھا کر ہمیں دیکھا اور دوبارہ لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ ہم سلام کر کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد منٹو صاحب نے کاپی ایک طرف رکھ دی اور مسکرا کر پوچھا۔

''کہاں سے آ رہے ہو؟''

''ٹی ہاؤس میں بیٹھے تھے۔ آپ سے ملنے کو جی چاہا۔ آ گئے۔''

''ہوں!'' منٹو صاحب نے آہستہ سے کہا اور خاموش ہو گئے۔ ہم جتنی دیر وہاں بیٹھے رہے زیادہ باتیں ہم نے ہی کہیں۔ منٹو صاحب بہت کم بولے۔ ہم کچھ دیر بیٹھ کر اجازت لے کر وہاں سے چلے آئے۔ آہستہ آہستہ منٹو صاحب کی صحت خراب ہوتی چلی گئی۔ اب وہ گھر سے بہت کم باہر نکلتے۔ بیٹھے لکھتے رہا کرتے۔ وہ دن میں چار

چار افسانے لکھ لیتے۔ یہ افسانے لے کر کسی پبلشر کے پاس یا اخبار کے دفتر جاتے۔ افسانے دے کر ان کا معاوضہ وصول کرتے اور اپنی مطلب کی چیز خرید کر گھر واپس آ جاتے۔ دیکھتے دیکھتے ان کی صحت خراب ہوتی گئی۔ پھر ایک روز پتہ چلا کر منٹو صاحب کو ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا ہے۔ میں ان سے ملنے میو ہسپتال گیا۔ ہسپتال کی دوسری منزل کے میڈیکل وارڈ میں دروازے کے ساتھ ہی ان کا بیڈ تھا۔ منٹو صاحب بیڈ پر نیم دراز تھے اور ان کی بڑی ہمشیرہ صاحبہ ان کو چمچ سے سوپ پلانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ میں خاموشی سے بیڈ کے قریب بنچ پر بیٹھ گیا۔ منٹو صاحب بے حد نحیف ہو گئے تھے۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر میرے دل کو بڑا دکھ ہو رہا تھا۔ میں خاموش بیٹھا تھا۔ منٹو صاحب نے نگاہیں اٹھا کر میری طرف دیکھا تو میں نے بڑے ادب سے پوچھا۔

''اب کیسی طبیعت ہے منٹو صاحب؟''

اس عظیم افسانہ نگار کے کمزور چہرے پر ایک خفیف سا اداس تبسم ابھرا اور صرف اتنا کہا۔

''بس۔ دیکھ لو خواجہ!''

اس کے کچھ ہی روز بعد سعادت حسن منٹو کا انتقال ہو گیا۔

....

سن 47ء میں قیام پاکستان کے بعد حافظ رحیم بخش صاحب جالندھر سے ہجرت کر کے لاہور آئے تو انہوں نے پاک ٹی ہاؤس کی بنیاد رکھی۔ دبلا پتلا بدن، دراز قد، آنکھوں میں ذہانت کی چمک، سادہ لباس، کم سخن، حافظ رحیم بخش کو دیکھ کر دلی' لکھنؤ کے قدیم وضعدار بزرگوں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔

حافظ صاحب کے اجداد بھی شاہ جہان پور کے رہنے والے تھے۔ بعد میں ان کا خاندان جالندھر میں آ کر آباد ہو گیا۔ ان کے دو بڑے بیٹوں علیم الدین اور سراج الدین نے پاک ٹی ہاؤس کی گدی کو سنبھالا اور ان کے چھوٹے بیٹوں محمد صادق اور حاجی عبدالحمید نے چائنیز لنچ ہوم کی داغ بیل ڈالی' جو کافی ہاؤس کے پہلو میں ہوا کرتا تھا اور جہاں ادیبوں' نقادوں اور شاعروں کے علاوہ وکلاء حضرات بھی بیٹھا کرتے تھے۔ چائنیز لنچ ہوم اب نہیں رہا۔ اس کی جگہ بولان بنک قائم ہو گیا ہے۔ موسیقار امانت علی خان کا

اپنے مداحوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا زیادہ تر چائنیز لنچ ہوم میں ہی تھا۔ سعادت حسن منٹو بھی عام طور پر اسی ریسٹورنٹ میں آتے تھے۔

شاعروں، ادیبوں اور نقاد حضرات کا مستقل اڈہ پاک ٹی ہاؤس ہی تھا۔ وہ ٹی ہاؤس کے شباب کا زمانہ تھا۔ صبح سے لے کر رات تک ادبی محفلیں جمی رہتی تھیں۔ اگر کوئی شاعر یا ادیب ٹی ہاؤس سے اٹھ کر جاتا تھا تو تھوڑی دیر بعد پھر واپس ٹی ہاؤس میں آ جاتا تھا۔ کم از کم میں، نواز، انور جلال، ضمیر الحسنین اور عبدالشکور بیدل یہی کرتے تھے۔

بزرگ نقادوں میں سے سید وقار عظیم، ڈاکٹر عبادت بریلوی اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ویسے تو ایک آدھ دن چھوڑ کر ٹی ہاؤس آ جاتے تھے لیکن اتوار کو یہ حضرات ٹی ہاؤس میں ضرور تشریف لاتے۔ اس روز وائی ایم سی اے ہال اور اس کے بعض کمروں میں انجمن ترقی پسند مصنفین، حلقہ ارباب علم و ادب کے ادبی اجلاس ہوتے تھے۔ افسانے، نظمیں، غزلیں اور مضامین پڑھے جاتے تھے اور بڑی گرم جوشی سے بحث مباحثے ہوتے تھے۔ اتوار کی شام کو ٹی ہاؤس میں تل دھرنے کو جگہ نہیں ہوتی تھی۔ پنجابی مجلس کا ادبی اجلاس بھی اتوار ہی کو ہوتا تھا۔ راجہ رسالو صاحب اس پنجابی انجمن کے میر کارواں تھے۔

دن کے وقت بھی ادیبوں، شاعروں، نقادوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ان میں جو حضرات اورینٹل کالج، گورنمنٹ کالج یا پنجاب یونیورسٹی میں پڑھتے یا پڑھاتے تھے وہ پڑھنے پڑھانے سے فارغ ہوتے ہی ٹی ہاؤس کا رخ کرتے۔ ٹی ہاؤس میں داخل ہوتے ہی دائیں جانب عام طور پر حلقہ ارباب ذوق والوں کی منڈلی بیٹھی ہوتی۔ چوڑے شانوں اور بلند قہقہے لگانے والا شاعر قیوم نظر، بھاری آواز اور دھیمے لہجے میں رک رک کر بڑی ذہانت کی باتیں کرنے والا ریاض، پروفیسر شاعر انجم رومانی، چمکیلی آنکھوں، کشادہ پیشانی والا خوش طبع شاعر شہرت بخاری، تیز اور شگفتہ باتیں کرنے والا سجاد باقر رضوی اور سید سجاد رضوی اور پرجوش لہجے میں ادب پر گفتگو کرنے والا افسانہ نگار سید امجد الطاف اور شاعر احمد مشتاق، افسانہ نگار انتظار حسین اور آہستہ آہستہ گفتگو کرنے والا ذہین نقاد ریاض احمد اور خوش کلام شاعر ناصر کاظمی، شیشے والی قد آدم دیوار کے بیچ نما صوفے پر اور میز کے اردگرد کرسیاں کھینچ کر یہ سب حضرات بیٹھے ہوتے۔ جو

کوئی آتا کرسی نہ بھی ہوتی تو کرسی پر کسی دوست کے ساتھ بیٹھ جاتا۔ دوسری میزوں کے گرد بھی شاعروں، ادیبوں کی محفل جمی ہوتی تھی اور شعر و ادب پر بڑے ذوق وشوق سے بحثیں ہو رہی ہوتی تھیں۔

میں ان سب دوستوں کی منڈلی میں بیٹھتا تھا مگر کبھی کسی بحث میں شریک نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے کہ مجھے شعر و ادب پر بحث کرنی نہیں آتی۔ نہ اس وقت آتی تھی، نہ اب آتی ہے۔ میں ان دوستوں میں خاموش بیٹھا کبھی ٹی ہاؤس کے شیشوں میں سے دکھائی دینے والے درخت کو دیکھنے لگتا اور کبھی اپنے بحث کرتے دوستوں کے چہرے ایک ایک کر کے تکتا رہتا۔ جیسے ہی نواز، تمیر الحسنین یا انور جلال ٹی ہاؤس میں داخل ہوتے میں بحث کرنے والوں کی میز چھوڑ کر ان کی طرف بڑھتا اور ہم اپنی الگ محفل لگا لیتے۔ ہم ادب پر بحث نہ کرنے والے ادیب تھے۔ جلد ہی ہماری الگ محفل انور جلال کے بلند قہقہوں اور تمیر الحسنین کی شگفتہ باتوں اور نواز کی ذومعنی گفتگو اور چائے اور اعلیٰ سگریٹوں کی خوشبوؤں سے گرم ہو جاتی۔ گورنمنٹ کالج کی طرف سے کتابیں بغل میں دبائے سوٹ بوٹ پہنے عبدالشکور بیدل آ کر ہمارے ساتھ بیٹھ جاتا تو ہماری صحت مند غیر ادبی اور شگفتہ باتوں میں موسیقی کا آہنگ خسروی بھی شامل ہو جاتا۔

عبدالشکور بیدل ویسے تو شاعر تھا مگر موسیقی کا گہرا علم رکھتا تھا۔ جس موسیقار نے انڈیا کی فلمی دنیا میں بطور موسیقار اپنے منفرد اسلوبِ موسیقی سے نمایاں مقام حاصل کر رکھا ہے اور جس کی بنائی ہوئی دھنیں بمبئی کی فلم انڈسٹری کے سبھی موسیقاروں سے اپنی الگ پہچان رکھتی ہیں اور جس موسیقار کا نام خیام ہے وہ عبدالشکور بیدل کا چھوٹا بھائی ہے۔ عبدالشکور بیدل گورنمنٹ کالج میں اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد ریڈیو پاکستان لاہور سے منسلک ہو گیا اور بطور پروگرام پروڈیوسر اس نے موسیقی کے شعبے میں یادگار تخلیقی کام کیا۔ اس کی بنائی ہوئی اور ریکارڈ کی ہوئی دھنیں آج بھی ریڈیو پاکستان کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ میں بھی ابتدائی دور میں ریڈیو پاکستان لاہور سے وابستہ ہو گیا تھا چنانچہ میرا اور عبدالشکور بیدل کا اس وقت تک ساتھ رہا جب اس نے چند برس پہلے لاہور سے کراچی ریڈیو جوائن کر لیا اور وہیں اللہ کو پیارا ہو گیا۔ عبدالشکور بیدل کی شخصیت بڑی گہری اور وضع داری کی پابند تھی۔ شاعری اور موسیقی کو اس نے اپنے مزاج میں شامل کر

لیا ہوا تھا جس کی وجہ سے اس کے چہرے پر ہر وقت ایک جذب کی سی کیفیت طاری رہتی تھی۔ اعتدال پسند تھا، چائے کا بڑا اچھا ذوق رکھتا تھا مگر زیادہ چائے نہیں پیتا تھا۔ سگریٹ سلگا کر اسے اس محبت اور شرافت سے پیتا جیسے وہ سگریٹ صرف اسی کے لئے بنایا گیا ہو، مگر زیادہ سگریٹ نہیں پیتا تھا۔ سلطان باہوؒ کا کلام ایسے جذب و سوز میں ڈوب کر گاتا کہ سننے والے پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ ریڈیو سٹیشن کے جس کمرے میں میری میز پر کرسی لگی تھی اس کے ساتھ والا کمرہ اس کا تھا۔ میرا وہ بے تکلف دوست تھا۔ کبھی کبھی میں اس کے پاس جا کر بیٹھ جاتا۔ جن دنوں میرے پاس صبح کو نشر کیا جانے والا پنجابی پروگرام راوی رنگ تھا ان ہی دنوں عبدالشکور بیدل نے خواجہ فرید کی ایک کافی ریکارڈ کروائی۔ مجھ سے کہنے لگا۔

"خواجہ! میں نے خواجہ فریدؒ کی ایک کافی ریکارڈ کی ہے اسے اپنے پروگرام میں لگاؤ۔ لوگ اسے پسند کریں گے۔"

وہ کافی تھی "گرو نے پورے بھید بتائے" یہ دو بڑے سریلے گلوکار بھائیوں نے گائی تھی۔ اس میں لے اور تال کے ساتھ چٹکی بجانے کی آواز آتی تھی۔ میں نے شکور بیدل سے پوچھا کہ یہ ساتھ چٹکی کس نے بجائی ہے۔ شکور بیدل نے کچھ شرماتے ہوئے کہا۔

"یہ چٹکی میں نے بجائی ہے۔"

جن دو نوجوان گلوکار بھائیوں نے یہ کافی عجب سوز و گداز میں ڈوب کر گائی ہے ان کا نام غالباً اعجاز علی، امتیاز علی ہے، میں نے اپنے پروگرام "راوی رنگ" میں یہ کافی کئی بار لگائی اور لوگوں نے اسے پسند کیا۔

منٹو لاہور میں

سعادت حسن منٹو کی زندگی کے آخری ایام لاہور میں بسر ہوئے۔ لاہور کی بیڈن روڈ جہاں مال روڈ سے آ کر ملتی ہے پر دائیں جانب ایک کشادہ احاطہ ہے۔ یہاں بڑے ماڈرن اور خوش نما فلیٹس میں ایک دو منزلہ عمارت کا نام لکشمی مینشن ہے۔ منٹو صاحب اسی لکشمی مینشن کی پہلی منزل کے فلیٹ میں رہائش پذیر تھے۔ وہ قیام پاکستان

کے کچھ ہی عرصے بعد بمبئی سے ہجرت کر کے لاہور آ گئے تھے۔ سن مجھے یاد نہیں۔ میرا خیال ہے 1950ء ہو گا شاید...... ہم لوگ دوسرے تیسرے دن منٹو صاحب سے ملنے ان کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتے تھے۔ میں اور احمد راہی تو تقریباً روزانہ شام کو منٹو صاحب کے فلیٹ پر حاضری دیتے۔ کبھی کبھی اشفاق احمد بھی آ جاتا تھا۔ لکشمی مینشن کے علاوہ منٹو صاحب سے ''سویرا'' کے دفتر میں بھی شرف نیاز حاصل ہوتا۔ احمد راہی ان دنوں رسالہ ''سویرا'' کے ایڈیٹر تھے۔ ظہیر کاشمیری، حمید اختر اور عبداللہ ملک بھی آ جاتے اور بڑی اچھی محفل لگتی۔ ''سویرا'' کے ادب دوست، ادب شناس اور دوست نواز پبلشر مالک چودھری نذیر احمد صاحب ہمارے لئے لوہاری دروازے سے ملائی والی سبز چائے اور انارکلی کی ایک گلی میں واقع خاص دکان سے گاجر کا حلوہ منگواتے۔

چودھری رشید احمد صاحب نے ادبی رسالے ''اردو ادب'' کا اجراء کیا تو سعادت حسن منٹو اور محمد حسن عسکری اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ ''اردو ادب'' رسالے کا کوئی خاص آفس نہیں تھا۔ رسالے کا ادبی مواد عسکری صاحب اور منٹو صاحب کو بھجوا دیا جاتا تھا جسے وہ گھر پر ہی دیکھتے تھے۔ اس وجہ سے بھی منٹو صاحب ''سویرا'' کے آفس ضرور آتے اور چودھری رشید صاحب سے بھی ملاقات کرنے ان کے سٹال پر جاتے۔ ''ادب لطیف'' کا دفتر رسالہ ''سویرا'' کے پہلو میں تھا۔ چودھری نذیر احمد صاحب نے میرے افسانوں کی پہلی کتاب ''منزل منزل'' چھاپی تھی اور ''ادب لطیف'' کے مکتبہ اردو کی طرف سے بھی میری بعض کتابیں اور ناول شائع ہوئے۔ چودھری رشید احمد اور چودھری بشیر احمد صاحب نے انارکلی کتاب گھر کے تحت میرے افسانوں کا تیسرا مجموعہ ''کچھ یادیں، کچھ آنسو'' بڑی خوبصورتی سے چھاپا۔ جس کا سرورق حنیف رامے صاحب نے بنایا تھا۔ اس حوالے سے میرا لوہاری دروازے کے باہر ادب لطیف اور سویرا کے دفتر میں تقریباً روز ہی آنا ہوتا تھا۔ احمد راہی سویرا کا ایڈیٹر تھا۔ وہ میرا گہرا دوست تھا۔ اس سے ملنا بھی ضروری ہوتا تھا۔ ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کا بھی ''سویرا'' اور مکتبہ اردو کے دفاتر میں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ادب میں جدید رجحانات پر بڑی زور و شور سے بحثیں ہوتی تھیں۔ ان ہی دنوں میں نے گوپال متل صاحب کو پہلی اور آخری بار ادب لطیف

کے دفتر میں دیکھا۔ اس وقت تک مجھے متل صاحب کے بارے میں صرف اتنا ہی علم تھا کہ وہ بڑے اچھے شاعر ہیں۔ ترقی پسندوں اور کمیونسٹوں کی اس انتہا پسندانہ پالیسی کے خلاف ہیں کہ آزادی حاصل کرنے کے واسطے خون ریز انقلاب ناگزیر ہے۔ گوپال متل صاحب کی نثر کے جوہر مجھ پر دو تین برس پہلے کھلے جب میں نے ان کی کتاب ''لاہور کا جو ذکر کیا'' پڑھی۔

مجھے زندگی کی دعا دینے والے
ہنسی آ رہی ہے تیری سادگی پہ

یہ گوپال متل کا ہی شعر ہے۔ وہ کھدر کے کرتے پاجامے میں تھے۔ رنگ گہرا سانولا تھا اور گفتگو کا انداز بے باکانہ تھا۔

''سویرا'' یعنی نیا ادارہ کا دفتر ایک دکان میں واقع تھا۔ دکان کے پیچھے دائیں جانب ایک چھوٹی سی نشست گاہ تھی جہاں منٹو صاحب اپنی خاص مجلس لگایا کرتے تھے۔ میں اور ابن انشاء اور ظہیر کاشمیری انکی محفل میں بھی کبھی شریک ہو جایا کرتے تھے۔ منٹو صاحب کی فرمائش پر میں نے انہیں ''اردو ادب'' رسالے کیلئے اپنا ایک افسانہ دیا تھا۔ انہوں نے خود مجھ سے کسی افسانے کی فرمائش کی تھی۔ یہ میرے لئے بڑے اعزاز کی بات تھی۔

ان ہی ایام میں ادارہ فروغ ادب کے زیر اہتمام محمد طفیل صاحب نے جو ادارے کے مالک تھے ادبی رسالے ''نقوش'' کا اجرا کیا۔ اس رسالے کی ادارت احمد ندیم قاسمی اور محترمہ ہاجرہ مسرور صاحبہ کے سپرد ہوئی۔ ''نقوش'' میں میرے اکثر افسانے شائع ہوتے رہے۔ بعد میں طفیل صاحب نے ''نقوش'' کے بڑے یادگار قسم کے نمبر نکالے جو ادب میں سنگ میل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ ''نقوش'' نے ناولٹ نمبر نکالنے کا اعلان کیا۔ طفیل صاحب نے مجھے بھی ناولٹ لکھنے کی دعوت دی۔ ناولٹ نمبر میں چار یا شاید پانچ ناولٹ شامل تھے۔ ایک ناولٹ منٹو صاحب کا تھا۔ ایک شوکت تھانوی صاحب کا تھا۔ ایک ناولٹ اشفاق احمد کا تھا اور ایک ناولٹ میرا تھا۔ طفیل صاحب نے اس ناولٹ نمبر کے لئے میری، منٹو صاحب، شوکت تھانوی اور اشفاق احمد

کی لارنس باغ (باغِ جناح) میں ایک گروپ فوٹو بھی اتروا کر چھاپی۔ جو ایک یادگار تصویر ہے۔ ''نقوش'' کا دفتر ایک روڈ پر تھا۔ لاہور کے ادیب شاعر اور نقاد حضرات اکثر ''نقوش'' کے دفتر میں آتے جاتے تھے۔ ان میں ڈاکٹر عبادت بریلوی، جناب وقار عظیم صاحب، ابواللیث صدیقی اور احمد ندیم قاسمی کے نام نمایاں ہیں۔ میں بھی ان بڑے ادیبوں سے ملنے آ جاتا تھا۔ یہ میرے بزرگ تھے، مجھ سے بڑی شفقت اور محبت کا سلوک کرتے تھے اور اپنے پاس بٹھاتے تھے۔ منٹو صاحب کبھی کبھار ہی ''نقوش'' کے دفتر آتے تھے۔

عجیب بات ہے میں نے منٹو صاحب کو سب سے پہلے آل انڈیا ریڈیو دلی سٹیشن کے آفس میں دیکھا۔ مجھے آٹھویں جماعت سے اٹھا کر بڑی ہمشیرہ صاحبہ اور بھائی جان کیپٹن ممتاز ملک کے ساتھ رنگون بھیجا جا رہا تھا۔ سن مجھے یاد نہیں رہتے۔ دوسری عالمگیر جنگ شروع ہو چکی تھی اور یہ وہ زمانہ تھا جب اردو شعر و ادب کے تقریباً سبھی نامور ادیب دلی ریڈیو سٹیشن پر ملازم ہو گئے تھے۔ ن م راشد تھے۔ میرا جی تھے، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، مہدی علی خاں، اوپندر ناتھ اشک، راجندر سنگھ بیدی کے اسمائے گرامی نمایاں ہیں۔ فیض احمد فیض صاحب اور مولانا چراغ حسن حسرت صاحب اعزازی فوجی عہدہ پانے کے بعد فوج کی پریس برانچ سے منسلک ہو چکے تھے۔ حسرت صاحب ''فوجی اخبار'' کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ہو گئے تھے۔ ن م راشد دلی ریڈیو سٹیشن پر ڈائریکٹر پروگرامز کے عہدے پر فائز تھے۔ بھائی جان سے ان سب کی دوستی تھی۔ چنانچہ امرتسر سے رنگون جاتے ہوئے راستے میں ہم لوگوں نے دلی میں راشد صاحب کی کوٹھی میں چند روز قیام کیا۔ ن م راشد صاحب کی پرانی وضع کی کشادہ کوٹھی دلی کی علی پور روڈ پر تھی۔ آل انڈیا ریڈیو کے سٹوڈیوز بھی اسی سڑک پر واقع تھے اور اولڈ سیکرٹریٹ بھی آل انڈیا ریڈیو والی لین Lane کے بالمقابل علی پور روڈ پر ہی تھا۔ میری عمر اس وقت زیادہ سے زیادہ تیرہ چودہ سال کی تھی۔ بھائی جان صبح ن م راشد کے ساتھ ریڈیو سٹیشن جاتے تو مجھے بھی ساتھ لے لیتے۔ انہیں رنگون جانے سے پیشتر دلی ریڈیو پر کچھ ضروری کام نمٹانے تھے۔ میں ن م راشد صاحب کے پاس بیٹھ جاتا۔

راشد صاحب کی بڑی سی میز ایک بڑے کمرے میں لگی تھی۔ جس کے دائیں بائیں صوفہ سیٹ اور سامنے کرسیاں لگی تھیں۔ میں خاموشی سے صوفے پر بیٹھ جاتا۔ اس کمرے میں دو اور ادیب بھی اپنی چھوٹی سی میز کے سامنے کرسی پر بیٹھے لکھنے میں مصروف نظر آتے تھے۔ ان میں سے ایک اس زمانے کے مشہور افسانہ نگار چندر کانت تھے جن کے افسانے میں بڑے شوق سے ''ادبی دنیا'' رسالے میں پڑھا کرتا تھا۔ دوسری میز پر سعادت حسن منٹو بیٹھتے تھے۔

یہاں میں نے پہلی بار منٹو صاحب کو دیکھا۔ گورا چٹا رنگ، صحتمند بھرا بھرا جسم، چوڑی فراخ پیشانی، بڑے خوبصورت نیم گھنگھریالے بال، موٹے فریم کا چشمہ جس کے شیشوں کے پیچھے بڑی بڑی چمکیلی ہر شے کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی آنکھیں...... میں منٹو صاحب کا زبردست مداح تھا اور ان کا ہر افسانہ پڑھتا تھا۔ میں نے انہیں پہچان لیا تھا۔ رسالوں میں ان کی تصویر چھپتی رہتی تھی اور ن م راشد صاحب نے بھی مجھے بتایا کہ ''یہ منٹو صاحب ہیں۔ اردو کے نامور افسانہ نویس'' منٹو صاحب خاموشی سے لکھنے میں مصروف تھے۔ اس زمانے میں سعادت حسن منٹو نے بڑے کمال کے ریڈیائی فیچر اور ڈرامے لکھے۔ ''جنازے'' اور ''آؤ'' اس زمانے کے ان کے مشہور ڈراموں اور فیچرز کی یادگار کتابیں ہیں۔ کرشن چندر کو بھی میں نے پہلی بار ن م راشد کے پاس دیکھا۔ ن م راشد صاحب کے ہاں ہمارا قیام تین چار روز ہی رہا۔ اس کے بعد ہم دلی سے کلکتے روانہ ہو گئے۔ جہاں سے ہمیں بحری جہاز میں سفر کر کے رنگون جانا تھا۔

اس کے بعد میں نے منٹو صاحب کو دوسری بار لاہور میں ان کے مکان لکشمی مینشن میں دیکھا۔ جب وہ پاکستان بننے کے بعد بمبئی کو ہمیشہ کیلئے چھوڑ کر پاکستان آ گئے تھے۔ ایک روز اپنے مکان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے منٹو صاحب بمبئی چھوڑنے کی وجہ بیان کر رہے تھے۔ جو احباب وہاں بیٹھے تھے ان میں' میں بھی تھا۔ منٹو صاحب کہہ رہے تھے۔

''اب میرا بمبئی میں رہنا مشکل ہو گیا تھا کیونکہ میرے وہ دوست جو مذہب کے معاملے میں آزاد خیال تھے یعنی اداکار شیام اور اشوک کمار، اب وہ بھی میرے منہ پر

پاکستان کو برا بھلا کہنے لگے تھے۔ یہ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور میں نے بمبئی کو ہمیشہ کیلئے چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔"

مسعود پرویز نے منٹو صاحب سے مل کر ایک پنجابی فلم کی کاغذی تیاریاں شروع کر دیں۔ ریگل سینما کی دوسری یا شاید تیسری منزل پر فلم کا آفس تھا۔ منٹو صاحب فلم کا سکرین پلے لکھنے لگے۔ وہ مختلف خوشنما پنسلیں اور ربڑ لے کر میز کے سامنے بیٹھ جاتے اور لکیر دار بے داغ کاغذ پر فلم کا سکرین پلے اور پھر مکالمے لکھتے رہتے۔ کبھی کبھی وہ اپنا بڑا سا چہرہ اٹھا کر موٹی موٹی آنکھوں سے کمرے کا جائزہ لیتے اور دوبارہ لکھنے میں مصروف ہو جاتے۔ احمد راہی فلم کے پنجابی گیت لکھ رہا تھا۔ میوزک ڈائریکٹر رشید عطرے تھے۔ میں دن میں ایک بار فلم کے آفس میں ضرور آتا اور کچھ دیر بیٹھ کر واپس چلا جاتا۔ منٹو صاحب کو شاید بمبئی میں ایک علت لگ گئی تھی جو پاکستان آ کر بھی ان کے ساتھ ہی لگی رہی۔ آہستہ آہستہ اس علت نے ان کی صحت پر برے اثرات مرتب کرنا شروع کر دیئے۔ پنجابی فلم تو نہ بن سکی اور منٹو صاحب نے اخباروں میں کالم نگاری بھی کی۔ مگر کچھ ہی دن کے بعد کالم نویسی چھوڑ کر افسانے لکھنے شروع کر دیئے۔ اپنی علت کے اخراجات پورے کرنے کے لئے بھی انہیں کچھ نہ کچھ لکھنا پڑتا تھا۔

میں ان دنوں "آفاق" اخبار سے وابستہ تھا۔ منٹو صاحب اخبار کے ادبی ایڈیشن کیلئے ایک دو افسانے لے کر آتے۔ اخبار کے منیجر اقبال صاحب کو دیتے۔ معاوضہ وصول کرتے اور وہیں سے واپس چلے جاتے۔ منٹو صاحب اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے لکھتے تھے بلکہ انہیں افسانے لکھنے پڑتے تھے۔ ظاہر ہے ایسی صورتحال میں افسانے کا معیار برقرار رکھنا مشکل ہو جاتا ہے لیکن منٹو صاحب کا نام بڑا نام تھا۔ اخباروں اور رسالوں کے ایڈیٹر ان کے افسانے لے کر انہیں اسی وقت معاوضہ ادا کر دیتے تھے۔ یہ تین تین یا زیادہ سے زیادہ ساڑھے تین فل سکیپ صفحوں پر لکھے ہوئے افسانے ہوتے تھے اور منٹو صاحب کو روزانہ دو تین افسانے لکھنے پڑتے تھے۔ انہیں ایک افسانے کا معاوضہ دس پندرہ روپے تک اور کبھی بیس روپے بھی مل جاتے تھے۔ ضرورت کے تحت اور رواں روی میں لکھے گئے افسانوں کا معیار کم تر ہوتا چلا گیا۔ پبلشر منٹو

صاحب کو انکار تو نہیں کر سکتے تھے لیکن اب منٹو صاحب کو آتا دیکھ کر ادھر ادھر ہو جاتے۔

ایک روز کا ذکر ہے میں "نقوش" کے ایبک روڈ والے دفتر میں بیٹھا تھا۔ وہاں پر محترم پروفیسر وقار عظیم صاحب اور پروفیسر ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب بھی تشریف رکھتے تھے۔ طفیل صاحب اپنی سیٹ پر بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے کہ باہر ایک تانگہ آ کر رکا۔ اس میں سے منٹو صاحب اتر کر اندر آ گئے۔ انہوں نے حاضرین مجلس میں سے کسی کی طرف توجہ نہ دی۔ ان کے ہاتھ میں کچھ تہہ کئے ہوئے کاغذ تھے۔ وہ سیدھے طفیل صاحب کے پاس آئے۔ انہیں کاغذات دے کر کہا۔

"یہ تین افسانے ہیں۔ ان کا معاوضہ ابھی ادا کر دیں۔"

طفیل صاحب نے نہایت اچھے اخلاق کا مظاہرہ کیا۔ خندہ پیشانی سے منٹو صاحب کے افسانے لئے اور جو ان کا معاوضہ بنتا تھا انہیں ادا کر دیا۔ منٹو صاحب نے پیسے جیب میں ڈالے اور جس طرح آئے تھے اسی طرح دکان سے واپس نکل کر تانگے میں بیٹھے اور تانگہ آگے چل پڑا۔ محترم وقار صاحب، عبادت صاحب اور طفیل صاحب نے کوئی تبصرہ نہ کیا۔ میں بھی خاموش تھا لیکن ان سب حضرات کے چہروں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ انہیں منٹو صاحب کی اس حالت پر دکھ محسوس ہوا ہے۔

اس حالت میں بھی منٹو صاحب نے اپنی عزت نفس کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور کسی کے آگے دست سوال دراز کرنے کی بجائے اپنی جان مار کر جیسا بھی لکھا گیا خود لکھا اور اسے فروخت کر کے اپنی ضرورت پوری کی۔ "زمیندار" اخبار کے مولا داد صاحب اور سپرا صاحب نے روزنامہ "منشور" نکالا تو اس کی ادارت کی ذمہ داری مظفر احسانی صاحب کے سپرد ہوئی۔ مظفر احسانی صاحب نے مجھے دوپہر کی شفٹ کا انچارج بنا دیا۔ میں "احسان" اخبار میں ان کی زیر ادارت کام کر چکا تھا اور وہ مجھ سے ہمیشہ بڑی شفقت کا سلوک کرتے تھے۔ اخبار کا ادبی ایڈیشن بھی میرے پاس تھا۔ اخبار کا دفتر گوالمنڈی میں پیرس ہوٹل کی دوسری منزل پر تھا۔ ایک روز منٹو صاحب اخبار کے دفتر میں آئے اور مولا داد صاحب کو دو افسانے دے کر معاوضہ وصول کر کے چلے گئے۔ مولا داد صاحب نے دونوں افسانے مظفر احسانی صاحب کو دے دیئے۔ احسانی صاحب نے

دونوں افسانے پڑھے۔ پھر مجھے دے کر کہا۔

''انہیں پڑھ لیں اور مجھے اپنی رائے سے آگاہ کریں۔''

ان میں سے ایک افسانہ بہت خطرناک تھا۔ میں نے احسانی صاحب سے کہا۔

''اگر آپ میری رائے مانگتے ہیں تو میں عرض کروں گا کہ یہ افسانہ اگر اخبار میں چھپ گیا تو اخبار کی ضمانت ضبط ہو جائے گی۔''

مظفر احسانی صاحب مسکرائے...... کہنے لگے۔

''یہ افسانہ پڑھ کر میں بھی اسی نتیجے پر پہنچا ہوں۔ ہم نے منٹو صاحب کو اس کا معاوضہ دے دیا ہے مگر یہ افسانہ چھاپیں گے نہیں۔''

یہ بات منٹو صاحب تک بھی پہنچ گئی کہ اے حمید نے ان کے ایک افسانے کو خطرناک سمجھ کر اخبار کے ادبی ایڈیشن میں نہیں چھاپا۔ منٹو صاحب غضبناک ہو کر اخبار کے دفتر پہنچ گئے۔ میں نے مظفر احسانی صاحب کے کمرے میں منٹو صاحب کی غصیلی آواز سنی۔

''کہاں ہے اے حمید؟ وہ کون ہوتا ہے میرے افسانے کو ناپسند کرنے والا؟''

میں نے منٹو صاحب کی آواز سنی تو سب کچھ چھوڑ کر دفتر کی دوسری سیڑھیاں اتر کر چوک گوالمنڈی میں آ گیا۔ وہاں سے موچی دروازے کی طرف غائب ہو گیا۔

☆......☆......☆

ن۔م۔راشد

پنجاب ایکسپریس یا ہوڑہ ایکسپریس' جالندھر' لدھیانہ' پھگواڑہ کے کھیتوں میں دھواں اڑاتی' سیٹی بجاتی کھٹا کھٹ اڑتی چلی جا رہی ہے۔ میری نوعمری کا زمانہ تھا۔ شاید نویں یا دسویں جماعت میں تھا۔ ٹرین کی کھڑکی سے لگا کھیتوں' درختوں' نہروں' دریاؤں اور آم کے باغوں اور دھریک کے گھنے جھنڈوں میں نظر آتے کچے مکانوں کو تک رہا تھا اور میرے سیاہ بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ پھر ایک بہت بڑے شہر کے مکانات شروع ہو گئے۔ ٹرین ایک پل پر سے گزری۔ نیچے سڑک تھی تانگے چل رہے تھے۔ ٹرین ایک بہت بڑے ریلوے یارڈ میں سیٹیاں دیتی داخل ہو گئی۔ چاروں طرف ریل کی پٹڑیوں کا جال بچھا تھا۔ انجن شنٹ کر رہے تھے۔ ٹرین کی رفتار کم تھی اور مختلف پٹڑیوں پر سے ہوتی' بل کھاتی' ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ٹرین ایک کشادہ پلیٹ فارم میں شور مچاتی' وسل دیتی داخل ہو گئی۔ ایک بورڈ پر اردو اور انگریزی میں شہر کا نام دلی لکھا تھا۔

دلی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے

میر تقی میر کے اس شعر سے میں ابھی ناواقف تھا۔ دلی کے گلی کوچوں میں بھی پہلی بار آوارہ گردی کرنے والا تھا۔ اوراق مصور میری آنکھوں کے سامنے ایک ایک کر کے کھلنے والے تھے۔ سامان سٹیشن سے باہر نکالا گیا۔ ہم تانگے میں بیٹھ کر ن م راشد صاحب کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

بھائی جان' ن م راشد کے پرانے دوست تھے۔ میں نے ابھی افسانے لکھنے شروع نہیں کیے تھے۔ راشد صاحب کا شمار صف اول کے ترقی پسند شعراء میں ہوتا ہے۔

ان کی معرا نظموں کا پورے ملک میں شہرہ تھا۔ شاید ماوراء شائع ہو چکی تھی۔ میں ان نظموں کو بڑے شوق سے پڑھا کرتا تھا۔ میں ان سے پہلی بار ملنے والا تھا۔ تانگہ دلی کی سڑکوں پر سے ہوتا شہر سے باہر آ گیا تھا۔ ایک جگہ دیوار پر میں نے اندرا پرستھا گرلز کالج لکھا دیکھا۔ مجھے آج بھی یاد نہیں کہ وہ کون سی سڑک تھی جس پر راشد صاحب کی کوٹھی تھی۔ ہم علی پور روڈ پر سے گزرے تھے۔ تانگہ ایک پرانی وضع کی لمبے برآمدوں' بلند ستونوں اور اونچی چھتوں والی کوٹھی کے کشادہ گیٹ میں سے گذر کر برآمدے کے ستونوں کے پاس رک گیا۔ ایک درمیانے قد کا خوش شکل' تیز چمکیلی آنکھوں والا' پکی عمر کا آدمی کرتے پاجامے میں باہر نکلا اور بھائی جان سے گلے ملا۔ یہ ن م راشد تھے۔

''ممتاز تم نے کمال کر دیا۔ میں رات فرنٹیئر میل کو دیکھتا رہا۔ سوچا شاید تم نے پروگرام بدل دیا ہے۔ چلو اندر آؤ۔''

بھائی جان نے میرا تعارف کروایا۔ راشد صاحب نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''سناؤ پہلوان! کیا حال ہے؟''

میں موٹا اور صحت مند ہوا کرتا تھا۔ راشد صاحب کے سر پر سنہری بال تھے۔ ابھی ان کا سر بالوں سے فارغ نہیں ہوا تھا۔ ان کے چہرے پر بڑی شرمیلی سی مسکراہٹ تھی۔ وہ مجھے اچھے لگے۔ چہرے پر آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔

پھر وہ ہمیں اپنے دفتر لے گئے۔ ان دنوں وہ آل انڈیا ریڈیو دلی پر پروگرام ڈائریکٹر ہوا کرتے تھے۔ آل انڈیا ریڈیو دلی کا دفتر علی پور روڈ پر پرانے سیکرٹریٹ کے سامنے تھا۔ میں ان کے کمرے میں کچھ دیر بیٹھا رہا۔ انہوں نے چائے منگوائی تھی اور بھائی جان سے اپنے لاہور کے دوستوں کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ شام کو انہوں نے کوٹھی کے باہر کرسیاں ڈلوا لیں۔ انہوں نے اپنے دلی کے دو تین دوستوں کو بھی کھانے پر بلا رکھا تھا۔ کھانے کی میز پر طرح طرح کے کھانے سجے ہوئے تھے۔ میں ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔ کمرہ خالی تھا۔ دیوار کے ساتھ ادب لطیف کا کوئی سالنامہ بھی تھا جس کے سرورق پر کرشن چندر' بیدی اور منٹو کی تصویریں تھیں۔ میں اس رسالے کو دیکھ رہا تھا کہ راشد صاحب کی آواز آئی۔

''پہلوان! تم کہاں چلے گئے؟''

کھانے کی میز پر بڑی دلچسپ باتیں ہوئیں۔ وہ باتیں مجھے یاد نہیں۔ لیکن اتنا یاد ہے کہ راشد صاحب قہقہے لگا کر ہنس رہے تھے اور ہنسا رہے تھے۔ کھانے کے بعد میں کوٹھی کے برآمدے کی سیڑھیوں میں بیٹھ گیا۔ سامنے وسیع و عریض لان میں ہمارے بچھونے لگے تھے۔ جھاڑیوں میں موتیے کے پھولوں کی خوشبو آ رہی تھی۔

راشد صاحب کے ہاں ہم دو روز ٹھہرے اور پھر میں بھائی جان کے ہمراہ رنگون روانہ ہو گیا۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ جاپان نے اتحادیوں کیخلاف اعلان جنگ کر دیا۔ رنگون پر بمباری شروع ہوئی تو برما گورنمنٹ رنگون سے ہجرت کر کے شملے آ گئی۔ مجھے ایک آخری بحری جہاز میں سوار کروا کر کلکتے روانہ کر دیا گیا۔ رات کو جہاز پر بلیک آؤٹ کر دیا جاتا۔ خطرہ تھا کہ جاپانی آبدوز اسے غرق نہ کر دے۔ لیکن جہاز خیریت سے کلکتے پہنچ گیا۔

بھائی جان قافلوں کے ساتھ رنگون سے پیدل چل کر کاکس بازار پہنچے۔ جنگ زوروں پر تھی۔ انہیں چراغ حسن حسرت اور فیض احمد فیض کے ساتھ دلی کے فوجی اخبار میں نوکری مل گئی۔ میں انہیں ملنے امرتسر سے دلی گیا۔ وہ علی پور روڈ کے آخر میں لکھنؤ روڈ کے قریب تیمار پور میں رہتے تھے۔ برابر میں چراغ حسن حسرت کا کوارٹر تھا۔ شام کو صحن میں کرسیاں ڈال کر دوست احباب بیٹھ جاتے۔ ان میں سجاد سرور نیازی' اوپندر ناتھ اشک' حمید نسیم اور مظہر ہاشمی بھی ہوتے۔ حسرت صاحب اپنی دلچسپ باتوں سے محفل کو خوب گرماتے۔ کبھی کبھی راشد صاحب بھی آ جاتے اوپندر ناتھ اشک اپنی ہندی کی نظمیں سنایا کرتا تھا۔

یہاں سے نقل مکانی کر کے بھائی جان دلی کے علاقے تیس ہزاری میں آ گئے۔ این ٹائپ کے کوارٹروں کی ایک قطار میں سب سے آخری کوارٹر سعادت حسن منٹو کا تھا۔ اس کے بعد ن م راشد کا کوارٹر تھا۔ پھر اوپندر ناتھ اشک' اس کے بعد کرشن چندر اور پھر ہمارا کوارٹر تھا۔ ہمارے ہی کوارٹر کے ایک کمرے میں راجہ مہدی علی خان قیام پذیر تھے۔ یہ آل انڈیا ریڈیو دلی کے عروج کا زمانہ تھا۔ یہ سب نابغہ روزگار ادیب اور شاعر دلی ریڈیو پر ملازم تھے۔ سعادت حسن منٹو' راشد صاحب کے کمرے میں بیٹھتے تھے۔ یہ

میرا آوارہ گردیوں کا زمانہ تھا۔ میں صبح تیس ہزاری والے اپنے کوارٹر سے نکل کر راشد صاحب کے پاس ریڈیو سٹیشن آ جاتا' راشد صاحب مجھ سے بے حد شفقت سے پیش آتے۔ ان کی بڑی میز کے پاس ایک صوفہ پڑا ہوتا تھا۔ میں اس صوفے پر جا کر بیٹھ جاتا۔ راشد صاحب مسکرا کر عینک کے پیچھے سے دیکھتے ہوئے کہتے۔

''پہلوان! چائے منگوائی جائے تمہارے لیے' کیا خیال ہے اور بسکٹ بھی؟''

میں ان سے کسی قسم کی ادبی گفتگو نہیں کر سکتا تھا۔ بس صوفے پر بیٹھا چائے پیتا اور راشد صاحب سے لاہور اور امرتسر کی باتیں کرتا رہتا۔ سامنے دیوار کے ساتھ سعادت حسن منٹو کی میز لگی تھی۔ منٹو صاحب وہاں بیٹھ کر ریڈیو کیلئے سکرپٹ لکھا کرتے۔ وہ زیادہ تر خاموش رہتے' کسی وقت اپنی گول گول آنکھیں گھما کر میری طرف دیکھتے اور پھر اپنے کام میں معروف ہو جاتے۔ یہ اسی دفتر کا واقعہ ہے کہ ایک روز بڑی بارش ہو رہی تھی۔ راشد صاحب دفتر میں بیٹھے کام کر رہے تھے۔ برآمدے کے باہر ایک ایسی سائیکل بارش میں بھیگ رہی تھی جس کے نہ پیڈل تھے اور نہ گدی تھی۔ منٹو صاحب اندر آئے اور راشد صاحب کو مخاطب کر کے بولے۔

''راشد! تمہاری شاعری باہر بھیگ رہی ہے۔''

راشد صاحب کے اسی کمرے میں' میں نے کرشن چندر کو پہلی اور آخری بار دیکھا۔ وہ قمیض پتلون میں ملبوس اندر آئے۔ راشد صاحب کے میز کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔

جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور راشد صاحب سے کہا۔

''زندگی بڑی اجیرن ہو گئی ہے راشد صاحب!''

راشد صاحب ہر ایک سے اپنی مخصوص دلکش اور شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ بات کرتے۔ ہنستے تو ان کے چھوٹے چھوٹے دانتوں کی قطاریں دکھائی دیتیں۔ کسی لطیفے پر قہقہہ لگاتے تو سر پیچھے کو کر لیتے۔ فارسی کے شعر بہت سناتے تھے۔ انہیں سینکڑوں فارسی کے شعر یاد تھے۔ میں ریڈیو سٹیشن کے لان اور سٹوڈیوز میں گھومتا پھرتا میں نے ایک کمرے میں میرا جی کو دیکھا۔ عجیب قسم کے رومال کو گلے میں باندھے کرسی پر پاؤں رکھے ایک خالی کمرے کی میز پر بیٹھے تھے اور خلا میں گھور رہے تھے۔ کینٹین میں ہری چند

چڈا' ایس ایس ٹھاکر' چندر کانت اور شیام کی ہونے والی بیوی ممتاز کو دیکھا۔ زیب قریشی اور پنڈت اونکار ناتھ ٹھاکر اور گوالیار والے پنڈت کرشنا راؤ کو دیکھا۔

ریڈیو کی کینٹین کے باہر نیم کا ایک گھنا درخت تھا۔ اس درخت کی چھاؤں میں ایک لمبا میز بچھا رہتا جس کی دونوں جانب بنچ لگے تھے۔ دلی ریڈیو کے آرٹسٹ اسی میز پر بیٹھ کر چائے پیا کرتے اور اپنے سازوں کو سر کیا کرتے تھے۔ کینٹین کا ایک کشادہ کمرہ بھی تھا جس کی فضا شامی کبابوں' آملیٹ اور دال کے تڑکے کی خوشبو سے بوجھل رہتی۔ راشد صاحب کو میں نے اس کینٹین میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں ہی چائے پیتے اور دوست احباب وہیں ان کے پاس آ کر مجلس جماتے تھے۔ روایتی شاعروں والی ان میں کوئی بات نہیں تھی۔ وہ شعر فہم زیادہ اور شاعر کم لگتے تھے۔ صرف اس وقت وہ سر سے پاؤں تک شاعر لگتے جب اپنی کوئی نظم سناتے۔ اس وقت راشد صاحب کے چہرے پر ایک چمک سی آ جاتی۔ کبھی وہ آنکھیں بند کر لیتے اور سر کو آہستہ سے پیچھے کو لے جاتے۔ نظم کے الفاظ ان کے ہونٹوں سے ایک ایک کر کے بڑی شائستگی کے ساتھ باہر آتے۔ لفظ کا وہ پورا حق ادا کرتے۔ وہ اسے پوری طرح آراستہ کر کے آواز کے حوالے کرتے۔ مجھے ان کے نظم سنانے کا انداز بڑا پسند تھا۔

تیس ہزاری کے علاقے میں اپنے قیام کے دوران ن م راشد صاحب چونکہ تین چار کوارٹر چھوڑ کر رہتے تھے اس لئے شام کو اکثر ہمارے ہاں آ جاتے۔ بھائی جان اور وہ برآمدے میں یا کبھی دیوان خانے میں بیٹھ کر چائے پیتے اور اپنے خاص انداز میں دھیمے دھیمے بڑی مزیدار باتیں کرتے۔ بات کر کے کبھی ذرا سا مسکراتے' کبھی بغیر آواز کے ہنستے اور کبھی قہقہہ لگا کر سر پیچھے کو لے جاتے۔ فارسی اور انگریزی ادب پر راشد صاحب بے تکان گفتگو کرتے۔ مجھے ان کی باتیں بھی بہت پسند تھیں اور گفتگو کرنے کا انداز بھی بہت اچھا لگتا تھا۔ میں ان کے قریب آ کر بیٹھ جایا کرتا تھا۔ کسی وقت وہ میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہتے۔

''سناؤ پھر پہلوان! ایکٹر بننے بمبئی کب جا رہے ہو۔''

ان دنوں مجھ پر بمبئی جا کر ایکٹر بننے کا بھوت سوار تھا۔ میں ہنس کر خاموش ہو رہتا۔ راشد صاحب پنجابی میں بھی اس انداز سے بات کرتے کہ معلوم ہوتا اردو بول

رہے ہیں اور اردو اس طرح بولتے کہ لگتا فارسی بول رہے ہیں۔ ان کی زبان سے جو لفظ بھی ادا ہوتا بڑا دلکش لگتا۔ کوئی بھی بازاری لفظ کبھی ان کی زبان پر نہیں آتا تھا۔ بات اگر گنڈیریوں کی بھی ہوتی وہ ہمیشہ کلاسیکی زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے۔

راجہ مہدی علی خان سائیکل پر دفتر جاتے تھے۔ راشد صاحب کو ریڈیو کی گاڑی لینے آتی' کبھی وہ تانگے میں سوار ہو کر ریڈیو سٹیشن جاتے۔ لباس کے معاملے میں بڑے وضع دار تھے۔ ہمیشہ صاف ستھرے کپڑے پہنتے۔ کوٹ پتلون سے زیادہ رغبت تھی۔ گھر میں ململ کا کرتہ اور چوڑی مہری کا لٹھے کا پاجامہ پہنتے۔ گرمیوں میں اکثر بش شرٹ اور پتلون میں ملبوس رہتے۔ دلی میں تیس ہزاری کے زمانے میں ان کے سر پر کافی بال تھے بعد میں تو کافی جھڑ گئے اور سر ننگا ہو گیا۔ لیکن ان کا بالوں کے بغیر سر بھی بڑا خوبصورت لگتا تھا۔ جیسے کسی رومن مجسمے کا سر ہو۔

ایک روز تیسرے پہر کالی گھٹا چھا گئی۔ نیم کے درخت ساون کی ٹھنڈی ہوا میں جھولنے لگے۔ ہمارے کوارٹر کے سامنے بھیروں جی کا مندر تھا۔ اس کے برابر میں نیم کے درختوں کے جھنڈ تھے اور دھوبیوں کے کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ ساون کی ہلکی ہلکی پھوار میں دھوبیوں کی بچیوں نے درختوں میں جھولے ڈال رکھے تھے اور انہیں جھلاتے ہوئے گا رہی تھیں۔

آئی ساون کی بہار رے

راشد صاحب برابر میں کرشن چندر کے کوارٹر سے نکل کر ہمارے کوارٹر کی طرف آئے۔ میں برآمدے میں بیٹھا لڑکیوں کو ساون کے گیت گاتے اور جھولے جھلاتے دیکھ رہا تھا۔ راشد صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''پہلوان موسم انجوائے کر رہے ہو۔ ممتاز صاحب کہاں ہیں؟''

میں اٹھ کر ان کے پاس گیا اور بتایا کہ بھائی جان شہر کسی کام سے گئے ہیں۔ پھوار بارش میں تبدیل ہو گئی تھی۔ میں بھاگ کر اندر سے راشد صاحب کیلئے کرسی لے آیا۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئے۔ موسم بڑا خوشگوار تھا۔ ساون کی جھڑی لگی تھی۔ سامنے لڑکیاں جھولے جھلاتی گیت گا رہی تھی۔ راشد صاحب کہنے لگے۔

''پہلوان لاہور کی لڑکیاں ساون کے گیت گاتی ہیں کیا؟''

میں نے جواب دیا کہ میں نے لڑکیاں جھولے جھلاتی ضرور دیکھی ہیں مگر ان کے گیت کبھی نہیں سنے۔ تھوڑا سا مسکرائے اور بولے۔

''یار ہمارے لٹریچر نے بہت جھوٹ بولا ہے۔ بس اب ختم کر دینا چاہیے یہ کاروبار۔''

اتنے میں تانگہ آ کر رکا اور بھائی جان اس میں سے اترے۔ پھر ان کی راشد صاحب کے ساتھ مجلس جم گئی۔ ایک کوارٹر چھوڑ کر اوپندر ناتھ اشک بھی آ گئے۔ کچھ دیر بعد راجہ مہدی علی خان بھی سائیکل پر بھیگتے تشریف لے آئے اور مجلس کی رونق دوبالا ہو گئی۔

جنگ ختم ہو گئی۔ پھر تحریک پاکستان کے عروج کا زمانہ آ گیا۔ پاکستان بن گیا۔ وسیع پیمانے پر نقل آبادی شروع ہو گئی۔ ہم امرتسر سے نکل کر لاہور آ گئے۔ راشد صاحب کا گھر گوجرانوالہ میں تھا۔ وہ بھی پاکستان آ گئے۔ کوہ مری کی پہاڑیوں میں ایک ہوٹل میٹروپول ہوا کرتا تھا۔ جو کافی بلندی پر واقع تھا۔ یہ ہوٹل فسادات میں جل گیا تھا۔ اور صرف اس کا ڈھانچہ ہی باقی تھا۔ اس کی تھوڑی بہت ضروری مرمت کر کے یہاں آزاد کشمیر کا ایک ریڈیو سٹیشن بنا دیا گیا اور نشریات شروع ہو گئیں۔ ن م راشد اس ریڈیو سٹیشن کے ڈائریکٹر بن کر آئے تو میں بھی وہاں سکرپٹ وغیرہ لکھنے لگا۔ شاید 1949ء کا زمانہ تھا۔ میں ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے ادبی حلقوں میں متعارف ہو چکا تھا۔ اس ریڈیو سٹیشن پر جو لوگ سکرپٹ لکھتے اور آواز لگاتے تھے ان میں مختار صدیقی' یوسف ظفر' اعجاز حسین بٹالوی' آغا بابر بٹالوی' شمیم احمد' ممتاز مفتی' محمد حسین' نفیس خلیلی' نور محمد تاج' تقی احمد سید' کیپٹن ممتاز ملک' نصیر انور' رضی ترمذی اور خمار دہلوی شامل تھے۔ شدید برفباری میں رات کو آخری ٹرانسمیشن کے بعد ہم ڈھلوانی برفانی راستوں پر سنبھل سنبھل کر اتر رہے ہوتے اور ہمیں دور کشمیر کے پہاڑوں کی برف پوش چوٹیاں دکھائی دیا کرتیں۔ ان دنوں یہ گیت بڑا مشہور تھا

دل کی دنیا بسا گیا ہے کون

اعجاز حسین بٹالوی ریڈیو سٹیشن کی عمارت سے کچھ فاصلے پر رہتا تھا۔ ایک دن بڑی برف پڑی۔ سردی اتنی شدید تھی کہ جیب سے ہاتھ باہر نہیں نکلتا تھا۔ ہم رات کو گرم

جرابیں پہن کر لحاف کے اندر کمبل اوڑھ کر اور پاؤں میں گرم پانی کی بوتل رکھ کر سوئے تب کہیں نیند آئی تھی۔ میں اپنے کمرے میں لحاف کے اندر لیٹا گرم ہو کر کوئی کتاب پڑھ رہا تھا کہ نوکر نے آ کر کہا کہ اعجاز حسین بٹالوی نے کہا ہے کہ جتنی جلدی ہو سکے میرے پاس آ جاؤ۔ بادل نخواستہ لحاف ہٹا کر اٹھا۔ گرم کپڑے پہن کر اوپر چیسٹر پہنا۔ سر پر گلوبند لپیٹا اور چھڑی لے کر برف میں قدم قدم سنبھل سنبھل کر چلتا بڑی مشکل سے اعجاز بٹالوی کے کمرے میں پہنچا۔ وہ بڑے مزے سے لحاف میں دبکا پلنگ سے ٹیک لگائے ٹیبل لیمپ جلائے کتاب پڑھ رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"اس وقت ایسا کون سا ضروری کام پڑ گیا تھا؟"

بڑا اپکا اور سنجیدہ منہ بنا کر بولا۔

"اے حمید! تم سے ایک بڑا اہم سوال پوچھنا ہے۔ بیٹھو۔"

میں اس کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ بھی سیدھا ہو کر اٹھ بیٹھا۔ چہرے کو ایسے بنایا جیسے سخت مشکل میں گرفتار ہے۔ میں بھی سنجیدہ ہو گیا تھا۔ یقیناً وہ کسی بڑے اہم مسئلے سے دوچار تھا۔

میں نے کہا۔

"خیریت تو ہے؟"

کہنے لگا۔ "بس میں تم سے ایک سوال کروں گا اے حمید! بس اس کے جواب پر میری زندگی کا دارومدار ہے۔"

میں نے کہا۔ "خدا کیلئے سوال تو کرو۔ ایسی کون سی آفت آن پڑی ہے؟"

کہنے لگا۔ "یہ بتاؤ کہ دل کی دنیا بسا گیا ہے کون؟"

اور پھر خود ہی اتنی زور سے کھل کھلا کر ہنسا۔ میں نے اگلے روز یہ بات راشد صاحب کو بتائی تو وہ بھی بہت ہنسے۔ راشد صاحب کا مکان ڈاکخانے سے اوپر جاتے ہوئے پانی کے ٹینکوں سے ذرا نیچے پہاڑی سڑک کے موڑ پر تھا۔ یہ ایک منزلہ کشادہ کوٹھی تھی جس کے آتشدان میں آگ جلا کرتی۔ راشد صاحب اپنی محفلیں اسی کمرے میں گرم کرتے۔ خمار دہلوی ان سے تین کوٹھیاں چھوڑ کر رہتا تھا۔ ایک روز برفباری میں خمار صاحب سر پر کوئی عجیب و غریب شے پہن کر آ گئے۔ محفل میں ہر شخص قیافہ لگانے لگا کہ

یہ کیا شے ہو سکتی ہے۔ راشد صاحب نے کہا کہ یہ غالب کی ٹوپی ہے۔ خمار صاحب نے اس کے اندر نیا استر لگوا کر روئی بھروالی ہے۔ ایک اور صاحب نے کہا کہ یہ ہلاکو خاں کی ٹوپی ہے۔ خمار صاحب نے اس کے سینگ کٹوا دیئے ہیں۔ آخر میں خمار صاحب نے خود ہی یہ کہہ کر اس رازداری کو فاش کیا کہ برفباری سے سر کو بچانے کیلئے انہوں نے ٹی کوزی پہن رکھی ہے۔ شاعروں' ادیبوں اور فنکاروں کی یہ محفلیں تھیں جن میں ن م راشد جان محفل ہوتے تھے۔ وہ بہت کم اپنا کلام سناتے تھے مگر ان کی باتیں ان کی نظموں سے کم خوبصورت نہیں تھیں۔

ان کا آزاد کشمیر ریڈیو کا دور بھی گزر گیا۔ وہ پشاور ریڈیو سٹیشن کے ڈائریکٹر ہو گئے۔ میرا پشاور جانا ہوا تو میں انہیں ملنے ان کی کوٹھی پر گیا۔ وہ میرے افسانے پڑھ کر بہت خوش ہوتے تھے اور مجھ سے پہلے سے زیادہ شفقت کرتے تھے اور کبھی کبھی بڑے اچھے مشورے بھی دیتے تھے۔ مجھے دیکھ کر مسکرائے اور گلے لگا کر کہا۔

"پہلوان کیا حال ہے؟ کب آئے۔ آؤ آؤ بیٹھو کیا پیو گے؟ ممتاز کا کیا حال ہے؟"

ان کے پاس پشاور کے ایک صاحب تشریف فرما تھے۔ میرا ان سے تعارف کروایا اور کہا۔ "یہ افسانہ نگار بھی ہے اور پہلوان بھی' سناؤ یار آج کل کتنے ڈنڈ لگاتے ہو صبح صبح۔"

میں مسکراتا رہا۔ راشد صاحب بھی مسکرانے لگے۔ ان کے بال کافی اڑ گئے تھے۔ مگر چہرہ ویسے ہی بھرا بھرا تھا اور آنکھوں میں وہی ذہانت کی چمک تھی اور مسکراہٹ ویسی ہی شرمیلی اور دلکش تھی۔ سگریٹ پی رہے تھے۔ قالین پر کرتہ پاجامہ پہنے بیٹھے تھے۔ دیر تک میں ان کے پاس بیٹھا ان کی قیمتی اور دلچسپ باتیں سنتا رہا۔ پھر کھانا لگ گیا۔ کھانے کے بعد مجھے ایک طرف لے جا کر پوچھا۔

"کہاں ٹھہرے ہو۔ اگر وہاں کوئی تکلیف ہو تو میرے ہاں آ جاؤ پیسوں کی ضرورت تو نہیں ہے۔"

میں نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ میں اپنے ایک عزیز دوست کے پاس ٹھہرا ہوا ہوں اور پیسوں کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ پیسوں سے مجھے یاد آیا کہ ایک

بار راشد صاحب مستی گیٹ لاہور کے ایک مکان میں رہائش پذیر تھے۔ میں ٹی ہاؤس سے اٹھ کر ان سے ملنے مستی گیٹ گیا۔ اب مجھے یاد نہیں رہا کہ مجھے ان سے کیا کام تھا۔ مجھے ملے اور جب میں واپس جانے لگا تو قریب آ کر پوچھا۔

''پہلوان پیسوں کی ضرورت ہو تو مجھ سے لے لو میرے پاس اس وقت ہیں۔''

پشاور کے بعد جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے راشد صاحب اقوام متحدہ کے انفارمیشن کے ادارے کے سربراہ ہو کر نیویارک چلے گئے۔ وہ پاکستان میں ہوتے تھے تو کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں ان سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ نیویارک جانے کے بعد ان سے ملے ایک عرصہ گزر گیا جن دوستوں کا امریکہ جانا ہوتا تھا وہ اکثر آ کر راشد صاحب سے اپنی ملاقاتوں کا حال بیان کرتے اور ان کی خیریت معلوم ہو جاتی۔ پھر ایسا ہوا کہ وہ اقوام متحدہ کے محکمہ اطلاعات کے مشرق بعید کے انچارج ہو کر کراچی آ گئے۔

کراچی میں سٹریچن روڈ پر ان کا دفتر تھا۔ میں نے انہیں خط لکھا جس کے جواب میں انہوں نے اپنی خیر خیریت سے مطلع کرنے کے بعد لکھا کہ میں کراچی آؤں تو ان سے ضرور ملوں۔ اتفاق سے مجھے کراچی جانا پڑ گیا۔ میں ٹیکسی لے کر سٹریچن روڈ والے ان کے دفتر پہنچا۔ راشد صاحب بڑی شفقت سے ملے۔ سب بہن بھائیوں کی خیریت پوچھی۔ میں دیر تک ان کے پاس بیٹھا۔ پھر اجازت لے کر واپس ہوا۔ راشد صاحب کے کراچی آ جانے سے ان سے گاہے بگاہے کی ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ وہ لاہور آتے تو مجھے پتہ چل جاتا' وہ جہاں بھی ہوتے خود انہیں ملنے جاتا۔ ان سے مل کر بہت خوشی ہوتی۔ ان سے باتیں کر کے ان کی باتیں سن کر بڑی خوشی ہوتی۔

وہ کچھ بیمار رہنے لگے تھے۔ شاید معدے کی تکلیف تھی۔ پرہیزی کھانا کھاتے تھے۔ شاید دہی اور چاول...... چہرہ اتر سا گیا تھا مگر باتوں میں وہی شگفتگی اور آنکھوں میں وہی ذہانت کی چمک اور ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ تھی۔ ایک ایک کر کے سب بہن بھائیوں کے احوال پوچھتے۔ اپنی نئی کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں بہت مصروف تھے۔ وقت گزرتا گیا۔ لاہور میں ان کا پھیرا بہت کم ہوتا۔ ایک روز میں ریڈیو سٹیشن گیا تو پتہ چلا کہ راشد صاحب لاہور آئے ہوئے ہیں اور انٹر کانٹی نینٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔

میں نے انہیں فون کیا۔ کہنے لگے آج دوپہر میں ریڈیو سٹیشن آ رہا ہوں۔ تم سے ضرور ملاقات ہوگی۔ میں دفتر میں ہی رہا۔ بارہ بجے کے قریب ان کی گاڑی ریڈیو سٹیشن کے احاطے میں داخل ہوئی۔ میں آگے بڑھ کر ان سے ملا۔ راشد صاحب کا رنگ جو کبھی سرخ ہوا کرتا تھا۔ زرد ہو رہا تھا۔ چہرے پر تھکاوٹ اور کمزوری کے اثرات تھے' مگر خوبصورت مسکراہٹ میں کوئی کمزوری اور تھکاوٹ نہیں تھی۔ اسی طرح مسکرا کر ملے جس طرح وہ آج سے چالیس برس پہلے اپنی دہلی والی کوٹھی کے برآمدے میں مجھے ملے تھے۔

''سناؤ پہلوان کیا حال ہے؟''

ان کے ساتھ میرا ایک دوست بھی تھا۔ وہ مجھے بھی ساتھ لے کر سٹیشن ڈائریکٹر کے کمرے میں آ گئے۔ چائے کا دور چلا۔ راشد صاحب نے اپنی تازہ کتاب کے بارے میں کچھ باتیں کیں۔ پھر کچھ لطیفے ہوئے۔ ریڈیو میں ان کے احباب ان سے آ کر ملے۔ ہر ایک سے مسکرا کر ہاتھ ملاتے اور خیریت پوچھتے جب واپس جانے لگے تو مجھ سے کہا۔

''شام کو میرے ہوٹل میں آنا۔ کھانا میرے ساتھ ہی کھانا۔ میں تو آج کل صرف دہی چاول کھاتا ہوں فکر نہ کرو تمہارے لیے مرغ مسلم ہوگا۔''

اور پھر بڑے پیارے انداز میں مسکراتے ہوئے مجھ سے ہاتھ ملایا اور گاڑی میں بیٹھ کر ہاتھ ہلاتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ اس کے بعد ایک روز اخبار میں خبر چھپی کہ لندن میں ن م راشد کا انتقال ہو گیا۔ انسان کا جب وقت پورا ہو جاتا ہے تو اسے یہاں سے جانا ہی پڑتا ہے۔ ان کے انتقال کی خبر سن کر ان کی شکل آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ یہ ان کی دلی کی تصویر تھی۔ چالیس بیالیس برس پہلے کی تصویر' اونچے ستونوں والا برآمدہ' چاندنی رات' ٹھنڈی ہوا' کشادہ لان میں بکھری ہوئی موتیے کی خوشبو اور سفید کرتے پاجامے میں ملبوس ن م راشد۔

☆......☆......☆

ن م راشد اور سعادت حسن منٹو کی یاد میں

اسلام آباد سے ن م راشد صاحب کی بڑی صاحبزادی نسرین راشد کا فون آیا۔ کہنے لگیں میں راشد صاحب کی بڑی بیٹی نسرین راشد بول رہی ہوں۔ ہم نوائے وقت کے سنڈے ایڈیشن میں چھپنے والے مضمون بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ اس بار آپ نے میرے والد صاحب ن م راشد کا جس محبت' عقیدت اور تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے اسے پڑھ کر میری آنکھیں آبدیدہ ہوگئیں۔ آپ نے اپنے مضمون میں دلی میں ہماری علی پور روڈ والی کوٹھی اور اس کے بعد دلی کی آبادی تیس ہزاری والے کوارٹروں کا نقشہ بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ میں ان دنوں بہت چھوٹی تھی۔ مجھے وہ زمانہ ایک بھولے بسرے خواب کی طرح یاد ہے۔ لیکن میری خالہ نے مجھے بتایا کہ میں اس زمانے میں راشد صاحب کے ہاں مقیم تھی۔ اے حمید نے تیس ہزاری کے کوارٹروں کے بارے میں جو جو باتیں بتائی ہیں وہ بالکل درست ہیں اور اس زمانے میں ان کوارٹروں میں اردو ادب کی مایہ ناز شخصیتیں قیام پذیر تھیں۔ مثلاً راجہ مہدی علی خاں' افسانہ نگار سعادت حسن منٹو' اوپندر ناتھ اشک' کرشن چندر وغیرہ۔ خالہ جان کہتی ہیں کہ اے حمید کا مضمون پڑھ کر وہ گزرا زمانہ سارے کا سارا میری آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ہمارے ساتھ والے کوارٹر میں راشد صاحب کے جگری دوست ممتاز ملک اور ان کی بیگم سرور آپا رہائش پذیر تھیں اور ان کے ساتھ ان کا ایک چھوٹا بھائی بھی رہتا تھا جو امرتسر سے آیا تھا اور جس کی عمر چودہ پندرہ سال کی ہوگی۔ آپ کا مضمون پڑھ کر پتہ چلا کہ وہ آپ تھے۔

اس کے بعد نسرین راشد صاحبہ نے اپنے والد گرامی کے بارے میں ایک دو

باتیں پوچھیں جن کا مجھے علم نہیں تھا۔ میں نے انہیں کہا کہ میں آپا سرور سے پوچھ کر بتا سکتا ہوں۔ نسرین صاحبہ نے مجھ سے میری بڑی بہن آپا سرور کا فون نمبر لیا اور کہا کہ میں خود آپا سرور سے پوچھ لوں گی۔ میں نے اسی وقت آپا سرور یعنی مسز کیپٹن ممتاز ملک کو فون کیا اور انہیں بتایا کہ ابھی ابھی مجھے اسلام آباد سے ن م راشد صاحب کی بڑی بیٹی کا فون آیا تھا۔ آپا سرور نے مجھے بتایا کہ راشد صاحب کی تین بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ نسرین سب سے بڑی ہے اس کے بعد یاسمین راشد ہے اور تیسری بیٹی کا نام نوشابہ راشد ہے۔ بیٹے کا نام شہریار تھا جو عین عالم شباب میں اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اس کے بعد میں اور آپا سرور دیر تک تیس ہزاری کے زمانے کی اور دوسری جنگ عظیم کے زمانے کے رنگون کی اور پھر کولمبو شہر کی باتیں کرتے رہے۔ میری یہ بہن مجھ سے دو سال بڑی ہے اور بڑی بہادر خاتون ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں ہی جب جاپانیوں نے رنگون پر پہلی بمباری کی اور رنگون شہر میں مقیم ہندوستانیوں کی مارکیٹوں' دکانوں اور گھروں کو برمیوں نے لوٹنا اور نذر آتش کرنا شروع کر دیا اور ہندوستانی' قافلوں کی شکل میں پیدل ہی انڈیا کی طرف چل پڑے تو میری یہ بہن بھی اپنے شوہر کیپٹن ممتاز ملک اور ان کے دوست باری علیگ اور ان کی بیگم کے ہمراہ رنگون میں اپنا گھر بار چھوڑ کر افراتفری کے عالم میں ایک قافلے کے ساتھ چل پڑی تھی اور پھر برما کے گنجان' خطرناک' دشوار گزار اور سانپوں' دلدلوں اور خون خوار درندوں سے بھرے ہوئے جنگلوں میں چالیس دن تک پیدل سفر کر کے امرتسر پہنچی۔ یہ ایک رونگٹے کھڑے کر دینے والی داستان ہے جو میں اپنی آپ بیتی میں تفصیل کے ساتھ بیان کروں گا۔

ٹیکسلا کینٹ سے ناصر علی صاحب اپنے خط میں لکھتے ہیں۔ حمید صاحب! نوائے وقت کے سنڈے میگزین میں آپ کا مضمون پڑھ کر ہر بار جی چاہا کہ آپ کو خط لکھ کر داد دی جائے مگر اس ڈر سے خط نہیں لکھا کہ داستان گو' آنکھیں بند کئے داستان سنانے میں محو ہے۔ کہیں ہمارے ہنکارا بھرنے سے داستان گو بھٹک نہ جائے اور داستان کا سلسلہ منقطع نہ ہو جائے۔

خدا آپ کو طویل عمر اور صحت دے۔ آمین۔ آپ یقیناً دور حاضر کے ادبی انسائیکلوپیڈیا ہیں۔ حمید صاحب! میں آپ کا بڑا پرانا مداح ہوں۔ آپ کے افسانوں کے

سارے مجموعے میں نے اس زمانے میں ہی پڑھ لئے تھے۔ جب میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا۔ میرے پاس آپ کی تمام کتابیں موجود ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ کسی روز آپ کے پاس آ کر ان کتابوں پر آپ کے آٹوگراف لوں۔ حال ہی میں نوائے وقت کے سنڈے ایڈیشن میں حضرت آرزو لکھنوی پر آپ کا مضمون پڑھا۔ آپ نے جس خلوص اور محبت سے یہ مضمون قلمبند کیا ہے اس کی تعریف کے واسطے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ بلاشبہ آپ نے ہمارے ہر محبوب ادیب یعنی سعادت حسن منٹو، ناصر کاظمی، احمد راہی، ن م راشد، سیف الدین سیف، احمد ندیم قاسمی، ابن انشاء اور راجہ مہدی علی خاں کے بارے میں خلوص اور محبت اور پوری تفصیل کے ساتھ مضامین لکھے ہیں۔ ہم سب آپ کے شکر گزار ہیں۔ آپ کے یہ مضامین آنے والی نسلوں اور اردو ادب کے شائقین کیلئے ایک قیمتی سرمایہ اور ریفرنس ثابت ہوں گے۔ اس نفسانفسی کے دور میں آپ نے جس طرح پاکستان کے ان بے مثال ادیبوں پر مضامین لکھے ہیں اور ہمیں ان کی سوشل زندگی کے بارے میں چھوٹی سے چھوٹی باتوں کو تفصیل کے ساتھ بتایا ہے انہیں پڑھ کر یہ مشہور ادیب اور شاعر ہماری آنکھوں کے سامنے چلتے پھرتے نظر آنے لگے ہیں اور ان کی قدر و منزلت ہمارے دلوں میں اور بڑھ گئی ہے۔ میں اس سلسلے میں آپ سے دو ایک باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔

1۔ حضرت آرزو لکھنوی سے آپ کی ملاقات کس سن میں ہوئی تھی؟ آپ کا مضمون پڑھ کر میں نے راولپنڈی کے تمام کتب خانوں اور بک سٹالوں میں آرزو لکھنوی کے شعری اور گیتوں کے مجموعے تلاش کئے مگر مجھے ان کا ایک مجموعہ بھی نہیں مل سکا۔ ہم آپ کے شکر گزار ہیں کہ آپ نے اس بے مثال مسلمان اور گمنام بزرگ شاعر پر اس قدر شاندار مضمون لکھا اور ان کے گیت بھی لکھے اور آرزو صاحب کا فوٹو بھی دیا جو بالکل نایاب ہے۔

2۔ اسی ہفتے سنڈے میگزین میں ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کا جو مضمون چھپا ہے اس میں ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ منٹو صاحب اردو ٹائپ رائٹر اس لئے استعمال کرتے تھے کہ ان کے ہاتھوں میں رعشہ تھا۔ کیا واقعی ایسا تھا؟

محترم ناصر علی صاحب! میں اپنے مشاہدے اور منٹو صاحب کے قریب رہنے

کی بنیاد پر اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس بات میں کوئی صداقت نہیں۔ میں نے منٹو صاحب کو نیا ادارہ کے دفتر میں اپنا ڈرامہ ''اس منجدھار میں'' لکھتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ میں نے انہیں دوسری جنگ عظیم کے دوران آل انڈیا ریڈیو دلی میں ن م راشد صاحب والے کمرے میں بیٹھے ریڈیو ڈرامہ بھی لکھتے دیکھا ہے۔ (آل انڈیا ریڈیو دلی کے زمانے میں ان کے لکھے ہوئے ریڈیائی ڈراموں کے جہاں تک مجھے یاد ہے دو مجموعے چھپے تھے۔ ایک کا نام ''جنازے'' تھا اور دوسرے ریڈیائی ڈراموں کے مجموعے کا نام ''آؤ'' تھا) پھر میں نے منٹو صاحب کو لاہور کے ریگل سینما کی دوسری منزل میں مسعود پرویز صاحب کے فلم پروڈکشن آفس میں بیٹھے فلم سکرپٹ لکھتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ میں ان شواہد کی بناء پر پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ سعادت حسن منٹو کے ہاتھوں میں کوئی رعشہ نہیں تھا۔ ریگل سینما والے پروڈکشن آفس میں، میں اور احمد راہی اکثر جایا کرتے تھے۔

احمد راہی اس پنجابی فلم کے گانے لکھ رہا تھا۔ یہاں میں نے پہلی بار منٹو صاحب کو اردو ٹائپ رائٹر استعمال کرتے دیکھا تھا۔ منٹو صاحب نے اردو میں ٹائپ کرنا باقاعدہ سیکھا نہیں تھا میں ان کے پاس ہی صوفے پر بیٹھا انہیں دیکھا کرتا تھا۔ وہ اپنے دائیں ہاتھ کی صرف انگشت شہادت سے ٹائپ کیا کرتے تھے اور رک رک کر ٹائپ کرتے تھے اردو کا ہر حرف ٹائپ کرنے کے بعد ان کی انگلی رک جاتی تھی اور وہ دوسرا حرف تلاش کر کے ٹائپ رائٹر کی نوب Knob پر انگلی مارتے تھے۔ اتنی دیر تک ان کا ہاتھ ٹائپ رائٹر کے اوپر ساکت حالت میں رکا رہتا تھا اور ان کی آنکھیں متعلقہ حرف تلاش کرتی رہتی تھیں۔ میں پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ منٹو صاحب کے ہاتھ میں یا ہاتھوں میں کوئی رعشہ نہیں تھا۔ آگے چل کر محترم ناصر علی اپنے خط میں لکھتے ہیں۔

''ہم آپ سے درخواست کریں گے کہ ایک بار پھر دلی کے تیس ہزاری والے کوارٹروں کا ذکر کریں جب ان کوارٹروں میں ہمارے اردو ادب کے وہ مشہور و معروف ادیب اور شاعر رہا کرتے تھے جو اب تاریخی حیثیت اختیار کر چکے ہیں اور جن کے ذکر کے بغیر اردو ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکے گی۔ پلیز! ایک بار پھر اپنی تیس ہزاری کی یادوں میں ہمیں شریک کریں اور وہ مناظر ہمیں ایک بار پھر دکھائیں جو آپ کے سوائے

ہمیں اردو ادب کا کوئی ادیب، کوئی رائٹر نہیں دکھا سکتا۔ دوسری گزارش آپ سے یہ ہے کہ ہمیں اردو کے ہندو، سکھ ادیبوں شاعروں کے بارے میں بھی کچھ بتائیں کیونکہ وہ بھی ہمارے اردو ادب کا ایک اثاثہ ہیں اور ان کے ادب اور ان کی شخصیت کے بارے میں تو پاکستان کی نئی نسل کچھ بھی نہیں جانتی۔ آپ نے آج تک اردو کے غیر مسلم ادیبوں کے بارے میں ویسے بھی کبھی کچھ نہیں لکھا۔ اردو ادب سے آپ کی اس بے اعتنائی کی کیا وجہ ہے؟ میرا خط تھوڑا طویل ہوگیا ہے اس کیلئے معذرت خواہ ہوں لیکن مجھے اور میرے دوستوں اور آپ کے مداحوں کو آپ کی تحریروں سے جو محبت ہے اور ان کی وجہ سے آپ سے جو انس اور عقیدت ہوگئی ہے اس کے ناطے آپ یہ گوارا کریں گے شکریہ۔

دوسری درخواست یہ ہے کہ آپ اردو کے نامور افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کے بارے میں ایک بار پھر کچھ لکھیں۔ اس بار ہمیں ان کے افسانوں کے بارے میں کچھ بتائیں۔

کیا ان کے افسانوں کے انگریزی میں تراجم ہوئے ہیں؟ اگر ہوئے ہیں تو کس نے کئے ہیں اور یہ کہاں سے دستیاب ہو سکتے ہیں۔ کافی عرصہ پہلے روزنامہ پاکستان کے کالم نویس توصیف علی نے اپنے کالم میں منٹو کی قبر کے بارے میں لکھا تھا کہ قبرستان میانی صاحب میں انتہائی خستہ حالت میں ہے اور اس کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہے۔ اگر واقعی ایسی بات ہے تو یہ اردو فکشن کی بڑی بدقسمتی ہی کہی جا سکتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہمیں بیڈن روڈ والی لکشمی مینشن کے بارے میں بھی کچھ بتائیں جہاں بمبئی سے آ کر منٹو صاحب نے زندگی کے آخری دن گزارے تھے۔ کیا لکشمی مینشن کا وہ فلیٹ جس میں سعادت حسن منٹو رہا کرتے تھے ابھی تک ہے اور کیا اسے منٹو کی یادگار کے طور پر محفوظ کر لیا گیا ہے؟ کیا منٹو کی زیر استعمال چیزیں ان کی کتابیں وغیرہ محفوظ کرلی گئی ہیں؟ یا نہیں؟ برائے مہربانی ہمیں اس بارے میں ضرور بتایئے۔

فقط

ناصر علی ٹیکسلا کینٹ

منٹو کے کچھ افسانوں کے ترجمے محترم خالد حسن صاحب نے کئے ہیں جو آج کل واشنگٹن (امریکہ) میں مقیم ہیں۔ وہ کہاں سے دستیاب ہو سکتے ہیں اس کا مجھے علم

نہیں۔ ویسے بھی ان تراجم کا جہاں تک مجھے علم ہے کوئی مجموعہ نہیں چھپا۔

پچھلی دفعہ خالد حسن لاہور آئے تھے تو انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ منٹو کے کچھ افسانوں کے تراجم جرمنی میں جرمن زبان میں ہوئے ہیں اور وہاں اس کے افسانوں کو بڑے شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ اسی طرح منٹو کے افسانوں کے تراجم روس، چیکوسلواکیہ اور فرانس میں بھی ہو چکے ہیں۔

منٹو صاحب کی قبر خستہ حالت میں نہیں ہے۔ منٹو صاحب کی بیٹی جس سے منٹو صاحب کو بڑی محبت تھی اور ان کے داماد اور ان کی اولاد ماشاء اللہ حیات ہے اور وہ ان کی قبر کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ باقی رہ گئی لکشمی مینشن کی بات جہاں منٹو صاحب نے اپنی زندگی کے آخری دن گزارے تھے تو انشاء اللہ میں ضرور اس جگہ کے بارے میں کچھ لکھوں گا۔ میں اور اشفاق احمد اور میرے دوسرے ترقی پسند دوست منٹو صاحب سے ملنے وہاں اکثر جایا کرتے تھے۔ اس زمانے کی ساری یادیں میرے ذہن میں موجود ہیں۔ اس خواہش کا اظہار منٹو کے دوسرے مداحین نے بھی مجھ سے کیا ہے۔

منٹو کے بارے میں ایک اور بات بتانی میں بھول گیا ہوں وہ بات یہ ہے کہ منٹو صاحب نے اردو ٹائپ رائٹر میرے خیال میں بلکہ مجھے یقین ہے کہ اس لئے استعمال کرنا شروع کیا تھا کہ منٹو صاحب انتہائی نفاست پسند انسان تھے۔ کپڑے ہمیشہ سفید اور بے داغ پہنتے تھے۔ میں نے انہیں ہمیشہ بڑی چمکیلی اور پورے سائز کی صاف ستھری پنسلوں کے ساتھ لکھتے دیکھا ہے۔ ساری پنسلوں کی باریک نوکیں نکلی ہوتی تھیں۔ وہ لکیر دار شفاف لمبے کاغذوں پر لکھتے تھے۔ پنسلوں کے پاس ربڑ پڑا ہوتا تھا۔ عام طور پر وہ لکھتے ہوئے لکھتے چلے جاتے تھے۔ اگر کوئی لفظ کاٹنا پڑ جاتا تھا تو پنسل ایک طرف رکھ کر اس لفظ کو بڑی نزاکت اور نفاست کے ساتھ ربڑ کے ساتھ مٹاتے اور پھر بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے یا صاف ستھرے رومال سے کاغذ کو صاف کر دیتے۔ بس اسی نفاست پسندی کی وجہ سے انہوں نے اردو ٹائپ رائٹر استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ منٹو ہر کام میں اپنی انفرادیت برقرار رکھنے کے عادی تھے اور اردو ٹائپ رائٹر ان دنوں نیا نیا آیا تھا اور میرا خیال ہے کہ اس زمانے میں اس وقت تک کسی اردو ادیب کے زیر استعمال نہیں تھا۔

آخر میں میں اتنا ضرور کہوں گا کہ میں نے منٹو صاحب کو ان کے بستر مرگ پر بھی دیکھا ہے۔ جب ان کی موت میں شاید دو تین دن باقی رہ گئے تھے۔ یہ ان کی زندگی کے آخری ایام تھے اور انہیں میو ہسپتال لاہور میں داخل کرا دیا گیا تھا۔ میں آخری بار ان کی خبر لینے میو ہسپتال گیا۔ وہ میو ہسپتال کی دوسری منزل میں بائیں جانب میڈیکل وارڈ میں تھے جو عام وارڈ تھا۔ ان کا بستر وارڈ میں داخل ہوتے ہی دائیں جانب دروازے کے پاس ہی تھا۔ وہ بے حد کمزور ہو گئے تھے لیکن ماتھا ویسے ہی چوڑا چکلا تھا اور آنکھوں میں ویسی ہی چمک تھی۔ ان کے سرہانے بائیں جانب ان کی بڑی ہمشیرہ صاحبہ کھڑی تھیں اور منٹو کو چمچ سے تھوڑی تھوڑی کر کے یخنی پلا رہی تھیں۔ میں سلام کر کے خاموشی سے ان کے بستر کے قریب پڑے بنچ پر بیٹھ گیا۔ منٹو صاحب میری طرف دیکھ کر ذرا سا مسکرائے۔ میں نے حال پوچھا تو مدھم مسکراہٹ کے ساتھ بولے ”بس خواجہ دیکھ لو۔“ یخنی کا ایک قطرہ ان کے ہونٹوں میں سے نکل کر ذرا بہہ گیا تو منٹو صاحب نے مجھے یاد ہے اپنے بائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے سفید رومال سے اپنے ہونٹوں کو صاف کیا تھا۔ اس وقت بھی ان کے ہاتھ میں کوئی رعشہ نہیں تھا۔

☆......☆......☆

حسن کوزہ گر کو کہاں لاسکیں گے

(نسرین راشد دختر ن م راشد)

میرے والد ن م راشد (مرحوم) یکم اگست 1910ء کو علی پور چٹھہ میں پیدا ہوئے۔ وفات انگلینڈ میں حرکت قلب بند ہونے سے ہوئی۔ ابتدائی تعلیم علی پور چٹھہ میں حاصل کی اور گورنمنٹ کالج لاہور سے اکنامکس میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ شادی بھی علی پور چٹھہ میں اپنی ماموں زاد سے ہوئی۔ میرے والد کے دادا ڈاکٹر غلام رسول سول سرجن تھے۔ جن کا انتقال 1936ء میں ہوا اور علی پور چٹھہ میں دفن ہوئے۔ ڈاکٹر غلام رسول کے بیٹے فضل الٰہی چشتی (راشد کے والد) اور ان کی بہو حسین بی بی (راشد کی والدہ) علی پور میں اپنے سسر کے ہاں گئے تو راشد کی والدہ کو خواب آیا کہ ان کے ہاں ایک لڑکا ہوا ہے۔ اس کی بوٹیاں آسمان کی طرف پھینک رہی ہیں۔ انہوں نے خواب اپنے سسر کو سنایا تو انہوں نے کہا کہ ”یہ خواب اچھا ہے‘ لڑکا پیدا ہوگا‘ بیرونی ممالک کی خوب سیر کرے گا۔“ واقعی یہ خواب سچا ہوا۔ راشد پیدا ہوئے۔ یو این او کی ملازمت کے دوران اور فوج کی ملازمت کے دوران مختلف ممالک دیکھے اور سیر بھی کی۔
جب راشد پیدا ہوئے تو راشد کے دادا ڈاکٹر غلام رسول نے اپنے بیٹے فضل الٰہی چشتی (جو کہ محکمہ تعلیم میں اے ڈی آئی تعینات تھے) سے کہا کہ یہ بچہ مجھے دے دو لیکن راشد صاحب کے والد نے اپنے باپ سے کہا کہ جب میری دوسری اولاد ہوگی تب دے دوں گا۔ جب فضل الٰہی چشتی (راشد کے والد) کے ہاں ممتاز بیٹی پیدا ہوئی تو ڈاکٹر غلام رسول اپنے ساتھ راشد کو علی پور لیجاتے۔ ان کے دادا اور دادی بیگم بی بی نے ان کی

پرورش اور تعلیم و تربیت میں خاصا کردار ادا کیا۔ ان کی دادی نے ان کو بہت لاڈ پیار دے رکھا تھا اور کہتی کہ ''بیٹا نہ پڑھ تیری نظر کمزور ہو جائے گی۔'' مگر والد صاحب کو تعلیم حاصل کرنے کا بے حد شوق تھا۔ علی پور میں وہ اکثر پول لیمپ کی روشنی میں رات گئے تک پڑھتے۔ جب راشد بیمار ہوئے تو ان کے دادا پوچھتے ''بیٹا تمہیں کھانے کیلئے کیا لا کر دوں؟'' تو وہ کہتے۔ ''مجھے فلاں کتاب لا دیں۔'' پھر ایک دفعہ بخار آیا تو ان کے دادا نے پوچھا بیٹا کیا لا کر دوں؟ راشد نے کہا مجھے کتابیں رکھنے کیلئے ایک الماری لا دیں۔
اپنے دادا کے اتنے لاڈلے تھے کہ انہوں نے ایک خوبصورت سی الماری بنوا دی جو کافی مہنگی تھی۔ کسی نے ان کے دادا کو مشورہ دیا کہ بچے کو گائے کا دودھ پلایا کریں تا کہ ذہانت بڑھے۔ دادا نے راشد کیلئے اسی وقت گائے خریدی اور راشد کو گائے کا دودھ پلاتے رہے۔ راشد کو بچپن سے پیار سے ''نذری'' کہتے تھے۔ راشد تقریباً چھ برس کے تھے کہ انہوں نے ایک نظم لکھی تھی جس کا عنوان تھا ''انسپکٹر اور مکھیاں'' جس پر ان کو سلور میڈل بھی ملا۔ نظم کی کاپی میرے پاس موجود ہے۔ انگریز حکومت نے ان کے دادا ڈاکٹر غلام رسول کو چترال اور کشمیر تعینات کیا اور ان کی شاندار خدمت کے عوض ان کو ایک دفعہ سترہ مربعے اراضی اور دوسری دفعہ دو مربعے کی پیشکش کی لیکن انہوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ انہی کی پرورش، تعلیم و تربیت کا گہرا اثر میرے والد کے کردار میں بھی نمایاں ہے۔ راشد ایک سچے، کھرے، دیانت دار اور بااصول آدمی تھے اور بچپن سے شاعرانہ خصوصیات کے مالک تھے۔ اپنی جدید منفرد سوچ اور تجربے کی وجہ سے ترقی کر گئے۔ ہر چیز کی تحقیق و جستجو کرنا اور اس کی تہ تک پہنچنا ان کے مزاج میں شامل تھا۔ راشد کے پردادا خواجہ احمد بھی تعلیم یافتہ تھے اور ان سے جنات، انسان کے روپ میں تعلیم حاصل کرنے آتے۔ آپ نے بہت سی مساجد تعمیر کرائیں۔ والد کے دادا ڈاکٹر صاحب نے تفسیر حضرت یوسف بھی لکھی جو کسی رشتہ دار کے پاس خستہ حالت میں موجود ہے۔ کیونکہ میرے والد کا تعلق کھاتے پیتے، تعلیم یافتہ گھرانے سے تھا۔ جس کی وجہ سے میرے والد کے ذہن میں وسعت، روشن خیالی اور سوچ و فکر بھی ماورائی تھی۔ وہ علم کی روشنی سے مالا مال تھے۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ راشد اپنی محنت، قابلیت و صلاحیت سے ترقی کرتے گئے۔ راشد کے والد فضل الٰہی چشتی بی اے بی ٹی تھے اور سکول کے بچوں کا نصاب

اور کتب بذریعہ پبلشر فیروز سنز شائع کیں۔ انگریزی کتابوں کے ترجمے کیے۔ فیروز سنز والے دادا کے دوست تھے۔ میرے والد کے بھائی فخر محمد ماجد تین ایم اے پاس اور علیگ تھے۔ والد صاحب نے اپنے بھائی کو ڈاکٹریٹ کرنے کینیڈا بھیجا بعد میں وہ شاہ عبداللطیف بھٹائی کالج میرپور خاص میں بطور پرنسپل تعینات رہے۔ راشد کا بیٹا شہریار راشد جو ایم اے انگلش تھا اور کوالیفائیڈ سی ایس پی آفیسر تھا، فرائض منصبی ادا کرتے ہوئے بطور سفیر تاشقند ازبکستان حرکت قلب بند ہونے سے انتقال کر گیا۔ راشد کی فارنر بیوی سے دوسرا بیٹا ''تنزیل'' (نظارو) Merrill بنک انگلینڈ میں تعینات ہے۔ میرے والد کے ماموں جو ان کے سسر بھی تھے اور بی اے بی ٹی علیگ تھے اور اراضیات و مکانات کے مالک تھے۔ والد کے نانا محبوب عالم کے نام سے گوجرانوالہ میں محبوب عالم ہائی سکول موجود ہے۔ انگریز حکومت نے ان کو ''خان بہادر'' کا خطاب دیا تھا۔ یہ راشد کے خاندان کا مختصر سا تعارف ہے ورنہ لکھنے کو تو بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔

راشد سخی بہت تھے۔ ہر ضرورت مند کی مدد کیلئے تیار رہتے۔ ان کی جب نئی نئی شادی ہوئی تو ان دنوں وہ آل انڈیا ریڈیو دہلی میں تعینات تھے۔ ایک دفعہ سردی کے موسم میں ان کے دروازے پر ایک فقیر آیا۔ والد صاحب نے اپنی شادی کی نئی رضائی اس فقیر کو دے دی۔ میری والدہ نے کہا کہ ''نئی رضائی کیوں دے دی؟'' راشد کہنے لگے کہ فقیر کو رضائی کی مجھ سے زیادہ ضرورت تھی۔ فقیر دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔ خود رات بھر سردی سے ٹھٹھرتے رہے۔ اسی طرح ایک اور واقعہ ہے۔ ایک دفعہ علی پور چٹھہ میں اپنی پھوپھو سکینہ کے ہاں ٹھہرے اور پرانے خدمت گاروں کو بلوایا۔ اسی اثنا میں محلے کے لوگ بھی ملاقات کے لیے آ گئے کہ راشد اتنے سال بعد اپنے پیدائشی علاقہ میں آئے ہیں۔ سب کو خوش کرنے کیلئے دس دس روپے دیے۔ لوگ دعائیں دیتے ہوئے چلے گئے۔ یوں تو والد صاحب کے بارے میں بہت سے واقعات ہیں مگر جگہ کی کمی کی وجہ سے بیان نہیں کر سکتی۔

فوج کی ملازمت کے دوران جب وہ کپتان تھے بہت سے ایسے ممالک بھی دیکھے جہاں درویشوں کے مقبرے، قبریں، محلات تھے۔ مثلاً عراق، مصر وغیرہ، ان کی نظموں میں ڈرامائی انداز اور سائنٹفک سوچ پائی جاتی ہے۔ یو این او میں بحیثیت

ڈائریکٹر تعیناتی کے دوران کافی ممالک اور مقامات دیکھے مثلاً روس' انڈونیشیا' فرانس' امریکہ' ایران' بنگلہ دیش' جنیوا' اٹلی' انگلینڈ' مصر' جزیرہ سیلون' من برٹن برمودہ کی بھی سیر کی۔ اسی لیے وہ سوشل بھی بہت تھے۔ ہمیں بچپن میں بھی خوب سیر وتفریح کیلئے لے جاتے تھے۔ کلب وغیرہ کے ممبر رہے ہیں۔ Connecticut امریکہ میں کیمپنگ (Camping) کے لیے بھیجا جہاں ہم بچوں نے سوئمنگ' سکواش' بیڈمنٹن وغیرہ سیکھے۔ اکثر کہا کرتے تھے بیٹا! ہر چیز سیکھو مگر اپنی عزت کی حفاظت رکھنا۔ ہمارے والد بچوں کے ساتھ دوستوں کی طرح رہتے۔ اس کے علاوہ انہیں ہر اچھی و معیاری چیز خریدنے کا شوق تھا۔ اصولوں میں سخت تھے اور نظم وضبط کے قائل تھے لیکن اندر سے ریشم کی طرح نرم تھے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود اسی زمانے میں ملازمت حاصل کرنا مشکل تھا۔ مگر انہوں نے کمشنر ملتان کے دفتر میں چھوٹی موٹی نوکری قبول کر لی۔ اپنی محنت' قابلیت سے ترقی کر گئے۔ تعلیمی میدان میں سکالرشپ حاصل کرتے رہے۔ اپنی عمر اور وقت ضائع نہیں کیے۔ اسی وجہ سے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ ان کو دوستی نبھانا خوب آتا تھا۔ نوابوں' سرداروں' گورنروں' کمشنرز' ججز' منسٹرز وغیرہ سے پائیدار دوستیاں رہیں۔ وہ لوگوں کے ہمیشہ کام آتے۔ یوں تو والد صاحب نے بہت کچھ لکھا ہے۔ فارسی سے اردو میں شعرا کے کلام کا ترجمہ کیا اور ان شعرا سے ملاقاتیں بھی کیں اور شاعری کے چار مجموعے بھی شائع ہوئے جن کے عنوان 1۔ ماورا 2۔ ایران میں اجنبی 3۔ لا = انسان 4۔ گماں کا ممکن ہیں۔ اس کے علاوہ نثر' شعرا کی کتابوں کے حاشیے' مکالمے' مضامین' سونٹ' ٹی وی ریڈیو کیلئے تقریریں لکھیں اور یو این او میں تقاریر کیں۔ انہیں متعدد زبانوں پر عبور حاصل تھا مثلاً فرانسیسی' انگریزی' اردو' انڈونیشین' روسی اور پنجابی جو کہ مادری زبان تھی۔ خاص طور پر فارسی پر مکمل عبور حاصل تھا۔

ایران میں کافی عرصہ رہے اس ملک سے محبت بھی بہت تھی۔ روسی اور فارسی زبان کی کتابوں کے اردو میں ترجمے کیے۔ جدید اور آزاد شاعری لکھنے کیلئے آزاد اور جدید ذہن بھی چاہیے۔ اللہ نے ان کو اعلیٰ ذہن دے رکھا تھا مگر افسوس اس بات کا ہوتا ہے کہ میرے والد کی برسی پر سرکاری ادارے اور انجمنیں خراج عقیدت بھول جاتے ہیں اور یہ صرف ان کی کری میشن کی وجہ سے ایسا کیا جا رہا ہے۔ جبکہ اس میں ان کا کوئی قصور

نہیں ہے اور نہ کوئی تحریری وصیت موجود ہے۔ یہ سب کیا دھرا ان کی دوسری فارنر بیوی شیلا کا ہے جس نے اپنے والدین کو بھی کریمیٹ کیا تھا۔ میرے والد ملتان میں خاکساروں کے سپہ سالار بھی رہ چکے تھے اور انہوں نے علی الصبح خاکساروں کو لیکچر دینا ہوتا تھا۔ جس کی وجہ سے رات گئے تک قرآن کا گہرائی سے مطالعہ کرتے۔ اسی لیے آدھا قرآن حفظ ہو چکا تھا۔ ان کی شاعری میں روحانیت' پراسراریت' جدیدیت' نئی سوچ اور نئی فکر موجود ہے۔ الہامی کیفیت بھی انہی لوگوں میں ہوتی ہے جو خدا پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری میں قرآن کے حوالہ جات موجود ہیں اور اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کا موضوع خدا اور انسان ہے۔ ان کے ایک شعری مجموعہ کا نام بھی ''لا = انسان'' ہے۔ ان کی بعض نظمیں پڑھ کر احساس ہوتا ہے جیسے انسان کسی اور دنیا میں ہو۔

حیرت اس بات کی ہوتی ہے کہ ایسے ادیب جنہیں نہ کوئی جانتا ہے' نہ پہچانتا ہے' نہ ان کی تحریریں معیاری ہوتی ہیں' نہ کوئی ذاتی تجربے ہوتے ہیں' نہ کچھ تخلیق کیا ہوتا ہے اور خاص معیاری تعلیم بھی نہیں ہوتی ان کی تعریف بڑھا چڑھا کر بیان کی جاتی ہے۔ ایسے ادیب نقال بھی ہوتے ہیں۔ دوسروں کی تحریریں اور ان کے الفاظ کی ہو بہو نقل کر کے اپنے نام کے ساتھ منسوب کر لیتے ہیں۔ ایسے چھوٹے ادیبوں کیلئے لکھنا آسان ہو جاتا ہے جو اپنے سے بڑے ادیبوں کی نقل کر کے بننا چاہتے ہیں۔ بعض ادیبوں اور شاعروں کے اپنے واقعات اور خیالات تک نہیں ہوتے۔ ان کے ساتھ ایسے ایسے القاب لگائے جاتے ہیں جن کے وہ مستحق نہیں ہوتے۔ ایسے گم نام شاعروں' ادیبوں کے نام کے ساتھ نامور' مشہور' ممتاز' شہرت یافتہ جیسے القابات لگائے جاتے ہیں جنہیں کوئی اچھی طرح سے جانتا بھی نہیں۔ بار بار ٹی وی پر بلا کر ان کی شہرت بڑھائی جاتی ہے حالاں کہ اچھا شاعر اور ادیب وہ ہوتا ہے جو حقیقت پر مبنی مضامین وغیرہ تحریر کرے اور تخلیق کرے۔ بعض ادیبوں کا علم اور تجربہ بہت کم ہوتا ہے جس چیز کے بارے میں لکھتے ہیں اس کے متعلق کم معلومات ہوتی ہیں کیونکہ مطالعہ نہیں کرتے اور تحقیق کرنے کی زحمت بھی نہیں کرتے۔ جس کی وجہ سے ان کی تحریروں میں غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ ن م راشد روزانہ ایک کتاب کا مطالعہ کر کے سوتے۔ ان کے پاس علی پور چٹھہ میں بھی

کتابوں اور ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریروں کا انبار تھا لیکن ان کے انتقال کے بعد بہت کچھ ضائع ہو گیا۔ ہمارے ہاں ایک کمرہ لائبریری بنا ہوا تھا۔

جو ادیب یا شاعر راشد سے حسد رکھتے ہیں اور ان کے کری میشن کی وجہ سے ان کے خوب صورت اور اہم کلام کو جان بوجھ کر نظر انداز کر رہے ہیں ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ ایک دن راشد اپنا مقام بنائیں گے جس کے وہ مستحق ہیں۔ ہمیں تو فخر کرنا چاہیے کہ ہمارے پاس دو بڑے شاعر اقبال اور راشد ہیں جو قوم کا سرمایہ ہیں۔ جنہوں نے غزلوں اور نظموں میں نئی سوچ، نئی فکر اور جدیدیت پیدا کی اور تخلیق کی۔ راشد کے افکار کے شعلوں سے ٹوٹے ہوئے شرر سے سب فائدہ اٹھا رہے ہیں اور متاثر بھی ہو رہے ہیں مگر صرف کری میشن کے واقعہ کی وجہ سے خاموش ہیں۔

ایک طرف ہم خدا پر ایمان بھی رکھتے ہیں اور اس کی رضا پر بھی چھوڑتے ہیں کہ خدا کی مرضی کے بغیر پتا بھی نہیں ہل سکتا۔ دوسری طرف ہم انسان پر بھی الزام دیتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ انسان کو خدا نے سب مخلوقات پر عقل اور فکر میں افضل بنایا ہے مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عقل کہاں سے آئی ہے؟ وہ بھی تو خدا نے دی ہے۔ جس کو جس کام کیلئے جتنی عقل دی ہے وہ اتنی ہی استعمال کرے گا۔ اسی طرح موت جس انداز میں جب بھی آتی ہے وہ بھی خدا کی طرف سے آتی ہے۔ خدا جسے چاہے عزت دے جسے چاہے نہ دے۔ اسی ہستی کی مرضی سے سب کچھ ہوتا ہے۔ موت سے پہلے بھی اور موت کے بعد بھی وہ انسانوں کے ذریعے انسانوں کے حالات بدلتا ہے۔ ہمارے ہاں جو زندہ لوگوں کے ساتھ ظلم اور زیادتیاں ہوتی ہیں ان سے سب واقف ہیں۔ ہم اسلام کے بارے میں باتیں کرتے ہیں مگر ہماری حرکات اور کردار اسلام کے منافی ہیں۔ بھلا مردے کو کیسے الزام دے سکتے ہیں جبکہ تحریری وصیت بھی نہیں ہے۔

لہٰذا راشد جیسے دانش ور کے خوبصورت اور اہم کلام کا گہرائی سے مطالعہ کرنے اور سمجھنے کی بے حد ضرورت ہے جس سے لوگوں کے علم میں اضافہ ہو سکتا ہے اور علم کی روشنی حاصل ہو سکتی ہے۔ مجھے ان کا یہاں ایک شعر یاد آ رہا ہے۔

روشنی سے ڈرتے ہو؟ روشنی تو تم بھی ہو، روشنی تو ہم بھی ہیں
آدمی سے ڈرتے ہو؟ آدمی تو تم بھی ہو، آدمی تو ہم بھی ہیں

مجھے ان کی ایک اور نظم بعنوان "حسن کوزہ گر" سے چند مصرعے یاد آ رہے ہیں جو پیش خدمت ہیں۔

یہ ریزوں کی تہذیب پا لیں تو پا لیں
حسن کوزہ گر کو کہاں لا سکیں گے؟
یہ اس کے پسینے کے قطرے کہاں گن سکیں گے؟
یہ فن کی تجلی کا سایہ کہاں پا سکیں گے؟

اس سے پہلے بھی میں تفصیل سے کری میشن کے بارے میں لکھ چکی ہوں۔ امید ہے میری یہ تحریر بھی لوگوں کے ذہن کو روشن کرے گی اور کری میشن کے بارے میں مزید غلط فہمی دور ہو سکے گی اور جو لوگ ان کے کلام پر کری میشن کی وجہ سے پردے ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں ان کو سمجھ لینا چاہیے کہ انسان تو فانی ہے۔ مگر ایک عظیم شاعر کا کلام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

☆......☆......☆

اعجاز حسین بٹالوی کی یادیں

یادش بخیر نواب زادہ نصراللہ خان مرحوم کے ہمدم دیرینہ اور معتمد خاص سردار عنایت اللہ خان چانڈیہ کا خط ملا ہے۔ خط میں انہوں نے اپنے عہد ماضی کا ذکر کرتے ہوئے مجھے بھی میری بھولی بسری یادوں کی جنت میں پہنچا دیا۔ وہ لکھتے ہیں:

"محترمی! کچھ عرصہ پہلے "نوائے وقت" کے سنڈے ایڈیشن میں محترم اعجاز حسین بٹالوی کا تذکرہ آپ کے کالم میں ریڈیو آزاد کشمیر کے صداکار اور رائٹر کی حیثیت سے پڑھا۔ مجھے ایک بھولی بسری کہانی یاد آ گئی۔ یہ تذکرہ ہے 63-1962ء کا۔ جب ملتان سے لاہور ریلوے کے سٹیم انجن چلا کرتے تھے۔ اور شکری ابھی ساہیوال نہیں بنا تھا۔ بارشیں خوب ہوا کرتی تھیں۔ آج کے جو نا قابل اعتبار موسم ہیں یہ نہیں ہوا کرتے تھے۔ سٹیم انجن والی گاڑی میں ملتان سے لاہور تک سفر کرتے ہوئے اگر راستے میں بارش شروع ہو جاتی تو سٹیم انجن کی چھوا چھو اور چھک چھک کی آواز کے ساتھ بارش کی آواز اپنا رنگ جما دیتی۔ کان انجن کی چھوا چھو کی آواز کی طرف ہوتے۔ آنکھیں بارش کی پھوار کو تکتیں۔ ریل کی پٹڑی کی کھٹا کھٹ اور انجن کی چھک چھک مل کر ایک خاص موسیقی پیدا کرتی تھیں۔ جی چاہتا کہ یہ سفر جاری رہے۔ ختم نہ ہو۔ اس زمانے میں ملتان سے لاہور تک حاجی ریحان الدین کی بس سروس ہریانہ ٹرانسپورٹ کا اپنا ایک الگ مقام تھا۔ اس بس سروس کا ملتان سے لاہور تک کا کرایہ پانچ روپے تھا اور ملتان سے لاہور تک دس گیارہ گھنٹوں کا سفر ہوا کرتا تھا۔ ہر مسافر کو حاجی صاحب کی بس سروس کی طرف سے شکری میں ایک پیالی گرم چائے مفت پیش کی جاتی تھی۔ ان دنوں ملتان' ڈیرہ غازی خان' مظفر گڑھ کے لوگوں کا عام طور پر لاہور میں ٹھکانہ دلی مسلم ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ دلی

مسلم ہوٹل انار کلی میں واقع ہے۔ دلی مسلم ہوٹل والے اس زمانے میں ہر مسافر سے 20 روپے 24 گھنٹوں کا کرایہ وصول کرتے تھے جس میں دو وقت کا کھانا مع ناشتہ مفت فراہم کیا جاتا تھا۔ اس ہوٹل کے ہر کمرے میں ایک چارپائی ضرور ہوتی تھی جس پر صاف ستھرا کھیس اور دو تکیئے ضرور رکھے ہوتے تھے۔ سن 63-1962ء میں ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ میں ایک کیس علی نواز بنام محمد یوسف زیر سماعت تھا چونکہ اس کیس میں شرعی نوعیت کے مختلف نکات زیر بحث تھے اس لئے ان نکات کا فیصلہ کرنے کے لئے سپریم کورٹ کا بڑا بنچ تشکیل دیا گیا تھا۔ جس کی سربراہی اس وقت کے چیف جج سپریم کورٹ جناب اے۔ آر۔ کارنیلس کر رہے تھے۔ بنچ میں دیگر جج صاحبان کے نام یہ تھے: سینئر جج جناب ایس اے رحمان' جناب فضل اکبر' جناب بدیع الزمان' جناب کیکاؤس اور جناب حمود الرحمٰن۔

میں گھر سے لاہور جانے کیلئے نکلتا۔ ملتان تک کا کرایہ نو (9) آنے تھا۔ ملتان سے میں حاجی صاحب کی ہریانہ ٹرانسپورٹ بس میں سوار ہو کر دس بارہ گھنٹوں میں لاہور پہنچ جاتا۔ اگر بس نہ ملتی تو ٹرین میں سوار ہو کر یہ سفر طے کرتا۔ لاہور میں میرا قیام ہمیشہ دلی مسلم ہوٹل میں ہوتا جو انار کلی کے بازار کے وسط میں واقع ہے۔ دوسرے روز ناشتے کے بعد لاہور ہائیکورٹ کی طرف پیدل ہی روانہ ہو جاتا۔ جب کورٹ کی جانب سے علی نواز گردیزی بنام محمد یوسف کیس کی آواز پڑتی تو میں بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ کورٹ میں داخل ہو جاتا۔ اس وقت جناب اعجاز حسین بٹالوی ایڈووکیٹ استغاثہ کی طرف سے جرح کر رہے تھے۔ اعجاز حسین بٹالوی جس انداز میں کیس مندرجہ بالا کی پیروی کر رہے ہوتے تھے وہ دیکھنے اور سننے کے لائق ہوتا تھا۔ وہ اپنی بحث میں مختلف حوالوں کے ساتھ غالب اور میر کے برمحل اشعار استعمال کرتے۔ تمام جج صاحبان اور کورٹ میں موجود لوگ ان کی بحث بڑی توجہ اور دلچسپی سے سنتے۔ اعجاز بٹالوی ایک ایک نقطے پر دو دو گھنٹے بحث کرتے۔ وہ اس کیس کی پیروی کے سلسلے میں مختلف ممالک سے منگوائی گئی دینی اور فقہی کتابوں کے حوالوں سے دین اور تصوف کے نکات پر سیر حاصل بحث کرتے۔ میں اپنے گاؤں سے صرف اعجاز بٹالوی صاحب کی جرح سننے جایا کرتا تھا۔ بحث ختم ہوتی تو میں واپس دلی مسلم ہوٹل چلا آتا۔ وہاں سے سیدھا لاہور ریلوے

سٹیشن پہنچتا اور کسی ایسی ٹرین کا انتظار کرتا جس میں سٹیم انجن لگا ہوا ہوتا۔ پھر ٹرین میں سوار ہو کر ملتان پہنچتا اور ملتان سے لوآنے کا ٹکٹ لے کر اپنے گاؤں آ جاتا۔

میں نے ”نوائے وقت“ کے سنڈے ایڈیشن والے آپ ہی کے کالم میں جب پڑھا کہ آپ آزاد کشمیر ریڈیو کے دنوں میں جناب اعجاز بٹالوی مرحوم کے ساتھ ہوا کرتے تھے تو مجھے بے اختیار وہ دن یاد آ گئے جن کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ ہمیں اعجاز بٹالوی صاحب کے بارے میں اپنی یادوں میں شریک کرتے ہوئے کچھ مزید باتیں بتائیں۔

نیازمند

سردار عنایت اللہ جانڈیہ

اعجاز بٹالوی سے میری دوستی اور یادوں کا سلسلہ اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب قیام پاکستان کے فوراً بعد ریاست کشمیر کے عوام و خواص نے پاکستان کے ساتھ اپنے الحاق کا اعلان کیا اور اس کے ساتھ ہی ہندوستان نے اپنی فوجیں ریاست میں داخل کر کے کشمیر پر غاصبانہ قبضہ کر لیا اور ریڈیو مقبوضہ جموں کشمیر سے پاکستان کے خلاف زہر اگلنا شروع کر دیا۔ ہم آزاد کشمیر ریڈیو تراڑ کھیل سے ہندوستان کے جھوٹے پراپیگنڈے کا منہ توڑ جواب مختلف تقاریر اور فیچرز سے دیا کرتے تھے۔ یہ ریڈیو سٹیشن کوہ مری میں چشموں کے اوپر ایک پہاڑی پر واقع تھا۔ جہاں پہلے میٹروپول ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ غالباً یہی نام تھا اس ہوٹل کا۔ فسادات کی آگ میں یہ ہوٹل جل چکا تھا۔ صرف اس کی دیواریں ہی باقی تھیں۔ ان دیواروں پر عارضی چھتیں ڈال کر لحاف ڈال دیئے گئے تھے۔ صرف ایک براڈکاسٹنگ سٹوڈیو تھا۔ اس کے ساتھ اناؤنسرز بوتھ تھا۔ ساتھ میں ایک کمرے میں خبروں کا ترجمہ ہوتا تھا۔ فیچرز لکھے جاتے تھے۔ مقبوضہ جموں کشمیر ریڈیو سے جھوٹے پراپیگنڈے کا کوئی فیچر یا کوئی تقریر سن کر وہیں اس کا منہ توڑ جواب تقریر یا فیچر کی شکل میں تیار کر کے ”ڈھول کا پول“ کے عنوان سے اسی وقت براڈکاسٹ کر دیا جاتا تھا۔ ہمارے اس وقت کے آزاد کشمیر ریڈیو کے سٹاف میں اردو ادب کے بعض بڑے مشہور شاعر ادیب اور ریڈیو آرٹسٹ اور صداکار شامل تھے۔

جو نام مجھے یاد ہیں وہ میں لکھے دیتا ہوں۔ جن کے اسمائے گرامی میں بھول

گیا ہوں ان سے میں معذرت خواہ ہوں۔ شاعر یوسف ظفر تھے' مختار صدیقی' ن م راشد صاحب جو کہ سٹیشن ڈائریکٹر تھے۔ خمار دہلوی افسانہ نگار' آغا بابر بٹالوی' اعجاز حسین بٹالوی' صداکار محمد حسین' امینہ بانو' صداکار محمد حسین تاج' تقی احمد سید' امرتسر کے نامور شاعر نفیس خلیلی تھے اور بعد میں ممتاز مفتی بھی آ گئے تھے۔ آزاد کشمیر ریڈیو بے سروسامانی کے عالم میں شروع کیا گیا تھا۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ کوہ مری میں چشموں کے اوپر والی پہاڑی پر جلے ہوئے میٹروپول ہوٹل کی سوختہ چار دیواری کے اوپر ادھر ادھر گرے پڑے درختوں کے بالے اور ان کے اوپر لحاف ڈال کر ایک سٹوڈیو' ایک ڈیوٹی روم بنا کر براڈکاسٹنگ سٹیشن بنا دیا گیا تھا۔

ایک سگنیچر ٹیون بھی فوراً تیار کی گئی۔ جس کے بول — ”وطن ہمارا آزاد کشمیر“ اس قدر مقبول ہوا کہ یہ سگنیچر ٹیون آج بھی آزاد کشمیر ریڈیو کی امتیازی پہچان ہے۔ اسے اس زمانے کی مشہور گلوکارہ امینہ بانو کی آواز میں ریکارڈ کیا گیا تھا جو کشمیری زبان جانتی تھی۔ اس ترانے میں ایک بند کشمیری زبان میں تھا جسے امینہ بانو نے اپنی دلکش آواز میں بڑی خوش اسلوبی سے گایا تھا۔

رات کو ٹرانسمیشن ختم کرنے کے بعد ہم لوگ یعنی میں' انجینئر عمادالدین اور اعجاز بٹالوی برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑی ڈھلان پر سے چھڑیوں کے سہارے نیچے اتر رہے ہوتے تھے تو سگنیچر ٹیون کی آواز ”وطن ہمارا آزاد کشمیر“ دور تک ہمیں سنائی دیتی تھی۔

میٹروپول ہوٹل والوں نے اپنے ملازمین کے واسطے پہاڑی پر ہی ایک جگہ چار پانچ کوارٹر بنا رکھے تھے۔ یہ کوارٹر بھی آدھے جل چکے تھے۔ تھوڑی سی مرمت کے بعد انہیں رہائش کے قابل بنا دیا گیا تھا۔ انہی کوارٹروں میں سے ایک چھوٹے سے کوارٹر میں اعجاز بٹالوی نے اپنا بستر لگا رکھا تھا۔ سرد برف باری کی راتوں میں وہ اپنے لحاف میں دبکا کسی کتاب یا رسالے کا مطالعہ کیا کرتا۔ اس کے سرہانے تپائی پر ایک ٹیبل لیمپ روشن ہوتا تھا۔ ایک رات میں اس کے کوارٹر میں گیا تو اس نے کتاب ایک طرف رکھ دی اور کہنے لگا۔

”کیسا ہے یہ ٹیبل لیمپ؟“

دودھیا شیڈ اور ایک عام سا ٹیبل لیمپ تھا۔ اس کے ساتھ دو ریشمی دھاگے لٹکے ہوئے تھے۔ میں نے کہا۔

"اچھا ہے۔"

اعجاز بٹالوی بولا۔

"یہ جادو کا لیمپ ہے یہ دیکھو۔"

اس نے ٹیبل لیمپ کا ایک دھاگہ ذرا سا نیچے کھینچا تو ٹیبل لیمپ کی روشنی دھیمی ہوگئی۔ تھوڑا سا دھاگہ اور نیچے کھینچا تو روشنی اور دھیمی ہوگئی۔ بڑا خوش ہو کر بولا۔

"اس کو جتنا چاہو دھیما کر سکتے ہو پھر اس کی مدھم روشنی میں سو بھی سکتے ہو۔ یہ خاص ٹیبل لیمپ ہے۔ اب بولو کیسا ہے؟"

میں نے کہا۔

"کمال ہے بھئی ایسا ٹیبل لیمپ تو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

اعجاز بٹالوی خوش ہو کر بولا۔

"اے حمید! میرے پاس ایسے اور بھی جادو کے کرشمے ہیں۔ اب یہاں بیٹھو میں تمہیں اپنا ایک شعر سناتا ہوں۔ یہ مطلع ہے۔ غزل ابھی میں نے پوری نہیں کی۔"

اس کے بعد اعجاز بٹالوی نے مجھے اپنی نامکمل غزل کا مطلع سنایا جس کا صرف مصرعہ اولیٰ مجھے یاد رہ گیا ہے۔ وہ تھا۔

کتنی لڑکیاں کتنے لڑکے اس دنیا میں رہتے ہیں

اعجاز بٹالوی عمر میں مجھ سے بڑا تھا مگر میری اس سے بڑی بے تکلفی تھی۔ اسے میری کہانی "منزل منزل" بہت پسند تھی۔ اپنے ایک مضمون میں اس نے لکھا تھا کہ ہماری مڈل کلاس کی ہیروئن اے حمید کی کہانیوں میں ہمیں اپنے مکمل ترین رنگ روپ میں ملتی ہیں۔

جہاں تک مجھے یاد ہے وہ اس زمانے میں بھی وکالت کیا کرتا تھا اور کافی پاپولر وکیل تھا۔ مجھے ایک اور منظر پوری جزئیات کے ساتھ یاد ہے۔ ایک روز میں اور وہ یعنی اعجاز بٹالوی کوہ مری میں اوپر والے گرجا گھر یا کانونٹ سکول کی سڑک پر سیر کر رہے تھے کہ کوہ مری کے راستے میں اس کے ایک دوست سے ملاقات ہوئی جو شاید کوہ مری میں

مجسٹریٹ یا جج تھا۔ اس کے ہاتھ میں لکڑی کی چھوٹی صندوقچی تھی۔ کہنے لگا۔

"اعجاز میں تمہاری طرف ہی جا رہا تھا۔ یہ لو تمہاری امانت۔"

ہم دونوں اعجاز بٹالوی کے کوارٹر والے چھوٹے سے کمرے میں آ گئے۔ اعجاز بٹالوی نے صندوقچی بستر پر رکھی اور میری طرف شرارت بھری مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا۔

"اے حمید جانتے ہو اس میں کیا ہے؟"

جب میں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو وہ بولا۔

"علی بابا کا جو غار تھا نا جو کھل جا سم سم کے اسم سے کھلا کرتا تھا۔ یہ صندوقچی وہاں سے آئی ہے۔"

پھر اس نے بلند آواز میں کہا۔

"کھل جا سم سم۔"

اور ایک ہاتھ سے صندوقچی کھولی تو وہ نوٹوں سے بھری ہوئی تھی۔ معلوم ہوا کہ اس نے کوئی مقدمہ جیتا تھا۔ یہ اس کی بقایا فیس کی رقم تھی۔ پھر ذرا سنجیدہ ہو گیا۔ کہنے لگا۔

"میں ادب اور قانون کے درمیان پھنس گیا ہوں۔ کبھی جی چاہتا ہے کہ پریکٹس چھوڑ کر افسانہ نگاری شروع کر دوں۔ پھر سوچتا ہوں کہ نہیں میرے لئے وکالت کا پیشہ ہی بہتر رہے گا۔"

اعجاز بٹالوی نے اپنے مستقبل کے بارے میں جو فیصلہ کیا تھا وہ اس کے لئے بہت بہتر رہا لیکن قانون دانی کے ساتھ ساتھ شروع شروع میں اس کی افسانہ نگاری اور تنقیدی مضمون نگاری کی مشق بھی جاری رہی۔ اس نے جتنے افسانے لکھے وہ معیاری اور کامیاب افسانے تھے۔ جس روز اس نے حلقہ ارباب ذوق کے ادبی اجلاس میں اپنا کوئی مضمون یا افسانہ پڑھنا ہوتا تھا میں بھی وہاں موجود ہوتا تھا۔ اس کا افسانہ پڑھنے کا انداز بڑا خطیبانہ ہوتا تھا۔ اسے داد بھی بہت ملتی تھی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری اس سے جدا ہوگئی اور اس کا سارا وقت قانون کی موشگافیوں میں گزرنے لگا۔

جو کسر اس کی افسانہ نگاری میں رہ گئی تھی۔ وہ اس نے اپنی قانونی موشگافیوں اور قانونی بحث کے خطیبانہ ادبی انداز میں پوری کر دی اور اس کا شمار پاکستان کے لائق

ترین اور کامیاب وکیلوں میں ہونے لگا۔ کسی مقدمے کی پیروی کرتے ہوئے جیسا کہ سردار عنایت اللہ چانڈیہ نے اپنے خط میں لکھا ہے اعجاز بٹالوی اردو' فارسی اور انگریزی کے ادیبوں' شاعروں اور قانون دانوں کے ایسے ایسے حوالے دیتا کہ عدالت میں بیٹھے ہوئے لوگ داد دیئے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ لیکن چونکہ مجھے قانون دانی سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی اس لئے سوائے ایک دفعہ کے میں نے کبھی اعجاز بٹالوی کو عدالت میں بحث کرتے نہیں دیکھا۔

ذکر میں آزاد کشمیر ریڈیو کے زمانے کا کر رہا تھا۔ ایک بار ہم تقریباً سبھی آزاد کشمیر ریڈیو کے ادیب شاعر دو جیپوں میں بیٹھ کر کوہالہ کی سیر کو گئے۔ میں اور اعجاز بٹالوی سب سے اگلی جیپ میں تھے۔ جیپ بغیر چھت کے تھی۔ مجھے یہ منظر بھی پوری طرح یاد ہے۔ ہم دونوں جیپ کی ونڈ سکرین کے راڈ کو پکڑ کر کھڑے تھے اور ہماری جیپ دریائے جہلم کے ساتھ ساتھ کوہالہ کی طرف جا رہی تھی۔ مجھے یاد نہیں کہ ہم کیا باتیں کر رہے تھے۔ اتنا یاد ہے کہ ہم بڑے خوشگوار موڈ میں تھے اور سامنے سے آتی ہوئی تیز ہوا میں اعجاز بٹالوی کے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ ہم صرف کوہالہ برج تک گئے۔ پتہ نہیں پھر کیا بات ہوئی کہ ہمیں وہیں سے واپس مڑنا پڑا۔

اعجاز بٹالوی بے حد ظریف الطبع تھا۔ عام گفتگو میں مزاح کا پہلو اس پر غالب رہتا تھا۔ اس نے کہیں سے کسی ترقی پسند شاعر کا ایک شعر سن لیا۔ اس شعر میں ایک مزدور کے پھٹے پرانے لباس کا ذکر تھا۔ پہلا مصرعہ مجھے یاد نہیں رہا۔ دوسرے مصرعے میں اس مزدور کے پھٹے پرانے لباس کے حوالے سے کہا گیا تھا کہ اس کے لباس میں

ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں

اس زمانے میں کسی کھیت مزدور یا کارخانے کے مزدور کی خستہ حالت کو مزید خستہ ظاہر کرنا ہی ترقی پسندی کی معراج سمجھا جاتا تھا۔ یہ منظر بھی مجھے یاد ہے کہ میں اعجاز بٹالوی کے سامنے جاتا تو وہ مجھے مخاطب کر کے کہتا۔

''اے حمید!''

اور پھر

''ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں'' کے مصرعے کو دہرا کر صرف ہر

گھڑی ہر گھڑی ہر گھڑی کی گردان کرتا اور پھر ہم دونوں خوب ہنستے۔

مجھے یہ اعزاز حاصل تھا کہ وہ اس قسم کی بے تکلفی کا اظہار صرف میرے سامنے ہی کیا کرتا تھا۔ شاید اس لئے کہ لاابالی پن میں میری اور اس کی بہت سی قدریں ایک دوسرے سے ملتی جلتی تھیں۔

ایک بات میں بتانی بھول گیا ہوں کہ میں آزاد کشمیر ریڈیو پر کوئی سکرپٹ وغیرہ نہیں لکھتا تھا۔ میری آواز بڑی اچھی ہے اور میں شروع ہی سے اچھا گا لیا کرتا تھا۔ چنانچہ اس خیال سے کہ مجھے کچھ پیسے مل جایا کریں گے میں نے سٹیشن ڈائریکٹر صاحب کی اجازت سے کبھی کبھی تین چار منٹ کے لئے کسی نہ کسی پروگرام میں ہیر وارث شاہ گانی شروع کر دی تھی۔ ہیر وارث شاہ کے مجھے بند کے بند یاد ہوا کرتے تھے۔ آج بھی مجھے کئی بند زبانی یاد ہیں۔ ریڈیو پر ہیر گانے کے مجھے ایک پروگرام کے پانچ روپے ملتے تھے جو اس زمانے میں کافی سے زیادہ ہوتے تھے۔

میں یہ بتانا بھی بھول گیا ہوں کہ آزاد کشمیر ریڈیو کے سکرپٹ رائٹروں میں اعجاز بٹالوی کا بڑا بھائی آغا بابر بٹالوی بھی شامل تھا جس نے بڑے کمال کے افسانے لکھے ہیں۔ آغا بابر بٹالوی نے کشمیر کے موضوع پر اپنا مشہور ریڈیو ڈرامہ ''سیز فائر'' انہی دنوں لکھا تھا جس نے بڑی مقبولیت حاصل کی اور بعد میں یہ ڈرامہ سٹیج بھی ہوا۔

ایک فوٹو کاپی دیر تک میرے پاس رہی جس میں اعجاز بٹالوی' آغا بابر صاحب کوہ مری کی برف پوش پہاڑی ڈھلان پر کسی جگہ کھڑے ہیں۔ ہمیں مری کی برف باری میں شدید سردی سے بچنے کیلئے آزاد کشمیر ریڈیو والوں کی طرف سے لمبے لمبے اوورکوٹ ملے ہوئے تھے۔ وہ بڑے گرم تھے مگر ان کے بڑ کانوں کی طرح گردن پر چبھا کرتے تھے۔ انجینئر عماد الدین نے مجھے ایک روز بتایا کہ یہ اوورکوٹ ان کمبلوں کو کاٹ کر بنائے گئے ہیں جو دوسری جنگ عظیم میں سامان ڈھونے والے خچروں کی پیٹھ پر ڈالے جاتے تھے۔ اس تصویر میں ہم تینوں نے یہی خچروں والے اوورکوٹ پہن رکھے تھے اور ہاتھوں میں برف پر چلنے والی چھڑیاں یعنی سٹکیں تھیں۔

کوہ مری کی برف باری میں ان چھڑیوں یعنی لکڑی کی سٹکوں کے بغیر چلنا پھرنا خطرناک ہوتا تھا۔ جب برف گر رہی ہوتی تو ہم بڑی آسانی سے پہاڑی راستوں

پر اترا چڑھا کرتے لیکن جب برف باری کے بعد سرد ہوا چلتی اور پہاڑی راستوں پر پڑی ہوئی برف جم کر شیشے کی طرح سخت ہو جاتی تھی تو آدمی کو چھڑی کے باوجود بڑا سنبھل سنبھل کر چلنا پڑتا تھا۔ ایک وہ منظر بھی آج میری آنکھوں کے سامنے ہے کہ میں' اعجاز بٹالوی اور ترقی پسند بلکہ کمیونسٹ دانشور تقی احمد سید بی اے (آکسن) ایجنسی کی طرف سے سنی بنک کی طرف سیر کرتے جا رہے تھے۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ سڑک پر جمی ہوئی برف شیشے کی طرح سخت ہو چکی تھی۔ ہم سنبھل سنبھل کر قدم اٹھا رہے تھے کیونکہ شیشہ بنی ہوئی برف پر ہر قدم پر پھسلنے کا خطرہ تھا۔ اعجاز بٹالوی نے تقی احمد سید کو خبردار کیا۔

"تقی! دیکھنا کہیں پھسل نہ جانا۔ اگر گر پڑے تو پیارے پھر اٹھ نہ سکو گے۔"

"ایسا ہی ہوا۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے تقی احمد سید کا پاؤں پھسلا اور وہ چاروں شانے چت برف پر گر پڑا۔ اب وہ جس قدر اٹھنے کی کوشش کرتا اتنا ہی اور پھسل جاتا۔ ہم نے اسے اٹھانے کی کوشش کی تو ہم بھی پھسل گئے۔ دور دور تک کوئی بندہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر تک ہم ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے برف کی سل پر ماہی بے آب کی طرح تڑپتے رہے۔ خوش قسمتی سے اعجاز بٹالوی کی آگے سے مڑی ہوئی چھڑی نے سڑک کنارے کی ایک جھاڑی کو پکڑ لیا اور ہم بڑی مشکل سے ایک ایک کر کے سڑک پر رینگتے ہوئے جھاڑیوں کو پکڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ اعجاز بولا۔

"پیارے! یہاں سے جو پھسلتا ہے پھر وہ سیدھا پنڈی پہنچ کر ہی دم لیتا ہے یا دم دے دیتا ہے۔"

تقی احمد سید قیام پاکستان سے تھوڑا عرصہ پہلے آکسفورڈ سے بی اے کر کے واپس آیا تھا۔ میری اس سے بڑی دوستی ہو گئی تھی۔ ولائت میں اپنی طالب علمی کے زمانے میں تقی نے انگریزی ادب کا جو مطالعہ کیا وہ تو اسے کرنا ہی تھا لیکن کارل مارکس کے داس کیپٹل کو وہ گھوٹ کر پی گیا تھا اور اب زندگی کے ہر مسئلے کو وہ کمیونزم کی عینک سے دیکھتا تھا۔ ویسے وہ پاکستان کے اشتراکی دانشوروں میں ایک آدھ کو چھوڑ کر سب سے زیادہ پڑھا لکھا دانشور تھا۔ قرۃ العین حیدر کے خاندان سے اس کی بڑی قریبی رشتے داری تھی۔ ہم دونوں کوہ مری کے کانونٹ سکول والی چھوٹی سی خاموش سڑک کنارے

بنے ہوئے شیڈ میں بیٹھ کر لندن جانے کے پروگرام بنایا کرتے تھے۔ وہ لندن میں رہ چکا تھا اور مجھے لندن کے سفر میں ساتھ لے جانے والی چیزوں کے بارے میں ضروری ہدایات دیا کرتا تھا۔

تقی احمد سید میرے رومانی افسانوں کے سخت خلاف تھا اور مجھے کہا کرتا تھا کہ اے حمید تم اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔ مگر مجھے چونکہ وہ پسند تھا اس لئے مجھے اس کی اس قسم کی تنقید بھی ناگوار نہیں گزرتی تھی۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ جتنا اس کا عقیدہ اشتراکیت پر پختہ تھا اس سے کہیں زیادہ میرا اپنی رومان پسندی پر ایمان تھا۔ برفباری کے دنوں میں آزاد کشمیر ریڈیو کی طرف سے ہمیں گرم سواتی ٹوپیاں ملی ہوئی تھیں۔ یہ ٹوپیاں بھی جنگ کے ایام میں خچروں پر جو موٹے کمبل ڈالے جاتے تھے ان کی بنی ہوئی تھیں لیکن ایک روز شام کے وقت جبکہ برف گر رہی تھی اور برفیلی ہوائیں چل رہی تھیں دلی کا وضع دار شاعر خمار دہلوی ایک عجیب و غریب ٹوپی پہن کر سٹوڈیوز میں آ گیا۔ اس کی ٹوپی کے بارے میں مختلف قیاس آرائیاں شروع ہو گئیں۔ کسی نے کہا یہ غالب کی اونچی دیوار والی ٹوپی ہے کس نے کہا خمار دہلوی نے اپنے پرانے سرہانے کی ٹوپی بنا لی ہے بعد میں پتہ چلا کہ اس روز سخت سردی سے بچنے کیلئے خمار صاحب ٹی کوزی سر پر پہن کر آ گئے تھے۔

اس دوران تقی احمد سید اکیلا ہی لندن چلا گیا۔ اعجاز بٹالوی اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات کی وجہ سے لاہور واپس آ گیا۔ اس کے جانے کے بعد مجھے بھی لاہور کی پراسرار فضاؤں نے اپنے پاس بلا لیا۔ لاہور میں ٹی ہاؤس میں ہم ادیبوں کی محفلیں اپنے عروج پر تھیں۔ اعجاز بٹالوی ان ہی دنوں وکالت میں مزید تعلیم حاصل کرنے لندن چلا گیا۔ یہ سن 1950ء کا زمانہ تھا۔

لندن پہنچ کر اعجاز بٹالوی نے مجھے ایک پوسٹ کارڈ بھیجا جو رسالہ ادب لطیف کے ایڈریس پر تھا۔ خط میں اس نے لکھا۔

"پیارے اے حمید!

وادی وادی' صحرا صحرا' مارے مارے پھرتے ہیں
ہم کو وحشی' جان کے آہو' ساتھ ہمارے پھرتے ہیں

اعجاز

اگر یہ خط مرزا ادیب صاحب کے ملاحظے سے گزرے تو میری دعا ہے کہ وہ مجھے "ادب لطیف" کے پرچے بھیجیں۔ میرا لندن کا پتہ یہ ہے۔"

اس کے بعد میرے اور اعجاز کے درمیان جدائی کا ایک لمبا عرصہ آ گیا۔ وہ لندن سے بیرسٹر بن کر واپس آیا تو اس کی قانونی مصروفیات میں اضافہ ہو گیا۔ وہ ٹی ہاؤس نہیں آتا تھا۔ مجھے اس کی وکالت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کبھی کبھار اتفاق سے کسی ادبی فنکشن میں ملاقات ہو جاتی اور وہیں مل بیٹھنے کا تھوڑا وقت مل جاتا۔ ایک روز میں ہائی کورٹ کے قریب سے گزر رہا تھا تو سوچا اعجاز بٹالوی سے ملنا چاہیے۔ میں اس کے دفتر پہنچ گیا مجھے دیکھ کر وہ بڑا خوش ہوا۔ اس کے پاس کوئی ایرانی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دونوں جرمن ناول نگار ہرمن ہیسے کے نوبل انعام یافتہ ناول "سدھارتھ" (Sidaratha) کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ اس جرمن ناول کا نیا نیا انگریزی ترجمہ چھپ کر مارکیٹ میں آیا تھا۔ اعجاز نے مجھے اس خیال سے اپنی گفتگو میں شامل نہ کیا کہ میں نے یہ ناول نہیں پڑھا ہو گا۔ لیکن جب میں نے اسے بتایا کہ کچھ برس پہلے اس ناول کے انگریزی ترجمے کو انڈیا کے مشہور رسالے السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا والوں نے بڑے خوبصورت سکیچوں کے ساتھ شائع کیا تھا اور میں نے اس کی ساری کٹنگ سنبھال کر رکھی ہوئی ہے اور بعد میں میں نے اسے کتابی صورت میں پڑھا ہے تو اعجاز کو بڑی خوشگوار حیرت ہوئی۔ پھر میں نے انہیں انگریزی ترجمے کے چند ایک خاص جملے زبانی سنائے تو اعجاز بولا۔

"اے حمید مجھے وہ سکیچ ضرور دکھانا۔"

پھر نہ مجھے یاد رہا اور نہ اعجاز کو فرصت ملی کہ وہ "سدھارتھا" ناول کے سکیچز کے لئے مجھے تقاضا کرتا۔

کچھ اور وقت ہمیں ایک دوسرے سے ملے بغیر گزر گیا۔ اسی طرح میں ایک روز ہائی کورٹ کے قریب سے گزر رہا تھا کہ اعجاز بٹالوی کی محبت نے زور مارا اور میں اس گلی میں مڑ گیا جہاں وکلاء حضرات کے دفاتر ہوتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ ہائی کورٹ گیا ہو گا مگر وہ اپنے آفس میں ہی تھا اور اکیلا تھا۔ مجھے دیکھ کر حسب عادت ہنس

پڑا۔ اس نے پہلا سوال یہ کیا۔

"اے حمید پہلے یہ بتاؤ کہ تمہیں مجھ سے کام کیا ہے کیونکہ تم بغیر کام کے ملنے والی جنس نہیں ہو۔"

میں نے کہا۔

"مجھے تم سے کوئی کام نہیں ہے اور خدا نہ کرے کہ مجھے تم سے کوئی کام پڑے۔"

میرے اس جواب پر وہ بہت خوش ہوا۔ کہنے لگا۔ ٹھہرو میں تمہیں چائے پلاتا ہوں۔ پھر اس نے میز کے دراز میں سے ایک ضخیم کتاب نکال کر میرے آگے رکھ دی اور بولا۔

"میں چاہتا ہوں تم یہ ناول ضرور پڑھو۔"

وہ ضخیم کتاب مشہور فرانسیسی ادیب رومان رولاں کا ناول "یاں کرستوف" تھا پھر کہنے لگا۔

"یہ کتاب میں تمہیں اس شرط پر دوں گا کہ تم اسے پڑھ کر مجھے واپس کر دو گے۔ اس لئے کہ یہ کتاب میرے بڑے بھائی عاشق حسین بٹالوی کی ہے اور اس پر ان کے دستخط ثبت ہیں۔"

میں نے کتاب کا پہلا صفحہ الٹ کر دیکھا وہاں عاشق حسین بٹالوی کے انگریزی میں کیے ہوئے دستخط تھے۔ میں نے عاشق حسین بٹالوی کے افسانے "ادبی دنیا" میں پڑھ رکھے تھے اور میں ان کا بڑا مداح تھا۔ وہ لندن میں رہ رہے تھے۔ میں نے اعجاز بٹالوی سے وعدہ کر لیا کہ میں کتاب پڑھ کر واپس کر دوں گا لیکن جب میں نے کتاب پڑھی تو مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ یہ کتاب کسی بھی صورت میں ان کتابوں میں سے نہیں ہے جنہیں پڑھ کر واپس کر دیا جاتا ہے۔ کتاب پڑھ چکنے کے بعد میں اعجاز بٹالوی کے آفس پہنچ گیا۔ اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"اے حمید کتاب پڑھی؟ کیسی ہے؟"

میں نے کہا۔ "بڑا اچھا ناول ہے۔"

کہنے لگا۔ "مجھے معلوم تھا تمہیں یہ ناول پسند آئے گا۔ اسے واپس لائے ہو۔"

میں نے جواب دیا۔

''اعجاز بٹالوی! میں صاف صاف بتا دوں کہ یہ ناول میں تمہیں واپس نہیں کروں گا چاہے کچھ کرلو۔ مجھ پر مقدمہ دائر کردو گے تو میں عدالت میں صاف مکر جاؤں گا کہ تم نے مجھے کوئی کتاب نہیں دی۔ باقی کتاب کے شروع میں جو عاشق حسین بٹالوی کے دستخط ہیں وہ مجھے اس کتاب ہی کی طرح عزیز ہیں اور کتاب کے ساتھ انہیں بھی سنبھال کر رکھوں گا۔''

وہ مجھے جانتا تھا سمجھ گیا کہ کتاب اس کے ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ میرا جواب سن کر اس نے صرف اتنا ہی کہا۔

''مجھے شک تھا کہ تم یہ کمینگی ضرور کرو گے۔''

وہ ناول آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ جناب عاشق حسین بٹالوی کے دستخط بھی محفوظ ہیں اور زندگی کے آخری سانس تک محفوظ رہیں گے۔

جب کبھی میرا ویانا اور پیرس کے میوزک کنسرٹوں میں شوپین، ویگنر اور بیتھاون کا دل گداز سحر انگیز میوزک سننے اور فرانس کے قدیم قلعوں کے جنگلی گلابوں سے ڈھکی ہوئی اونچی محرابی کھڑکیوں کے نیم روشن خاموش دیوان خانوں میں انیسویں صدی کے مصوروں، شاعروں اور موسیقاروں اور عالی ظرف نازک اندام خواتین کے ساتھ بیٹھ کر سنہری چائے پینے کو جی چاہتا ہے تو میں روماں رولاں کا ناول ''ژاں کرستوف'' نکال کر کہیں سے بھی پڑھنے لگتا ہوں اور اعجاز بٹالوی کو دعائیں دیتا ہوں۔

اس کے بعد حسب سابق ہماری ملاقاتوں میں ایک لمبا وقفہ آ گیا۔ اعجاز کی عدالتی مصروفیات اور میری عدم مصروفیات نے ہمیں ایک دوسرے سے ملنے نہ دیا۔ پھر اس نے مجھے راشد صاحب کی نظموں کی کتاب کا ایک نیا اڈیشن بھیجا۔ کتاب کا نام تھا ''گمان کا ممکن'' کتاب کے اندرونی صفحے پر اس نے ہم دونوں کے ایک ساتھ گزارے ہوئے دنوں کی یاد میں فارسی کا ایک شعر لکھا:

یاد ایامے کہ با او گفتگو ہا داشتیم
اے خوشا حرفے کہ گوید آشنا با آشنا

اے حمید کے لئے راشد صاحب کی یاد میں

میں نے کتاب کا شکریہ ادا کرنے کے لئے اسے فون کیا۔ کہنے لگا میں بیمار ہوں تم ملنے نہیں آئے۔ بڑے خود غرض ہو۔ خیر کوئی بات نہیں۔ میں نے گھر بدل لیا ہے۔ اب میں شادمان کالونی میں آ گیا ہوں۔ پھر اس نے مجھے اپنے نئے مکان کا نمبر دیا اور سارا محل وقوع سمجھایا۔ میں بڑی توجہ سے سنتا رہا کہ کہاں سے ٹرن لیتی ہے اور آگے کس طرف جاتا ہے لیکن مجھے معلوم تھا کہ میں اسے بیماری کی حالت میں دیکھنے نہیں جاؤں گا۔

اس کے بعد اعجاز حسین بٹالوی سے جسٹس خواجہ محمد شریف کی رش مانو کی دعوت میں ملاقات ہوئی۔ یہ میری اور اعجاز بٹالوی کی آخری ملاقات تھی۔ وہ کچھ دبلا ہو گیا ہوا تھا۔ کئی جج صاحبان اور وکلاء حضرات اس سے باتیں کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ بڑا خوش ہوا۔ پھر ہم دونوں سب سے آنکھ بچا کر ایک طرف ہو گئے اور خوب دل کھول کر باتیں کرتے اور ہنستے رہے۔ کہنے لگا۔

''اب میں کسی قدر ٹھیک ہوں۔ تم بڑے کمینے ہو میری خبر تک لینے نہ آئے۔''

آپ بھی یقیناً اسے میری کمینگی اور انتہائی سنگ دلی سمجھیں گے لیکن میں کیا کروں؟ میں جن سے محبت کرتا ہوں انہیں بستر مرگ پر نہیں دیکھ سکتا۔

☆......☆......☆

افسانہ نگار: حجاب امتیاز علی

رومانی افسانہ نگار حجاب امتیاز علی پر بہت کچھ لکھا جانا چاہئے تھا لیکن اب تک جتنا کچھ لکھا گیا ہے وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اردو کے رومانی ادب میں حجاب امتیاز علی کی شخصیت بڑی دیو قامت ہے۔ میں انہیں اردو کی پہلی (اور ابھی تک آخری) رومانی افسانہ نگار خاتون سمجھتا ہوں۔ ہمارے ہاں رومان کا لفظ بڑا بدنام ہے اور اجنبی بھی ہے۔ اس لفظ کی صحیح اور کلاسیکل روایت کو انگریز اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ یہ روایت انہیں فرانس کے توسط سے نشاۃ الثانیہ کے اٹلی سے ملی تھی۔ اٹلی میں رومان نے کاؤنٹوں کے قلعوں میں ظاہری رکھ رکھاؤ اور عورت کے نسوانی حسن و زیبائش کے ماحول میں پرورش پائی۔ فرانس نے اس روایت کو جوں کا توں قبول کر لیا اور اپنی طرف سے عورت کے جسمانی حسن کی تعریف کو مبالغے کی حد تک پہنچا دیا لیکن انگلستان کے رومان پسند طبقہ اشرافیہ نے رومان کے مفہوم میں نسوانی حسن و آرائش کے ساتھ فطرت کے حسن اور گرم سمندروں کے نیلے شفاف آسمان پر چمکتے ستاروں اور گرم ایشیائی پس منظر کو بھی اپنے رومانوی ادب میں شامل ہی نہیں کیا بلکہ اسے کلاسیکی درجہ دے دیا۔ فرانس میں روسو نے رومان کو جذب و وجدان کا منبع کہا تھا اور انگلستان میں شیلے نے رومان کو اپنی نظموں اور گیتوں کے ذریعے ایک انقلابی فکر عطا کیا۔ یہ ساری باتیں میں ادب کے ایک طالب علم کی حیثیت سے لکھ رہا ہوں نہ میری حیثیت ادب کے نقاد کی ہے اور نہ میں طبعی رومان نگاری میں کسی تنقید کا قائل ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ طبعی رومان نگاری میں تنقید کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ یہاں میں پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) استاد جامعہ ملیہ اسلامیہ (دلی) کے مضمون کا ایک اقتباس نقل کرنا چاہتا ہوں۔

پروفیسر مجیب لکھتے ہیں:

''ہر ادب میں دو عنصر ہوتے ہیں۔ ایک فطری یا طبعی اور دوسرا اکتسابی اور اس کی نشوونما اس پر منحصر ہوتی ہے کہ یہ دونوں عنصر ایک دوسرے سے کس حد تک ہم آہنگی رکھتے ہیں۔ اکتسابی عنصر وہ ہے جو ہر نسل کو ورثے میں ملتا ہے۔ جس میں اسلوب اور مذاق کی تمام خوبیاں ہوتی ہیں لیکن عموماً تصنع اور قواعد کی پابندی اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ سچے جذبات ظاہر کرنے کی گنجائش کم ہو جاتی ہے۔ فطری یا طبعی عنصر قوم یا نسل یا ان دونوں کے رنگ میں رنگے ہوئے انفرادی جذبات ہوتے ہیں جو اسلوب اور قواعد سے بے نیاز اور تنقید سے بے خوف سیدھے دل سے زبان کا راستہ لیتے ہیں۔ انہیں ہم چاہیں تو کائنات کی پوشیدہ قوت سمجھ سکتے ہیں یا فطرت انسانی کے وہ معمے جن کا حل کرنا ہمارے امکان سے بالکل باہر ہے۔ ادبی لحاظ سے ان کی خصوصیت جوش اور سچائی' سادگی اور صاف گوئی ہوتی ہے جو ان میں کسی قسم کا تصنع اور آورد شامل نہیں ہونے دیتی۔ ادبی نشوونما ان فطری جذبات کا وہ اسلوب مذاق اور معیار قبول کرتا ہے جو تاریخی سلسلے میں ایک نسل کو دوسری نسل سے ملتے ہیں۔ فطری یا طبعی جذبات کی شان یہی ہے کہ وہ اپنی قوت سے ظہور میں آئیں۔ اس طرز میں ایک سادگی اور بے ساختہ پن ہوتا ہے جو تہذیب اور ذہنی نشوونما کے عمل کو تیز کرتا ہے اور انسانی ذہن کو غرور اور تعصب سے پاک کر دیتا ہے۔''

اپنے اسی مضمون میں آگے چل کر سچی رومان نگاری کے ضمن میں بیاہ شادیوں پر گائے جانے والے ایک روسی لوک گیت کی مثال دی ہے۔ پروفیسر محمد مجیب کو روسی زبان پر عبور حاصل تھا چنانچہ انہوں نے اس روسی گیت کا خود ترجمہ کر کے مضمون میں درج کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ایک لڑکی جس کا سسرال میں جی نہیں لگتا یوں شکایت کرتی ہے:

''کاش! اگر برف نہ گرتی' پھول برستے

جاڑوں میں بھی پھول کھلتے
آہ! اگر میرے دل پر بوجھ نہ ہوتا
تو مجھے کوئی دکھ بھی نہ ہوتا
میں یوں ٹیک لگائے بیٹھی نہ رہتی
میں نے باپ سے کہا تھا
جو مجھ سا نہ ہو اس سے میرا بیاہ نہ کر
دوسرے کی دولت پر نہ جا
اونچے مکان کو نہ دیکھ
مجھے شوہر چاہئے' روپیہ کیا کروں گی
اجلے دن چاہئیں' بڑا مکان کیا کروں گی

اس اعتبار سے میں حجاب امتیاز علی کو فطری اور طبعی رومان نگار سمجھتا ہوں اور اس کے لٹریچر کی سچائی اور بے ساختہ پن دیکھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ پاکستان (بلکہ برصغیر) کے اردو ادب میں حجاب امتیاز علی فطری رومانیت کا منبع ہے۔ میں حجاب امتیاز علی کے کسی افسانے' ناول یا کسی ادب پارے کی مثال نہیں دوں گا۔ میرے نزدیک حجاب امتیاز علی کی پوری شخصیت' بھی اور فطری رومان نگاری کا سرچشمہ بن گئی تھی۔ وہ جو لکھتی تھیں وہ جو بولتی تھیں وہ رومان تھا۔ ایک سچے غیر اکتسابی اور طبعی رومان نگار کی یہی خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ اکتساب اور تصنع سے پاک ہوتا ہے۔ وہ دل سے لکھتا ہے دماغ سے نہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس کی تحریر کا اثر قاری کے دل پر ہوتا ہے اور اس کی ساری شخصیت' اس کا اٹھنا بیٹھنا' بولنا چلنا' خاموش رہنا سب کچھ اسی پاکیزہ رنگ میں رنگا جاتا ہے۔

شاہ بلوط کے درختوں کے سایوں اور فرانسیسی دریچوں کی ان کی نگاہوں میں کوئی مادی حیثیت نہیں تھی بلکہ یہ کائنات کی پراسرار پوشیدہ قوتوں کے وہ خوبصورت اور پاکیزہ روحانی خیالات تھے جو ہماری زندگی سے پہلے بھی کائنات میں موجود تھے اور ہماری زندگی کے بعد بھی کائنات کی بیکراں وسعتوں میں جاری وساری رہیں گے۔
میں اس سے زیادہ محترمہ حجاب امتیاز علی کے لٹریچر کی تفصیل میں نہیں جاؤں

گا۔ میں اپنے آپ کو اتنا ہمہ گیر بھی نہیں سمجھتا کہ حجاب امتیاز علی کی رومان نگاری کی گہرائی اور اس کی وسعتوں کا احاطہ کر سکوں۔ میں ان کے ادب کا ایک قاری اور مداح ہوں۔ کبھی کبھی جب میں ان کی کوئی کتاب کھولتا ہوں تو میرے سامنے ایک باغ عدن کا گویا دریچہ کھل جاتا ہے اور اس دریچے میں سے سچی خوشی اور روحانی کیف و وجدان کی خوشبوئیں آتی محسوس ہوتی ہیں۔ تب میں سوچتا ہوں کہ حجاب امتیاز علی تو حقیقی رومان نگاری اور اس کی وجدانی کیفیات سے سرشار صلے اور ستائش کی تمنا سے قدرتی طور پر بے نیاز تھیں۔ جس طرح صحرا کی وسعتوں میں کھلا ہوا پھول اس بات سے بے نیاز ہوتا ہے کہ کوئی اس کو دیکھنے والا' اس کے رنگ و خوشبو سے لطف اندوز ہونے والا ہے یا نہیں...... لیکن ہمیں اپنے پاکستانی ادب کے انمول ورثوں سے لاتعلق نہیں رہنا چاہئے۔ میں نے محترمہ کے ادب پر یہ چند سطریں لکھنے کی اس لئے کوشش کی ہے کہ پاکستان کی نئی نسل کو یاد دلا سکوں کہ ہم اپنے ان قیمتی ورثوں کو بھولتے جا رہے ہیں کہ جنہیں یاد رکھنا اور ان کی قدر و منزلت کرنا ہمارا فرض ہے۔

یہ بڑی حوصلہ افزا بات ہے کہ کچھ لوگوں کو اس قیمتی ادبی ورثے کی اہمیت کا احساس ہوا ہے۔ پاکستان کے کچھ طلباء اور پروفیسر صاحبان نے حجاب امتیاز علی کے لٹریچر پر تحقیقی مقالات لکھنے کا بیڑا اٹھایا ہے اور انہوں نے خط لکھ کر مجھ سے ان کی شخصیت کے بارے میں استفسار کیا ہے۔ میری طرف انہوں نے اس لئے رجوع فرمایا کہ میں بھی بطور رومانوی افسانہ نگار کے مشہور ہوں۔ یہ ان کا حسن نظر ہے ورنہ میں نے ایک سچے اور حقیقی رومانوی افسانہ نگار ہونے کا کبھی دعویٰ نہیں کیا۔ اگر میرے لٹریچر میں تھوڑی بہت رومان نگاری ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ قدرت کی طرف سے مجھے عطا ہوئی ہے۔ اس میں میری کاوش بالکل شامل نہیں ہے جو اصحاب محترمہ حجاب امتیاز علی پر تحقیقی مقالہ لکھنا چاہتے ہیں انہوں نے ان کا لٹریچر تو پڑھ لیا ہے جو اب مارکیٹ میں دستیاب ہے اور اس کا سہرا نیاز احمد صاحب مالک سنگ میل پبلی کیشنز کے سر ہے کہ انہوں نے محترمہ کی تقریباً ساری کتابیں دوبارہ چھاپ دی ہیں مگر ان اصحاب کا کہنا ہے کہ ہمیں محترمہ کی زندگی اور شخصیت کے بارے میں کچھ علم نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس بارے میں میری معلومات بھی بہت محدود ہیں۔ مجھے

کبھی کبھار ہی ان کی خدمت میں بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا ہے اور جتنی دیر تک (اور یہ مدت بہت قلیل ہوتی تھی) میں ان کی خدمت میں بیٹھا رہا' مجھ میں کبھی یہ ہمت نہ ہوئی کہ میں ان سے ان کی شخصیت یا ان کی زندگی کے بارے میں کوئی سوال کروں۔ وہ بہت کم بات کرتی تھیں اور مجھے اتنی بڑی ادیبہ کے ساتھ بات کرنے کو الفاظ نہیں ملتے تھے۔

ایک بار انہوں نے میری طرف متوجہ ہو کر کہا۔ آپ اچھا لکھتے ہیں۔ میں اس کے جواب میں انہیں کہنا چاہتا تھا کہ میں نے آپ کو پڑھ کر لکھنا سیکھا ہے لیکن میں یہ نہ کہہ سکا۔ جب تک محترمہ حجاب ریڈیو سٹیشن کی عمارت کے قرب و جوار میں قیام پذیر رہیں' میں گاہے بگاہے ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ جب انہوں نے مکان بدل لیا اور گلبرگ اور پھر ماڈل ٹاؤن چلی گئیں تو ان سے شرف نیاز نہ رہا۔ ان کی خیر خیریت ان کی صاحبزادی یاسمین طاہر صاحبہ سے ضرور پوچھ لیا کرتا تھا۔

جب ان کا انتقال ہوا تو میں ملک سے باہر تھا۔ اب ان کے ادب پر تحقیقی کام کی احباب کو ضرورت ہے تو میں نے اپنے طور پر محترمہ کی زندگی کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوا۔ ان کے بارے میں صرف یاسمین طاہر صاحبہ ہی گراں قدر معلومات مہیا کر سکتی تھیں اور وہ امریکہ میں مقیم ہیں۔ اتفاق سے میرے پرانے کاغذات سے حجاب امتیاز علی صاحبہ کی ایک نادر تصویر مجھے مل گئی۔ یہ تصویر آج سے کئی برس پہلے جب انہوں نے ریڈیو کے واسطے اپنا انٹرویو ریکارڈ کرایا تھا اتاری گئی تھی۔ یہ بڑی نایاب تصویر ہے میں نے بہت کوشش کی کہ ریڈیو سٹیشن کی ریکارڈ لائبریری سے ان کے انٹرویو کی ٹیپ مل جائے مگر افسوس کہ وہاں ان کے انٹرویو کی ٹیپ موجود نہیں تھی پھر پرانے کاغذات میں سے مجھے محترمہ حجاب کا ایک چھپا ہوا انٹرویو مل گیا۔ یہ انٹرویو گفتگو کی شکل میں ''نوائے وقت'' مطبوعات کے ایک ہفتہ وار اخبار ''ندائے ملت'' کے 17 نومبر 1995ء کے شمارے میں چھپا تھا اور محترمہ سے گفتگو ندائے ملت کے ایوب ندیم صاحب نے کی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ محترمہ حجاب علی کا یہ واحد انٹرویو ہے جو لاہور کے کسی اخبار کو انہوں نے دیا اور میں سمجھتا ہوں کہ ندائے ملت نے محترمہ کے لٹریچر پر تحقیقی کام کرنے والوں کو محترمہ کی شخصیت' ان کی زندگی اور

ان کے سیاسی اور ادبی نظریات کے بارے میں ایسی قیمتی معلومات مہیا کر دی ہیں جو انہیں شاید ہی اور کہیں سے دستیاب ہو سکتیں۔ ملاحظہ ہو۔

انٹرویو: حجاب امتیاز علی

شمس العلماء مولوی ممتاز علی کی بہو' امتیاز علی تاج کی بیگم' حجاب امتیاز علی نے گیارہ سال کی عمر میں کہانی لکھنے کا آغاز کیا اور وہ صرف بارہ سال کی عمر میں ''میری ناتمام محبت'' کے عنوان سے ایک ناول بھی مکمل کر چکی تھیں جو اس زمانے کے ''نیرنگ خیال'' میں شائع ہوا۔ حجاب کی پیدائش حیدر آباد دکن میں ہوئی لیکن ان کے والد' نظام حیدر آباد دکن کے سیکرٹری سید محمد اسماعیل نے طاعون کے ڈر سے اپنی فیملی کیلئے مدراس میں ایک گھر خرید لیا تا کہ ان کے بچوں کی تعلیم اور صحت پر کوئی مضر اثر نہ پڑے۔ حجاب' حجاب امتیاز علی بن کر 1936ء میں لاہور آئیں اور پھر یہیں کی ہو کر رہ گئیں۔ بطور افسانہ نگار ان کی عمر خاصی طویل ہے۔ ان کے افسانوں کے 20 سے زائد مجموعے اور کوئی پانچ ناول شائع ہو چکے ہیں۔ حکومت پاکستان کی طرف سے ان کی ادبی خدمات کے صلے میں انہیں ''تمغہ امتیاز'' دیا گیا ہے۔ ان کے قویٰ بظاہر تو مضمحل دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کا عہد جوانی اب بھی ان کی آواز کی گھن گرج اور جسم و لباس کی آرائش و زیبائش سے جھانکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

س: آپ نے اگرچہ ''تہذیب نسواں'' میں نظم نما نثر کے عنوان سے مضامین بھی لکھے لیکن آپ کا اصل میدان رومانی افسانے رہا ہے۔ کیا آپ نے رومان سے ہٹ کر کچھ اور موضوعات پر بھی کہانیاں لکھی ہیں؟

ج میری بیشتر کہانیوں کا موضوع محبت ہے اس لئے کہ میرے نزدیک محبت کائنات کی سب سے بڑی سچائی اور انسان کا سب سے اہم جذبہ ہے تاہم میں نے معاشرے کے دیگر مسائل کو بھی اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا۔ مثال کے طور پر میرا ناول ''پاگل خانہ'' میرے دیگر افسانوں اور ناولوں سے بالکل مختلف اور منفرد ہے۔ اس پر میں نے بہت محنت کی اور سائنسی نقطہ نظر سے لوگوں کے اندر رونما ہونے والی تبدیلیوں کے حوالے سے بات کو آگے بڑھایا۔ میں نے اس ناول میں کہانی کے ذریعے یہ بات کہی

کہ وقت کے ساتھ ساتھ موسموں اور انسانوں کے طرز عمل میں بھی تبدیلی رونما ہوتی چلی جائے گی۔ میں نے اس ناول میں جو کچھ لکھا وہ آج ہو رہا ہے۔ انسانوں کے ہاتھوں انسان قتل ہو رہے ہیں' ماں بیٹی کو' باپ بیٹے کو' بیوی شوہر کو اور بھائی بہن کو مار رہا ہے۔ انسانی رشتوں کی حرمت بری طرح پامال ہو رہی ہے۔ یہ سب کچھ اس شدت کے ساتھ ہمارے زمانے میں نہیں ہوتا تھا لیکن مستقبل کی اس صورتحال کا ادراک مجھے برسوں پہلے ہو گیا تھا۔

س: آپ نے رومانی افسانے لکھے۔ کیا آپ ادب کی رومانوی تحریک سے باقاعدہ طور پر وابستہ تھیں؟

ج: میں نے جب لکھنا شروع کیا تو صرف اپنے لئے اور اس کے بعد بھی جو لکھا اس میں بھی میں پڑھنے والوں کا خیال نہیں رکھتی تھی۔ میں نے ہمیشہ اپنی ذات کیلئے لکھا اور ہمیشہ اپنے خیالات اور جذبات کو پیش کیا۔ مجھے اس بات کی کبھی فکر نہیں ہوتی تھی کہ لوگ میری کہانیوں کو پسند کریں گے یا نہیں۔

یہ حسن اتفاق ہے کہ لوگوں نے میری کہانیوں کو پسند کیا' میرا کسی تحریک سے کوئی باقاعدہ تعلق نہیں تھا اور نہ ہی میں نے کسی تحریک کے مقاصد کو کبھی پیش نظر رکھا۔ یہاں میں ایک اور بات بتاتی چلوں کہ "تہذیب نسواں" جو ہندوستان کا سب سے پہلا نسوانی اخبار تھا۔ اس میں میری والدہ عباسی بیگم' عطیہ فیضی اور مسز سجاد حیدر لکھا کرتی تھیں۔ یہ تینوں آپس میں دوست بھی تھیں۔ انہی کو دیکھ کر میرے اندر لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ میری خالائیں رابعہ سلطان' خیر النساء بیگم بھی تخلیق کار تھیں' گویا ہمارا پورا گھرانہ ہی رائٹرز کا تھا۔

س: کیا آپ نے ترقی پسند تحریک کے اثرات قبول کئے؟

ج: ہرگز نہیں' ترقی پسند تحریک سے نہ میرا کوئی تعلق رہا اور نہ ہی اس کا مجھ پر کوئی اثر ہوا۔ البتہ میں ادب میں تجربات کی مخالف نہیں ہوں۔ ترقی پسند افسانہ نگاروں نے حقیقت نگاری کا تجربہ کیا' انہیں کرنا چاہئے تھا لیکن میری دنیا ان سے مختلف تھی۔

س: امتیاز علی تاج کی شہرت کا دارومدار ان کے ڈراموں بالخصوص "انارکلی" پر ہے' اگر ان کے تخلیقی اثاثے میں سے "انارکلی" کو نکال دیا جائے تو ان کے پاس باقی کیا

بچتا ہے؟

ج: وہ ڈرامے کے آدمی تھے اور میں کہانیاں لکھتی تھی۔ وہ "تہذیب نسواں" کے ایڈیٹر تھے اور میں "تہذیب نسواں" میں لکھتی تھی۔ ابھی ہماری شادی نہیں ہوئی تھی لیکن دونوں کے درمیان ایک پسندیدگی کا تعلق موجود تھا' ایک بار میں نے انہیں ایک خط لکھا جس کا انہوں نے جواب نہ دیا۔ اس پر میں ناراض ہو گئی' پھر جب انہیں میری ناراضگی کا خیال آیا تو انہوں نے مجھے خط لکھا مگر میں نے اس کا جواب نہ دیا۔ اس پر وہ بہت پریشان ہوئے۔ پطرس بخاری نے انہیں مشورہ دیا کہ آپ اپنے ڈرامہ "انارکلی" کا انتساب حجاب کے نام کر دیں تو وہ خوش ہو جائیں گی۔ چنانچہ امتیاز صاحب نے یہی کیا اور یوں "انارکلی" میرے نام ہو گیا اور یہی ڈرامہ ہمارے ملاپ کا باعث بنا۔ یہ ان کا شاہکار ڈرامہ ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے بچوں کے سلسلے میں بھی بہت لکھا۔ لوگ آج تک ان کی بچوں کے متعلق کتابیں ڈھونڈتے ہیں۔ انہوں نے ڈرامے بھی لکھے۔ ادب میں ان کا نام بہت ہے اور پھر "انارکلی" کو ہم ان کے تخلیقی اثاثہ سے خارج کیوں کریں۔

س: افسانہ اور ناول لکھنے والی خواتین بالعموم عورتوں کے مسائل پر ہی لکھتی ہیں' اس سے ان کی کہانیوں کا کینوس محدود ہو کر رہ جاتا ہے ایسا کیوں ہے؟

ج: جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں نے عورتوں سے متعلق بہت کم لکھا ہے بلکہ لکھا ہی نہیں۔ میرا موضوع ہمیشہ معاشرت رہی ہے البتہ دیگر خواتین نے عورتوں کے مسائل اور معاملات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے۔ میرا معاملہ یہ ہے کہ میں نے فرائیڈ کو بہت پڑھا ہے۔ فرائیڈ نے لکھا ہے کہ عورتوں اور مردوں کے درمیان مقابلہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ اس لئے کہ وہ عورت کی جسمانی ساخت کو نامکمل اور خود کو مکمل سمجھتا ہے اور اسی بنا پر اپنے آپ کو عورت سے برتر خیال کرتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ آج عورتیں ہر شعبے میں مردوں کی طرح کام کر رہی ہیں۔ میری جاننے والی سبھی خواتین کہیں نہ کہیں ملازم ہیں یا کوئی کاروبار کر رہی ہیں۔ میں نے اپنی کہانیوں میں فرائیڈ کے نظریات کو زیادہ نہیں آنے دیا' بس بعض مقامات پر صرف اشارے دیئے ہیں۔ میرے یہ اشارے نفسیات کے طالب علم بہ آسانی سمجھ جاتے ہیں۔

س: آپ کس حد تک عورت کی آزادی کی قائل ہیں؟

ج: میں سمجھتی ہوں کہ عورت کو مرد کے برابر آزادی ملنی چاہئے۔ اب عورتیں بھی یہ ثابت کر رہی ہیں کہ وہ مردوں کی طرح کام کر سکتی ہیں۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ میں پائلٹ بھی ہوں' میں جس زمانے میں ایئر کلب میں شامل ہوئی اس زمانے میں' میں تین سو مردوں کے درمیان تنہا عورت تھی۔ ان میں چالیس مرد تو باقاعدہ پائلٹ تھے مگر باقی صرف تماشہ دیکھنے والے۔ اس طرح میں نے برطانوی دور حکومت میں ایئر لائسنس حاصل کر کے پہلی مسلمان لیڈی پائلٹ کا اعزاز پایا۔

س: کیا عورت اور مرد کے اس آزادانہ میل جول سے بے راہ روی کا خطرہ بڑھ نہیں جائے گا؟

ج: دیکھیں خطرہ تو ہر چیز میں ہوتا ہے۔ انسان کا اصل کام تو خطروں کا مقابلہ کرنا ہے۔ خطرہ ہے تو کیا ہے؟ اب خطرات کو دیکھ کر عورتیں اپنی ترقی روک تو نہیں سکتیں' یہ تو معاشرے کے ہر فرد کا فرض ہے کہ عورت کو تحفظ فراہم کرے اور اسے عزت و احترام کی نظر سے دیکھے۔

س: عورت کا اصل مقام کہاں ہے؟ گھر میں؟ محفل میں؟ یا سکرین پر؟

ج: عورت کا اصل مقام وہ ہے جہاں اسے حالات لے جائیں۔ ہمارے معاشرے میں عورت بالعموم حالات کے رحم و کرم پر ہوتی ہے۔ میرے خیال میں آج کی عورتیں پرانی عورتوں سے بہتر ہیں۔ اس لئے کہ یہ عورتیں گھر بھی سنبھالتی ہیں اور دفتر میں کام بھی کرتی ہیں۔ آج کی عورت پر بہت بار ہے لیکن وہ اس بار کو اٹھانے میں مرد سے زیادہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کر رہی ہے۔

س: آپ انسانی معاشرے کو مرد کا معاشرہ کہتی ہیں کیوں؟

ج: اس لئے کہ اس انسانی معاشرے میں تمام قوانین' احکامات اور اصول مرد نے بنائے ہیں اور پھر ان قوانین' احکامات اور اصولوں کی آڑ میں ہمیشہ عورت پر حکومت کی ہے۔ یہ مردوں کا معاشرہ نہیں تو اور کیا ہے؟ لیکن شکر ہے کہ آج عورت اپنی کوشش سے مردوں کے اس معاشرے سے رفتہ رفتہ باہر نکل رہی ہے۔

س: مرد کو یہ برتری تو ہمارے مذہب بلکہ تمام مذاہب نے دی ہے؟

ج: ایوب بیٹے! میں آپ کو یہ بتا دوں کہ میں کسی مذہب کی قائل نہیں ہوں۔ یہ بات میں نے اس سے پہلے کبھی برملا نہیں کہی مگر اب آپ نے سوال کیا ہے تو مجھے اپنے دل کی اس بات کو زبان پر لانا ہی پڑا ہے۔ میں خدا کو مانتی ہوں لیکن خدا تو کسی سے بات نہیں کرتا۔ یہ جو معاشرے میں قیود اور مشکلات ہیں سب ہم نے پیدا کی ہیں اور اپنے آپ کو خود ہی پابندیوں میں جکڑ لیا ہے۔ میں کسی بھی مذہب کے احترام سے انکار نہیں کرتی۔ لیکن میں خدا کے علاوہ کسی اور عقیدے کی قائل نہیں ہوں۔

س: کیا خواتین کو عملی سیاست میں حصہ لینا چاہئے اور اگر لینا چاہئے تو کس حد تک؟

ج: میں نے کہا نا کہ صرف سیاست ہی نہیں' خواتین کو ہر شعبے میں اپنے جوہر دکھانے چاہئیں اور سیاست میں تو ضرور ہی حصہ لینا چاہئے۔ اس لئے کہ سیاست کا ہماری روزمرہ کی زندگی میں دخل بہت بڑھ گیا ہے۔ میں نے عملی سیاست میں تو کبھی حصہ نہیں لیا لیکن سیاست میں دلچسپی مجھے ہمیشہ رہی ہے۔ میری خواہش ہے کہ ہمارے معاشرے میں محترمہ فاطمہ جناح' رعنا لیاقت علی اور بینظیر بھٹو جیسی بہت سی عورتیں پیدا ہوں۔

س: کیا آپ کی محترمہ فاطمہ جناح سے کوئی ملاقات ہوئی؟

ج: کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ وہ بڑی نفیس خاتون تھیں لیکن میرے پائلٹ ہونے سے بہت مرعوب تھیں۔ ہمیشہ یہی پوچھتیں آپ کو پائلٹ بننے کا خیال کیسے آیا اور آپ اتنی اچھی پائلٹ کیسے بن گئیں؟

س: آپ نے قیام پاکستان کا مرحلہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ آپ کو یہ تجربہ کیسا لگا؟

ج: یہ بہت اچھا تجربہ تھا۔ اگرچہ اس کیلئے ہمیں بہت سی قربانیاں دینی پڑیں پھر بھی یہ ملک کسی بیش بہا نعمت سے کم نہیں ہے' لیکن میں یہاں یہ بھی بتا دوں اور اس بات پر میرا سو فیصد یقین ہے کہ پاکستان کسی جماعت نے نہیں بنایا یہ صرف قائداعظم کی کوششوں کا نتیجہ ہے اور یہ قائد کا پوری قوم پر بڑا احسان ہے۔ مسلم لیگ کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ اگر مسلم لیگ نہ بھی ہوتی تب بھی قائداعظم مسلمانوں کیلئے ایک آزاد ملک

حاصل کرنے کی اہلیت رکھتے تھے۔

س: قیام پاکستان کا مقصد کیا تھا؟ اسلامی نظام کا نفاذ' ماڈل ریاست کا قیام' ہندو کی معاشی غلامی سے آزادی یا کوئی اور؟

ج: برطانوی دور میں ہماری ذہنیت غلامانہ تھی۔ ہم کسی معاملے پر بھی آزادی سے نہیں سوچ سکتے تھے کیونکہ ہم برطانوی حکومت کے زیر اثر تھے۔ چنانچہ قائداعظم نے ہماری جسمانی اور ذہنی آزادی کیلئے ہمیں یہ ملک لے کر دیا جس میں ہمیں بے فکری اور آزادی حاصل ہوگئی لیکن افسوس کہ قیام پاکستان کے بعد ہماری غلامی کا دور پھر شروع ہو گیا۔ پہلے ہم ظاہری طور پر برطانوی حکومت کے زیر تسلط تھے' قیام پاکستان کے بعد یہ ظاہری تسلط تو ختم ہو گیا لیکن نہ نظر آنے والے تسلط کا آغاز ہو گیا۔ ہم امریکہ کو اپنا آقا ماننے لگے جو وہ کہتا ہم اس کے سامنے سرنگوں کر دیتے۔ چنانچہ آہستہ آہستہ امریکہ نے ہمیں اپنے معاشی اور فکری شکنجے میں جکڑ لیا۔ آج ہم پر امریکہ ہی نہیں' اس کے مالیاتی ادارے بھی حکومت کر رہے ہیں۔ میں کہتی ہوں اب ہمارے طرز عمل میں تبدیلی آ جانی چاہئے۔

ہمارا یہی سمجھ لینا کافی نہیں کہ ہم ایک آزاد ملک کے باشندے ہیں۔ ہمیں اس کی مکمل آزادی کی جدوجہد بھی کرنی چاہئے۔ ہمیں امریکہ کو چھوڑ کر بھی اپنے معاشرتی اور معاشی سیٹ اپ پر غور کرنا چاہئے ورنہ غلامی کا یہ دور طویل سے طویل تر ہوتا چلا جائے گا اور امریکی تسلط کے پنجے میں بھی مضبوطی آتی چلی جائے گی۔ پھر ہماری بظاہر آزادی بھی شاید برقرار نہ رہ سکے۔

س: آپ کے خیال میں کونسا نظام انسانوں کیلئے مفید ہے؟ اسلام' سوشلزم یا جمہوریت؟

ج: میں ایسے نظام کو پسند کرتی ہوں جس میں کسی ایک کے ہاتھ سے روٹی چھین کر کسی دوسرے کو نہ دی جائے چونکہ سوشلزم میں ایک کا حق چھین کر دوسرے کو دیا جاتا ہے اس لئے مجھے یہ نظام بالکل پسند نہیں' البتہ اسلام کا سماجی نظام اچھا ہے۔ اسلام کسی کا استحصال کر کے دوسرے کو خوشحال کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اسی طرح کیپٹلزم بھی ایک بہتر سماجی نظام ہے۔ عام طور پر لوگ دولت مندوں پر یہ اعتراض کرتے ہیں

کہ وہ غریبوں کا خیال نہیں رکھتے۔ یہ اعتراض کسی حد تک درست ضرور ہے لیکن یہ بھی تو سوچئے دولت کسی خاندان کی باندی تو نہیں۔ جو دولت مند بنتا ہے وہ ایک طویل محنت کے بعد اس مقام پر پہنچتا ہے چنانچہ غریبوں کو اعتراض کے بجائے محنت پر توجہ دینی چاہئے تاکہ وہ بھی دولت مند بن سکیں۔ اس وقت دنیا میں جو ممالک سرمایہ دارانہ نظام چلا رہے ہیں' وہاں جمہوریت کی جڑیں بھی مضبوط ہیں اور جمہوریت کیلئے میرے دل میں نہایت نرم گوشہ موجود ہے۔ اس لئے کہ جمہوریت میں کسی سے کوئی چیز چھینی نہیں جاتی۔ المیہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں دولت مند لوگوں کو ملزم سمجھا جاتا ہے لیکن امریکہ اور مغربی ممالک میں ایسا نہیں ہے۔ وہاں انہیں احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے البتہ ہمارے معاشرے کے وہ سرمایہ دار جو دوسروں کی جائیدادیں غصب کرتے ہیں اور ٹیکس نہیں دیتے وہ واقعی مجرم ہیں۔ انہیں امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک کے سرمایہ کاروں اور تاجروں کی تقلید کرنی چاہئے۔

س: جمہوریت کا یہ تصور تو اسلام میں بھی موجود ہے کہ کسی کا حق چھین کر دوسرے کو نہ دیا جائے۔ کیا اسلام کا یہ طرز عمل جمہوری نہیں ہے؟

ج: اسلام اور جمہوریت میں یہی قدر مشترک ہے۔ ان میں سب کے حقوق برابر رہتے ہیں' کسی فرد کے حق کا استحصال نہیں ہوتا۔ ان میں چھینا جھپٹی نہیں ہے اس لئے یہ درست ہے کہ اسلام میں جمہوریت موجود ہے لیکن تمثیلی نمونے کے اعتبار سے مغربی جمہوریت ہماری جمہوریت سے آگے ہے۔ بہرحال مذہب ہو یا کوئی نظام' انسانوں کو ذہنی اور عملی آزادی حاصل ہونی چاہئے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو پھر ملکوں کا وہی حال ہوتا ہے جو روس کا ہوا' ضرورت سے زیادہ پابندیاں ہمیشہ انقلاب کا باعث بنتی ہیں۔

س: قائداعظم کیسا پاکستان بنانا چاہتے تھے؟ کیا موجودہ پاکستان ان کے تصورات اور خیالات کے مطابق ہے؟

ج: قائداعظم ایسا ہی پاکستان بنانا چاہتے تھے جیسا آج کے لیڈر اپنی تقاریر میں بیان کرتے ہیں' یعنی ایک ایسا پاکستان جس میں لوگ ذہنی' معاشی اور جسمانی غرض ہر اعتبار سے آزادانہ زندگی بسر کر سکیں۔ قائداعظم یہ نہیں چاہتے تھے کہ ہم کسی ملک کے

غلام بنیں اور اس کی تقلید کریں۔

س: آپ کے نزدیک آئیڈیل عورت کا تصور کیا ہے؟

ج: آئیڈیل عورت وہ ہے جو اپنی ذمہ داریوں کو سمجھے اور اپنی نسوانیت کو بھی قائم رکھے۔ اسے یہ کبھی نہیں بھولنا چاہئے کہ وہ عورت ہے اور نسوانیت ہی اس کا اصل حسن ہے۔ آج کی بعض عورتیں یہ سمجھتی ہیں کہ شاید مردوں جیسے کپڑے پہننے سے وہ ترقی کر رہی ہیں۔ میرے خیال میں یہ ان کی خام خیالی ہے۔

س: آپ کا آئیڈیل مرد کون ہے؟

ج: مجھے اتاترک کمال پاشا بطور لیڈر بہت پسند تھے۔ میں ان کے خیالات اور ترک قوم کے ساتھ ان کے تعلقات کی بہت قدردان ہوں۔ میں سمجھتی ہوں کہ اگر ہمارے معاشرے میں بھی اتاترک جیسا لیڈر آ جائے جو ذہنی طور پر نہایت آزاد خیال ہو تو ہمارے معاشرے میں بھی انقلاب آ جائے۔

س: آپ نے قائداعظم اور ان کے ساتھیوں کو دیکھا اور آج کے سیاست دان بھی دیکھ رہی ہیں۔ ان میں آپ کو کیا فرق محسوس ہوتا ہے؟

ج: زمین آسمان کا فرق ہے ان کے درمیان۔ وہ قول کے سچے اور اپنے مقاصد پر کسی بھی قیمت پر کسی قسم کا سمجھوتہ نہ کرنے والے سیاست دان تھے لیکن آج کے سیاست دان تو بس گرگٹ کی طرح رنگ ہی بدلتے رہتے ہیں۔ آج قوم ایک سچے رہنما کی متلاشی ہے مگر ایسا رہنما کہیں نہیں ہے۔

✦ ✦ ✦

ساحر لدھیانوی

ساحر لدھیانوی نے کمرے کی اونچی چھت اور پرانی کھڑکیوں کو دیکھ کر کہا۔

”یہ تو مجھے کوئی بھوت گھر لگتا ہے۔“

ابن انشاء نے اپنے موٹے شیشے والی عینک کے پیچھے آنکھیں گھما کر کہا۔

”اب اس میں بھوت ہی رہیں گے۔“

ابن انشاء اور ساحر لدھیانوی کے یہ ریمارکس اس عمارت کے بارے میں تھے جو ایبٹ روڈ پر نشاط سینما کے بالکل سامنے واقع ہے۔ ان دنوں یہ ایک ویران اجڑی ہوئی سرخ عمارت تھی۔ جس کا ذکر ہمیں آج بھی آرتھر کانن ڈائل اور ایڈگر ایلن پو کی پراسرار کہانیوں میں ملتا ہے۔ پاکستان کو بنے بمشکل چھ سات مہینے ہوئے ہوں گے۔ گوالمنڈی میں ہندو سکھوں کے مکان بھی خالی پڑے تھے۔ تھانہ گوالمنڈی کے سامنے والے مکان کی ایک ادھیڑ عمر کی ہندو عورت نے اپنا مکان نہیں چھوڑا تھا۔ وہ کھڑکی میں بیٹھی آتے جاتے لوگوں کو مخاطب کر کے کہتی۔

”میں نہیں جاؤں گی۔ لوگ چلے گئے ہیں تو جاتے رہیں۔“

اس کے باقی گھر والے ہندوستان جا چکے تھے۔ خدا جانے اس عورت کا بعد میں کیا حشر ہوا۔ اسی طرح ایک ادھیڑ عمر کے ہندو میاں بیوی کو میں نے سوتر منڈی لاہور میں بھی دیکھا۔ چوک سوتر منڈی سے جو گلی بازار شیشہ موتی کو مڑتی ہے اس کی نکڑ پر اس ادھیڑ عمر ہندو کی دکان تھی۔ وہ سر پر گول ہندوانہ ٹوپی رکھے صندوقچی کے آگے بیٹھا مسلمان مریضوں کو دوائی دیتا۔ اس کی بیوی دکان کے اندر صف پر بیٹھی ہوتی۔ یہ ہندو جوڑا بعد میں دکھائی نہ دیا۔

رائل پارک کی بلڈنگیں بھی سنسان تھیں۔ صرف لکشمی بلڈنگ کے نچلے حصے میں کچھ مہاجر آباد ہوئے تھے۔ رائل پارک کی گلیاں کچی تھیں اور چوک میں ایک طرف لکڑی کا شہتیروں کا ڈھیر لگا تھا۔ کبھی کبھی میں اور احمد راہی ان شہتیروں پر بیٹھ کر باتیں کیا کرتے۔

پھر احمد راہی' عارف عبدالمتین کے ساتھ فکر تونسوی کو نکالنے تونسہ شریف چلا گیا۔ اس دوران میں ساحر لدھیانوی اور میں نے رائل پارک کی ایک بلڈنگ کی پہلی منزل پر قبضہ کرلیا۔ بعد میں اس منزل میں قتیل شفائی آ گیا تھا۔

فکر تونسوی آ گیا۔ دبلا پتلا' باریک آنکھوں والا ذہین نوجوان' جسے تونسہ شریف سے چلے آنے کا افسوس تھا۔ ''ادب لطیف'' کی ایڈیٹری کا زمانہ اس نے ہمارے ساتھ اسی منزل میں گزارا۔ بس ایک ڈرائنگ روم اور ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ سامان وہاں سوائے ایک صوفہ سیٹ اور پلنگ کے کوئی نہ تھا۔ کارنس پر ایک کانسی کا بڑا سا پیالہ پڑا رہ گیا تھا۔ اس پیالے میں ہم باری باری پانی پیا کرتے تھے۔ ابن انشاء ایک روز وہاں آیا تو اس پیالے کو دیکھ کر کہنے لگا۔

''ارے یہ تو وہی پیالہ ہے جس میں سقراط نے زہر پیا تھا۔''

رات کو فکر تونسوی صوفے پر' عارف عبدالمتین اور ساحر لدھیانوی زمین پر اور میں اور احمد راہی پلنگ پر سو رہتے۔ ہماری جیبیں اکثر خالی رہتی تھیں۔ کبھی دو چار روپے ہوتے اور کبھی کچھ بھی نہ ہوتا۔ غزل کا معاوضہ پانچ دس روپے اور کہانی افسانے کا معاوضہ مجھے پندرہ اور پچیس روپے کے درمیان ملتا تھا۔ اس سے کچھ روز گزر بسر ہوتی اور پھر وہی فاقہ مستی شروع ہو جاتی۔ ہمارے پبلشرز وہ تھے جنہوں نے اس ملک میں اعلیٰ ترین معیاری طباعت اور کلاسیکل ادبی روایات کی بنیاد رکھی۔ احمد راہی اور فکر تونسوی ادب لطیف کے ایڈیٹر تھے۔ بعد میں راہی ''سویرا'' کا ایڈیٹر بن گیا تھا۔ ساحر لدھیانوی کی ''تلخیاں'' شائع ہو چکی تھی اور بے حد مقبول ہوئی تھی مگر پبلشر سے پیسے اسے توڑ توڑ کر ملتے تھے۔ ایک روز میں اور ساحر لدھیانوی ''سویرا'' کے دفتر گئے۔ ہمارا پروگرام یہ تھا کہ پبلشر سے قسط کے پیسے لے کر انارکلی کے ہوٹل ممتاز میں چائے پیسٹری اڑائیں گے۔

ان دنوں ہماری سب سے بڑی عیاشی یہی ہوا کرتی تھی یا زیادہ سے زیادہ کوئی فلم دیکھ لی اور کپڑے بنوا لیے۔ اسی پبلشر نے میرے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''منزل منزل'' بھی شائع کیا تھا اور کچھ پیسے میرے بھی رہتے تھے۔ میں نے سوچا کہ میں بھی کچھ پیسے وصول کرلوں گا۔ ''سویرا'' کا دفتر ان دنوں بھی لوہاری کے باہر تھا۔

چودھری نذیر احمد بڑے باغ و بہار اور علم دوست پبلشر تھے اور ہم سے بڑی محبت اور شفقت کا برتاؤ کرتے۔ میں اور ساحر ''سویرا'' کے دفتر میں آئے تو چودھری صاحب میز پر جھکے پوسٹ کارڈ لکھ رہے تھے۔ ہم نے سلام کیا۔ انہوں نے سر اٹھا کر ہمیں دیکھا۔ ذرا مسکرائے اور کارڈ لکھنے میں محو ہو گئے۔ چہرے پر خاص مسکراہٹ ابھی تک ویسی ہی تھی۔

ساحر ڈرپوک تھا۔ اس میں جرات رندانہ کا فقدان تھا۔ اب ہم آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔

میں نے ساحر سے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا۔ ''چلو مانگو اپنی کتاب ''تلخیاں'' کے باقی پیسے؟''

اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے جواب دیا۔ ''تم کیوں نہیں مانگتے اپنے افسانے کے بقایا پیسے؟''

میرے پیسے زیادہ نہیں تھے کیونکہ چودھری نذیر صاحب نے میرے پیسے کبھی نہیں رکھے تھے اور ہمیشہ مجھے میرا معاوضہ دو تین قسطوں میں ادا کر دیا کرتے تھے۔ ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا تھا کہ میرے کچھ پیسے ان کی طرف رہ جائیں۔

اتنا مجھے یقین تھا کہ ساحر لدھیانوی پیسوں کا تقاضا نہیں کرے گا اور پہاڑ کاٹ کر جوئے شیر مجھے ہی نکالنی پڑے گی۔

میں نے باتوں ہی باتوں میں چودھری صاحب کے قریب جا کر جھٹ کہہ دیا۔

''چودھری صاحب! پیسوں کی ضرورت آن پڑی ہے۔''

''خیر تو ہے...... کیا ضرورت پڑ گئی تم لوگوں کو؟''

چودھری صاحب نے ہمیں سارے پیسے دے دیئے۔ ہم ممتاز ہوٹل آ گئے۔

ہوٹل میں ریکارڈنگ ہو رہی تھی۔ لتا منگیشکر' ہمنت کمار' جگموہن' طلعت محمود' رفیع اور گیتا رائے کے ریکارڈ بج رہے تھے۔ ہم دیوار کے ساتھ لگی ایک میز کے پاس کرسیوں پر جا کر بیٹھ گئے اور مزے سے چائے پیتے اور میوزک سنتے رہے۔

ساحر لدھیانوی لمبے قد کا دبلا پتلا نوجوان تھا۔ لمبا قد ہونے کی وجہ سے وہ ذرا آگے کو جھک کر چلتا۔ لہجہ خالص لدھیانوی تھا۔ اردو لدھیانوی پنجابی انداز میں بولتا۔ بات نرمی سے کرتا اور کھل کر کبھی قہقہہ نہیں لگاتا تھا۔ شعر سناتے وقت ذرا ذرا مسکراتا رہتا تھا۔ ان دنوں ساحر کی نظم ''ثناء خوانِ تقدیس مشرق کہاں ہیں'' اور ''تاج محل'' کا بڑا چرچا تھا۔ ''تاج محل'' تو کالج کے لڑکوں اور لڑکیوں میں بے حد پاپولر تھی۔ مشاعرے میں یہ دونوں نظمیں خاص طور پر فرمائش کر کے اس سے سنتے۔

ساحر مشاعرے میں اپنی نظم پڑھتے ہوئے جھینپ جایا کرتا تھا۔ جب اس کے کسی شعر پر لوگ داد دیتے تو اس کا چہرہ شرم سے لال ہو جاتا۔ کھانے پینے میں بڑا سادگی پسند تھا۔ کپڑے زیادہ تر کھدر کے پہنتا۔ اس کا ایک گرم اوورکوٹ تھا' جسے میں' احمد راہی اور عارف عبدالمتین بھی پہنا کرتے تھے۔ ابن انشاء اس کوٹ کو گوگول کا اوور کوٹ کہا کرتا۔

رائل پارک والی بلڈنگ کے دن بڑے یادگار دن تھے۔ اس بے سروسامانی کے عالم میں بھی ایک دلکشی اور جشن کا پہلو تھا۔ ہمیں کچھ خبر نہ ہوتی تھی کہ صبح کا ناشتہ کر لیا ہے تو دوپہر کا کھانا کہاں سے کھائیں گے؟ ناشتہ یہ ہوتا کہ چائے کے ساتھ دو سلائس کھا لیتے۔ رات کو جب سگریٹ ختم ہو جاتے تو آپس میں پیسے ڈال کر بازار سے سگریٹ لاتے۔ بڑے ستاروں والے کیپسٹن کا پیکٹ ان دنوں شاید تین چار آنے میں آتا تھا۔ یہ سگریٹ ہم سبھی بڑے شوق سے پیا کرتے تھے۔ عارف سگریٹ نہیں پیتا تھا۔ وہ ہمیں سگریٹ پیتے دیکھا کرتا تھا۔ عارف امرتسر سے ہی نظمیں کہتا لاہور آیا تھا اور یہاں آ کر بڑی اچھی شاعری کر رہا تھا۔

ایک رات ایسا ہوا کہ سگریٹ حسبِ معمول ختم ہو گئے۔ فکر تونسوی نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دو آنے نکال کر کہا۔

''دوستو! میں یہ نذرانہ پیش کر سکتا ہوں۔ اس کے سوا اس خاکسار کی جیب

میں خاک نہیں۔''

ساحر لدھیانوی کہنے لگا۔

''چلو اے حمید اس کے سگریٹ لے آؤ۔''

میں نے احمد راہی کو ساتھ لیا۔ تو ساحر نے آواز لگا دی۔

''آدھے راستے میں ہی نہ پی آنا یہاں آ کر ہمارے ساتھ پینا۔''

رات کافی گزر چکی تھی۔ خوشگوار رات تھی اور معمولی سی خنکی تھی۔ میکلوڈ روڈ ان دنوں دن کے وقت ویران ویران سی ہوتی تھی رات کو بالکل ہی سنسان تھی۔ گیتا بھون بلڈنگ کے نیچے ایک مراد آبادی بزرگ پان سگریٹ کا کھوکھا لگاتے تھے۔ وہ اپنے کھوکھے میں بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ ہم نے ان سے کیپسٹن کے سگریٹوں کی نصف ڈبی لی اور رائل پارک میں آ گئے۔

چوک میں آ کر ہم نہ جانے کیوں شہتیروں پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ باتوں میں ایسے مگن ہوئے کہ یہ خیال ہی نہ رہا کہ ساحر لدھیانوی اور فکر تونسوی ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ بیٹھے بیٹھے ہم دو سگریٹ پی گئے۔ پھر خیال آیا کہ وہ لوگ سگریٹوں کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ جلدی سے اٹھ کر وہاں پہنچے تو ہمارا خیر مقدم بڑی لچھے دار گالیوں سے ہوا۔ ساحر لدھیانوی کا نشہ ٹوٹنے سے برا حال تھا۔ فکر تونسوی کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔

''کمینو! کہاں ہیں سگریٹ؟''

ہم نے جھٹ باقی تین سگریٹ ان کی طرف پھینک کر کہا۔

''ہم اپنے حصہ کے سگریٹ پی آئے ہیں۔''

ساحر لدھیانوی نے مسکرا کر کہا۔

''اب ان سگریٹوں کا دھواں بھی تمہاری طرف نہیں جائے گا۔ فکر قابو کر کے رکھ لے ڈبی کو۔'' فکر تونسوی نے ڈبی کھول کر ایک سگریٹ خود لگایا' ایک ساحر لدھیانوی کو لگا کر دیا۔

عارف بولا:

''دوستو! کیا تم ایک سگریٹ سے کام نہیں چلا سکتے۔ ختم ہو گئے تو پھر کیا کرو

گے؟ ابھی تو ساری رات پڑی ہے۔"

ساحر لدھیانوی کہنے لگا۔

"اب تو ہم بھی پورا پورا سگریٹ پئیں گے۔ یہ اے حمید اور احمد راہی کیوں ایک ایک سگریٹ ختم کر کے آئے ہیں؟"

ہمارے لئے بڑی مصیبت تھی' کیونکہ ہمیں تو وہ سگریٹ کا ایک کش لگانے کی بھی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ ہمارے سامنے انہوں نے ایک ایک سگریٹ ختم کیا اور اس کا دھواں بھی دوسری طرف پھینکتے رہے۔ ایک سگریٹ باقی رہ گیا تھا۔ عارف کو نیند آ گئی۔ وہ تو فرش پر بچھی ہوئی دری پر سو گیا۔ ساحر لدھیانوی کی آنکھیں بھی نیند سے ابل رہی تھیں۔ رات کے دو بج چکے تھے۔

اس نے جمائی لے کر کہا۔

"یار! میں تو سونے لگا۔"

فکر نے کہا۔

"آج صوفے پر میں سوؤں گا۔"

ساحر جھٹ سے بولا۔

"اور میں تمہارے سر پر سوؤں گا؟ میں زمین پر نہیں سو سکتا۔ میری کمر میں پہلے ہی درد رہتا ہے۔"

احمد راہی نے کہا۔

"پھر تو تمہیں ضرور زمین پر سونا چاہئے کیونکہ یہ حکیمی نسخہ ہے کہ جس کی کمر میں درد ہو اس کیلئے فرش پر سونا فائدہ مند ہوتا ہے۔"

ساحر لدھیانوی بولا۔

"آج تم کیوں نہیں سو جاتے زمین پر۔"

"میری کمر میں درد نہیں ہے۔"

فکر تونسوی کہنے لگا۔

"یار کیا فضول بحث کر رہے ہو۔ میں تم لوگوں کو اپنا تازہ مزاحیہ مضمون سناتا ہوں۔ خدا کی قسم تم لوگوں کی نیند نہ اڑ جائے تو فکر نام نہیں۔"

ساحر لدھیانوی نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"اے دشت نجد کے آوارہ مجنوں! خبردار جو تم نے مضمون سنانے کا پھر نام لیا۔"

فکر تونسوی ہنس کر بولا۔

"تو پھر چپکے سے زمین پر سو جاؤ اور میرے لئے آرام دہ صوفہ چھوڑ دو۔"

ساحر لدھیانوی نے سر جھکا کر کہا۔

"میں زمین کے اندر سو سکتا ہوں مگر تمہارا مضمون نہیں سن سکتا۔"

احمد راہی کہنے لگا۔

"ہم بھی تو تمہاری نظمیں سنتے ہیں کبھی تم سے شکایت کی۔"

عارف عبدالمتین نے لیٹے لیٹے کہا۔

"دوستو! میری نیند تو غارت نہ کرو۔"

فکر تونسوی نے سر جھاڑ کر کہا۔

"چلو یار اب سو جاؤ۔ اے حمید! سہگل کا کوئی گیت سناؤ یار۔ نیند ذرا جلدی آ جائے گی۔"

میں نے پلنگ کی پٹی پر ٹیک لگاتے ہوئے فلم "سٹریٹ سنگر" میں سہگل کا گایا ہوا ایک گیت سنانا شروع کر دیا۔

ساحر لدھیانوی دری پر لیٹا دیوار کی طرف منہ کئے سونے کی کوشش کر رہا تھا۔

نیند بھری آواز میں بولا۔

"اے حمید تمہاری آواز میں بڑا سوز ہے۔"

فکر تونسوی بولا۔

"تم ریڈیو پر کیوں نہیں گاتے؟"

عارف سوتے سوتے بڑبڑایا۔

"خدا کیلئے سونے دو۔"

احمد راہی نے کہا۔

"میرا بلبل سو رہا ہے شور و غل نہ مچا۔"

سب سو گئے۔ صرف میں اور احمد راہی جاگ رہے تھے۔ ہم دونوں ایک ہی پلنگ پر چت لیٹے چھت کو تک رہے تھے۔ جس کا پنکھا لوگ اتار کر لے گئے تھے۔ ہم آہستہ آہستہ باتیں کرر ہے تھے۔ ساحر لدھیانوی کی نیند بھری آواز آئی۔

"اوئے آہستہ باتیں کرو۔"

میں نے کہا۔

"اس سے آہستہ بات تو عارف متین ہی کرسکتا ہے' ہم نہیں کر سکتے۔"

ساحر لدھیانوی ہنس پڑا۔ عارف عبدالمتین سو چکا تھا۔ نہیں تو وہ ضرور ہم پر کوئی نہ کوئی جملہ چست کرتا۔ تھوڑی دیر بعد ہمیں بھی نیند آ گئی۔ رات کے چار بجے تھے کہ میری آنکھ اچانک کھل گئی۔ میں نے فضا میں سگریٹ کے دھوئیں کی خوشبو محسوس کی۔ ایک دو بار لمبے لمبے سانس لیے۔ کمرے کی بند فضا میں کیپسٹن کے سگریٹ کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ یہ چھپ چھپ کر سگریٹ کون پی رہا ہے؟ جبکہ رات کو ہمارے سارے سگریٹ ختم ہو چکے تھے بلکہ ہم نے تو فرش کے کونوں کھدروں سے ٹوٹے بھی ڈھونڈ کر پی لئے تھے۔

میں نے احمد راہی کو آہستہ سے ہلا کر جگایا اور اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"کوئی سگریٹ پی رہا ہے۔"

اس نے اپنی لال لال آنکھیں کھول کر ناک کے چوڑے نتھنے پھیلائے اور سرگوشی میں جواب دیا۔

ساحر کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔

پھر وہ اچھل کر پلنگ سے اٹھا اور ہم دونوں نے فرش پر لیٹے ساحر لدھیانوی پر چھلانگ لگا دی۔ وہ ہڑ بڑا کر بولا۔

"کیا طوفان آ گیا ہے؟"

"سگریٹ کہاں ہے؟" احمد راہی نے مطالبہ کیا۔

ساحر لدھیانوی مٹھی میں سگریٹ کو دبائے ہوئے تھا۔

"کمینے ہم سے سگریٹ کو چھپا کر پیتا ہے۔"

فکر تونسوی بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"یار یہ سگریٹ کی خوشبو کہاں سے آ رہی ہے' ہمیں بھی ایک کش لگواؤ۔"

"ساحر پی رہا ہے۔"

"لاؤ یار ساحر ایک جرعہ ہمیں بھی عنایت ہو۔"

"مگر یہ ہم سے چھپا کر سگریٹ پیتا ہے۔"

ساحر بولا۔

آخری ٹکڑا کونے سے ڈھونڈ کر پی رہا تھا۔ یہ لو کمینو! تم بھی پیو۔"

اور ساحر لدھیانوی نے ٹکڑے کا آخری حصہ میری جھولی میں پھینک دیا۔ میں نے جھولی کو جھٹکا تو جلتا ہوا سگریٹ عارف کی گردن پر جا گرا۔ وہ اچھل کر اٹھ بیٹھا۔

"کیا مصیبت ہے؟"

سگریٹ کا ٹکڑا عارف کی گردن سے اچھل کر فکر تونسوی کے صوفے کی طرف آیا تو اس نے دونوں ہاتھوں سے کیچ کر کے اسے ہتھیلیوں میں دو ایک بار اچھالا اور پھر اسے انگلیوں میں دبا کر کش پر کش لگانے شروع کر دیئے۔

"سگریٹ کے آخری حصے میں بڑی نکوٹین ہوتی ہے۔ بڑا نشہ آ رہا ہے۔"

فکر تونسوی' عارف اور احمد راہی تو پھر سو گئے لیکن میں اور ساحر لدھیانوی جاگتے اور باتیں کرتے رہے۔ صبح ہونے والی تھی اس وقت ہمیں چائے اور سگریٹ کی بڑی طلب ہوئی۔ ساحر لدھیانوی نے کہا۔ "اگر تم وعدہ کرو کہ کسی سے بات نہیں کرو گے تو میں تمہیں ایک حسین راز بتا سکتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "وعدہ کرتا ہوں' وہ حسین راز کیا ہے؟"

ساحر لدھیانوی سرگوشی میں بولا۔

"میری جیب میں اس وقت پورے دو روپے پڑے ہیں۔"

وہ آہستہ آہستہ ہنسنے لگا۔ میں نے اپنے سوئے ہوئے دوستوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اگر تم بھی وعدہ کرو کہ کسی سے بات نہیں کرو گے تو میں بھی تمہیں ایک حسین راز بتا سکتا ہوں۔"

ساحر لدھیانوی نے جھٹ سوال کیا۔

"تمہارے پاس کتنے پیسے ہیں؟"

"ڈیڑھ روپیہ میری جیب میں ہے۔"

ساحر لدھیانوی کہنے لگا۔

"چلو پھر باہر چل کر کہیں چائے پیتے ہیں۔"

"چلو۔"

ہم دونوں آہستہ آہستہ سے دبے پاؤں اٹھ کر دروازے کے پاس ہی آئے تھے کہ احمد راہی کی بھاری بھرکم خواب آور آواز گونجی۔

"تم دونوں کمینے ہو۔"

اس سے پہلے کہ احمد راہی ہمیں گالیاں دیتا ہم بھاگ کر گلی میں آ چکے تھے اور ہنس ہنس کر ہمارا برا حال ہو رہا تھا۔

ساحر لدھیانوی بولا۔

"ایک پیکٹ سگریٹ ان کو بھی دے کر جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔"

ہم میکلوڈ روڈ پر آ گئے۔ رات ڈھل رہی تھی۔ سڑک سنسان پڑی تھی۔ برسٹل ہوٹل کے باہر ایک تانگہ کھڑا تھا جس کا کوچوان اگلی سیٹ پر سو رہا تھا۔ مراد آبادی کھوکھا بند تھا۔ ساحر لدھیانوی کہنے لگا۔

"پیارے اس وقت تو صرف ریلوے سٹیشن پر ہی چائے مل سکتی ہے۔ واپسی پر ان لوگوں کے سگریٹ بھی وہیں سے لیتے آئیں گے۔ چلو سٹیشن پر ہی چلتے ہیں۔"

اور ہم دونوں ریلوے سٹیشن کی طرف روانہ ہو گئے۔ رتن سینما ویران پڑا تھا۔

"چٹان" کا دفتر بھی بند پڑا تھا اور باہر چوکیدار فرش پر ہی سو رہا تھا۔ "لاہور ہوٹل" کی عمارت ابھی تک پرانی ہی تھی اور اس کے ساتھ والی مشہور پارسی لانڈری اور کشمیری لانڈری کی دکانیں بھی بند تھیں۔ ریلوے سٹیشن جاگ رہا تھا۔ لوہے کی اونچی چھت والے تانگہ سٹینڈ میں تانگے کھڑے تھے۔ سامنے جو چھوٹا سا پلاٹ ہوا کرتا تھا وہاں مہاجر کیمپ بنا تھا جہاں ہندوستان سے آنے والے مہاجرین گھڑی پل کو رکتے تھے اور پھر انہیں مسلم لیگ کے ٹرکوں میں ڈال کر والٹن کیمپ پہنچا دیا جاتا تھا۔

ہم پلیٹ فارم پر آ گئے۔ پلیٹ فارم ٹکٹ لینے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ ان دنوں ریلوے ٹکٹ بھی کوئی نہیں خریدتا تھا۔ مہاجرین کی سپیشل ٹرینیں چلا کرتی تھیں۔ مسافر مفت سفر کرتے تھے۔ ہم ریلوے کینٹین کے کاؤنٹر پر کھڑے ہو کر چائے پینے لگے۔ وہیں سے ہم نے سگریٹ بھی لے لئے تھے۔ ریلوے سٹیشن کی چائے بڑی اچھی ہوتی تھی اور پیالی دو اولس کی ہوا کرتی تھی۔ پیالی کے باہر لکھا ہوتا تھا۔

"دو اولس۔"

میں نے چائے کا آخری گھونٹ پیا اور سگریٹ سلگا کر ساحر کے ساتھ پل کی سیڑھیاں اتر کر سٹیشن سے باہر آ گیا۔ اب دن کا اجالا چاروں طرف پھیل چکا تھا۔

سویرا کا نیا دفتر لکشمی چوک گیتا بھون کی دوسری منزل پر ہوتا تھا۔ نیچے پیراڈائز ریسٹورنٹ کھلا تھا۔

میں نے کہا۔

"یہاں بیٹھ کر ناشتہ کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے ابن انشا بھی یہاں آ جائے۔"

پیراڈائز ریسٹورنٹ میکلوڈ روڈ کا کافی ہاؤس تھا۔ سبھی ترقی پسند ادیب اور شاعر اسی جگہ بیٹھتے تھے۔ ریسٹورنٹ کا مالک یو پی کا ایک سرخ و سپید دبلا پتلا نوجوان تھا جس کو شاعروں اور ادیبوں سے بڑی عقیدت تھی۔ شاید یہ اسی عقیدت کے اظہار کا ایک پہلو تھا کہ جب کسی شاعر یا افسانہ نگار کا بل بڑھ جاتا تو وہ ریسٹورنٹ کے باہر لگے ہوئے تختہ سیاہ پر اس شاعر یا ادیب کا نام لکھ کر آگے واجب الادا رقم درج کر دیتا تھا۔

پیراڈائز ریسٹورنٹ خالی تھا۔ نوکر فرش دھو رہے تھے۔ ہم اندر جا کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد قمر اجنالوی آ گیا۔ اونچا لمبا گہرے گنجان سیاہ بالوں والا۔ مٹھی میں سگریٹ دبائے زور سے کش لگا کر اس نے ہم دونوں کو دیکھا اور ہنستا ہوا ہمارے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

"صبح دم دروازہ کھلا۔ چائے تو میں بھی پیوں گا کامریڈ۔"

اتنے میں ابن انشا بھی آ گیا۔

"ارے تم لوگ رات سے اسی جگہ بیٹھے لگتے ہو۔ کم بختو! اس شہر دل نگار میں سورج تو نکل لینے دیا کرو۔"

رائل پارک کی بلڈنگ ہم سے چھن گئی۔ عارف عبدالمتین نے پرانی انارکلی اور احمد راہی نے گوالمنڈی میں مکان الاٹ کروا لئے۔ فکر تونسوی کو لاہور چھوڑ کر ہندوستان جانا پڑ گیا۔ میرا خیال ہے فکر تونسوی اور کنہیا لال کپور دو آخری غیر مسلم ادیب تھے جنہوں نے روتے ہوئے لاہور کو الوداع کہا۔

ساحر لدھیانوی کو نشاط سینما کے سامنے والا ''بھوت گھر'' الاٹ ہو گیا۔ ہماری فیملی بھی لاہور آ گئی اور فیض باغ میں ایک مکان میں رہنا شروع کر دیا۔

ساحر لدھیانوی کا کمرہ نچلی منزل میں تھا۔ بلڈنگ خستہ حال تھی۔ دیواروں کا چونا گر رہا تھا۔ اونچی چھت میں جالے لٹکتے تھے۔

غسل خانے کی کھڑکی بند نہ ہوتی تھی۔ نلکے کی ٹوٹی سے پانی ہر وقت گرتا رہتا تھا۔ اس جگہ کھڑکی میں ٹوٹا ہوا شیشہ رکھ کر ساحر لدھیانوی شیو بنایا کرتا تھا۔ روشن دان میں چڑیوں نے گھونسلا بنا رکھا تھا۔ اس عمارت کے آگے ایک لان تھا جس میں جھاڑ جھنکار اُگا ہوا تھا۔ آج کل یہاں کڑاہی تکہ والوں کے کھوکھے ہیں پہلے یہاں نہیں تھے۔ سامنے ''امروز'' کا دفتر تھا۔ جس کی ایک جانب کسی گڈز ٹرانسپورٹ کمپنی نے دفتر بنا رکھا تھا۔

ابن انشاء نے اسی بلڈنگ کی ایک انیکسی الاٹ کروا لی تھی۔ جس کی چھت سرخ اور مخروطی تھی۔ یہ چینی طرز کا ایک منزلہ مکان آج بھی ویسے ہی ہے اور ابراہیم جلیس اسے چینی پگوڈا کہا کرتا تھا۔ ساحر کے کمرے میں صرف ایک چارپائی، ایک میز، دو کرسیاں اور ایک پرانی سی دری بچھی تھی۔ اندھیرا سا چھایا رہتا۔ گرمیوں میں یہ کمرہ بڑا ٹھنڈا اور سردیوں میں بہت زیادہ سرد ہوتا۔

دوپہر کے بعد میں اور ساحر ہفت روزہ ''ادا کار'' کے دفتر میں گئے۔ قتیل شفائی پریس میں بھیجنے سے پہلے پرچے کی کاپیاں دیکھ رہا تھا۔ اس نے ہمارے لئے چائے منگوائی اور انگلی کھڑی کر کے بولا۔

''صرف ایک منٹ۔''

خوش شکل نوجوان، گھنے سیاہ بالوں والا سرخ و سفید، قتیل شفائی زندگی اور شعری استعداد سے بھرپور تھا۔ عشق و محبت کے ساتھ ساتھ اس کی نظموں اور غزلوں میں

طبقاتی تضاد سے پیدا ہونے والے مسائل کا بھی بھرپور شعور ملتا تھا۔ اس کی غزل اس عہد کی نئی آواز تھی۔ چہکتے کھنکتے اور مترنم شعر کہتا تھا۔

چائے آ گئی۔ قتیل نے کاپی پریس بھجوا دی اور سگریٹ ہماری طرف کر کے بولا۔

''یار! تم لوگ بڑے ہرجائی ہو۔ وعدے کرتے ہو مگر بھاگ جاتے ہو۔ اگلی بار اگر تم لوگوں نے اپنی کوئی چیز نہ دی تو میں واقعی ناراض ہو جاؤں گا۔''

قتیل شفائی کی ناراضگی ہمیں گوارا نہیں تھی۔

ساحر لدھیانوی نے کہا۔

''میں ایک نظم ضرور دوں گا۔ اے حمید سے تم بات کر لو کیونکہ اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔''

قتیل نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

''کیوں بھائی! اب بات کرو مجھ سے۔''

''افسانہ تو نہیں مزاحیہ مضمون کا پکا وعدہ کرتا ہوں۔''

''چلو ہو گئی بات۔ اب لو ایک عدد سگریٹ کا مجھے نقصان پہنچاؤ۔''

اسی شام کو ترقی پسند مصنفین کا اجلاس تھا جس میں ساحر پر ایک صاحب مقالہ پڑھنے والے تھے۔ میں ان کا نام بھول گیا ہوں۔ شکل یاد ہے۔ یہ صاحب پکے رنگ کے تھے اور علی گڑھ سے ترک وطن کر کے آئے تھے۔ ہم تینوں ''ادا کار'' کے دفتر سے اٹھ کر سیدھے دیال سنگھ کالج کی لائبریری میں گئے۔ جہاں انجمن کا ادبی اجلاس ہونے والا تھا۔ سبھی دوست جمع تھے۔ علی گڑھ والے صاحب نے ساحر لدھیانوی پر اپنا مقالہ پڑھا۔ بڑا پرمغز مقالہ تھا لیکن انہوں نے ساحر لدھیانوی کی رومانویت پر سخت تنقید کی تھی۔

ویسے بھی ترقی پسند مصنفین رومانیت کے جانی دشمن تھے۔ میرے افسانوں پر انہیں سب سے بڑا اعتراض یہی ہوتا تھا کہ میں ناریل کے درختوں اور بدھ مندر کی دیو داسیوں اور زرد گلابوں اور موتیوں کے گجروں کے بغیر ایک قدم آگے نہیں چلتا تھا۔ ساحر لدھیانوی حالانکہ اتنا زیادہ رومانٹک نہیں تھا اور اس کی شاعری میں ہمیں حقیقت پسندی

اور سماج سے بغاوت بدرجہ اتم ملتی ہے لیکن خدا جانے ان علی گڑھ والے صاحب کو ساحر کی آٹے میں نمک کے برابر رومان پسندی بھی کیوں گوارا نہ ہوئی۔

ساحر میرے پاس بیٹھا تھا۔ میں نے اس کے کان میں کہا۔

"ابھی حدیث دل کی بہت تفسیریں لکھی جائیں گی پیارے۔"

ساحر لدھیانوی کو اپنی ہمہ گیر مقبولیت کا بھرپور احساس تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس عہد کی نئی نسل کا فیض احمد فیض کے بعد وہی پسندیدہ ترین شاعر ہے۔ وہ فیض صاحب کا بے حد احترام کرتا تھا اور ان کا مداح تھا۔

سیف الدین سیف کی شاعری کو وہ بڑے جذبے کی شاعری سمجھتا تھا۔ غزل میں قتیل اور عبدالحمید عدم کا ڈنکہ بج رہا تھا۔

کالجوں میں مشاعرے ہوتے تو یہی لوگ مشاعرہ لوٹ کر لے جاتے تھے۔

ایک روز میں ابن انشاء کے چینی مندر سے اٹھ کر ساحر کی طرف گیا تو وہ غسل خانے کے ٹوٹے ہوئے شیشے کے آگے کھڑا رگڑ رگڑ کر شیو بنا رہا تھا۔ مجھے شیشوں میں سے اس کی ایک آنکھ نظر آئی۔

"وہ چینی بھکشو کہاں ہے؟"

ساحر لدھیانوی کا مقصد ابن انشاء سے تھا۔ میں نے ساحر کے پلنگ پر بیٹھ کر نیو ٹائمز کا تازہ شمارہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"وہ بھی اپنے ٹوٹے ہوئے شیشے کے سامنے کھڑا رگڑ رگڑ کر شیو بنا رہا ہے۔"

ساحر تولئے سے منہ پونچھتا ہوا غسل خانے سے باہر آیا۔ وہ گنگنا رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"آج یہ تیاری کس کیلئے ہو رہی ہے؟ کیا اس سے ملنے تو نہیں جا رہے؟"

ساحر لدھیانوی مسکرانے لگا۔

"میں پتلون پہن کر ابھی آیا۔"

میں نے کہا۔

"تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔"

"پتلون پہن کر آتا ہوں پھر سوال کا جواب دوں گا۔"

تھوڑی دیر میں وہ آ گیا۔ اس نے کریم کلر کی ٹھنڈی پتلون پہن رکھی تھی۔ اس کے کالے سیاہ بال پیچھے کو جمے ہوئے تھے اور چمک رہے تھے۔ بسکٹ رنگ کی پوری آستین کی شرٹ نے اس کی پتلی بانہوں کو چھپا رکھا تھا۔ اس نے کارنس پر رکھے ٹائم پیس میں وقت دیکھا اور جھک کر آئینے میں اپنا چہرہ تکنے اور بالوں میں ایک بار پھر کنگھی پھیرنے لگا۔ میں نے رسالہ پھینکتے ہوئے کہا۔

"تمہارے ارادے کیا ہیں آج؟"

"آؤ میرے ساتھ۔"

اور میں اس کے پیچھے پیچھے کمرے سے نکل کر احاطے کی روش پر سے ہو کر دوسری طرف ایبٹ روڈ پر آ گیا۔"

"ابن انشاء کو بھی ساتھ لے لیتے ہیں۔"

"ارے خدا کا نام لو اے حمید۔"

ساحر نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

"اس کو بالکل خبر نہیں کرنی۔"

"کس بات کی؟" میں نے پوچھا۔

ساحر نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"تم آؤ تو سہی۔"

میں یہ نہیں بتاؤں گا کہ ہم لوگ کہاں گئے تھے۔

ان ہی دنوں انقلابی نظمیں لکھنے کی وجہ سے ساحر کے پیچھے سی آئی ڈی لگ گئی۔ وہ ڈرپوک ہونے کی حد تک امن پسند تھا۔ چنانچہ گھر سے بہت کم باہر نکلتا تھا۔ انہیں دنوں کیفی اعظمی لاہور آ گیا۔ کیفی کے ساتھ پاک ٹی ہاؤس اور پیراڈائیز میں محفلیں سجنے لگیں۔ حمید اختر یہاں پہلے ہی سے موجود تھا لیکن ساحر کم گھر سے باہر نکلتا تھا۔

ساحر لدھیانوی نے ایک روز گھبرا کر بمبئی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے ابن انشاء اور حمید اختر نے اسے بہت سمجھایا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے مگر ساحر کے پاؤں لاہور کے میدان سے اکھڑ چکے تھے۔ ہم اسے بار بار سمجھاتے کہ لاہور سے نہ جائے وہ بار بار یہی کہتا۔

"نہیں اب میں یہاں نہیں رہوں گا۔"

کیفی اعظمی بمبئی جا چکا تھا۔ اس نے بمبئی سے ساحر لدھیانوی کو خط لکھا کہ پیارے بس آ جاؤ۔ بمبئی کی فلم انڈسٹری تمہاری راہ دیکھ رہی ہے۔ ہم نے ایک بار پھر ساحر کو بمبئی جانے سے روکا۔ یہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوش قسمتی تھی کہ وہ ہماری نصیحتوں پر عمل نہیں کر رہا تھا۔

پھر ایک روز ہم ساحر لدھیانوی کو الوداع کہنے والٹن ایئرپورٹ پر جا رہے تھے۔

ابھی لاہور کا ہوائی اڈا تعمیر نہیں ہوا تھا اور فوکر طیارے والٹن کے ہوائی اڈے سے اڑا کرتے تھے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ بڑی مشکل سے اڑا کرتے تھے۔

ساحر لدھیانوی نے ٹنڈ کروا رکھی تھی اور فلیٹ ہیٹ کھینچ کر کانوں تک پہن رکھی تھی۔ وہی پرانا پھٹا ہوا کوٹ زیب تن تھا جس کو میں اور احمد راہی باری باری پہنا کرتے تھے۔ ہوائی اڈے پر بھی وہ کسی ملک کے بڑے اہم جاسوس کی طرح بار بار گردن گھما کر دائیں بائیں دیکھ رہا تھا کہ کوئی اس کے پیچھے تو نہیں لگا ہوا۔

حمید اختر نے کہا۔

"اگر پیچھے لگا بھی ہوگا تو اب تمہارا کیا بگاڑ لے گا۔"

ساحر لدھیانوی نے سوکھا لمبا جسم جھکا جھکا کر ہم سب سے ہاتھ ملایا اور میلے کچیلے کوٹ کے ساتھ سب سے باری باری بغل گیر ہوا۔ ہم میں سے کسی دوست نے مذاقاً کہا۔

"ساحر اب بھی وقت ہے واپس آ جاؤ۔ مت لاہور کو چھوڑ کر جاؤ۔"

لیکن ساحر لدھیانوی کی قسمت یاوری کر رہی تھی۔ وہ فوکر جہاز میں سوار ہو گیا اور جہاز کے دونوں پنکھے طوفانی گردش میں آ گئے۔ چند لمحوں کے بعد ہوائی جہاز لاہور کی فضا سے نکل کر بمبئی کی طرف پرواز کر رہا تھا۔

بمبئی جا کر ساحر لدھیانوی کا سب سے زیادہ روشن اور سنہری دور شروع ہوتا ہے۔

فلم "ٹیکسی ڈرائیور" نے اس کی زندگی کو کامیابی اور عروج کی راہ پر ڈال دیا۔

دیکھتے دیکھتے ساحر لدھیانوی کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ جن لوگوں نے اس کے زوال کے خواب دیکھے تھے وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے تھے۔

ساحر لدھیانوی ایک بار دہلی آیا تو ہم نے سنا کہ اس نے اپنی نئی کار بھی ریل گاڑی میں ساتھ رکھوالی تھی تاکہ دہلی میں اسے سواری کی دقت نہ ہو۔ ہم نے سنا تو خوش ہوئے کہ ساحر نے اچھا کیا جو دہلی کے پبلشروں کے آگے ایک شاعر کی حیثیت کو بلند کر کے دکھایا۔ آخر شاعر اور ادیب کے پاس کار کیوں نہیں ہو سکتی؟

پھر وقت گزرتا چلا گیا اور ساحر لدھیانوی کامیابی کی منزلیں طے کرتا ایک مقام پر جا کر سکون پذیر ہو گیا۔ کبھی کبھی اس کا کوئی خط لاہور کے دوستوں کے نام آ جاتا۔ کبھی یہاں کے دوست ممبئی جا کر اسے مل آتے۔

واپس آ کر بتاتے کہ ساحر نے بمبئی میں ایسے فلیٹ بنوا رکھے ہیں جہاں ہندوستان اور پاکستان کا کوئی بھی ادیب شاعر جا کر جتنے روز چاہے ٹھہر سکتا ہے۔

ساحر پر دل کا دورہ پڑا ہے۔ ایک دوست نے بمبئی سے آ کر بتایا۔

"وہاں سب ادیب اپاہج ہو گئے ہیں۔ ساحر چل پھر نہیں سکتا۔ کیفی اعظمی ویل چیئر پر بیٹھتا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کسی آدمی کے کندھے کا سہارا لے کر سٹوڈیوز میں آتا ہے۔ خدا بچائے بمبئی سے۔"

☆......☆......☆

افسانہ نگار شوکت صدیقی

شوکت صدیقی ہمارے اردو ادب کا صف اول کا افسانہ نگار ہے۔ بلاشبہ اس کے ذکر کے بغیر اردو افسانے کی تاریخ مکمل نہیں ہوتی۔ اس نے کیا لکھا؟ اپنے افسانوں اور ناولوں میں کس طبقے کی عکاسی کی؟ اس کا تجزیہ کرنا نقادوں کا کام ہے۔ میں اس کا ایک عام قاری ہوں اور مجھے اس کے افسانے اور ناول بہت پسند ہیں۔ وہ میرا عزیز دوست ہے اور بطور انسان بھی مجھے بہت عزیز ہے اور پسند ہے۔ سوشیالوجی اور انسانی ساج کی طبقاتی کش کش کی تاریخ کا وہ بڑا عالم فاضل ہے۔ میں اس معاملے میں بالکل صفر ہوں۔ نہ میری کبھی ساج سے ملاقات ہوئی ہے اور نہ میں طبقاتی کشمکش سے ہی کبھی ملا ہوں۔ مجھے یاد ہے آج سے بہت عرصہ پہلے اس نے مجھے چینی اشتراکی افسانہ نگار لوھسون کے افسانوں کی کتاب دی تھی جو اس کے افسانوں کا انگریزی ترجمہ تھا۔ لوھسون بلاشبہ بڑا اچھا اشتراکی افسانہ نگار تھا اور میں نے اس کے کچھ افسانے پہلے بھی پڑھے تھے لیکن یہاں بھی وہی مصیبت سامنے آ گئی کہ اس کے افسانوں میں کہانی کم اور طبقاتی کش کش زیادہ تھی۔ چنانچہ میں لوھسون کا کوئی بھی افسانہ پورا نہیں پڑھ سکا۔ شوکت صدیقی نے مجھ سے لوھسون کی کتاب کے بارے میں پوچھا کہ کیوں؟ پڑھی کتاب؟ میں نے اس کے سامنے اپنی طبقاتی کشمکش والی معذوری کا ذکر کیا تو اس نے مجھے لیکچر دینا شروع کر دیا۔ میں نے اسے درمیان میں ہی روک کر کہا۔

"اپنا اور میرا وقت ضائع نہ کرو، تم نے اب تک جو کچھ کہا ہے اس کا ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہیں آیا۔"

اس کے بعد شوکت صدیقی نے کبھی مجھ سے طبقاتی کشمکش کی بات نہیں کی۔

اتنا میں آپ کو بتا دوں کہ شوکت صدیقی اندر سے بڑا بھولا اور سیدھا سادا آدمی ہے۔ طبقاتی کشمکش کے غیر ملکی نظریات نے اس کی تحریروں پر ضرور اثر ڈالا ہے مگر شوکت صدیقی کی روح کو ذرا متاثر نہیں کیا۔ جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں وہ اندر سے بڑا بھولا اور سادہ لوح ہے۔ روپے پیسے کے معاملے میں اسے کوئی بھی بے وقوف بنا سکتا ہے چونکہ روپے پیسے سے مجھے بھی ایک خاص حد سے آگے کبھی دلچسپی نہیں رہی، اس لئے میں نے شوکت صدیقی کو کبھی بے وقوف نہیں بنایا۔ میری طرح وہ بھی پیسے گنتے گنتے، گنتی بھول جاتا ہے اور اسے پتہ نہیں چلتا کہ اناسی اور نواسی میں کیا فرق ہے۔ شوکت صدیقی سے میری ملاقات قیام پاکستان کے کچھ دن بعد ہی ہو گئی تھی۔ ترقی پسند ادیبوں میں اس کا نام بھی نمایاں تھا۔ میں بنیادی طور پر رومان پسند ہوں لیکن پاکستان کے اولین دور کے سارے ترقی پسندوں سے میری گہری دوستی تھی اور یہ دوستی آج تک قائم ہے۔

شروع شروع میں انتہا پسند، ترقی پسند نقاد اور دانشور مجھے رجعت پسند کہا کرتے تھے اور ان میں سے دو ایک نے تو مجھے اپنے رنگ میں رنگنے کی کوشش بھی کی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ نظریاتی اختلافات کے باوجود میرے بہترین دوست ترقی پسند ادیب ہی رہے اور انہوں نے بھی مجھے بے حد پیار دیا، محبت دی جس کے لئے میں ہمیشہ انہیں یاد رکھتا ہوں۔

میں یہ نہیں کہوں گا کہ شوکت صدیقی اب بوڑھا ہو گیا ہے۔ میرے نزدیک کوئی بوڑھا نہیں ہوتا۔ آدمی جب پیدا ہوتا ہے تو اس کے اندر ایک بوڑھا موجود ہوتا ہے اور جب بظاہر بوڑھا ہوتا ہے تو اس کے اندر ایک بچہ موجود ہوتا ہے۔ چنانچہ جب بھی میں شوکت صدیقی سے ملتا ہوں تو ہم اپنے اپنے اندر کا بچہ باہر نکال لیتے ہیں اور پھر دو بچے آپس میں بھولی بھالی معصوم باتیں کرتے ہیں۔ نہ وہ ماؤزے تنگ ہوتا ہے نہ میں خلیل جبران ہوتا ہوں۔ بس بچے جس طرح باتیں کرتے ہیں ہم بھی اسی طرح باتیں کرتے رہتے ہیں۔

میں بہت کم خط لکھتا ہوں لیکن شوکت صدیقی کو، جب وہ مجھے بہت یاد آتا ہے تو اسے ضرور خط لکھتا ہوں۔ وہ بھی میرے خط کا جواب ضرور دیتا ہے۔ اس وقت اس کا ایک خط میرے سامنے ہے۔ میں اس کے کچھ اقتباس نقل کرتا ہوں۔

"یار مہربان اے حمید! تمہارا خط مل گیا۔ یار تمہارا دم غنیمت ہے کہ اس نفسانفسی کے دور میں بھی تم اس محبت سے یاد کر لیتے ہو۔ تم نے حمید اختر کا ذکر کیا تو اس کی تازہ تصنیف "روداد انجمن" یاد آئی۔ یہ کتاب ابھی کراچی میں نہیں ملتی۔ اس میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی ادبی نشستوں کی روداد لکھی گئی ہے۔ بڑی تاریخی دستاویز ہو گی۔ کتاب مل گئی تو پڑھوں گا۔ اور عمر رفتہ کو آواز دوں گا۔ حمید اختر کو آداب کہنا۔ مزاج پوچھنا۔ تم بھی "نوائے وقت" کے ادبی ایڈیشن میں اپنی یادداشتیں لکھ رہے ہو۔ میرے علاوہ کراچی کے اور احباب بھی تمہاری تحریروں کو دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ ان یادداشتوں کو کتابی شکل میں ضرور چھپوانا...... یہ گزرے زمانے کی پوری تاریخ ہے۔"

جان من! پیٹ پوجا کے لئے ضرور لکھو کہ

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

یہ بنیادی مسئلہ ہے لیکن کچھ ایسا بھی تخلیقی کام کرتے رہو جو تم کو بحیثیت ادیب' تاریخ ادب میں زندہ رکھے۔ مجھے تو تمہارا وہ زمانہ یاد آتا ہے جب تمہارے افسانے بڑی آب و تاب کے ساتھ "ادب لطیف"، "سویرا" اور "نقوش" میں شائع ہوتے تھے۔ ہر سو تمہارا چرچا تھا تمہارے افسانوں کا پہلا مجموعہ "منزل منزل" تو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ کیا عروج کا زمانہ تھا تمہارا۔

کچھ اس کی لاج ہی رکھ لو اور ایسا کام کرو جو اے حمید کی شناخت ہے۔

(تمہارا......شوکت صدیقی کراچی)

شوکت صدیقی سے میری پہلی ملاقات 1950ء میں ہوئی جب وہ ہندوستان سے ہجرت کر کے لاہور آ گیا تھا۔ میں 1948ء میں اپنا پہلا افسانوی مجموعہ "منزل منزل" لکھ کر دنیائے ادب میں داخل ہو چکا تھا۔ ظہیر کاشمیری، شہزاد احمد، سیف الدین سیف، علاؤ الدین کلیم (جو بعد میں گورنمنٹ کالج میں انگریزی پڑھاتے رہے) احمد راہی، عارف عبدالمتین، صدیق کلیم، صلاح الدین ندیم اور بعض دوسرے ادیب اور

شاعر اور دانشور بھی ہجرت کر کے لاہور آ چکے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کی ادبی محفلیں اور مباحثے اور ادبی مناظرے امرتسر کے کامریڈ ہوٹل اور صوفی غلام محمد ترک کے ہوٹل میں ہوا کرتے تھے اور میں ادب کے طالب علم کی حیثیت سے ان کی محفلوں میں بیٹھا کرتا تھا۔ ان میں ظہیر کاشمیری، عارف عبدالمتین اور احمد راہی کا شمار ترقی پسند شاعروں میں ہوتا تھا۔ لاہور میں ساحر لدھیانوی، ابن انشاء، حمید اختر سے ملاقات ہوئی' جو لدھیانے سے ہجرت کر کے لاہور پاکستان پہنچے تھے۔ یہ سب ترقی پسند تھے اور ادبی دنیا میں پہلے سے جانے جاتے تھے۔ پھر حیدر آباد دکن سے ابراہیم جلیس بھی لاہور پہنچ گئے اور شوکت صدیقی بھی لکھنؤ سے آ گیا۔ یوں لاہور میں میرے ترقی پسند دوستوں کا ایک گروپ بن گیا اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے ہفتہ وار اجلاس ہونے لگے۔ یہ میرا ادبی زندگی کا ابتدائی زمانہ تھا اور میں جو افسانہ لکھتا ترقی پسند مصنفین کی ہفت روزہ ادبی نشست میں پڑھتا۔ میرے افسانوں کو دوسرے سامعین کے ساتھ ساتھ میرے ترقی پسند دوست بھی پسند کرتے لیکن بعض کٹر قسم کے ترقی پسند دانشور اور نقاد مجھے زبردست تنقید کا نشانہ بناتے۔ ان میں عبداللہ ملک اور صفدر میر زینو پیش پیش ہوتے تھے۔ انہیں میری کہانیوں پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ ان کا تانا بانا رومانوی فضا میں بنا گیا ہے اور یہ ترقی پسند نظریات کے خلاف ہے اور اس سے سرمایہ دارانہ ذہنیت کی عکاسی ہوتی ہے۔ مجھے یاد ہے ترقی پسند مصنفین کا ایک ادبی اجلاس دیال سنگھ کالج کی لائبریری کی دوسری منزل پر منعقد ہوا۔ میں نے اس میں اپنا ایک افسانہ پڑھا۔ اس افسانے میں' میں نے ایک مسجد کی ڈیوڑھی کا ذکر کیا تھا جس پر زرد پھولوں والی ایک بیل نے سایہ ڈال رکھا تھا۔ میں نے مسجد کا ذکر بڑی عقیدت اور احترام سے کیا تھا۔ میں نے افسانہ ختم کیا تو ترقی پسندوں کے انتہا پسند گروپ کی جانب سے مجھ پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی گئی۔ ایک کٹر ترقی پسند نقاد نے تو اٹھ کر صاف صاف کہہ دیا کہ اے حمید نے اس افسانے میں مسجد کا ذکر کیوں کیا ہے۔ اس کے ہر افسانے میں اس قسم کی رجعت پسندانہ باتیں ضرور ہوتی ہیں۔ میں مطالبہ کرتا ہوں کہ آئندہ سے اس شخص کو ترقی پسند مصنفین کی ادبی نشستوں میں افسانہ پڑھنے کی اجازت نہ دی جائے۔ ایک اور کٹر ترقی پسند نے اٹھ کر کہا کہ یہ شخص رومانیت کا پرچار کرتا ہے جو ہمارے نظریات کے خلاف ہے۔ اسے ترقی پسند

مصنفین کی رکنیت سے خارج کر دیا جائے۔ بہرحال اس کے باوجود میرے ترقی پسند دوست میری کہانیوں کو سراہتے تھے یا شاید وہ ایسا کرنے پر مجبور تھے۔ بلکہ ایک بار تو جیسا کہ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں' ابن انشاء نے مجھے رازداری سے یہ کہا تھا کہ اے حمید یہ لوگ تمہاری رومان نگاری کی وجہ سے تمہیں رجعت پسند کہتے ہیں۔ ان کو معلوم نہیں کہ میں بھی تمہاری طرح اندر سے ترقی پسند نہیں ہوں بلکہ رجعت پسند ہوں کیونکہ مجھے بھی پراسراریت اور رومان نگاری اور قدیم بغداد کے گلی کوچوں اور ان کی رومانٹک فضا سے محبت ہے۔ میں اپنی ''غیر ترقی پسندانہ'' رومان نگاری پر ثابت قدمی سے قائم رہا اور اب بھی قائم ہوں لیکن میرے کٹر ترقی پسند دوستوں نے بھی مجھے سمجھانا مجھ پر تنقید کرنا اور مجھے ''راہ راست'' پر لانے کی کوششیں ترک کر دیں۔ شوکت صدیقی شروع ہی سے میری کہانیوں کی رومانیت کا درپردہ مداح تھا اور وہ آج بھی ہے۔

بہرحال یہ ضمنی باتیں تھیں۔ شوکت صدیقی سے نظریاتی اختلافات کے باوجود میری دوستی اور محبت قائم رہی بلکہ روز بروز بڑھتی اور پروان چڑھتی رہی۔ میں کراچی جاتا تو ابن انشاء کے جہانگیر روڈ والے مکان میں اس کے پاس ٹھہرتا اور شوکت صدیقی سے ضرور ملنے جاتا۔ ان دنوں بڑی خوبصورت کہانیاں لکھنے والا افسانہ نگار انور زندہ تھا اور اس کی کہانیاں ملک کے ادبی رسالوں میں شائع ہوتی تھیں۔ وہ پاکستان بحریہ میں کمانڈر کے عہدے پر فائز تھا اور کمانڈر انور کے نام سے ہم دوستوں میں مشہور تھا۔ اس کا تعلق بھی ابن انشاء اور حمید اختر کی طرح لدھیانے کی سرزمین سے تھا۔ مگر تعجب کی بات ہے کہ ابن انشاء اور حمید اختر اور ساحر لدھیانوی کی بول چال میں لدھیانوی لہجہ غالب تھا مگر کمانڈر انور کے ساتھ ایسی بات نہیں تھی۔ اول تو وہ پنجابی نہ بولنے کے برابر اور اشد ضرورت کے وقت بولتا تھا۔ ہمیشہ اردو بلکہ فوجی اردو میں کلام کرتا تھا اور یہ اردو اس کے منہ سے بڑی اچھی لگتی تھی۔ ''منزل کی طرف'' کے نام سے انور کے افسانوں کا ایک مجموعہ بھی چھپا تھا جو غالباً نیا ادارہ یا مکتبہ اردو نے شائع کیا تھا۔ میں کراچی جاتا تو کمانڈر انور کے فوجی میس میں ہماری شام کی نشست جمتی، جس میں ابن انشاء، ابراہیم جلیس اور شوکت صدیقی ضرور شامل ہوتے۔ انور کے فوجی میس (mess) کی کافی کا ذائقہ میں آج تک فراموش نہیں کر سکا۔ انور ہمیں اپنے ہاتھ سے

کافی بنا کر پلایا کرتا۔ ہمارا یہ پیارا دوست اور خوبصورت کہانیاں لکھنے والا دوست بڑی جلدی ہم سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ گیا۔

میرے اصرار پر کہ یار مجھ سے لوگ تمہارے بارے میں پوچھتے ہیں کہ تم کہاں پیدا ہوئے۔ کہاں کہاں تعلیم حاصل کی۔ افسانہ نگاری کب شروع کی مجھے خود یہ باتیں معلوم نہیں ہیں۔ انہیں کیا جواب دوں۔ تم ایسا کرو کہ مجھے اپنا ایک مختصر بائیو ڈیٹا لکھ کر بھیج دو چنانچہ شوکت صدیقی نے ایسا ہی کیا۔ اپنے بائیو ڈیٹا بلکہ سوانحی خاکے میں وہ لکھتا ہے۔

میں 20 مارچ 1923ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم ایک دینی درس گاہ مدرسہ عالیہ فرقانیہ میں حاصل کی۔ میں نے کلام پاک کا ناظرہ کیا۔ اس کے بعد پرائمری سکول میں بٹھا دیا گیا۔ ساتھ ہی گھر میں ایک پرائیویٹ ٹیوٹر سے انگریزی کی تعلیم بھی حاصل کرتا رہا۔

1938ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا اور کرسچین کالج میں داخلہ لیا۔ دو سال امتحان میں فیل ہونے کے بعد طبیعت تعلیم سے اچاٹ ہو گئی لیکن بعد میں سیاسیات میں ایم اے کیا۔

1940ء میں پہلا افسانہ لکھا جو لاہور کے ہفت روزہ ''خیام'' میں چھپا۔ پہلے افسانے کی اشاعت سے حوصلہ افزائی ہوئی اور پھر ان دنوں خوب جم کر افسانے لکھے جو ''خیام'' کے علاوہ ماہنامہ ''عالمگیر'' لاہور میں شائع ہوتے رہے۔ ان دنوں ادیبوں، شاعروں کے لکھنؤ میں دو ٹھکانے تھے۔ ''دانش محل'' یہ امین آباد میں کتابوں کی دکان تھی جس میں پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر عبادت بریلوی اور غلام احمد فرقت کاکوروی روزانہ شام کو پابندی سے آتے تھے۔ ان کے علاوہ نیاز فتح پوری' جعفر علی خان اثر لکھنوی، کرشن پرشاد کول اور دوسرے بزرگ اہل قلم بھی شریک محفل ہوتے تھے۔ اہل قلم کا دوسرا ٹھکانہ کافی ہاؤس حضرت گنج میں تھا۔ جہاں ڈاکٹر عبدالعلیم، اسرار الحق مجاز، سلام مچھلی شہری، شورش صدیقی، علی جواد زیدی، کمال احمد صدیقی، مظہر سلیم

اور دوسرے سینئر اور جونیئر ادبا و شعراء شام کو کافی کی پیالی پر محفل آرائی کرتے تھے۔ میں دانش محل میں کبھی کبھی اور کافی ہاؤس میں پابندی سے روزانہ جاتا تھا۔ 1944ء میں فیض آباد سے ماہنامہ ''جدید ادب'' کا اجرا ہوا۔ جدید ادب کے حوالے سے فراق گورکھپوری، ڈاکٹر اعجاز حسین اور الٰہ آباد اور فیض آباد کے اہل قلم سے روابط پیدا ہوئے۔ ''جدید ادب'' کی مجلس ادارت میں میرے علاوہ کاوش انصاری بھی شامل تھے۔ میں نے 1945ء میں ''جدید ادب'' سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

1950ء میں، میں پاکستان آ گیا۔ پہلا پڑاؤ لاہور تھا۔ یہ اپریل کا مہینہ تھا۔ لاہور سے میں کراچی آ گیا اور اب تک یہیں قیام پذیر ہوں۔ کراچی میں صحافت کو بطور پیشہ اختیار کیا۔ آغاز انگریزی صحافت سے ہوا۔ روزنامہ ''پاکستان سٹینڈرڈ'' روزنامہ ''ٹائمز آف کراچی'' کے قائم مقام ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ 1963ء میں انگریزی صحافت سے کنارہ کش ہو کر اردو صحافت سے وابستہ ہو گیا اور روزنامہ ''انجام'' کراچی کا چیف ایڈیٹر مقرر ہوا۔ روزنامہ ''مشرق'' کراچی، لاہور اور ''مساوات'' کے لئے کالم نویسی کی پھر ''مساوات'' کراچی اور ساہیوال کا چیف ایڈیٹر مقرر رہا۔ میرے افسانوی مجموعے، تیسرا آدمی، اندھیرا اور اندھیرا، راتوں کا شہر اور کیمیا گر ہیں۔ ناولوں میں خدا کی بستی، چار دیواری، جانگلوس (تین جلدوں میں) شامل ہیں۔ ایک ناولٹ ''کمین گاہ'' لکھا۔

1966ء میں افریشیائی ادیبوں کی کانفرنس منعقدہ بیجنگ میں بحیثیت پاکستانی مندوب شرکت کی۔ 1987ء میں دانشوروں اور سکالروں کی عالمی کانفرنس منعقدہ ماسکو میں پاکستانی نمائندے کی حیثیت سے شرکت کی۔ علاوہ ازیں یورپ، امریکہ، انگلستان، چین، عراق، شام، الجزائر اور دوسرے بیرون ممالک کا سفر کر چکا ہوں۔''

یہ افسانہ نگار شوکت صدیقی کا مختصر مگر جامع سوانحی خاکہ ہے۔ شوکت صدیقی پر تحقیقی کام کرنے والوں کو اس سے ضرور مدد ملے گی۔ شوکت صدیقی سے ملاقات ہوئے دیر ہو گئی ہے۔ ایک بار اس نے مجھے کہا تھا کہ یار ہم تو اب بوڑھے ہو گئے مگر میں ایسا نہیں سمجھتا مجھے یہاں ناول نگار وکٹر ہیوگو کا ایک جملہ یاد آ رہا ہے اس نے کسی جگہ لکھا تھا کہ ''روشنی کبھی بوڑھی نہیں ہوتی'' اور پھر مجھے تو اس معصوم بچے سے ملنا ہوتا ہے جو شوکت صدیقی کے اندر چھپا ہوا ہے۔ شوکت صدیقی بے شک بوڑھا ہو جائے مگر مجھے یقین ہے کہ اس کے اندر جو بھولا بھالا بچہ ہے وہ ویسے کا ویسا ہی ہو گا کیونکہ باہر کا آدمی لاکھ بوڑھا ہو جائے مگر اس کے اندر چھپا ہوا بچہ کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔

☆......☆......☆

ساغرصدیقی

"نوائے وقت" کے قارئین کرام سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے میرے مضامین پڑھ کر مجھے اکثر خط لکھ کر اپنی پسندیدگی کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ ان پر تنقید بھی کرتے ہیں اور میری بعض غلطیوں کی نشان دہی بھی کرتے ہیں اور لاہور شہر کے بارے میں اپنی یادوں کے حوالے سے میرے علم میں اضافہ بھی کرتے ہیں جس کیلئے میں ہمیشہ ان کا شکر گزار رہا ہوں۔

اس وقت میں جس خط کا ذکر کرنے والا ہوں وہ راشد منہاس روڈ کراچی سے حاجی چودھری محمد علی صاحب نے آج سے دو برس پہلے لکھا تھا۔ خط پر 23 جولائی 2002ء کی تاریخ درج ہے۔ اپنے خط میں چودھری صاحب نے لاہور کے کچھ پرانے ٹھکانوں کا تذکرہ کرتے ہوئے بعض ایسی معروف صحافتی اور ادبی شخصیات کا حوالہ دیا ہے جنہیں اکثر لوگ تقریباً فراموش کر چکے ہیں۔ یہ خط میں نے اپنے کالم میں شائع کرنے کی غرض سے بڑی احتیاط کے ساتھ ایک جگہ رکھ دیا۔ مجھ سے کچھ ضرورت سے زیادہ ہی احتیاط ہوگئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس خط پر دو برس تک میری نظر نہ پڑ سکی۔ جس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔ آج اتفاق سے میں کچھ پرانے کاغذات دیکھ رہا تھا کہ اچانک چودھری صاحب کا خط نکل آیا۔ میں چودھری صاحب سے معذرت خواہ ہوں کہ مجھ سے یہ نادانستہ تاخیر سرزد ہوگئی۔ اپنے محترم قارئین کی دلچسپی کیلئے میں اس خط کو یہاں نقل کر رہا ہوں۔ راشد منہاس روڈ کراچی سے حاجی چودھری محمد علی صاحب اپنے خط میں لکھتے ہیں۔

"برادرم حمید صاحب! السلام علیکم! میرا نام حاجی چودھری محمد علی ہے۔ میرا

تعلق انبالے سے ہے۔ قیام پاکستان کے بعد میں ملتان آ گیا۔ وہاں سے پھر لاہور آ گیا۔ میں پچاس سال تک لاہور میں رہا ہوں۔ جنوری 2000ء سے کراچی میں مقیم ہوں۔ آپ نے 21 جولائی کے 'بارش' سماوار میں بھارت کے نامور اداکار امجد خان کے والد کا تذکرہ لکھا ہے۔ امجد خان کے والد کا اسلامی نام زکریا خاں تھا اور اس کا فلمی نام بے انت نہیں جینت تھا۔ ان کا تعلق پشاور سے تھا۔ آپ نے اس زمانے کے فلمی اداکار ایم ظہور کا جو نام لکھا ہے۔ اس کا نام ظہور راجہ تھا۔ ظہور راجہ تقسیم کے بعد لاہور آ گئے تھے اور انہوں نے انور کمال پاشا کی کچھ فلموں میں کام بھی کیا تھا۔ اس کے بعد وہ فلمی دنیا سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ آپ نے اسی مضمون میں معروف صحافتی شخصیت م ش صاحب کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اس کا کریڈٹ آپ کو جاتا ہے کہ آپ اپنے وقت کی مشہور شخصیتوں کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ جنہیں زمانہ اب بھلاتا جا رہا ہوں۔ آپ کی واحد شخصیت ایسی ہے کہ جو میرے ایسے لاکھوں انسانوں کو ان کا ماضی یاد دلاتے رہتے ہیں اور دیار ماضی کی سیر کراتے رہتے ہیں۔ یہ میں ہی نہیں میرے ایسے بہت سے لوگ آپ کو دعائیں دیتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے۔ خدا بخشے م ش صاحب اپنی ڈائری میں بڑی دلچسپ اور بڑی علمی اور سیاسی بصیرت والی باتیں لکھا کرتے تھے۔ یہ وہ دولت ہے جو اب واپس نہیں آ سکتی۔ میں بڑے تسلسل کے ساتھ آپ کا کالم 'بارش' سماوار' خوشبو پڑھ رہا ہوں۔ اور میاں محمد شفیع یعنی م ش صاحب کے بعد آپ کے کالم کو چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا آپ نے میاں اے آر کاردار کے چھوٹے بھائی کا ذکر کیا ہے جو فلمی اداکار تھے۔ انہوں نے اے آر کاردار کی فلم "درد" میں ثریا کے ساتھ ہیرو کا رول ادا کیا تھا۔

حمید صاحب! پچھلے دنوں میں لاہور گیا۔ وہ علاقہ جہاں میں پچاس برس پہلے رہا کرتا تھا اب پہچانا نہیں جاتا تھا۔ چوک بھاٹی میں ایک سینما پیراماؤنٹ ہوا کرتا تھا۔ وہ ختم ہو چکا ہے۔ اس کی جگہ اب ویگنیں کھڑی ہوتی ہیں۔ پیراماؤنٹ سینما کی سڑک والی دیوار کے ساتھ مشہور شاعر ساغر صدیقی ٹیک لگائے بیٹھے ہوتے تھے۔ ساغر صدیقی سے یہاں پر ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔ اس وقت ساغر صدیقی کا نشے کا روگ آخری سٹیج پر پہنچا ہوا تھا۔ میں نے ایک بار انہیں کہا۔ ساغر صاحب آپ اس روگ کو چھوڑ کیوں نہیں

دیتے۔ کہنے لگے۔ چودھری صاحب! یہ روگ تو اب ساغر کی قبر میں جائے گا۔ بھاٹی گیٹ اور لوہاری گیٹ کے درمیان جو باغ ہے وہی ساغر صدیقی کا مسکن تھا۔ اسی باغ میں ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر وہ کاغذ پر نئی غزلیں تخلیق کرتا تھا۔ ہر غزل کا معاوضہ اسے پبلشر کی جانب سے دس بیس روپے مل جاتا تھا۔ وہ اسی میں خوش تھا۔

بھاٹی گیٹ کے چوک میں سوڈا واٹر اور پان سگریٹ کی ایک طرح دار دکان دارالسرور ہوا کرتی تھی۔ اس کے بانی مولوی محمد یوسف بٹ ہوا کرتے تھے جو کہ شعر و شاعری کا بھی اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنا ایک شعر دکان کے اوپر بڑے بورڈ پر لکھوا کر لگایا ہوا تھا۔

بھاٹی کے چوک میں جو ہو آنا حضور کا
اک پان خاص چیز ہے دارالسرور کا

مولوی محمد یوسف بٹ انجمن پان سگریٹ فروشاں لاہور کے بانی تھے۔ انہوں نے اپنی کمائی سے داتا دربار کے نزدیک ایک ہسپتال بھی بنوایا تھا جو اب بھی خدمت خلق کر رہا ہے۔ میں ان دنوں پیراماؤنٹ سینما میں ملازم تھا اور گوالمنڈی میں میری رہائش تھی۔ میں گوالمنڈی سے پیدل باغوں باغ بھاٹی گیٹ آیا کرتا تھا۔ کیا زمانہ تھا۔ دوپہر کو باغ میں بڑے بوڑھوں کی ٹولیاں جمع ہو جاتیں۔ کہیں ہیر وارث شاہ سنائی جا رہی ہے۔ کہیں ایک شخص نسیم حجازی کا کوئی اسلامی ناول بلند آواز میں پڑھ کر سنا رہا ہے۔ آخر میں میری دعا ہے کہ اللہ آپ کو توفیق عطا فرمائے اور آپ ہمیں ان پرسکون اور ادب و آداب والے زمانے کی باتیں سناتے رہیں۔ فقط

حاجی چودھری محمد علی (راشد منہاس روڈ کراچی 23-7-2002)

محترم حاجی چودھری محمد علی صاحب! میں ایک بار پھر آپ سے معذرت خواہ ہوں کہ اپنے قارئین کرام تک آپ کی بھولی بسری یادوں کو پہنچانے میں مجھ سے دو سال کی تاخیر ہوگئی۔ آپ کے خط نے مجھے بہت کچھ یاد دلا دیا اور میں اس زمانے میں پہنچ گیا جو اس شہر بے مثال کا سنہری زمانہ تھا۔

ایک بات کی میں وضاحت کرنا چاہوں گا کہ آپ نے میرے مضمون کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ میں نے جس ایم ظہور کا ذکر کیا ہے وہ اصل میں ظہور راجہ فلم

ایکٹر تھا۔ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ ظہور راجہ بے شک ایک اداکار تھا۔ درمیانے قد کا ایک جوان رعنا تھا۔ اس زمانے کی مشہور فلم ''مرزا صاحباں'' میں اس نے مرزے کا کردار انتہائی سادگی اور خوبصورتی سے ادا کیا تھا۔ اس کی ہیروئن ایلا دیوی تھی۔ میں نے وہ فلم امرتسر کی امرت ٹاکیز سینما میں دیکھی تھی۔ اس فلم میں صاحباں کے بھائی شمیر کا کردار اس زمانے کے جوان سال اداکار بیگ نے ادا کیا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد ظہور راجہ لاہور آ گیا تھا۔ انور کمال پاشا صاحب نے اسے اپنی دو ایک فلموں میں کام دیا تھا۔ میں اس زمانے میں انور کمال پاشا صاحب کے یونٹ سے منسلک تھا۔ یہ غالباً 1950ء کے بعد کی بات ہے۔ میں نے ظہور راجہ کو وہاں آتے جاتے دیکھا تھا مگر وہ زیادہ کامیاب نہ ہو سکا اور کہتے ہیں کہ وہ لندن جا کر سیٹل ہو گیا تھا۔ بڑے اچھے ادبی ذوق کا مالک تھا۔

جس ایم ظہور کا میں نے ذکر کیا تھا وہ تقسیم سے پہلے بمبئی میں پرکاش فلم کمپنی کی ایکشن فلموں کا مشہور ولن تھا۔ میں دوسری بار گھر سے بھاگ کر بمبئی گیا تو محمد اشرف صاحب نے جو لاہور موچی دروازے کے رہنے والے تھے اور بمبئی کی سینگلٹن روڈ پر کاروں کے سپیئر پارٹس کا بزنس کرتے تھے مجھے اپنے گیراج کی ایک پرانی موٹر کار میں رات کے سونے اور رہنے کیلئے جگہ عنایت کر دی تھی۔ ایم ظہور سٹوڈیو جاتے ہوئے تھوڑی دیر کیلئے اشرف صاحب کے پاس ضرور آتے۔ گیراج کے باہر لوہے کی دو چار کرسیاں بچھی ہوتی تھیں۔ وہ اس زمانے کی بڑی موٹر سائیکل پر آیا کرتے تھے۔ باہر کرسی پر سگریٹ سلگا کر بیٹھ جاتے۔ انہیں جب پتہ چلا کہ مجھے بمبئی کی فلمی دنیا کا گلیمر پنجاب سے وہاں کھینچ لایا ہے تو کبھی کبھی اپنی موٹر سائیکل کے پیچھے بٹھا کر پرکاش سٹوڈیوز میں اپنی فلم کی شوٹنگ دکھانے لے جایا کرتے تھے۔ پرکاش سٹوڈیوز کی ان دنوں مشہور ہیروئن پرمیلا ہوا کرتی تھی۔ ایم ظہور صاحب ماضی کی مشہور ہیروئن ثریا کے ماموں تھے۔ ایک دو بار میں ان کی موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھ کر ہیروئن ثریا کے فلیٹ پر بھی گیا تھا۔ بمبئی کے میٹرو سینما کے سامنے ایک بلڈنگ کی پہلی منزل میں ثریا کا فلیٹ تھا۔ یہ ثریا کے کیریئر کا ابتدائی زمانہ تھا۔ میری عمر تیرہ چودہ برس کی تھی۔ مجھے وہاں اداکارہ ثریا کو دیکھنے کا اکثر موقع ملتا تھا۔ ان کا ڈرائنگ روم بڑا سجا سجایا تھا۔ مجھے یاد ہے درمیان میں ایک میز پر سیب، موسمبیوں اور ہری جھیل کے کیلوں سے بھری ہوئی پلیٹ پڑی رہتی تھی۔ میں نے اس

پلیٹ میں سے کبھی کسی کو پھل کھاتے نہیں دیکھا تھا۔ مجھے اس پر بڑی حیرانی ہوا کرتی تھی کہ یہ لوگ پلیٹ میں سے پھل کھاتے کیوں نہیں؟ تقسیم کے بعد ایم ظہور لاہور آ گئے۔ انہوں نے دو چار فلموں کی کہانیاں بھی لکھیں لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔

آپ نے خط میں ساغر صدیقی کا جس محبت اور تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے اس سے مجھے گمان گزرا کہ شاید اس میں ساغر صدیقی کی شاعرانہ عظمت کے علاوہ یہ جذبہ بھی کارفرما تھا کہ وہ آپ کا ہم وطن تھا۔ آپ بھی انبالے کے ہیں اور ساغر صدیقی بھی انبالے کا رہنے والا تھا۔ قیام پاکستان سے بہت پہلے ان کی فیملی انبالے سے امرتسر میں آ کر آباد ہو گئی تھی۔ اتفاق سے ان کا مکان ہمارے محلے میں ہی کٹڑہ گھنیا میں واقع تھا۔ میں اس زمانے میں ساتویں یا آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا اور اپنے استاد مکرم جناب ضبط قریشی صاحب کے ہمراہ ساغر صدیقی کے ہاں جایا کرتا تھا۔ مکان کی دوسری منزل میں ترکھانوں والا ایک اڈہ لگا تھا۔ جس پر بیٹھ کر ساغر صدیقی کنگھیاں بنایا کرتا تھا۔ میرے استاد صاحب' ساغر صدیقی کی شاعرانہ صلاحیتوں کے بڑے مداح تھے۔

قیام پاکستان کے بعد ساغر صدیقی لاہور آ گیا اور غالباً کرشن نگر میں کوئی مکان الاٹ کروا کر اپنی فیملی کے ساتھ رہنے لگا۔ بطور شاعر وہ مشہور ہو چکا تھا اور مجھے یاد ہے وہ بڑے سلیقے سے پینٹ اور بش شرٹ پہنا کرتا تھا۔ ہمیشہ صاف ستھرا رہتا تھا۔ پھر وہ اکیلا گوالمنڈی کے شاید کشمیر ہوٹل کی دوسری منزل والے کمرے میں آ کر رہنے لگا۔ طبع انتہائی موزوں تھی اور بڑی رواں' صاف' ستھری اور دل میں نقش ہو جانے والی غزلیں کہتا تھا۔ بعد میں اگرچہ وہ اپنے آپ سے بے پروا ہو گیا تھا مگر آخری زمانے تک وہ نہایت اعلیٰ پائے کی شاعری کرتا رہا۔ مسلم مسجد کے نیچے ایک پبلشر کی چھوٹی سی دکان ہوتی تھی۔ ایک بار میں دکان میں داخل ہوا تو ساغر صدیقی کو دیکھا کہ کاؤنٹر کے پیچھے کونے میں فرش پر بیٹھا کاغذ پر اپنی تازہ غزل لکھ رہا تھا۔ مجھ سے باتیں کرتے ہوئے اس نے بتایا کہ پبلشر کیلئے دن میں دو تین غزلیں لکھ کر دے دیتا ہوں جس کا فی غزل پانچ روپے معاوضہ مل جاتا ہے جو میرے روزانہ کے خرچ کیلئے بہت ہوتا ہے۔ ریڈیو سٹیشن پر ایک بار آج کے نامور گلوکار حسین بخش نے مجھے کہا کہ ریڈیو والوں نے مجھے ابھی تک بی کلاس میں رکھا ہے۔ میری خواہش ہے کہ مجھے اے کلاس کا درجہ دیا جائے۔

کل مولانا کوثر نیازی جو وزیر اطلاعات و نشریات ہیں ان کے اعزاز میں میوزک کا ایک فنکشن ہے اس میں مجھے بھی گانے کے لئے بلایا گیا ہے۔ میں نے اس فنکشن میں گانے کے لئے ساغر صدیقی کی ایک غزل منتخب کی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے۔ حسین بخش نے مجھے ساغر صدیقی کی غزل گنگنا کر سنائی۔ پھر کہنے لگا کہ ریڈیو سٹیشن کے میوزک کے پروگرام پروڈیوسر بھی وہاں ہوں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ مجھے اے کلاس کے آرٹسٹ کا درجہ دیا جائے۔ میں نے کہا ''تم یہ غزل وہاں گاؤ'' تمہیں ضرور اے کلاس کا درجہ مل جائے گا۔ ایک تو ساغر صدیقی کی غزل بڑی اچھی ہے دوسرے تم نے طرز بھی بڑی اثر کرنے والی بنائی ہے۔ اتفاق سے اس فنکشن میں' میں موجود تھا اور میری ساتھ والی سیٹ پر ریڈیو سٹیشن کا سینئر میوزک پروڈیوسر بھی موجود تھا۔ حسین بخش استاد گویا تھا۔ اس نے ساغر صدیقی کی غزل کچھ اس پر درد لہجے میں' کمال فن کے ساتھ گائی کہ مولانا کوثر نیازی اور میوزک کے سینئر پروڈیوسر صاحب بھی جھوم اٹھے۔ اس کے بعد انہوں نے حسین بخش کو اے کلاس کا درجہ دے دیا۔ ساغر صدیقی کی ہمیشہ زندہ رہنے والی غزل یہ تھی۔

ہے دعا یاد مگر حرف دعا یاد نہیں

افسوس کہ مجھے پوری غزل یاد نہیں ہے۔ اس شعر پر تو سامعین پر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی۔

میں نے پلکوں سے در یار پہ دستک دی ہے
میں وہ سائل ہوں جسے کوئی صدا یاد نہیں

خدا کرے کہ یہ شعر میں نے غلط نہ لکھ دیا ہو۔

☆......☆......☆

راجہ مہدی علی خاں

راجہ مہدی علی خان کی طنزیہ نظموں سے میں بڑا متاثر تھا۔ سکول کے زمانے میں ہی ہم دوست ان کی نظم ''ایک چہلم کے موقع پر'' ہنس ہنس کر پڑھا کرتے تھے۔ اس نظم میں عورتیں کسی مرحوم کے چہلم پر جمع ہیں۔ کھانا کھاتے ہوئے ڈالڈے کے گھی کی شکایت بھی کر رہی ہیں اور ساتھ ساتھ مرنے والے کی خوبیاں بھی گنوا رہی ہیں۔ ہمارے معاشرے کی بڑی سچی تصویر تھی اور انتہائی طنزیہ انداز میں پیش کی گئی تھی۔

میری بڑی آپا دلی تیس ہزاری میں رہتی تھیں۔ میں نے نویں جماعت کا امتحان جوں توں کر کے پاس کیا تو جس لڑکی سے میں محبت کرتا تھا اس کی شادی ہو گئی۔ میں دیوداس بن گیا اور سفر پر نکل کھڑا ہوا' کیونکہ دیوداس نے بھی پاروتی کی شادی کے بعد ریل گاڑیوں میں آوارہ گردی شروع کر دی تھی۔ ''دیوداس'' فلم میں مجھے وہ منظر بے حد پسند تھا جس میں دکھاتے ہیں کہ دیوداس ریل کے ڈبے میں بیٹھا اداس نظروں سے کھڑکی سے باہر دیکھ رہا ہے اور سٹیشن پر سٹیشن گزرتے جا رہے ہیں۔ دلی' الہ آباد' جھانسی' بھوپال' گوالیار' بنارس' متھرا۔

پس میرے اندر کا بھی دیوداس بیدار ہو گیا اور میں بمبئی جانے کے لئے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ چپکے سے امرتسر کے سٹیشن پر پہنچا اور فرنٹیئر میل کے ایک ڈبہ میں چھپ کر بیٹھ گیا تاکہ شہر کے لوگ مجھے دیکھ کر گھر جا کر مخبری نہ کر دیں۔ میں سیدھا دلی بڑی آپا کے پاس پہنچا۔ وہ مجھ سے بے حد پیار کرتی تھی۔ یہ جان کر بھی کہ میں گھر اطلاع دیئے بغیر بھاگ آیا ہوں اس نے میری سرزنش نہ کی۔ ہاں گھر ضرور خط لکھ دیا۔

جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ ہندوستان کا محکمہ جنگ پوری طرح حرکت میں آ

چکا تھا۔ فیض صاحب اور چراغ حسن حسرت صاحب کو بھی کمیشن مل چکا تھا۔ آپا کے شوہر کیپٹن ممتاز ملک آل انڈیا ریڈیو دلی پر کام کیا کرتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ ''فوجی اخبار'' کے نائب مدیر بھی تھے۔ وہ تیس ہزاری میں مقیم تھے۔ یہ جگہ بھی بڑی تاریخی جگہ تھی۔ این ٹائپ کوارٹروں کی ایک قطار چلی گئی تھی۔ ہمارے ساتھ والے کوارٹر میں کرشن چندر رہتے تھے۔ اس سے آگے اوپندر ناتھ اشک' آگے سعادت حسن منٹو اور اس سے آگے ن م راشد کا کوارٹر تھا۔ یہ سب لوگ آل انڈیا ریڈیو سے منسلک تھے۔

جب میں وہاں پہنچا تو یہ خبر گرم تھی کہ راجہ مہدی علی خاں بھی آ رہے ہیں اور وہ ہمارے کوارٹر میں ہی رہیں گے۔ ان کے لیے بھائی جان نے برآمدے کے ساتھ والا کمرہ خالی کر رکھا تھا۔ دوسرے ادیبوں کو دیکھنے کا تو وہاں اکثر موقع ملتا تھا۔ شام کو اوپندر ناتھ اشک کے بے ہنگم قہقہے اکثر گونجا کرتے۔ اشک نے وہاں آ کر دوسری شادی کر لی تھی۔ اس کی دوسری بیوی کا نام کوشلیا تھا۔ ناٹے قد کی بڑی سکھڑ بی بی تھی۔ میری آپا کو وہ ہندی پڑھایا کرتی تھی۔ کسی دفتر میں ملازم تھی اور اشک اسے سائیکل پر دفتر چھوڑنے جایا کرتا تھا۔ اوپندر ناتھ اشک کی کوشلیا سے شادی میرے وہاں پہنچنے سے کوئی دو ایک مہینے پہلے ہوئی تھی۔ اس شادی کے قصے کو اشک نے اپنے ایک افسانے میں بھی بیان کیا ہے۔ غالباً جس کا نام ''کوارٹر نمبر سات'' تھا۔

تیس ہزاری میں ملک کے چوٹی کے ادیبوں کا ایک جگہ جمع ہو جانا ایک انوکھی اور تاریخی بات تھی۔ ہمارے کوارٹر کے بالکل سامنے بھیروں جی کا مندر تھا۔ اس مندر میں صبح و شام ہندو عورتیں اور بوڑھے پوجا کرنے آیا کرتے۔ منہ اندھیرے گھنٹیوں کی مترنم آوازیں سنائی دینے لگتی تھیں۔ کرشن چندر کا ایک افسانہ ''بھیروں کا مندر'' ہے وہ اسی زمانے کی یادگار ہے اور ان کوارٹروں کے رہنے والوں کے بارے میں لکھا گیا ہے۔

اوپندر ناتھ اشک بڑا کنجوس تھا۔ اس کی کنجوسی کے قصے تمام کوارٹروں میں مشہور تھے۔ منٹو اور راجہ مہدی علی خان اسے آڑے ہاتھوں لیا کرتے تھے۔ اشک کی کالی بلی کا واقعہ میں آگے چل کر سناؤں گا لیکن اشک شگفتہ مزاج تھا اور اس کے قہقہوں میں بڑی زندگی ہوا کرتی تھی۔

آخر ایک روز مہدی علی خان تشریف لے آئے۔ گول مٹول' گٹھا سا آدمی۔

جس کی گردن کافی موٹی تھی۔ پہلی بار دیکھنے پر وہ مجھے ایک پہلوان لگا۔ بھائی جان نے میرا تعارف کروایا تو اس نے میرے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔

"ہور سناؤ پہلوان جی؟"

حالانکہ پہلوان وہ خود معلوم ہوتا تھا۔ دلی میں آتے ہی مہدی علی خان نے ایک نئی سائیکل خریدی۔ اس پر بیٹھ کر وہ آل انڈیا ریڈیو نوکری پر جایا کرتا تھا۔ رات کو یہ سائیکل اس کے کمرے میں پڑی رہتی۔ چونکہ وہ ہمارے کوارٹر کا کمرہ تھا اس لئے اس پر اپنا حق جماتے ہوئے میں وہ سائیکل لے کر شام کو نکل جاتا اور دلی کی سڑکوں پر گشت کیا کرتا۔ ویسے بھی راجہ مہدی علی خان مجھ سے بڑی شفقت سے پیش آتے۔

ایک روز انہوں نے میرے کان میں کہا۔

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ ریڈیو سٹیشن کے ساتھ جو میڈن ہوٹل ہے اس کے باہر ایک انگریز میم پان سگریٹ بیچتی ہے۔"

میں ادھر سے کئی بار گزرا تھا مگر میں نے ایسی انگریز عورت کہیں بھی نہیں دیکھی تھی۔ جب میں نے کہا کہ وہاں تو مجھے کبھی کوئی انگریز عورت پان سگریٹ بیچتی نظر نہیں آئی تو بولے۔

"ارے پہلوان! وہ ابھی ابھی انگلینڈ سے آئی ہے۔ آؤ تمہیں دکھاتا ہوں۔"

پھر وہ مجھے سائیکل پر بٹھا کر تیس ہزاری سے آل انڈیا ریڈیو کی طرف روانہ ہوئے۔ ریڈیو سٹیشن کے قریب پہنچ کر وہ سائیکل سے اتر پڑے اور فٹ پاتھ پر پیدل چل پڑے۔ میں ان کے ساتھ ساتھ تھا۔ سامنے میڈن ہوٹل کی عمارت تھی۔ ایک جگہ کھڑے ہو کر بولے۔

"وہ دیکھو۔"

میں نے دیکھا وہاں فٹ پاتھ پر ایک کالی کلوٹی مدراسی عورت سامنے سگریٹوں کے پیکٹ اور ماچس رکھے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ وہ بہت ہی کالی تھی۔ راجہ مہدی زور سے قہقہہ لگا کر کہنے لگا۔

"کیوں ہے ناں انگریز عورت۔"

راجہ مہدی علی خان، اوپندر ناتھ اشک کو بہت تنگ کیا کرتے تھے۔ ایک روز

انہوں نے زبردستی اشک سے چائے کی دعوت کی منظوری لے لی۔ سارے ادیب اوپندر ناتھ اشک کے دیوان خانے میں جمع تھے۔ زمین پر دری بچھی تھی۔ دیوار کے ساتھ ایک پرانا صوفہ سیٹ لگا تھا۔ دیوار پر کوشلیا باجی کے دوپٹے اور ایک ساڑھی لٹک رہی تھی۔

منٹو نے ان کپڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اوپندر ناتھ اشک! کالی شلوار کہاں ہے؟"

کرشن چندر نے کہا۔

"اصل میں اشک ان کپڑوں سے یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ بھابی کوشلیا کپڑے بھی پہنتی ہے۔"

راشد صاحب بولے۔

"چاہے کچھ ہو ہم ساڑھی کے کلر کی ضرور تعریف کریں گے۔ بڑا فنٹاسٹک کلر ہے۔"

اوپندر ناتھ اشک چائے بنا رہا تھا خوش ہو کر بولا۔

"راشد صاحب! یہ ساڑھی میرے ایک بڑے عزیز دوست نے بنارس سے تحفے کے طور پر بھیجی ہے۔"

راجہ مہدی نے کہا۔

"بیوی کا تحفہ تم نے کہاں سے وصول کیا؟"

اشک کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ ٹرے میں رکھی چائے کی پیالی کانپنے لگی۔ وہ چائے میں دودھ ڈالنے لگا تو راجہ مہدی علی خاں نے کہا۔

"آپ حضرات کو معلوم ہے اشک دودھ کہاں سے حاصل کرتا ہے؟"

منٹو نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے مگر میں بتاؤں گا نہیں۔ اگرچہ اس میں کچھ پردہ نشینوں کے نام نہیں آتے۔"

اشک بولا۔

"منٹو خبردار! خبردار!"

راشد صاحب نے کہا۔

"بھئی جس گوالے سے ہم دودھ لیتے ہیں' اشک بھی اسی گوالے سے دودھ لیتا ہے۔"

راجہ مہدی علی خان نے کہا۔

"نہیں راشد صاحب! ایسا نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ اشک نے ایک کالی بلی پال رکھی ہے۔ صبح صبح یہ اس بلی کو چھوڑ دیتا ہے۔ وہ بلی ہمسائے کے کوارٹروں میں جا کر خوب دودھ پی کر واپس آ جاتی ہے پھر اشک اس بلی کو نچوڑ کر اپنے لئے دودھ حاصل کر لیتا ہے۔ تو جناب یہ بلی کا دودھ پی رہے ہیں آپ اس چائے میں۔"

اوپندر ناتھ اشک نے مہدی علی خان کے سر پر زور سے دھپ مار کر کہا۔

"اوئے راجیا! تو باز نہیں آئے گا۔"

اوپندر ناتھ اشک کا لہجہ ہوشیار پوری اور جالندھری تھا۔ ایک شام آپا اور کوشلیا سیر کرنے تمیں ہزاری سے نکل کر ایک بڑی سڑک پر چلی جا رہی تھیں۔ میں راجہ مہدی علی خان کا سائیکل لئے ان کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

کوشلیا نے کہا۔

"سرور آپا پان تو ہم گھر پر ہی چھوڑ آئے۔"

آپا کے پاس اپنا پاندان تھا اور وہ خاص طور پر بنارس سے خوشبودار قوام منگوایا کرتی تھیں جس میں تمباکو کا شیرہ نہیں ہوتا تھا لیکن اس کی خوشبو سارے گھر کو مہکا دیتی تھی۔ ارے واہ سبحان اللہ! کہاں گئیں وہ بنارس کی خوشبوئیں۔

کم بخت کیا یاد آ گیا۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ آپا سرور نے دو پان لگا کر کانسی کے ٹرے میں نعمت خانے کے اوپر رکھے تھے کہ سیر کو جاتے ہوئے کھا لیں گے مگر وہ بھول گئیں۔ اب کوشلیا بھابی کو پان یاد آئے تو آپا نے مجھے کہا۔

"حمید! جا کر جلدی سے پان اٹھا لاؤ۔ نعمت خانے کے اوپر رکھے ہیں۔"

میں ایسے کاموں کے لئے ہر وقت تیار رہتا تھا کہ جس میں کچھ ایڈونچر دکھانے کا موقع ملے۔ پیڈل پر پاؤں رکھ کر اچھل کر سائیکل پر سوار ہوا اور مچھلی کی طرح دائیں بائیں لہرا لہرا کر سائیکل کی سپیڈ ایک دم تیز کر دی اور تھوڑی ہی دیر بعد تمیں ہزاری کی

طرف اڑا جا رہا تھا۔ راجہ مہدی علی خان کا نیا سائیکل تھا' کم بخت ویسے ہی ہوا سے باتیں کیا کرتا تھا۔

گھر پہنچا تو برآمدے میں راجہ مہدی علی خان کھڑے تھے۔ مجھے دیکھ کر کہا۔

"اچھا پہلوان! یہ تم روز شام کو میری سائیکل لے جاتے ہو اس کا کرایہ کون دے گا؟"

میں نے کہا۔

"بھائی جان دیں گے۔"

راجہ صاحب ہنس پڑے۔ پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"پہلوان ناراض کیوں ہو گئے۔ ارے تم تو میرے سب سے ننھے بھائی ہو۔ چلو میں تمہارے ساتھ سیر کروں گا۔"

میں نے کہا۔

"میں تو آپا اور کوشلیا بھابی کے لیے پان لینے آیا ہوں۔"

"ارے ہاں یاد آیا۔ وہ دونوں پان تو میں کھا گیا۔ ان کی خوشبو مجھے نعمت خانے کی طرف لے گئی تھی۔ آپا سے ہزار بار کہا ہے کہ اپنے پان کو کھلا نہ رکھا کریں۔ کم بخت کی خوشبو سارے گھر میں پھیلی ہوتی ہے۔"

میں نے کہا۔

"اب کیا کریں مجھے تو پان لے کر ابھی جانا ہے۔"

راجہ مہدی علی خان نے اپنی موٹی گردن کو گھمانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ارے پھر کیا ہوا۔ چلو دو پان خود لگا کر لے جاتے ہیں۔"

نعمت خانے کے پاس کھڑے ہو کر راجہ مہدی علی خان نے اپنی کلیجے ایسی پھولی ہوئی ہتھیلی پر پان رکھ کر ان پر چونا کتھا لگایا۔ چھالیا ڈالیں پھر خوشبو ڈالی تو آنکھیں بند کر کے ایک لمبا سانس لیا اور بولے۔

"اخاہ! شام اودھ کی خوشبو آ گئی۔"

دونوں پان الگ الگ کاغذ میں لپیٹ کر ہم کوارٹر سے باہر آئے۔

"آؤ میں تمہیں لے چلتا ہوں۔"

مگر میں تو کوشلیا بھابی کے سامنے ہیرو بننا چاہتا تھا اور اکیلا سائیکل تیزی سے لے جا کر ان کے پاس ایک دم سے بریک لگا کر رک جانا چاہتا تھا۔

میں نے کہا۔

''نہیں بھائی جان! میں خود لے جاتا ہوں پان' آپ یہیں پر ٹھہر جائیں۔''

''اچھا پہلوان! مگر خدا کے لئے سائیکل کی بریک آہستہ لگانا اور پیڈل بھی ذرا دیکھ کر چلانا۔''

میں نے پان جیب میں رکھے چونکہ راجہ مہدی علی خان دیکھ رہے تھے اس لئے بڑے آرام سے بوڑھے آدمیوں کی طرح سائیکل پر سوار ہوا۔ جونہی تیس ہزاری سے نکل کر بڑی سڑک پر نیم کے درختوں تلے آیا زور سے ایک جھکولا کھایا اور سٹنٹ فلموں کے ہیروؤں کی طرح تیز تیز سائیکل چلانے لگا۔ کبھی گدی چھوڑ کر زور زور سے پیڈل چلاتا۔ کبھی اپنا سارا بوجھ ہینڈل پر ڈال کر آگے جھک جاتا۔ آخر مجھے آپا سرور اور کوشلیا نظر آ گئیں۔

میں نے بڑی رفتار پر کوشلیا کے پاس جا کر سائیکل کو ایک دم بریک لگا دی۔ چیں کی آواز سے کوشلیا بھابی ڈر گئیں۔ میں یہی چاہتا تھا سینہ پھلا کر انہیں پان پیش کئے۔

کوشلیا بھابی نے کہا۔

''ارے تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔''

میں ان کے اس ریمارکس پر بڑا خوش ہوا۔

آپا کہنے لگیں۔

''تم نے اتنی دیر کیوں کر دی۔''

پھر پان کھول کر انہیں دیکھتے ہوئے بولیں۔

''یہ پان میرے ہاتھ کے لگے ہوئے نہیں ہیں۔ کیا تم نے لگائے ہیں۔ میرے والے پان کہاں تھے؟''

میں نے انہیں ساری بات بیان کر دی تو مسکرا کر بولیں۔

''راجہ مہدی علی خان' پان نہیں چھوڑ سکتا۔''

میں کوشلیا بھابی کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ میرا سانس جو تھوڑی دیر پہلے پھولا ہوا تھا اب کچھ کچھ ٹھیک ہو رہا تھا۔ کوشلیا بھابی نے میری طرف دیکھ کر آپا سے کہا۔

''آپا! تمہارا چھوٹا بھائی بہادر لڑکا ہے۔''

اور پھر کھلکھلا کر ہنس دیں۔ میں سمجھ نہ سکا کہ اس سے کوشلیا بھابی کا کیا مقصد تھا۔ چھوٹی عمر تھی بڑی کہانیاں سامنے تھیں۔ میں کیا خاک سمجھ سکتا مگر اتنا ضرور تھا کہ کوشلیا بھابی کے اس ریمارکس پر میں پھولا نہ سمایا تھا۔ کوشلیا بھابی کی شگفتہ مزاجی نے میرے اندر کی دیوداسیت تقریباً ختم کر دی تھی۔ دوسری طرف راجہ مہدی علی خان کی لطیفہ گوئی اور دلچسپ فقرہ بازی نے بھی مجھے اس لڑکی سے غافل کر دیا تھا۔ جس کی شادی کی خبر سن کر میں دیوداس بنا گھر سے نکلا تھا۔ میں نے بمبئی جانے کا سفر بھی ملتوی کر دیا تھا۔

لیکن ایک روز میں نے آپا کی زبانی سنا کہ میری پاروتی بھی دلی آ گئی ہے۔ میں اس کو دلہن کے روپ میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ پس میں نے بمبئی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک روز میں صبح صبح تیس ہزاری سے دلی ریلوے سٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں نے سب پتہ کر لیا تھا کہ بمبئی کو کونسی گاڑی جاتی ہے اور کس وقت دلی سے روانہ ہوتی ہے۔ میں جب ریلوے سٹیشن پہنچا تو پل کے پار ایک پلیٹ فارم پر بمبئی ایکسپریس تیار کھڑی تھی۔ تھرڈ کلاس کا ٹکٹ میرے پاس تھا۔ ایک اٹیچی کیس میں ایک جوڑا پتلون قمیص اور برش وغیرہ رکھا تھا۔ کچھ روپے تھے جو میں نے آتے ہی آپا کے پاس رکھوا دیئے تھے۔

آپا کو معلوم تھا کہ میں بمبئی جا رہا ہوں۔ انہوں نے مجھے بہت روکا بھی کہ اتنا لمبا سفر کیسے طے کرو گے اور پھر اجنبی شہر میں کہاں دربدر ہو گے مگر میں تو ایک بار پھر دیوداس بن چکا تھا۔ اب میرے اٹھے ہوئے قدم پیچھے نہیں ہٹ سکتے تھے۔ میں ریل میں سوار ہو گیا۔ گاڑی مسافروں سے اتنی بھری ہوئی نہ تھی۔ تھرڈ کلاس کے ایک ڈبہ میں بڑے آرام سے جگہ مل گئی۔ افراتفری کا زمانہ ابھی نہیں آیا تھا۔ ابھی لوگ بڑے آرام سے ریل میں بیٹھ کر سگریٹ پیا کرتے تھے۔ میں نے بھی پلیٹ فارم سے پلیئرز میڈیم کا ایک ڈبہ خرید لیا تھا۔

سگریٹ سلگا کر کھڑکی سے باہر ریلوے یارڈ میں شنٹ کرتے انجن کو تکنے

لگا۔ گارڈ نے سیٹی دی۔ انجن نے وسل دیا اور ایک ہلکے سے دھچکے کے ساتھ گاڑی پلیٹ فارم پر رینگنے لگی۔ اب میرے ذہن میں سوائے اس لڑکی کے تصور کے اور کچھ نہیں تھا جس کی شادی میرے ساتھ نہ ہو سکی تھی اور جو اپنے شوہر کے ساتھ دہلی آ رہی تھی یا آ چکی تھی۔

بمبئے ایکسپریس نئی دلی کے سٹیشن پر رک گئی۔ وہاں سے چلی تو نظام الدین کے سٹیشن پر رکی۔ پھر چل سو چل۔ متھرا کا سٹیشن آیا تو میں نے پلیٹ فارم پر اتر کر چائے پی۔ سگریٹ سلگایا اور یونہی پلیٹ فارم پر گھومنے لگا۔ متھرا کے بعد راجہ کی منڈی اور پھر آگرہ کینٹ آ گیا۔ گوالیار پہنچ کر میں نے کھانا کھایا۔

جھانسی آیا تو رانی آف جھانسی بہت یاد آئی جس نے انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی میں بھرپور کردار ادا کیا اور اپنے بیٹے کو تاج و تخت دلوانے کے لالچ میں اپنے عظیم مشن سے منہ موڑ لیا اور انسانی کمزوریوں کا شکار ہو گئی۔

رات کو جا کر کہیں بھوپال کا سٹیشن آیا۔ میں ہر سٹیشن پر پلیٹ فارم پر اتر کر سیر ضرور کرتا۔ سامان تو میرے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ جس کی مجھے فکر ہوتی۔ اٹارسی پہنچے تو پو پھٹ رہی تھی۔ کھنڈوا پہنچ کر دوپہر کا کھانا کھایا۔ بھوساول پھر رات ہو گئی تھی۔ جل گاؤں گاڑی رکی تو میں نے آدھی رات کو تھوڑا کھانا کھایا۔ چائے پی اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

دن کو آنکھ کھلی تو بمبئے ایکسپریس ناسک کے ریلوے سٹیشن پر رکی ہوئی تھی۔
اس کے بعد دیولالی اور الگیت پوری آ گیا۔ یہاں ریل کے پیچھے بھی بجلی کا انجن لگ گیا۔ یہاں سے بجلی کی ریلوے شروع ہو جاتی تھی اور چڑھائی بھی بہت زیادہ تھی۔ پھر کلیان اور داور کے لوکل سٹیشنوں سے ہو کر ریل بمبئی کے عظیم الشان ریلوے سٹیشن میں داخل ہو گئی۔ وہاں کس طرح دن گزارے؟ کہاں رہا؟ کیسے کیسے ایڈونچر اور تجربے ہوئے؟ یہ ایک الگ داستان ہے۔ بہرحال کوئی دو مہینے بمبئی شہر کی سڑکوں کی خاک چھاننے کے بعد میں ایک روز وہاں سے واپس دلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ ریل گاڑی نئی دلی کے ریلوے سٹیشن پر کھڑی ہوئی تو میں اتر گیا۔ یہاں سے میں پیدل تیس ہزاری جانا چاہتا تھا۔ مجھے راستہ آتا تھا۔ تیس ہزاری کے اوپر والے چھوٹے ٹیلوں سے نکل

کر کوارٹروں کی ڈھلان اتر رہا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے سے رابعہ مہدی علی خان سائیکل لیے چلے آ رہے ہیں۔ وہ دفتر جا رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر کچھ تعجب سے بولے۔

''ارے پہلوان! تم آ گئے؟''

میں نے کہا۔ ''جی ہاں۔''

''تم تو بمبئی ایکٹر بننے گئے تھے۔ کہو کس فلم میں کام ملا؟''

رابعہ مہدی علی خان کی یہ بات مجھے سخت ناگوار لگی۔ انہوں نے پیار سے میرے سر پر کچھ اس طرح سے ہاتھ پھیرا کہ میرے بال بکھر گئے۔ یہ بات بھی مجھے بڑی ناگوار گزری۔

میں نے پوچھا۔ ''آپا گھر پر ہیں ناں۔''

رابعہ مہدی علی خان نے خوش ہو کر کہا۔

''گھر پر ہی ہیں۔ چلو تمہاری خبر لیتی ہیں۔ دو تین خط آ چکے ہیں تمہاری امی کے۔''

میں کچھ گھبرا گیا کہ کہیں گھر سے کوئی نہ آ جائے پھر میرا وہاں رہنا بڑا محال تھا۔ آپا نے مجھے گلے لگا لیا اور ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''کیا حال بنا رکھا ہے تم نے اپنا۔''

پھر انہوں نے مجھے نہا دھو کر نئے کپڑے پہننے کو کہا۔ اپنے پاس بٹھا کر کھانا کھلایا۔ چائے بنا کر دی۔ بمبئی کی باتیں سنیں اور گھر سے جو خط آئے تھے ان کے بارے میں بتایا۔ میں ابھی واپس گھر نہیں جانا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے اس فیصلے سے آپا کو آگاہ کر دیا اور کہا۔

''آپا! اگر تم نے مجھے گھر جانے پر مجبور کیا تو میں اس بار اکیلا ہی کلکتے کی طرف نکل جاؤں گا۔''

آپا نے میری بلائیں لیتے ہوئے کہا۔

''نہیں، نہیں، تم بیشک میرے پاس رہو۔ میں نے آپو جی کو لکھ دیا ہے کہ حمید نے یہاں دسویں کلاس میں داخلہ لے لیا ہے۔''

بیچاری بہنیں کس کس طرح اپنے بھائیوں کا خیال رکھا کرتی ہیں۔ میں بڑا

خوش ہوا۔ پھر میں نے دبی زبان میں اس لڑکی کے بارے میں پوچھا جس کی دلی میں آمد کی وجہ سے میں دلی کا تاج وتخت چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ آپا نے بتایا کہ وہ لوگ کچھ روز دلی میں رہ کر واپس چلے گئے تھے۔ میں نے خدا کا شکرہ ادا کیا کہ بلا ٹل گئی۔

ان ہی دنوں راجہ مہدی علی خان کی شادی کی بات چیت شروع ہو گئی۔ مہدی علی خان کو آپا پر بڑا اعتماد تھا۔ ایک روز آپا سے کہنے لگا۔

''آپا تم نے میری شادی کی بات تو شروع کر دی ہے مگر ذرا غور کرو کہ میری اس سور ایسی موٹی گردن کے ہوتے ہوئے کون لڑکی مجھ سے شادی کرے گی؟''

بھائی جان نے کہا۔

''تو اس سور کی گردن کو کچھ گھٹاؤ نا؟''

''وہ کس طرح گھٹاؤں بھائی جان! جگر کا خون دے دے کر یہ گردن میں نے پالی ہے۔''

لیکن اسی روز راجہ مہدی علی خان نے صبح کی سیر اور ورزش شروع کر دی۔ مجھے بچپن ہی سے صبح کی سیر کی عادت تھی۔ میں بالکل چھوٹا سا تھا کہ والد صاحب مجھے ساتھ لے کر اکھاڑے جایا کرتے تھے۔ میرے بدن کی مالش کرتے۔ میرے ساتھ اکھاڑے میں کشتی لڑتے پھر نہر پر جا کر صابن مل مل کر نہلاتے اور تولیے سے میرا جسم پونچھ کر کہا کرتے۔

''بس ایک دم شیر بن جا پترا۔ تجھے ایک روز کیکر سنگھ پہلوان سے کشتی لڑنی ہے۔''

چنانچہ مجھے صبح کی سیر کی عادت پڑ گئی اور ویسے بھی میں صبح کی تازہ ہوا میں ستاروں کی جھلملاہٹ اور پھولوں کی خوشبوئیں محسوس کرنا چاہتا تھا۔ گھاس پتوں کی مہک اور صبح کے وقت چڑیوں کا چہچہانا اور سورج کا طلوع ہونا مجھے مسحور کر دیا کرتا۔

اب راجہ مہدی علی خان نے میری سیر کا بھی چارج سنبھال لیا۔

''پہلوان! کل سے تم میرے انڈر سیر کیا کرو گے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

راجہ صاحب نے بڑی نرمی سے جواب دیا۔

''ارے میاں! مطلب یہ ہے کہ میں بھی تمہارے ساتھ سیر کرنے جایا کروں گا۔ تم نے سنا نہیں بھائی جان کیا کہہ رہے تھے؟ مجھے اس موٹی گردن کو اور موٹے پیٹ کو ہلکا کرنا ہے۔''

اب صبح صبح راجہ صاحب مجھے ساتھ لے کر تیس ہزاری سے ذرا فاصلے پر باغ میں سیر کے لئے آ جاتے۔ یہاں آم اور نیم کے بڑے گھنے درخت تھے اور صبح کے وقت ہوا بے حد تروتازہ ہوتی تھی۔ راجہ صاحب درختوں کے نیچے کھڑے ہو کر ڈرل ماسٹر کی طرح کبھی دونوں بازو پھیلاتے' کبھی سر پیچھے جھکاتے اور کبھی پاؤں پر اچھلنا شروع کر دیتے۔ ذرا سی اچھل کود سے ان کا سانس پھول جاتا کیونکہ جسم موٹا تھا۔ وہ گھاس پر پتھلا مار کر بیٹھ جاتے اور ہانپنے لگتے۔

''پہلوان! پہلوان! سانس' سانس چڑھ گیا ہے۔''

میں انہیں کہتا۔

''بھائی جان! آپ تھوڑی تھوڑی ورزش کیا کریں۔''

''ہاں یار! میں تو گردن پتلی کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے تو صرف گردن کی ورزش کرنی چاہئے۔ اچھا گردن پتلی کرنے کی کیا ورزش ہو سکتی ہے؟ تم تو پہلوانوں کے خاندان سے ہو۔ بتاؤ نا کوئی اچھی سی ورزش۔''

میں نے کہا۔

''میرا خیال ہے آپ گردن کو دائیں بائیں پھیرا کریں۔''

''ہاں یار! یہ ٹھیک ہے۔''

پھر انہوں نے گردن کو دائیں بائیں چلانا شروع کر دیا مگر گردن اتنی موٹی تھی کہ آسانی سے چلتی نہیں تھی۔ ذرا سا بائیں کو مڑتی تو پھر اپنی اصلی جگہ پر آ جاتی۔ بڑی مشکل سے راجہ صاحب اسے ایک طرف گھماتے۔ ایسا کرتے ہوئے ان کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں باہر کو نکلنے لگتی تھیں۔ وہ سر جھٹک کر بول اٹھتے۔

''نہیں بھائی! یہ کام مجھ سے نہ ہو گا۔ میں اپنی گردن کا منکا نہیں تڑوانا چاہتا۔''

گھر آ کر انہوں نے آپا سے صاف صاف کہہ دیا۔

"آپا! اگر لڑکی کو میری سور ایسی گردن قبول ہے تو شادی کر لے نہیں تو بیشک انکار کر دے۔"

آپا نے پوچھا۔

"کیوں کیا ہو گیا ہے اب؟"

"آپا! میں گردن کا منکا نہیں تڑوانا چاہتا۔ کیا لڑکی میری لاش سے بیاہ کرنا چاہتی ہے۔"

بھائی جان نے یہ بات راشد صاحب کو بتا دی کہ راجہ مہدی علی خان کی گردن نے مڑنے سے انکار کر دیا ہے۔ انہوں نے یہ بات کرشن چندر اور منٹو کو بھی بتا دی۔ بس پھر کیا تھا۔ راجہ کی گردن کا ہر کوئی مذاق اڑانے لگا۔ اشک نے تو دو چار شعر بھی بنا ڈالے

راجہ کی گردن   بھینسے کی گردن
بھینسے کی گردن   راجہ کی گردن
گینڈے کی گردن   راجہ کی گردن
گردن کی گردن   راجہ کی گردن

لیکن اس گردن کے باوجود راجہ مہدی علی خان کی شادی ہو گئی۔ میں ان دنوں دلی میں نہیں تھا۔ میری راجہ صاحب سے کافی دیر بعد ملاقات ہوئی۔ میں ایف اے کی سٹڈی ادھوری چھوڑ کر بڑی آپا ہی کے ساتھ رنگون جا رہا تھا کہ راستے میں انہوں نے ن م راشد کے ہاں قیام کیا۔

راشد صاحب ان دنوں تیس ہزاری سے اٹھ آئے تھے اور ایک کشادہ باغ والی کوٹھی میں مقیم تھے۔ راشد صاحب نے مجھے دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا۔

"اوئے پہلوان! تم تو بڑے ہو گئے ہو۔"

دوسری جنگ عظیم ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ جنوب مشرقی ایشیا میں جاپان کی یلغار بھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ ہندوستان میں جاپان کی بڑھتی ہوئی فتوحات کے بعد کافی بے چینی پائی جاتی تھی۔ فوجوں کی نقل و حرکت پورے عروج پر تھی۔

دلی ریڈیو سٹیشن سے کافی ادیب بمبئی جا چکے تھے۔ راجہ مہدی علی خان بھی

پر تول رہے تھے۔ بعد میں وہ بھی بمبئی کی فلم انڈسٹری میں چلے گئے تھے۔ وہ آپا سے ملنے راشد صاحب کی کوٹھی پر آئے۔ ان کی بیگم بھی ان کے ساتھ تھیں۔ انہوں نے بیگم سے میرا یوں تعارف کروایا۔

"یہ ہے حمیدا پہلوان آف امرتسر! اس نے مجھے گردن پتلی کرنے کی ورزش بتائی تھی۔"

ان کی بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن آپ نے تو اس پر عمل نہ کیا۔"

راجہ صاحب جھٹ بولے۔

"بیگم! اگر اس پر عمل کرتا تو آج تمہارے سامنے زندہ نہ ہوتا۔"

بھابی بڑی شفقت سے پیش آئیں۔ بڑی خوش اخلاق اور خوش لباس تھیں۔ وہ آپا کے ساتھ کمرے میں باتوں میں مشغول ہو گئیں اور راجہ مہدی علی خان میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

"یار! تم تو پورے پہلوان بن گئے ہو۔ رنگون کیا لینے جا رہے ہو۔ یہیں رک جاؤ۔ میں کیکر سنگھ پہلوان سے تمہارے دنگل کا انتظام کروا دوں گا۔"

میں کشتیوں اور دنگلوں کا ماحول چھوڑ کر امرتسر سے بھاگا تھا۔ میں نے کہا۔

"میں رنگون سیر کرنے جا رہا ہوں۔"

"ارے واہ میرے ابن بطوطہ! اتنی سی عمر میں کہاں کہاں کی سیر کرو گے۔ تم تو بمبئی بھی چھوٹی عمر میں بھاگ گئے تھے۔ یار ویسے مجھے بھی تمہاری طرح آوارہ گردی کرنے کا بڑا شوق ہے مگر کیا کروں بیوی کا طوق گلے میں پڑ گیا ہے۔ اچھا آؤ ریڈیو سٹیشن چلتے ہیں تمہیں بڑی شاندار چائے پلائیں گے اور ہاں۔"

وہ رک کر بولے۔

"اس انگریز عورت کا پان بھی کھلاؤں گا۔"

"کیا وہ ابھی تک زندہ ہے بھائی جان!"

"ہمارے ہاں غریب عورتیں بہت دیر زندہ رہتی ہیں۔"

سائیکل انہوں نے چھوڑ دی تھی۔ ہم بس میں سوار ہو کر آل انڈیا ریڈیو سٹیشن

پہنچے۔ میں نے راستے میں ان سے پوچھا۔

"سائیکل کہاں ہے آپ کی؟"

رابعہ مہدی علی خان نے ناک سکیڑ کر کہا۔

"میاں! سائیکل اب مجھے تنگ کرنے لگی تھی۔ میں آگے پیڈل مارتا تو وہ پیچھے کو جاتی، میں اسے پیچھے لے جاتا تو وہ آگے کو جانے کی ضد کرتی تھی۔ میں اسے روکتا تھا تو چل پڑتی تھی، چلتی تھی تو رکتی نہیں تھی۔ رات کو کمرے میں کھڑے کھڑے اپنے آپ گھر سے باہر نکل کھڑی ہوتی تھی۔"

انہوں نے سائیکل کے بارے میں اپنے مخصوص انداز میں بڑی دلچسپ باتیں شروع کر دیں۔ بس میں بیٹھی ہوئی دوسری سواریاں بھی بڑی محظوظ ہوئیں۔ دلی ریڈیو سٹیشن پہنچ کر وہ مجھے سیدھا کینٹین پر لے گئے۔ یہاں کچھ اور آرٹسٹ بھی بیٹھے تھے۔ رابعہ صاحب نے ان سے فقرے بازی شروع کر دی۔

میری طرف دیکھ کر کہا۔

"یہ پہلوان میرا بیٹا ہے اور پنجاب سے آیا ہے۔"

انہوں نے میرے لئے پیسٹری اور کباب منگوائے۔ خود بھی کھائے مجھے بھی کھلائے۔ پھر چائے بنا کر دی۔ اس دوران وہ ساتھیوں سے بھی ہنسی مذاق کرتے رہے۔ میں نے دیکھا کہ رابعہ صاحب پہلے سے کچھ زیادہ موٹے ہو گئے تھے۔ ہنستے وقت ان کی آنکھیں کچھ زیادہ اندر کو دھنس جاتی تھیں۔ ان کی آنکھوں کے گرد حلقے بھی نمودار ہو گئے تھے۔ توند پہلے سے زیادہ باہر کو نکل آئی تھی۔ دوپہر کا کھانا بھی انہوں نے مجھے ریڈیو سٹیشن پر اپنے ساتھ کھلایا۔

زیب نام کی ایک خوش شکل خاتون کا ان دنوں وہاں بڑا چرچا تھا۔ وہ مہدی علی خان کو سلام کر کے گزری تو انہوں نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"اس نے کھیس کا کوٹ پہن رکھا ہے۔ کہو تو تمہیں بھی ایک ایسا ہی کوٹ بنوا دیں؟"

ہم ایک ہفتے دلی ٹھہرے۔ اس کے بعد ہم رنگون جانے کے لئے کلکتے کی طرف روانہ ہو گئے۔ رابعہ مہدی علی خان سے میری آخری ملاقات دلی کے ریلوے سٹیشن

پر ہی ہوئی۔ وہ ہمیں الوداع کہنے راشد صاحب کے ساتھ ہی آئے ہوئے تھے۔ ٹرین نے سیٹی دی تو انہوں نے بھائی جان سے ہاتھ ملائے۔ میرے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"آپا! میرے حمیدا پہلوان کا خیال رکھنا۔"

اور ٹرین چل پڑی۔ رابعہ مہدی علی خان کی مسکراتی شکل میں کھڑکی میں سے سر باہر نکالے دیر تک تکتا رہا۔ ٹرین دلی چھوڑ کر آگے نکل چکی تھی مگر رابعہ صاحب کی مسکراتی صورت مجھے جب بھی نظر آ رہی تھی۔ وہ شکل آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔

اس کے بعد میں رابعہ مہدی علی خان کو نہ دیکھ سکا۔ وہ بمبئی چلے گئے۔ انہوں نے فلمی دنیا میں شرکت کر لی۔ پھر میں نے انہیں فلم "آٹھ دن" میں دیکھا۔ اس فلم میں رابعہ مہدی علی خان کے علاوہ اوپندر ناتھ اشک اور منٹو نے بھی کام کیا تھا۔ کہانی اور مکالمے سعادت حسن منٹو کے تھے پھر انہیں دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ بمبئی سے بھائی جان کو ان کے خط آتے تو کبھی کبھار میرا بھی ذکر کرتے۔ میں نے پاکستان بننے کے بعد کہانیاں لکھنی شروع کیں تو پھر انہوں نے آپا کو خط لکھا۔

"حمیدا پہلوان بڑی عمدہ کہانیاں لکھ رہا ہے۔ اسے بمبئی بھیج دو آپا!"

رابعہ مہدی علی خان نے مجھے رنگون جاتا دیکھ کر آپا سے کہا تھا کہ میرا خیال رکھے لیکن رابعہ مہدی علی خان اپنا خیال نہ رکھ سکے۔ ایک روز اخبار میں یہ اندوہناک خبر پڑھنی پڑی کہ رابعہ مہدی علی خان کا بمبئی میں انتقال ہو گیا۔ یقین نہیں آتا تھا۔ ان کی شکل سامنے آ گئی۔ کبھی ہنس رہے ہیں، کبھی میرے ساتھ سیر کرنے جا رہے ہیں، کبھی ورزش کر رہے ہیں اور گردن کو دائیں بائیں موڑنے کی کوشش میں کہہ رہے ہیں۔

"بھاڑ میں جائے ایسی ورزش۔"

ابراہیم جلیس

ابراہیم جلیس حیدر آباد دکن سے اپنے ساتھ ایک رپورتاژ بھی لایا۔ اس رپورتاژ میں ہندوستان کی سب سے بڑی مسلم ریاست کے ڈوبتے دل کی آخری دھڑکنیں تھیں۔ ہم سب دوستوں کو لاہور میں جلیس کا بڑا انتظار تھا۔ سقوط حیدر آباد دکن سے پہلے وہاں کے ریڈیو سٹیشن سے کبھی کبھی اس کی پرجوش آواز سن لیتے۔ اس آواز میں وہاں کے مسلمانوں کے حق میں خودارادیت کی للکار تھی۔ جلیس دکن کے مسلمانوں کی آزادی کے لئے برسرپیکار تھا۔ پھر دکن کی ریاست بھارت کے قبضہ میں چلی گئی اور وہاں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا۔ جلیس کی آواز اسی کہرام میں گم ہو گئی۔ اب ہمیں اس کی بڑی فکر تھی۔ دوستوں کے دل میں طرح طرح کے خیال آتے۔ خدا کرے وہ خیریت سے ہو۔ میں اس سے پہلے نہیں ملا تھا۔ پاکستان کو قائم ہوئے چند مہینے ہی ہوئے تھے۔ ابراہیم جلیس کے افسانے اور طنزیہ مضمون میں رسالوں میں اکثر پڑھا کرتا تھا۔ اس کی کتاب ''چالیس کروڑ بھکاری'' چھپ کر منظرعام پر آ چکی تھی اور مجھے اس کا تیز، تیکھا اور پرجوش جذباتی انداز بہت پسند تھا۔ حمید اختر اور انشاء وغیرہ اسے پہلے سے جانتے تھے۔ آخر ایک روز ابن انشاء کو کہیں سے خبر ملی کہ جلیس کل لاہور پہنچ رہا ہے۔

ہم سب اسے لینے والٹن ایئرپورٹ پر گئے۔ ایک دبلا پتلا، چھ فٹ لمبا گہرے سانولے رنگ کا نوجوان ہنستا ہوا جہاز سے باہر نکلا اور بڑھ بڑھ کر ہر کسی سے ہاتھ ملانے اور بغل گیر ہونے لگا۔ وہ بے تحاشا ہنس رہا تھا اور پرانے دوستوں کو تھاپیاں مار رہا تھا۔ میرا اس سے تعارف کرایا گیا تو وہ مجھ سے بغل گیر ہو گیا اور میرے کندھے پر زور سے ہاتھ مار کر بولا۔

''اوئے یارا توں تے بڑا رومانٹک ایں۔''

جلیس کو پنجابی بولنے کا بڑا شوق تھا۔ ہمارے ساتھ وہ زیادہ سے زیادہ پنجابی میں بات کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ گلابی پنجابی بولتا اور غلط سلط بولے چلا جاتا۔

''کی گل اے بادشاہو!''

اس فقرے سے وہ بات شروع کرتا۔ وہ ہم سب سے بہت جلد بے تکلف ہو گیا۔ ٹی ہاؤس میں آ کر وہ یوں ہمارے ساتھ گھل مل گیا جیسے برسوں سے یارانہ ہو۔ اسی ہفتے ترقی پسند مصنفین کے اجلاس میں ابراہیم جلیس نے اپنا حیدر آباد دکن والا رپورتاژ پڑھا جو بے حد پسند کیا گیا۔ اس رپورتاژ میں شروع سے لے کر آخر تک ایک آبشار کی روانی تھی۔ اجلاس ختم ہوا تو ہم ٹی ہاؤس میں آ کر بیٹھ گئے۔ جلیس دکن سے اپنے فرار کی سنسنی خیز داستان سنانے لگا۔ چائے کا دور چلتا رہا۔ جلیس کی بیوی بچے ابھی نہیں آئے تھے۔ اسے ان کا بے چینی سے انتظار تھا۔ وہ دکن سے نکل چکے تھے اور اب کسی دوسرے شہر میں تھے۔ ایک روز وہ بڑا خوش خوش ہمیں ملا۔

''میری بیوی اور بچے کراچی پہنچ گئے ہیں۔ اب کیا کروں؟''

اور وہ زور سے قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ جلیس کا قہقہہ بہت پرشور، ہنگامہ خیز اور بلند ہوتا تھا۔ وہ اس قدر بھرپور قہقہہ لگاتا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آتے۔ دکن کے بعض اصحاب کی طرح وہ ق کو خ بولتا تھا۔

''اوئے خمینے!''

لیکن ہر جگہ اس خ کو استعمال نہیں کرتا تھا۔ وہ کئی چیزیں ہر جگہ استعمال نہیں کرتا تھا۔ اس کے پاس کچھ آنسو بھی تھے۔ جن کا کچھ حصہ وہ اپنے قہقہوں میں استعمال کرتا تھا۔ جلیس کے آتے ہی محفل میں گرم جوشی کا رنگ آ جاتا۔ خواہ کیسی ہی محفل کیوں نہ ہو۔ وہ فقرے بازی شروع کر دیتا اور محفل کا رنگ بدل جاتا۔ خوش گوار ہو جاتا۔ بادل چھٹ جاتے اور ہلکی بوندا باندی شروع ہو جاتی۔

لاہور کا بھی وہی حال تھا جو سن 48-1947ء میں پاکستان کے دوسرے شہروں کا تھا۔ ہر کوئی اکھڑا ہوا تھا۔ تہہ کسی کی بھی ابھی نہیں جمی تھی جس کو جہاں کہیں سر چھپانے کو جگہ مل گئی وہیں بیٹھ گیا۔

جلیس لاہور میں تھوڑا عرصہ ہی رہا۔ جب تک دکن سے اس کا کنبہ نہیں آیا تھا۔ اس نے کچھ روز حمید اختر کے مکان میں بسر کئے۔ حمید اختر نے سنت نگر میں ایک مکان الاٹ کرا لیا تھا جس کی چھت سے دریائے راوی نظر آتا تھا۔ مگر حمید اختر وہاں بہت کم دکھائی دیتا تھا نیچے ایک دکان تھی، جس کی بیٹھک بنالی گئی تھی۔ یہاں ابراہیم جلیس نے بستر جما لیا۔ بے ترتیبی، بے نظمی، فرش پر سگریٹ کے ٹکڑے، جرابیں میز پر، پتلون چارپائی پر، بستر آدھا نیچے لٹکا ہوا، میز پر کتابوں، کاغذوں اور رسالوں کا ڈھیر، ہم سب کی یہی حالت تھی، یہی عالم تھا۔ کسی روز ہم چائے چھت پر بیٹھ کر پیتے اور ساتھ ساتھ دریا کو بھی دیکھتے جاتے۔

جلیس کہتا۔

''وہ دریا مجھے حمید اختر تمہارے گھر کی طرف آتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ ارے کمینے! کہیں تم دریا برد نہ ہو جاؤ۔''

وہ زوردار قہقہہ لگا کر ہنستا۔

سید کرمانی کہتا۔

''یہ دریائے وولگا نہیں ہے بھائی! جو اس شخص کے گھر اس کا حال پوچھنے آئے گا یہ راوی ہے راوی۔''

اور احمد راہی پکار اٹھتا ؎

وگدی اے راوی
وچ دو پھل پیلے ڈھولا

سردیوں میں حمید اختر کے گھر ادرک کا حلوہ پکتا، حلوہ کیا کشتہ ہوتا تھا۔ حمید اختر ہر کسی کو پیش کرتے ہوئے کہتا۔

''اسے تھوڑا کھائیے گا۔''

جلیس نے کہا۔

''کمینے! اس طرح سے تو اپنا حلوہ بچانا چاہتا ہے۔ میں ابھی اس حلوہ کی خبر لیتا ہوں۔''

جلیس نے حلوہ کافی کھا لیا اور بیمار پڑ گیا۔ حمید اختر بار بار یہی کہتا۔

''میں نے کہا تھا تمہیں جلیس کے بچے تھوڑا کھانا پر تو نے لالچ کیا۔ اب اپنے لالچ کی سزا بھگت۔''

جلیس کی بیماری کے لئے ہر کوئی اپنے مکتبہ فکر کی دوا لایا۔

کرمانی ہومیوپیتھک کی نظر نہ آنے والی گولیاں لایا۔ ابن انشاء حکیم جی سے پڑیاں لے کر آیا۔ حمید اختر ایلوپیتھک سے کیپسول لایا اور احمد راہی نے مشورہ دیا۔

''تمہیں صرف دہی کی لسی پینی چاہئے۔''

دہی کی لسی کے نام ہی سے جلیس بدک جاتا تھا۔ وہ تو کافی شوق سے پیتا اور وہ بھی سخت گرم کہ اس کی زبان جل جائے۔ پان وہ دوستوں کے ساتھ تکلفاً کھاتا۔ البتہ وہ سگریٹ بہترین پیتا تھا اور پھر گرمیوں کے آخر میں دریائے راوی میں سیلاب آ گیا۔ سیلاب کیا تھا بس ایک عذاب تھا جو سیلاب کی شکل میں نازل ہوا۔ ان دنوں دریا بالکل آزاد تھا۔ اس پر کسی طرف بھی کوئی بند نہیں تھا۔ سیلاب کا ریلا بڑی آزادی اور بے فکری سے شہر کے مضافاتی علاقوں میں پھیل گیا۔ یہاں تک کہ بڑے ڈاک خانے تک پانی آ گیا۔ سنت نگر ایک ایک منزل پانی میں ڈوب چکا تھا۔ جلیس نے ہنس کر حمید اختر سے کہا۔

''یہ کمینہ سنت نگر میں کیوں رہتا ہے؟ اس کی وجہ سے سیلاب آیا ہے۔''

حمید اختر کے گھر کا سارا سامان وہیں تھا۔

جلیس نے کہا۔

''خوشی کی بات تو یہ ہے کہ حمید اختر بھی اپنے مکان میں قید ہو کر رہ گیا ہے۔ نہ اسے تیرنا آتا ہے اور نہ وہ یہاں واپس آ سکے گا۔''

حمید اختر کو تیرنا آتا تھا یا نہیں لیکن سبط حسن کی تیراکی بہت مشہور تھی۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس نے ایک بار نیویارک کا سمندر ہڈسن آدھی رات کو تیر کر پار کیا تھا۔ چنانچہ سبط حسن لنگر لنگوٹ کس کر سیلاب کے پانی میں اتر گیا اور تیرتا تیرتا سنت نگر کے جزیرے میں پہنچ گیا۔ حمید اختر اور اس کے بہن بھائی چھت پر کھڑے اسے دیکھ کر حیران بھی ہو رہے تھے اور خوش بھی۔ حیران اس لئے کہ سبط حسن ایسا ثقہ انٹلیکچوئل لنگوٹ باندھ کر پانی میں کیسے اتر آیا اور خوش اس لئے ہو رہے تھے کہ سبط حسن

ان کے لئے ادھر ادھر سے تلاش کر کے ایک کشتی والے کو بھی ساتھ ہی لایا تھا۔

ہم لوگ ٹی ہاؤس میں چائے پی رہے تھے۔ جلیس کہنے لگا۔

''سبط صاحب نے آج حمید اختر کی جنریشن کو بچا لیا۔ حمید اختر کے لئے یہ ڈوب مرنے کا مقام ہے۔''

سبط حسن نے پائپ میں دیسی خشک تمباکو بھرتے ہوئے کہا۔

''بھئی سنت نگر میں تو حمید اختر کے لئے یہ مقام حاصل کرنے کا نادر موقع ہے۔ اب ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔''

جلیس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''افسوس تو اس بات کا ہے کہ اس کمینے کے افسانوں کے مسودے بھی سبط صاحب ساتھ لے آئے ہیں۔ سبط صاحب آنیوالی نسل آپ کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔''

سیلاب اتر گیا۔ اس کے بعد جلیس کراچی چلا گیا۔ اب وہ کراچی میں مستقل رہائش کرنے کے جتن کر رہا تھا۔ اس کے بھی رشتے دار کراچی میں تھے مگر وہ لاہور میں بھی رہتا تھا۔ مہینے میں تین بار وہ لاہور ہمارے درمیان ہوتا۔ ادبی جلسوں میں افسانے، مضمون اور رپورتاژ پڑھتا۔ ہمارے ساتھ مال' میکلوڈ روڈ کی آوارہ گردی کرتا۔ ابن انشاء کے ایبٹ روڈ والے گھر کا نام اسی نے چینی گھوڑا رکھا تھا۔ اس چینی گھوڑے میں ہماری بڑی محفلیں لگتیں۔ ساحر اور فکر بھارت جا چکے تھے۔ ادبی تحریکیں بڑے زور پر تھیں۔ بڑا صحت مند ادب تخلیق کیا جا رہا تھا۔ شاعر اور ادیب اپنے اپنے تخلیقی کاموں میں مگن تھے۔ آوارہ گردیاں بھی عروج پر تھیں اور ادبی کام بھی اپنے عروج پر تھا۔ اس زمانے کی لکھی ہوئی غزل' افسانے اور مضامین آج اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ اس زمانے کی بوئی ہوئی زرخیز فصل کو ہم آج تک کاٹ رہے ہیں۔

ہم اخباروں میں لکھتے، رسالوں میں لکھتے، ہماری کتابیں یکے بعد دیگرے چھپ رہی تھیں۔ مشاعرے ہوتے، معرکے ہوتے۔ ادبی انجمنوں کے ہنگامہ خیز اجلاس ہوتے۔ بحثیں ہوتیں، کہیں سیاست چلتی، کہیں ادب چلتا، مذاکرے ہوتے۔ مناظرے ہوتے۔ ایک ہنگامہ تھا۔ ایک جشن تھا۔ کوئی کسی جگہ نوکر نہیں تھا۔ کوئی کسی کا غلام نہیں

تھا۔ کسی پر کسی کا حکم نہیں چلتا تھا۔ ہر کوئی آزاد تھا۔ بات کہنے میں خود مختار تھا۔ جیب خالی بھی ہوتی۔ جیب بھر بھی جاتی۔ بہترین سگریٹ پیتے، بہترین کپڑے پہنتے، بہترین چائے اور کافی پیتے، بہترین باتیں کرتے۔ شہر لاہور کی سڑکوں، گلی کوچوں میں آوارہ بھی پھرتے اور راتوں کو گھروں میں بیٹھ کر کہانیاں بھی لکھتے، طویل نظمیں اور مسلسل غزلیں بھی کہتے۔ سورج ہمارے سامنے صبح کو طلوع ہوتا۔ چاند ہمیں سڑکوں پر راتوں کو آوارہ پھرتے دیکھ کر غروب ہوتا۔ ایک خواب تھا وہ عہد! رنگ، خوشبو، حرکت، خیال اور زندگی سے بھرپور خواب!

''سویرا'' کی طرف سے لارنس باغ میں ایک خوبصورت چائے پارٹی دی گئی۔ اردو ادب کے تقریباً سبھی روشن ستارے وہاں موجود تھے۔ اوپن ایئر کیفے میں میزیں کھانے پینے کی چیزوں سے سجی ہوئی تھیں۔ چائے کا دور چل رہا تھا۔ پرجوش گفتگو ہو رہی تھی۔ کہیں جلیس کے اور کہیں صفدر میر کے فلک شگاف قہقہے گونج رہے تھے۔ کہیں فیض صاحب کی دل آویز شرمیلی شرمیلی مسکراہٹیں تھیں اور کہیں عارف عبدالمتین کی سرگوشیاں تھیں اور کہیں مولانا صلاح الدین احمد کی جامع اور مرصع گفتگو تھی اور کہیں مولانا چراغ حسن حسرت کی شگفتہ باتیں تھیں، کہیں ابن انشاء کی طنز تھی اور کہیں ظہیر کاشمیری کا وعظ تھا۔ یہ ایک یادگار محفل تھی۔ ان میں سے کچھ احباب ہم سے ہمیشہ کیلئے بچھڑ گئے تھے۔ جو زندہ ہیں وہ پہچانے نہیں جاتے۔

اس کے بعد مکتبہ اردو کے مالک چودھری برکت علی صاحب کی طرف سے بھی اسی جگہ ایک شاندار دعوت دی گئی۔ اس دعوت میں بھی وہی رونق، وہی ہنگامہ تھا۔ چودھری برکت علی کھلا خرچ کرنے والے دریا دل پبلشر تھے۔ انہوں نے زردے کی ایک دیگ بھی دم کروا رکھی تھی۔ وہ بڑے خوش تھے اور ہر ایک ادیب اور شاعر سے ہنس ہنس کر کہہ رہے تھے۔

''یار یہ فرنی بھی کھاؤ۔ بھئی زردہ کیوں نہیں لے رہے؟ چائے ٹھنڈی تو نہیں ہو گئی۔''

چودھری برکت علی مرحوم اردو ادب کے کلاسیکی ناشروں میں سے تھے۔ جلیس کی میز پر گئے تو اس نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"چودھری صاحب! اس زردے میں میری اگلی کتاب کا تھوڑا سا ایڈوانس بھی ڈال دیں۔"

چودھری صاحب نے ہنس کر کہا۔

"جلیس! تم جس قدر چاہے ایڈوانس لے لینا۔ اس وقت زردہ کھاؤ۔"

مکتبہ اردو کی اس دعوت کی تصویریں بھی اتروائی گئیں۔ یہ سب تصویریں لاہور کے واحد غائب ہو جانے والے واحد آرٹسٹ فوٹو گرافر حفیظ قندھاری نے اتاریں۔

حفیظ قندھاری میں ایک بڑی خوبی تھی کہ وہ تصویر اتارنے کے بعد غائب ہو جاتا تھا۔ کہیں سالوں بعد شکل دکھاتا۔ تصویر کے پروف دکھاتا اور پھر غائب ہو جاتا۔ ان تصویروں کے اس نے مجھے پروف دکھائے تو میں نے جلدی سے قابو کر لئے کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ حفیظ قندھاری غائب ہونے ہی والا ہے اور آپ یقین کریں کہ وہ غائب ہو چکا تھا۔ پروف میرے پاس تھے۔ جلیس اب مستقل طور پر کراچی میں آباد ہو گیا تھا۔

لاہور اس کا پھیرا ضرور رہتا۔ لاہور کے ساتھ اس کا ادبی اور روحانی رشتہ تھا۔ اس شہر کے سحر میں وہ بھی گرفتار تھا۔ ویسے بھی اس کے تقریباً سبھی دوست لاہور میں تھے۔ کراچی سے لاہور آتا تو سیدھا پاک ٹی ہاؤس یا "امروز" کے دفتر واقع ایبٹ روڈ یا ابن انشاء کے چینی پکوڑے میں آ کر سب دوستوں سے ملتا۔ اگر میں اسے ان جگہوں پر نہ ملتا تو تانگہ لے کر میرے مصری شاہ والے گھر آتا۔

"اوئے حمیدے! سبز چائے کہاں ہے تمہاری؟"

جلیس کو ابن انشاء کی طرح سبز چائے کا شوق تو بہت تھا مگر پیتا وہ بھی اسے گرم پانی کی طرح تھا۔ میں نے چائے بنائی۔ ساتھ نمکین کلچے رکھے۔ وہ کراچی کی باتیں سناتا رہا پھر ہم تانگے پر بیٹھ کر ابن انشاء کے چینی پکوڑے میں آ گئے۔ ابن انشاء ابھی اپنے گالوں پر الٹا ہاتھ پھیر کر شیو بنا رہا تھا۔

یہاں سے نکل کر ہم "امروز" کے دفتر آ گئے۔ کچھ دیر بیٹھ کر "سویرا" کے دفتر جا کر چودھری نذیر اور احمد راہی سے ملاقات کی۔ پھر ٹی ہاؤس چلے گئے اور شام تک وہیں دوستوں میں بیٹھے باتیں کرتے اور قہقہے لگاتے رہے۔ ابراہیم جلیس چوک لکشمی

کے ہوٹل برسٹل میں ٹھہرا تھا۔ وہ جب بھی کراچی سے لاہور آتا اسی ہوٹل میں ٹھہرا کرتا۔ کراچی میں وہ اخباروں میں کالم بھی لکھتا اور ایک آدھ فلم بھی لکھ رہا تھا۔

ہوٹل کی دوسری منزل پر تنگ سا شکستہ کمرہ تھا۔ ایک پلنگ، دو کرسیاں رکھی تھیں۔ میز پر جلیس کا شیو کا سامان پڑا تھا۔ میں رات کے نو بجے اس کے پاس گیا تھا۔

لاہور میں کچھ روز رہنے کے بعد جلیس کراچی چلا گیا۔

"جنگ" اخبار میں اس کا کالم بڑے شوق سے پڑھا جاتا تھا۔ وہ بڑی محنت سے لکھتا تھا اور کالموں میں اس کے مخصوص اسلوب کی شگفتگی، طنز اور مزاح بدرجہ اتم موجود ہوتی۔ ابن انشاء بھی کراچی کا ہو چکا تھا۔ ان ہی دنوں میرا کراچی جانا ہوا تو میں ابن انشاء کے جہانگیر روڈ والے مکان میں ٹھہرا۔ میں جلیس سے ملنے اخبار کے دفتر گیا۔ سب سے پہلے اپنے دیرینہ دوست شفیع عقیل سے ملاقات ہوئی۔ وہ بغل گیر ہو کر ملا۔

میں نے کہا۔ "جلیس کہاں بیٹھتا ہے؟"

شفیع عقیل نے کہا۔

"تم بیٹھو! اسے یہاں بلا لیتے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"میں اسے اس کے کمرے میں ملنا چاہتا ہوں۔"

"تم اسے رنگے ہاتھوں پکڑنا چاہتے ہو؟ آؤ میرے ساتھ۔"

ساتھ ہی ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ جلیس نے مجھے دیکھ کر دونوں بازو کھول کر نعرہ لگایا۔

"اوئے خبیثے تم یہاں بھی آ گئے؟"

میں نے دیکھا کہ کراچی آ کر ابن انشاء کی طرح جلیس بھی بہت مصروف ہو گیا تھا اور ان لوگوں کو واقعی سر کھجانے کی فرصت نہیں تھی۔ ہر روز کے روز کالم لکھنا۔ تقریبات میں شرکت کرنا۔ پریس کانفرنسوں میں جانا۔ وی آئی پی سے ملاقاتیں۔ درجن بھر اخباروں کا روزانہ مطالعہ۔ ادھر لکھا جا رہا ہے ادھر کاتب لکھ رہا ہے۔ کاپی پریس میں جا رہی ہے۔ جلیس کا جسم اگرچہ بھر گیا تھا لیکن صحت اچھی نہیں رہتی تھی۔ ابن انشاء کی طرح قسم قسم کی دوائیاں اس نے بھی اپنی میز کی دراز میں رکھی تھیں۔

جلیس نے چائے منگوائی۔ ہم تینوں چائے پر لاہور کی باتیں کرنے لگے۔

جلیس نے ایک ایک دوست کے بارے میں پوچھا۔ عبداللہ ملک، حمید اختر اور احمد راہی کی خیریت دریافت کی۔ میں نے کہا۔

''حمید اختر کے بال گرنے لگے ہیں۔''

وہ ہنس کر بولا۔

''اسے ٹنڈ کروالینی چاہیے۔''

جلیس نے اپنے خاص فوٹو گرافر صدیقی صاحب سے میری ایک تصویر اتروائی۔ پھر ایک گروپ فوٹو بنوایا۔ شام کو میں، جلیس اور شفیع عقیل صدیقی صاحب کے ہاں گئے۔ کراچی میں گرمی بہت پڑ رہی تھی۔ صدیقی صاحب نے ہمیں برازیل کی کافی پلائی۔

کھانا ہم نے وہیں کھایا۔ رات کے گیارہ بجے ہم کراچی کی سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے نکل گئے۔ دوسرے روز شفیع عقیل نے دعوت کی۔ ابن انشاء بھی وہاں موجود تھا۔ کافی پینے ہم کافی ہاؤس میں آ گئے۔ یہاں کراچی کے شاعر اور ادیب حضرات سے ملاقاتیں ہوئیں۔ کافی دیر وہاں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ پھر سمندر کی سیر کو چل دیئے۔ ابن انشاء کہنے لگا۔

''ساحل سمندر پر ہوا بڑی ہوتی ہے۔ بس یہی ایک کام خراب ہے یہاں۔''

جلیس بولا۔

''اوئے قیصرا! تینوں ہن کیہہ ہوا لگے گی؟''

ریت پر گھونگے بکھرے ہوئے تھے۔ جلیس نے ابن انشاء سے کہا۔

''اوئے تمہارے ایڈ گرایلن پو کے گھونگے پڑے ہیں۔ اٹھا کر جیب میں رکھ لو۔'' کراچی کی گولڈن شامیں ہم کشادہ سڑکوں پر سیر کر کے گزارتے۔ سمندر کی وجہ سے شام کی روشنی دیر تک سڑکوں پر رہتی تھی۔ ایک ہفتہ کراچی میں ہنس کھیل کر بسر کرنے کے بعد میں واپس لاہور آ گیا۔

ان ہی دنوں موسم بہار میں پاک جمہوریت ٹرین کا مشرقی پاکستان میں سفر شروع ہوا۔ ڈھاکہ جانے کے لئے میں لاہور سے کراچی پہنچا تو ایئرپورٹ پر ابن انشاء،

جمیل الدین عالی اور ابراہیم جلیس پہلے ہی موجود تھے۔ ڈھاکہ فلائٹ رات دو بجے جاتی تھی۔ ہم بڑی گرم جوشی سے ملے۔ پھر ایئرپورٹ کی کینٹین میں آ گئے۔ ہم نے چائے اور کافی منگوائی۔ ڈھاکہ کی باتیں شروع ہو گئیں۔ میں پہلی بار ہوائی جہاز کا سفر کر رہا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں جہاز میں چکر نہ آنے لگیں۔

ابن انشاء نے کہا۔

''اگر تم جہاز کے ونگ پر بیٹھو تو تمہیں بالکل چکر نہیں آئیں گے۔''

عالی نے کہا۔

''کوئی چکر وکر نہیں آتے بھائی! سب ٹھیک ہو جائے گا جب جہاز ٹیک آف کرے گا۔''

جہاز نے ٹیک آف کیا تو مجھے نفسیاتی طور پر کچھ ایسا لگا جیسے چکر شروع ہو گئے ہیں لیکن یہ میرا وہم تھا۔ سب ٹھیک ہو گیا۔ ہم نے کافی منگوائی اور دلچسپ باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جہاز ایک شہر کے اوپر سے گزرا تو جلیس ساتھ والی سیٹ سے اٹھ کر ہمارے پاس آیا اور گول شیشے میں سے جھانک کر بولا۔

''شہر کی روشنیاں دیکھو۔ ایسے لگتا ہے کہ جیسے کسی نے ستاروں کا ڈھیر لگا دیا ہے۔''

جلیس کی یہ تشبیہ مجھے اس وقت بڑی اچھی لگی تھی اور آج بھی اچھی لگتی ہے۔

میں نے نیچے زمین پر نظر ڈالی۔ واقعی روشنیاں ستاروں کی طرح ایک جگہ جمع ہو کر چمک رہی تھیں۔ ہنستے باتیں کرتے وقت گزر گیا۔ پو پھٹ رہی تھی کہ ہمارا جہاز ڈھاکہ ایئرپورٹ پر اتر گیا۔ ڈھاکہ کے ادیب اور شاعر ہمیں لینے آئے ہوئے تھے۔ جسیم الدین اور کوی غلام مصطفیٰ سے ملاقات ہوئی۔ ہماری رہائش کا انتظام نیو مارکیٹ کے سامنے ایم این اے ہوسٹل میں تھا۔ ہر کمرے میں دو پلنگ تھے جن پر مچھردانیاں لگی تھیں۔ ایک بڑے کمرے میں تین پلنگ بچھے تھے۔ میں اور ابن انشاء اور جلیس اسی کمرے میں آ گئے۔ جلیس اور ابن انشاء نے باتھ روم جا کر باری باری منہ دھویا۔ میں نے کہا۔

''ابھی صبح نہیں ہوئی تم منہ ہاتھ کیوں دھونے لگے۔''

جلیس تولئے سے منہ پونچھتے ہوئے بولا۔

''ہم تو ایسے منہ دھونے لگے جیسے کوئلے والی ٹرین میں سفر کر کے آئے ہوں۔'' ابن انشاء بولا۔

''یہ جہاز دھواں بہت دیتا ہے۔ میں تو آئندہ سے اڑن قالین پر آیا کروں گا۔''

اتنے میں جمیل الدین عالی نے منہ اندر کر کے پوچھا۔

''کیوں بھئی، سب ٹھیک ہے نا؟''

میں نے کہا۔

''میرا خیال ہے پلنگ کچھ کمزور ہیں۔''

عالی نے کہا۔

''تم لوگ کیا ان پر دھاچوکڑی مچانے کا ارادہ رکھتے ہو؟''

عالی چلا گیا۔ ہم سونے کی تیاریاں کرنے لگے۔ دن چڑھنے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا۔ سوچا کچھ دیر آرام ہی کر لیں کیونکہ جہاز میں ہم صرف باتیں کرتے اور ہنستے قہقہے لگاتے آئے تھے۔ ہم اپنے اپنے پلنگ پر لیٹ گئے۔ مگر لیٹنا کہاں نصیب ہو سکتا تھا۔ جلیس نے کوئی لطیفہ چھوڑا اور ہم اٹھ کر بیٹھ گئے۔

ابن انشاء نے کہا۔

''تم جھوٹے خان ہو۔ بڑا جھوٹ بولتے ہو۔ یہ لطیفہ نہیں ہے۔''

جلیس نے کہا۔

''اچھا میں تمہیں ایک سنجیدہ بات سناتا ہوں۔''

ابن انشاء نے مجھ سے کہا۔

''اے حمید! اب قہقہہ لگانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ ابراہیم جلیس سنجیدہ بات کرنے لگا ہے۔''

جلیس نے خدا جانے کون سا لطیفہ سنایا کہ میں قہقہہ لگا کر اچھل پڑا۔ خدا جانے قہقہہ لگا کر اچھلا تھا کہ اچھل کر میں نے قہقہہ لگایا تھا۔ بہرحال جو کچھ بھی تھا میرے پلنگ کا تختہ ٹوٹ چکا تھا اور میں پلنگ کے درمیان فرش پر پڑا تھا۔ اس پر جلیس

کچھ ایسے بھیانک انداز میں ہنسا کہ اس کا پلنگ بھی ٹوٹ گیا۔ ہم نے ابن انشاء کی طرف دیکھا۔ وہ بڑے آرام سے پلنگ پر سے اترا۔ فرش پر پاؤں جما کر اس نے فاتحانہ انداز میں ہمیں دیکھا اور پھر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

''کمینو! میں نے اپنا پلنگ بچا لیا ہے۔''

ہم یہ ہرگز گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ ہمارے پلنگ ٹوٹ جائیں اور ابن انشاء کا ثابت رہے۔ میں نے جلیس کی طرف اور جلیس نے میری طرف دیکھا آنکھوں ہی آنکھوں میں ہم نے ایک منصوبہ طے کیا اور پھر دوڑ کر ابن انشاء کے پلنگ پر چھلانگ لگا دی اور اس کا پلنگ بھی ٹوٹ گیا۔ اب سوال یہ تھا کہ رات کس جگہ بسر ہو۔ کہاں سویا جائے؟

ابن انشاء کہنے لگا۔

''چلو عالی سے چل کر بات کرتے ہیں۔ بستروں کی ساری ذمہ داری اسی کی ہے۔'' جب ہم نے عالی کا دروازہ کھولا تو یقین کریں کہ وہ بھی ٹوٹے ہوئے پلنگ پر بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ ہم کچھ کہنے ہی والے تھے کہ اس نے کہا۔

''پلنگ ٹوٹ گئے ہیں تو بھائی کسی طرح یہ دو گھنٹے گزار لو۔ صبح بدلوا دیئے جائیں گے۔ کم بخت میرا پلنگ بھی پہلو بدلتے میں ٹوٹ گیا۔''

باقی رات ہم بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔

☆ ☆ ☆

حمید اختر

اردو ادب کی تاریخ میں اگر انجمن ترقی پسند مصنفین کا ذکر نہ کیا جائے تو اردو ادب کی تاریخ مکمل نہیں کہلائی جا سکتی۔ اسی طرح اگر انجمن ترقی پسند مصنفین میں سے حمید اختر کا نام نکال دیا جائے تو انجمن ترقی پسند مصنفین کی تاریخ نہ تو مکمل کہلائی جا سکتی ہے اور نہ ہی مستند کہی جا سکتی ہے۔ 47-1946ء کے زمانے میں' اپنے قیام بمبئی کے دوران وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی مقامی شاخ کے سیکرٹری کی حیثیت سے انجمن کے ہفتہ وار ادبی جلسوں کی کارروائی رقم کرتا رہا' جو بمبئی کے اس زمانے کے مشہور ہفتہ وار ادبی رسالے ''نظام'' میں دو ڈھائی برس تک مسلسل شائع ہوتی رہیں۔ حمید اختر کا تعلق بھی لدھیانے کی مردم خیز زمین سے ہے۔ کشمیر کی وادی سے جب کشمیری سوداگر پشمینے کی شالوں کا مال لے کر کاروبار کے سلسلے میں کلکتے کی طرف جاتے تھے۔ راستے میں ان کے دو بڑے اہم پڑاؤ ہوتے تھے۔ پہلا پڑاؤ امرتسر اور دوسرا لدھیانہ تھا۔ چنانچہ پنجاب کے ان دونوں شہروں میں کشمیری کلچر اور کشمیری ثقافت کو نمایاں مقام حاصل ہوا۔ ہماری ایک رشتے دار کشمیری فیملی لدھیانے میں آباد تھی۔ مجھے ان کے ہاں لدھیانے جانے کا اتفاق تو نہیں ہوا مگر وہ لوگ امرتسر ہمارے گھر سال میں ایک دو بار ضرور آتے تھے۔ امرتسر میں کشمیری کلچر اور ثقافت تمام لوازمات کے ساتھ اپنے پورے عروج پر تھی۔ چنانچہ ہم جب لاہور میں اپنے کشمیری رشتے داروں کے ہاں جاتے تھے تو ہمیں ان کی سبز چائے اور ساگ گوشت اور گونگلو گوشت میں بڑی خامیاں نظر آتی تھیں۔ اس کی بڑی وجہ یہی تھی کہ کشمیری شال باف اور شال مرچنٹ سوداگر جموں سے وایا سیالکوٹ سیدھا امرتسر میں پہلا پڑاؤ ڈالتے اور لاہور کو نظر انداز کر جاتے تھے۔ امرتسر کے بعد لدھیانہ کشمیری

ثقافت کا مرکز تھا۔ افسوس کہ میں لدھیانے شہر کبھی نہیں گیا۔ حالانکہ مجھے وہاں جانے کا بڑا شوق تھا۔ لیکن جب کبھی میں اپنی آوارہ گردیوں کے زمانے میں گھر سے بھاگ کر کلکتے یا بمبئی کا رخ کرتا تھا۔ اپنے رشتے داروں سے خاص طور پر اپنے آپ کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ کیونکہ مجھے ڈر ہوتا تھا کہ یہ لوگ مجھے وہیں پکڑ کر بٹھا لیں گے اور میرے گھر والد صاحب کو اطلاع کر دیں گے جو اپنے خاص پہلوان باڈی گارڈز کو مجھے واپس لانے کے واسطے روانہ کر دیں گے۔ چنانچہ جالندھر کے بعد جب ٹرین لدھیانے ٹھہرتی تو میں بڑی محبت اور حسرت سے اس شہر کی عمارتوں کو ٹرین کی کھڑکی میں سے دیکھتا۔ شاید اس لئے بھی کہ لدھیانے والی اپنی رشتے دار فیملی سے مجھے ایک جذباتی لگاؤ بھی پیدا ہو گیا تھا۔

ملک تقسیم ہوا اور 1947ء میں جب ہم لوگ بھی ہجرت کر کے امرتسر سے لاہور پہنچے تو میرے امرتسر کے ترقی پسند ادیب اور شاعر دوست بھی میرے ساتھ ہی لاہور آ گئے تھے۔ ان میں احمد راہی' شہزاد احمد' عارف عبدالمتین تو تقریباً میرے ہم عمر تھے۔ ظہیر کاشمیری اور سیف الدین سیف ہم سے ذرا بڑے تھے۔ لاہور آئے تو حمید اختر' ابن انشا اور ساحر لدھیانوی سے ملاقات ہوئی۔ یہ لوگ بھی لدھیانے سے ہجرت کر کے لاہور پہنچے تھے۔ ہم سب کی آپس میں بڑی گہری دوستی ہو گئی۔ میں نے 1948ء میں اپنا پہلا افسانہ لکھا تو اسے انجمن ترقی پسند مصنفین کے ہفتہ وار ادبی اجلاس میں ہی پڑھا۔ ساحر لدھیانوی بوجوہ صرف ایک سال ہی پاکستان ٹھہر سکا اور بمبئی چلا گیا۔ باقی دوستوں نے جن میں حمید اختر بھی تھا' پاکستان کو ہی اپنا وطن بنایا اور پاکستان میں ہی اپنی نئی زندگی کے شب و روز کا آغاز کیا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے علاوہ لاہور میں حلقہ ارباب ذوق کے ادبی اجلاس بھی باقاعدگی سے منعقد ہوتے تھے۔ دونوں جلسوں میں بڑی رونق ہوتی تھی۔ یہ زمانہ پاکستان میں اردو ادب کے تخلیقی عروج کا زمانہ تھا۔ میں اپنی تازہ کہانیاں زیادہ تر انجمن ترقی پسند مصنفین کے ادبی جلسوں میں ہی پڑھتا تھا۔ حمید اختر نے بھی باقاعدہ افسانے لکھنے شروع کر دیئے۔ اس کی کہانیوں کا ایک مجموعہ ''لامکاں'' کے نام سے شائع بھی ہوا مگر وہ زیادہ دیر تک افسانہ نگاری کا کام جاری نہ رکھ سکا۔

"پاکستان ٹائمز" اور روز نامہ "امروز" باقاعدہ نکل رہے تھے۔ مولانا چراغ حسن حسرت "امروز" کے چیف ایڈیٹر تھے۔ انہوں نے امروز میں قسمت علمی و ادبی کے عنوان سے ہفتہ وار ادبی صفحات کا اجرا کیا تو ہم سب امروز کے ادبی ایڈیشن کے واسطے لکھتے۔ حمید اختر "امروز" اخبار سے وابستہ ہو گیا تھا۔ امروز اخبار کے دفاتر ان دنوں ایبٹ روڈ کے شروع میں ہی پرانے نشاط سینما کے ساتھ ہی تھے۔ یہ اصل میں کوئی بہت بڑا پرنٹنگ پریس تھا جو جوش صاحب کو الاٹ ہوا تھا اور جس کی ساری مشینری بیکار پڑی تھی۔ ایبٹ روڈ کے رخ اس ایک منزلہ عمارت میں داخل ہوں تو بائیں جانب ایک لمبا کمرہ تھا جہاں ایک جانب چھوٹی چھوٹی پارٹیشن کر کے اخبار کے عملہ ادارت کے واسطے کمرے سے بنا دیئے گئے تھے۔ ایک جانب دیوار کے ساتھ ایک لمبا تخت پوش بچھا ہوا تھا جس پر کاتب حضرات بیٹھتے تھے۔ درمیان میں تنگ سا راستہ تھا جو آگے ایک دیوار کے پاس جا کر ختم ہو جاتا۔ دیوار پر چق پڑی تھی۔ چق اٹھا کر دیکھیں تو اندر ٹیبل لیمپ کی روشنی میں مولانا چراغ حسن حسرت بیٹھے لکھتے دکھائی دیتے تھے۔

حمید اختر ان ہی پارٹیشنوں کے ایک چھوٹے سے کمرے میں بیٹھتا تھا۔ ابن انشا کو جو مکان الاٹ ہوا تھا۔ وہ اخبار کے دفتر کے بالکل سامنے تھا۔ میں اس کے ہاں جاتا تو ہم دونوں امروز اخبار کے آفس میں آ جاتے۔ وہاں حمید اختر کے ساتھ خوب گپ شپ ہوتی۔ نئے نئے موضوع سوجھتے اور ان پر افسانے اور نظمیں لکھی جاتیں۔ حمید اختر ان ادبی محفلوں کی روح رواں تھا۔ حمید اختر کے بڑے بھائی صفدر صاحب نے سنت نگر میں مکان الاٹ کرا لیا تھا۔ حمید اختر بھی ان کے ساتھ رہتا تھا۔ اس مکان میں بھی ابن انشا اور احمد راہی کبھی کبھی حمید اختر سے ملنے چلے جاتے تھے۔ مکان کی پہلی منزل میں بازار کے رخ ایک چھوٹا سا دیوان خانہ تھا۔ ہم وہاں بیٹھ کر چائے پیتے اور ادب و سیاست پر خوب باتیں ہوتیں۔ میں صرف ادبی گفتگو میں دوستوں کا تھوڑا بہت ساتھ ضرور دیتا لیکن جب سیاست پر گفتگو شروع ہوتی۔ میرا کام صرف خاموشی سے اپنے دوستوں کی باتیں سننا ہوتا تھا۔ حمید اختر کی گفتگو کا انداز سادہ' بے لاگ اور شگفتہ ہوتا۔ آواز پرجوش اور زندگی سے بھرپور ہوتی۔ اس کے افکار' اس کی ساری شخصیت' ایک خاص سیاسی نظریئے کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ وہ اپنے فکر اور عمل میں یک جان

تھا۔ زمانہ سازی اور مصلحت کوشی اسے بالکل نہیں آتی تھی۔ جوش اسے اس کے سیاسی نظریئے نے دیا تھا۔ وہ ہمہ وقت اس میں سرگرم عمل رہتا تھا۔

سنت نگر والے مکان میں اس کے شب و روز سخت محنت کشی اور معاشی جدوجہد کے دن تھے۔ ہم سب کا تقریباً یہی حال تھا مگر ہم سب اپنے حال میں مست تھے۔ جتنی ضرورت ہوتی تھی۔ اتنے پیسے ہم رسالوں' اخباروں میں لکھ کر کما لیتے تھے۔ باقی وقت آوارہ گردیوں اور لٹریچر لکھنے میں گزرتا تھا۔ ہم سب کی تقریباً اسی زمانے کی تخلیقات ہماری شہرت کی بنیاد بنیں۔ پاکستان بننے کے بعد بارشیں بڑی ہوئی تھیں۔ دریائے راوی میں سیلاب آ گیا۔ اس زمانے میں ابھی دریا پر بند نہیں تعمیر ہوا تھا۔ سیلاب اس قدر زبردست تھا کہ دریا کا پانی لاہور سیکرٹریٹ اور دوسری جانب جی پی او تک آ گیا۔ سنت نگر' شام نگر' کرشن نگر کی آبادی پانچ پانچ فٹ پانی میں ڈوب گئی۔ مجھے یاد ہے۔ ہمیں ٹی ہاؤس میں خبر ملی کہ حمید اختر کا مکان بھی سیلاب کی زد میں آ گیا ہے۔ امدادی کارروائیاں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ کسی کو کسی کی خبر نہیں تھی۔ میں سید سبط حسن صاحب کے ساتھ بیٹھا تھا۔ یہ خبر سنتے ہی سبط صاحب اٹھ کھڑے ہوئے کہنے لگے۔

"حمید اختر کی تو ساری فیملی وہاں پھنس گئی ہو گی۔"

وہ ٹی ہاؤس سے نکل کر سیکرٹریٹ کی طرف چل پڑے۔ میں بھی ان کے ساتھ ہو گیا۔ سیکرٹریٹ کے گیٹ کے ساتھ ہی جو سڑک کرشن نگر اور چشتیہ ہائی سکول کو جاتی ہے وہاں تک گھٹنے گھٹنے پانی تھا۔ بہرحال میں اور سبط صاحب پتلونیں اوپر اٹھا کر پانی میں رک رک کر چلتے چلتے اس جگہ پہنچ گئے جہاں دور سے سنت نگر کے مکان نظر آ رہے تھے۔ ابھی آبادی اتنی گنجان نہیں ہوئی تھی۔ حمید اختر کے مکان کے آگے ایک چھوٹی سی گراؤنڈ تھی۔ یہ گراؤنڈ ڈونگی تھی۔ چنانچہ یہاں سات سات' آٹھ آٹھ فٹ پانی کھڑا تھا۔ میں سبط صاحب کے پاس تین فٹ پانی میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ اب کیا ہو گا؟ میں حمید اختر کی دل و جان سے مدد کرنا چاہتا تھا۔ لیکن دل میں دعائیں مانگ رہا تھا کہ حمید اختر کی امداد کا غیب سے کوئی انتظام ہو جائے۔ مجھے پانی میں مزید آگے نہ جانا پڑے۔ اتنے میں سبط صاحب بولے "تم اسی جگہ ٹھہرو" اور یہ کہہ کر میرے دیکھتے دیکھتے سبط حسن صاحب اپنی کلف لگی سفید براق قمیض اور پائپ کے ساتھ پانی میں اتر گئے اور ایک

مشاق تیراک کی طرح حمید اختر کے مکان کی سیدھ میں تیرنا شروع کر دیا۔ میں دل میں شرمندہ بھی ہوا اور مجھے حیرت بھی ہوئی کہ اتنے نازک اور نفیس مزاج کا انٹیلکچوئل آدمی جو ہمیشہ اعلیٰ اور قیمتی لباس میں ملبوس ہوتا ہے اور اپنے لباس کی نفاست کا بے حد خیال رکھتا ہے اچانک کیسے سیلاب کے گدلے پانی میں کود گیا۔ اصل میں سبط حسن کی محبت میں کھوٹ نہیں تھی۔

حمید اختر نے ''کال کوٹھڑی'' کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں جیل میں گزارے ہوئے اس کے شب و روز کے احوال لکھے گئے تھے۔ اس نے کچھ افسانے بھی لکھے جو سویرا میں شائع ہوئے۔ اس کے ساتھ ٹریجڈی یہ رہی ہے کہ جس زمانے میں اسے افسانے لکھنے چاہیے تھے اس زمانے میں وہ سیاسی رپورٹیں لکھتا رہا اور افسانے لکھنے کا خیال اسے اس وقت آیا جب وہ سیاسی نظریات و خیالات میں پوری طرح رنگا جا چکا تھا۔ اس کی کتاب ''کال کوٹھڑی'' میں جیل کی زندگی کے شب و روز کی پوری رپورٹنگ تھی مگر ادبی عنصر غائب تھا۔ لیکن اب آ کر اس نے ایک اخبار میں جو کالم نویسی شروع کی تو میرے خیال میں حمید اختر کی خداداد صلاحیتوں نے پڑھنے والوں کو اپنی گرفت میں لے لیا اور پھر جب اس نے اپنے بعض دوستوں کے خاکے لکھے تو اس کا جوہر خداداد اپنے پورے عروج پر نظر آنے لگا۔ خاص طور پر اس نے ''بے وقوف'' کے نام سے اپنا جو خاکہ لکھا اور اسکے علاوہ ابن انشا اور ساحر لدھیانوی کے جو خاکے اپنی کتاب ''آشنائیاں کیا کیا'' میں رقم کئے ہیں۔ انہیں بلاشبہ اردو ادب کے اعلیٰ ترین ادب پاروں میں شمار کیا جائے گا۔ ابن انشاء اور ساحر لدھیانوی' حمید اختر کے ہم وطن' ہم کتب اور بچپن کے دوست تھے اور وہ انہیں اپنے دل کی گہرائیوں سے محبت کرتا تھا۔

ساحر لدھیانوی کے خاکے میں وہ لکھتا ہے۔

''بمبئی میں ساحر کو بڑی جدوجہد کرنی پڑی۔ وہ ڈیڑھ برس تک نگار خانوں کے چکر لگاتا رہا' مگر اسے پورا یقین تھا کہ جب بھی موقع ملا' فلمی شاعری میں وہ سب کو پیچھے چھوڑ جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ مشہور میوزک ڈائریکٹر ایس ڈی برمن نئے ٹیلنٹ کی تلاش میں ہے تو وہ اس کے پاس پہنچ گیا۔ برمن صاحب نے گانے کی دھن سنائی۔ دوسری مرتبہ سنتے ہی اس نے گیت کا مکھڑا لکھ کر دیا۔

ٹھنڈی ہوائیں' لہرا کے آئیں

یہ مصرعہ برمن کو پسند آیا اور یہ گانا فلم ''نوجوان'' میں ہٹ ہو گیا۔ اس کے بعد ساحر اور برمن کی جوڑی نے بڑے یادگار گانے دیئے' جن میں سے چند ایک یہ ہیں۔

1۔ تدبیر سے بگڑی ہوئی تقدیر بنا لے
اپنے پہ بھروسہ ہے تو یہ داؤ لگا لے
2۔ سنو گجر کیا گائے
3۔ یہ رات یہ چاندنی پھر کہاں
4۔ جیون کے سفر میں راہی ملتے ہیں بچھڑ جانے کو
5۔ جانے وہ کیسے لوگ تھے جن کے پیار کو پیار ملا
6۔ جانے کیا تو نے کہی' جانے کیا میں نے سنی
7۔ اشکوں میں جو پایا ہے' وہ گیتوں میں دیا ہے
8۔ پربتوں کے پیڑوں پر شام کا بسیرا ہے
9۔ میں نے شاید تمہیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے
10۔ زندگی بھر نہیں بھولے گی وہ برسات کی رات

اب اس کے عروج کا دور شروع ہوا۔ 1948ء کے بعد 1978ء میں یعنی تیس برس بعد میری ساحر سے بمبئی میں ملاقات ہوئی۔ ساحر بدلا ہوا آدمی نہیں تھا۔ البتہ وہ ٹوٹا ہوا آدمی ضرور تھا۔ اس سے مل کر اس کے ساتھ رہ کر مجھے خوشی نہیں ہوئی۔ خوشی اس بات کی ضرور ہوئی کہ تیس برس بعد ایک پرانے دوست سے ملاقات ہوگئی ہے اور یہ کہ وہ خوشحال اور ملک گیر شہرت کا مالک ہو گیا ہے۔ خدا نے اسے بے پناہ دولت دی تھی' عزت دی تھی' لیکن مجھے یہی محسوس ہوتا کہ میرے سامنے جو آدمی (ساحر لدھیانوی) بیٹھا ہے۔ اس شخص کے وجود میں سے کچھ نکل کر غائب ہو چکا ہے۔ وہ صوفے پر نیم دراز اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے انتہائی قیمتی ساز و سامان کے سجے ہوئے کمرے میں' خلاؤں میں ادھر ادھر تکتا رہتا۔ میں نے کئی بار سوچا' کیا ایسا ہوتا ہے کامیاب آدمی؟ زندگی میں کامیابی' شہرت' عزت' دولت حاصل کرنے کی آرزو کیا وہ اسی دن کیلئے کر رہا تھا؟ بیماری نے اس کے خوف میں اضافہ کر دیا تھا۔ وہ گھر سے نکلتا ہی نہیں تھا۔ رات

کو بیڈ روم میں جا کر سوتا۔ شادی اس نے نہیں کی تھی۔ صبح سویرے ڈرائنگ روم میں ہی صوفے پر آ کر لیٹ جاتا۔ وہ سونے کیلئے جاتا تو اسے یہ خیال پریشان کرتا کہ رات کو دل کا دورہ پڑ گیا تو بیڈ روم میں سے اس کی آواز کسی تک نہیں پہنچ سکے گی۔ الہ آباد تک جہاں ساحر کے خاندان کے کچھ لوگ آباد تھے۔ سفر کرنا پڑتا تو یہ سفر دو گاڑیوں میں ہوتا۔ ایک گاڑی میں وہ اپنی والدہ اور بہن کے ساتھ بیٹھتا۔ دوسری خالی گاڑی پیچھے پیچھے چلتی تاکہ راستے میں گاڑی خراب ہو جائے تو دوسری استعمال میں لائی جا سکے۔ اسے ہفتوں میں کہیں جانا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن ڈرائیور کو حکم تھا کہ وردی پہن کر صبح آٹھ بجے ڈیوٹی پر آ جائے۔ شاید ڈاکٹر کو بلانے کی ضرورت پڑ جائے۔ اس کے گردے میں پتھری تھی جو آپریشن سے نکالی جا سکتی تھی مگر عارضہ قلب کی وجہ سے آپریشن ممکن نہ تھا۔ ساحر لدھیانوی نے زندگی کے آخری تین چار برس کچھ بیماری میں مبتلا ہو کر اور کچھ بیماری کو اپنے اوپر طاری کر کے اس کے خوف میں بسر کئے۔ اس کی حالت پر رحم آتا تھا۔ وہ دن بھر خلا میں تکتا رہتا۔ اس نے جو چاہا تھا اس سے زیادہ حاصل کر لیا تھا مگر سب کچھ پا کر بھی وہ تنہا تھا۔''

حمید اختر کے لکھے ہوئے یہ تین خاکے' بے وقوف' پینڈو اور بنجارہ بڑی زندہ تحریریں ہیں۔ ان میں حمید اختر کے سارے معصوم جذبے' اس کے دل میں موجزن بنی نوع انسان کیلئے بے پناہ محبتوں کا جذبہ پورے جذب و جوش کے ساتھ نمایاں ہے۔ یہ بڑی محبت' بڑی دردمند اور بڑی رقت آمیز کیفیتوں میں ڈوب کر لکھی گئی تحریریں ہیں۔ ایسی تحریریں اسے ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔

☆......☆......☆

شمس آغا......ایک ٹوٹا ہوا تارا

جواں مرگ' خوبصورت اور بنیادی طور پر رومانیت پرست افسانہ نگار' شمس آغا سے میرا پہلا غائبانہ تعارف مولانا صلاح الدین احمد کے جہازی سائز کے رسالے ''ادبی دنیا'' میں ہوا۔

میں ان دنوں شاید نویں یا دسویں جماعت میں تھا۔ ہمارے محلے میں کوتوالی والی عظیم الشان عمارت میں میونسپل کمیٹی کی لائبریری ہوا کرتی تھی۔ کتابوں سے بھری ہوئی اونچی اونچی الماریاں دیواروں کے ساتھ اور درمیان میں کھڑی تھیں۔ ان الماریوں کے درمیان دو دو کرسیوں والی میزیں لگی تھیں میں یہاں بیٹھ کر کتابیں پڑھتا' انگریزی کے رسالے دیکھتا اور ان رسالوں میں سے اپنی پسند کی تصویریں کاٹ کر قمیض کے اندر چھپا لیتا اور پھر ان تصویروں کو گھر آ کر اپنی چھوٹی سی الماری میں سنبھال کر رکھ لیتا تھا۔ میں نے کتاب کبھی چوری نہیں کی تھی مگر تصویریں بہت چوری کرتا تھا۔ یہ ساری تصویریں امرتسر والے مکان ہی میں رہ گئیں۔ ادبی رسالوں میں 'ادبی دنیا' میں بڑے شوق سے پڑھا کرتا تھا۔ کرشن چندر سے میں بڑا متاثر تھا اور کرشن چندر کے افسانے زیادہ تر اسی رسالے میں چھپتے تھے۔ ایک روز میں ''ادبی دنیا'' کا تازہ رسالہ لیکر الماریوں کے درمیان بچھی میز پر آ کر بیٹھ گیا اور یونہی ایک جگہ سے رسالہ کھول کر پڑھنے لگا۔ تحریر کی روانی اور رومانیت مجھے اپنے ساتھ بہائے لئے چلی گئی۔ پہلے میں یہی سمجھا کہ یہ کرشن چندر کا تازہ افسانہ ہے۔ مگر کرشن چندر سے وہ تحریر اس اعتبار سے ذرا مختلف تھی کہ اس میں جھنگ کے دیہاتی ماحول کی بڑی بے ساختگی سے اور قدرتی انداز میں تصویر کھینچی گئی تھی۔ میں نے جلدی سے صفحے پلٹ کر دیکھا تو افسانہ نگار کا نام شمس آغا لکھا ہوا تھا۔ یہ

میرے لئے ایک نیا نام تھا۔ شمس آغا نے بھی مجھے اپنے اسلوب نگارش کی خوشبو کا عاشق بنا لیا۔ اب میں ادبی دنیا کے نئے رسالے کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ نیا پرچہ آیا تو اس میں شمس آغا کا تازہ افسانہ بھی تھا اور اس کی تصویر بھی چھپی تھی۔ وہ بڑا اچھا لگا۔ افسانے کا نام میں بھول گیا ہوں۔ افسانے کے کردار بھی یاد نہیں رہے۔ اگر کچھ یاد رہا ہے تو شمس آغا کی تحریر کی مہک یاد رہی ہے جو ہر پیراگراف میں کسی نہ کسی تازہ کھلے ہوئے پھول سے طلوع ہو رہی تھی۔

میں نے ابھی کہانیاں لکھنا شروع نہیں کی تھیں۔ میونسپل کمیٹی کی لائبریری میں بیٹھ کر بڑے افسانہ نگاروں کی کہانیاں پڑھتا تھا۔ محبتیں کرتا تھا اور نیو تھیٹرز کی فلموں کے گیت گاتا۔ کبھی اداس اور کبھی خوش' کمپنی باغ کی سیریں کیا کرتا تھا۔ یاد نہیں شمس آغا کا وہ کون سا افسانہ تھا' میں نے اس میں سے کئی فقرے نقل کر کے ایک محبت بھرے خط میں درج کئے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اسی زمانے میں مولانا صلاح الدین احمد نے اپنے ادارے میں کرشن چندر کے ایک خط کا ذکر کیا تھا جس میں افسانہ نگار کرشن چندر نے مولانا سے کہا تھا کہ شمس آغا میرے سٹائل میں افسانے لکھتا ہے اسے منع کریں۔ مولانا نے بڑے دل نشیں انداز میں کرشن چندر اور شمس آغا کے فن کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ کرشن چندر صاحب کو غلط فہمی ہوئی ہے اور نوجوان افسانہ نگار شمس آغا کا اسلوب کئی پہلوؤں سے بالکل مختلف ہے۔

مجھے مولانا صلاح الدین احمد صاحب کا یہ تجزیہ بڑا پسند آیا تھا کیونکہ یہ ایک حقیقت بھی تھی کہ شمس آغا کا طرز نگارش اپنا تھا اور اس کی تحریر میں دور شجاعت کے محبت کرنے والوں کی جو دلیری اور بہادری کا بھرپور امتزاج تھا وہ کرشن چندر کی تحریر میں نہیں تھا۔ محبت کے جذبوں کا ذکر کرتے ہوئے شمس آغا ہاتھ نہیں آتا تھا۔ الفاظ پیچھے رہ جاتے تھے، جیسے قلم اس کے ہاتھ سے نکل جاتا اور گرد کے بگولوں میں کبھی شاہ سوار سرپٹ گھوڑے دوڑاتے پرانے قلعوں کی طرف جاتے نظر آتے اور کبھی کسی قدیم محل کی بالکونی سے محبت کے اداس گیت کی آواز سنائی دیتی اور کبھی ساکت جھیل کے پانی میں چاند کا چپ چاپ زرد چہرہ حیرت کے عالم میں تکتا نظر آتا۔

شمس آغا کے پاس بڑے رنگ تھے گہرے بے ساختہ گرم اور گفتگو کرتے رنگ، اس کے سارے رنگ پال گوگیں اور وان گو کے رنگ تھے۔ ان رنگوں میں فطرت کی بے خوفی اور جنون تھا، جذبہ تھا۔ اس زمانے میں بھی مجھے شمس آغا کے افسانے پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا تھا کہ افسانہ ختم ہو گیا ہے مگر شمس آغا ابھی بول رہا ہے۔ رسالے کے صفحے پر الفاظ ختم ہو جاتے مگر مجھے افسانہ نگار کی آواز برابر سنائی دیتی تھی جیسے اس نے قلم پھینک دیا ہے اور افسانہ سنائے چلا جا رہا ہے۔

یہ کہانی اتنی جلدی ختم ہو جائے گی' شمس آغا عین عالم شباب میں اردو ادب سے بچھڑ جائے گا' یہ کبھی کسی کے گمان میں بھی نہیں آیا تھا۔ مگر اس کارگاہ عالم میں قدرت کی کچھ اپنی منصوبہ بندیاں ہوتی ہیں۔ کسی کی مجال نہیں کہ ان میں ذرا سا بھی رد و بدل کر سکے۔ قدرت کو جو منظور تھا ہو کر رہا اور شمس آغا نوجوانی کی عمر میں حیرت انگیز افسانے لکھتا لکھتا غائب ہو گیا۔

اس نے اپنی زندگی کا آخری خط 1945ء میں پنجاب ہوٹل دلی سے اپنی ہمشیرہ کے نام لکھا۔ اس خط کا عکس مجھے شمس آغا کے چھوٹے بھائی جمال الرحمٰن درانی کی وساطت سے ملا جو میں یہاں درج کرتا ہوں۔

پنجاب ہوٹل دہلی

3 دسمبر 45ء

پیاری بہن شمشاد سلامت رہو!

میرے لاہور سے یوں اچانک غائب ہو جانے سے نہ جانے وزیر آغا پر کیا گزری ہو اور پھر جب آپ لوگوں کو معلوم ہوا ہو تو خدا معلوم ..... خیر بہرحال میں تصور اور احساس کر سکتا ہوں میں نے جو کچھ کیا ہے سوچ سمجھ کر کیا ہے ..... آپ پر جو چند دن خوفناک گزرے ہوں گے ان کے لئے معذرت طلب ہوں اور آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں بخیر و عافیت ہوں اور انشاء اللہ بدستور خوش اور صحت مند رہوں گا۔ آپ ہرگز کسی قسم کا فکر نہ کریں کیونکہ میں نے جو قدم اٹھایا ہے اپنے لئے ایک زیادہ زندہ' ذمہ دار مستقبل پیدا کرنے کے

لئے اٹھایا ہے۔ میں دو روز دہلی میں ٹھہرنے کے بعد سیدھا کلکتہ جاؤں گا اور اس ہنگامے سے نبرد آزما ہونے کی کوشش کروں گا جس سے مجھ سے چھوٹا بھائی جمال پنجہ آزمائی کرتا رہا ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم خالہ اور دیگر بھائی بہنیں متفکر نہیں ہوں گی۔ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے کامیاب کرے۔ میری بڑی اچھی چھوٹی بہن! تمہارا بھائی تمہیں کبھی نہیں بھول سکتا۔ اب جس طرح جمال کے معاملے میں تم نے اسے امریکہ بھیجنے پر رضامندی کا اظہار کر کے کمال جرأت کا ثبوت دیا ہے اسی طرح اس معاملے میں بھی حوصلہ مندی سے کام لینا...... میرے ارادے بھی بہت بلند ہیں۔ اگر کلکتے میں خاطر خواہ نوکری مل گئی تو بہتر، ورنہ میں تو گھر سے اسی ارادے سے نکلا ہوں کہ اگر مجھے امریکہ جانا پڑا تو بھی پیچھے نہیں ہٹوں گا۔

یہاں دہلی میں دن بھر خوب سیر کرتا رہا ہوں اور تم بہنوں کے لئے تھوڑی سی خریداری بھی کی ہے۔ چھوٹے چھوٹے تحفے ہیں۔ تمہیں بذریعہ پارسل مل جائیں گے۔ میں نے سہارن پور سے دو تار بھیجے تھے۔ ایک وزیر آغا کے نام لاہور مرزا انور علی کی معرفت اور دوسرا تار آغا بابا جی کے نام تھا جس میں اپنی خیر خیریت سے آگاہ کیا تھا۔ امید ہے دونوں تار مل گئے ہوں گے اس لئے کل ایک اور تار دینے کا ارادہ ہے۔ میرے پاس کافی روپے ہیں۔ میرے پاس کمبل بھی ہے۔ گرم کوٹ، سویٹر اس کے علاوہ پاجامہ، قمیض اور خاکی پتلون بھی ہے۔ اب جس جگہ پنجاب ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں وہاں کافی سہولت ہے۔ آج صبح کے علاوہ شام کو بھی دلی شہر کی سیر کی۔ لوگ ناواقف ہیں۔ ابھی تو کسی سے میل ملاقات نہیں ہوئی۔ آگے دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے یہاں صرف ریڈیو سنتا ہوں تو کسی اداس گانے پر اداس ہو جاتا ہوں۔ تم لوگ یاد آ جاتے ہو۔ ابھی ابھی چائے والا لڑکا پوچھ گیا ہے۔ اچھا میری عزیز ترین بہن اب مجھے اجازت دو۔ میں خط بند کرتا ہوں۔ خالہ کی خدمت میں اس ہنگامے اور

تکلیف کے لئے ہزاروں معذرتیں۔ بزرگوں کی خدمت میں سلام۔

تمہیں ہمیشہ یاد رکھنے والا بھائی۔

”شمس“

شمس آغا کا اپنی عزیز بہن کے نام یہ آخری خط تھا۔ بقول جمال صاحب افسانہ نگار شمس آغا کو گھر میں سب پر فوقیت حاصل تھی۔ دادا جان نے اس کا نام اپنے پیر و مرشد کے نام پر رکھا تھا۔ شمس بنیادی طور پر سائنس کا طالب علم تھا۔ گھر میں چھوٹی سی لیبارٹری بنا رکھی تھی۔ ڈاک کے پرانے ٹکٹ جمع کرنا، شکار کھیلنا اس کے مشاغل تھے۔ بہت کم گو اور حساس طبیعت کا مالک تھا۔ 1938ء میں مشن ہائی سکول گجرات سے میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ انٹر کالج گجرات میں داخلہ لیا اس کی پہلی کہانی رکابی کیوں کر ٹوٹی ماہنامہ ”ہمایوں“ لاہور کے 1941ء کے شمارے میں چھپی۔ دادا جان نے اسے سٹیوسن الیکٹریکل کالج راولپنڈی میں داخلہ لے دیا' جہاں سے اس نے سٹی اینڈ گلڈز لندن کا ڈپلومہ حاصل کیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ گھر سے دور ایک کرائے کے کمرے میں اپنے ایک ہم جماعت کے ساتھ رہا۔ 1942ء میں بندوق میں کارتوس بھرتے ہوئے بارود پھٹنے سے بری طرح جھلس گیا اور ایک عرصے تک موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہا۔ دادا جان کی وفات کے بعد 1942ء میں دوبارہ ٹیلی فون کے محکمے میں فیصل آباد میں ملازمت کی۔ اس دوران شمس آغا کا کارزار عشق و محبت سے بھی گزر ہوا لیکن حالات کی مجبوری نے گریز پائی پر مجبور کیا۔ شمس آغا نے پنجاب کے میدانوں اور کشمیر کی وادیوں میں عوام کے دلوں کی دھڑکنیں ان کی جھونپڑیوں اور بستیوں میں تلاش کیں اور شب روز ان کی پسماندہ زندگیوں کا گہرا مطالعہ کیا۔ جبر و استبداد، ظلم و درندگی کو قریب سے دیکھا۔ بھوک، پریشان حالی، گریہ و زاری اور بنی نوع انسان کی تذلیل بھی دیکھی اور ان کے دلوں کی دھڑکنوں کو اپنی کہانیوں میں سمیٹا۔ اس کے افسانوں میں جو وہ زیادہ نہ لکھ سکا ایک طرف محبت اور رومان کی چاشنی تھی تو ساتھ ہی زہر میں ڈوبے ہوئے غربت کے حالات کی عکاسی بھی تھی۔ شمس آغا کبھی کبھی آدمی رات کو اٹھ کر لکھنا شروع کر دیتا اور گھنٹوں لکھتا رہتا۔

اپریل 1944ء میں اس کا پہلا باقاعدہ ادبی افسانہ خواب ماہنامہ ”ادبی دنیا“

میں شائع ہوا۔ مولانا صلاح الدین احمد نے بزم ادب میں اس کے بارے میں یوں اظہار خیال کیا۔

"خلیل الرحمٰن صاحب کی طرح شمس آغا صاحب بھی ہماری بزم ادب میں نووارد ہیں لیکن ان کا دل فروز افسانہ "خواب" پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا فکر اور ان کی نگارش تربیت کی بہت سی منزلیں طے کر چکی ہے۔ خواب کی پاکیزہ گھریلو فضا اور ان کا فنکارانہ تار و پود ہمارے خیال کو بیک وقت فیاض محمود اور ممتاز مفتی کی طرف منتقل کرتا ہے۔ شمس آغا کے فن میں اردو کے ان دونوں افسانہ نگاروں کی ممتاز خصوصیات یک جا نظر آتی ہیں اور اگر انہوں نے سوچنے اور لکھنے کا مشغلہ جاری رکھا تو ایک دن شمس آغا کا شمار اردو کے بڑے افسانہ نگاروں میں ہونے لگے گا۔"

اس کے بعد شمس آغا تیزی سے افسانے لکھتا چلا گیا۔ 45-1944ء میں اس کے شاہکار افسانے "صبح و شام، کہاں، شکست، فریب آرزو اور وادی زعفران" رسالہ "ادبی دنیا" میں شائع ہوئے اس نے اتنی کم عمری میں برصغیر میں اپنا ایک مقام بنا لیا۔ ابھی شمس آغا اپنے ناول "دل ناداں" پر ابتدائی کام کر رہا تھا کہ ایک جوار بھاٹا آیا اور اسے ان گہرے پانیوں میں لے گیا جہاں سے کبھی کوئی واپس نہیں آیا۔ جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے!

2 دسمبر 1945ء کا دن تھا۔ اس روز شمس آغا نے اپنے افسانوں کا مسودہ مولانا صلاح الدین احمد کے حوالے کیا اور خود اسی شام بذریعہ ٹرین عازم دہلی ہوا۔ جہاں دو روز پنجاب ہوٹل میں قیام کیا۔ اپنی چھوٹی بہن کے نام اپنا آخری خط لکھا اور اس کے بعد اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ ہم شمس آغا کو اپنا آخری سلام کہنے پر مجبور ہیں۔ اس کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلے جانے کے بعد اس کا تھیلا یا اٹیچی کیس مولانا صلاح الدین احمد کے ہاتھ آ گیا۔ جس میں اس کے نا تمام ناول "دل ناداں" کے چند باب لکھے ہوئے پڑے تھے۔

یہ باب ماہنامہ "ادبی دنیا" میں "دل ناداں، ایک رات، دیار محبوب میں ایک

دن اور محبوب کے ساتھ چند لمحے" کے عنوانات سے شائع ہوئے۔ اس کے بعد مولانا نے ادبی دنیا میں "شمس آغا...... ایک ٹوٹا ہوا تارا" کے عنوان سے بصیرت افروز مضمون لکھا جس میں شمس آغا کی زندگی اور اس کے فن کا ایک تقابلی جائزہ بڑے مؤثر انداز میں پیش کیا۔ یہ مضمون مولانا صلاح الدین احمد نے حلقہ ارباب ذوق لاہور کے اجلاس میں پڑھا اور ماہنامہ ادبی دنیا کے مارچ 1950ء کے شمارے میں چھپا۔

شمس آغا کی گمشدگی کے بارہ سال بعد 1957ء میں اکادمی پنجاب نے اس کے افسانوں کا مجموعہ "اندھیرے کے جگنو" شائع کیا۔ یہ شمس آغا کا پہلا اور آخری مجموعہ ہے۔ شمس آغا اپنی چھوٹی سی عمر میں اردو ادب کو ہمیشہ زندہ رہنے کے لئے کچھ افسانے دے گیا ہے۔ شمس آغا کی زندگی کے بارے میں، میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ میں نے ان مضامین میں سے لیا ہے جو اب اس کے بارے میں مختلف ادبی رسائل میں شائع ہونے لگے ہیں۔ میں ذاتی طور پر شمس آغا سے کبھی نہیں ملا اور میں نے اسے دیکھا بھی نہیں۔ صرف اس کی تصویر دیکھی تھی جو قیام پاکستان سے پہلے "ادبی دنیا" میں چھپی تھی' جو اس کی کتاب کے پیچھے بھی چھپی ہوئی ہے۔

شمس آغا اور مجھ میں دو تین باتیں بڑی ملتی جلتی ہیں۔ وہ رومانیت پرست ادیب تھا اور میں بھی رومانیت پسند ادیب ہوں۔ جب اس نے پہلا افسانہ لکھا تو وہ بھی نوعمر' خوش لباس اور خوش شکل تھا اور پہلے افسانے سے مشہور ہوا' میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ محبتیں اس نے بھی کیں اور ناکام ہوا۔ محبتیں میں نے بھی کیں اور آلام و مصائب کا شکار ہوا۔ وہ بھی گھر سے بھاگ کر دہلی، بمبئی اور کلکتے کی آوارہ گردیاں کرتا رہا' میں بھی کم عمری میں گھر سے پیسے چرا کر بھاگا اور بمبئی اور کلکتے کی سڑکوں کی خاک چھانتا رہا۔ شمس آغا کی زندگی میں بمبئی کے ساحل سمندر چوپاٹی کی بڑی اہمیت ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں یہ جواں مرگ افسانہ نگار گھنٹوں بیٹھا سمندر کی لہروں کو دیکھتا رہتا تھا۔ یہاں بیٹھ کر سمندر کی لہروں کو میں نے بھی بہت دیکھا ہے۔ جب مجھے پہلی بار اتنے بڑے شہر میں دو دن کا فاقہ آیا تو میں اسی جگہ میرن ڈرائیو کے سامنے سمندر کے ساتھ ساتھ دور تک جاتی پتھر کی دیوار پر بیٹھا سمندر کی لہروں کو دیکھ رہا تھا۔ میری عمر زیادہ سے زیادہ سولہ سترہ برس کی ہوگی۔ اس زمانے سے ہی مجھ میں بھوک برداشت کرنے کی بہت

زیادہ طاقت تھی۔ اس خیال سے مجھے عجیب قسم کی روحانی خوشی محسوس ہو رہی تھی کہ میری روح آہستہ آہستہ مادے پر فتح حاصل کر رہی ہے اور مادی آلائشوں سے پاک ہوتی جا رہی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد میں نے خود افسانے لکھنے شروع کر دیئے اور مجھے شمس آغا کے بارے میں مزید معلومات حاصل ہوئیں۔ پھر مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ اپنی زندگی کے آخری لمحات میں شمس آغا چوپاٹی پر سمندر کے کنارے بیٹھا دیکھا گیا تھا۔ تب میری آنکھوں کے سامنے بمبئی کے ساحل سمندر کا منظر آ گیا اور میں نے اس پتھریلی دیوار کو دیکھا جس کی دوسری طرف بڑے بڑے پتھر ڈال دیئے گئے تھے اور جن کے ساتھ سمندر کی بپھری ہوئی موجیں دور دور سے آ کر ٹکراتی اور جھاگ اڑاتی تھیں۔ ایک ہیجان خیز سمندر شمس آغا کے سامنے تھا۔ ایک ہیجان خیز سمندر اس کے اندر موجزن تھا۔ دونوں سمندروں کی منزل ایک ہی تھی۔ دونوں سمندر ایک دوسرے سے ملنے کو بے تاب تھے۔

اردو ادب کے تذکروں میں افسانہ نگار شمس آغا کا ذکر نہیں ملتا۔ ایک وقت آئے گا جب ادبی تذکرے کہیں نہیں ملیں گے تب مستقبل کی ایک داستان سرائے کا دروازہ کھلے گا۔ نیا داستان گو ہوگا، نئے سننے والے ہوں گے، اجنبی چراغوں کی روشنی ہو گی، ان دیکھے پھولوں کی خوشبوئیں ہوں گی اور پھر داستان گو ایک کہانی بیان کرنا شروع کرے گا اور یہ کہانی شمس آغا کی کہانی ہوگی۔

☆......☆......☆

صلاح الدین محمود...... یادِ یارِ مہربان

پاکستان کے علمی ادبی حلقوں میں صلاح الدین محمود کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ اگرچہ وہ بے حد کم آمیز ہیں اور گوشہ گمنامی میں بیٹھ کر کام کرنے کے قائل ہیں لیکن جب ایک آدمی خواہ مکان کی پچھلی کوٹھڑی میں ہی بیٹھ کر گلاب کا عطر بناتا ہے تو اس کی خوشبو تو محلے میں ضرور پھیلتی ہے۔ اسی خوشبو کے حوالے سے صلاح الدین محمود ایک شاعر اور دانشور کی حیثیت میں جانا پہچانا نام ہے۔ دس برس تک انہوں نے رسالہ ''سویرا'' کو ایڈٹ کیا اور اس ترقی پسند رسالے کو اپنے وطن پاکستان کے تمام رنگوں اور خوشبوؤں سے آشنا کرایا۔ جیسا کہ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں۔ صلاح الدین محمود علی گڑھ کے تعلیم یافتہ ہیں اور پیشے کے لحاظ سے الیکٹرک انجینئر ہیں اور پاکستان میں واپڈا کے کئی پراجیکٹس پر کام کر چکے ہیں۔ وہ میرے گھر کے پاس ایک مکان چھوڑ کر رہتے ہیں۔ ہماری ملاقات ہفتے میں ایک بار صرف اتوار کو ہوتی ہے کیونکہ وقت کو ضائع کرنا وہ گناہ سمجھتے ہیں اور جہاں تک میرا معاملہ ہے تو میرے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہے کہ میں ضائع کروں۔ مجھے روزانہ دس گھنٹے کام کرنا ہوتا ہے اور میں عید کے دن بھی چھٹی نہیں کر سکتا۔ اتوار کو مجھے ریڈیو سٹیشن ریکارڈنگ کیلئے جانا ہوتا ہے۔ ریڈیو سے میرا بڑا پرانا ناطہ ہے اور میں اس رشتے ناطے کو زندگی بھر نبھانا چاہتا ہوں۔ صلاح الدین کو بھی اتوار کے روز سائٹ پر جانا ہوتا ہے چنانچہ ہمارا یہ معمول سا بن گیا ہے کہ اتوار کے روز ہم صبح آٹھ بجے گھر سے نکلتے ہیں۔

سب سے پہلے پاک ٹی ہاؤس پہنچتے ہیں۔ وہاں بیٹھ کر نو بجے تک چائے پیتے ہیں، باتیں کرتے ہیں پھر صلاح الدین محمود مجھے ریڈیو پاکستان چھوڑ کر اپنے کام پر

روانہ ہو جاتے ہیں۔

اسی موسم کا ذکر ہے ہم دونوں ٹی ہاؤس میں اتوار کے دن معمول کے مطابق بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ صلاح الدین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں آپ کو ایک آدمی سے ملوانا چاہتا ہوں۔''

میں تھوڑا حیران ہوا کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ صلاح الدین کم آمیز ہیں زیادہ لوگوں سے نہیں ملتے۔ اپنے تخلیقی کام میں مصروف ہیں۔ میں نے پوچھا۔

''کیا وہ کوئی خاص قسم کے آدمی ہیں؟''

صلاح الدین نے اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

''مجھے خاص آدمیوں کی تو پہچان نہیں ہے مگر جن صاحب سے میں آپ کو ملوانا چاہتا ہوں ان سے مل کر یقیناً آپ خوش ہوں گے کیونکہ مجھے بھی ان سے مل کر بڑی خوشی ہوئی تھی۔''

میرا اشتیاق بڑھا تو صلاح الدین محمود چائے کا ہلکا سا گھونٹ بھر کر بولے۔

''گزشتہ موسم گرما میں ایک کتاب کی تلاش کے سلسلے میں میرا لاہور کے جرمن کلچر سنٹر میں جانا ہوا۔ وہاں اتفاق سے میرے ایک پرانے دوست مل گئے۔ ان کے ہمراہ دبلے پتلے، تیکھے نقوش اور ذہین آنکھوں والے ادھیڑ عمر کے ایک اور صاحب بھی تھے۔ انہوں نے مجھ سے ان کا تعارف کروایا کہ یہ ہمارے دوست محمد اسحاق میر ہیں۔ میں نے رسمی طور پر میر صاحب سے مصافحہ کیا اور اپنے دوست سے باتیں کرنے لگا۔ اتنے میں کاؤنٹر پر کلچرل سنٹر کے ایک جرمن اہلکار آ گئے۔ میرا دوست ان سے انگریزی میں کسی کتاب کے بارے میں گفتگو کرنے لگ گیا۔ میر صاحب انگلیوں میں سگریٹ دبائے ہاتھ کی مٹھی بنا کر بڑی بے نیازی سے کش لگا رہے تھے۔ میرے دوست نے اس جرمن اہلکار کی طرف سے توجہ ہٹا کر میر صاحب کی طرف دیکھا اور کہا میر صاحب میں چاہتا ہوں کہ کتاب کے بارے میں آپ انہیں تفصیل سے بتا دیں۔ میر صاحب نے ہلکی سی چٹکی بجا کر سگریٹ کی راکھ جھاڑی اور جرمن اہلکار سے کسی ایسی زبان میں گفتگو کرنے لگے جو میری سمجھ سے باہر تھی۔ نہ وہ انگریزی زبان تھی اور نہ فرنچ میرے دوست نے میرے تحیر کو بھانپ لیا اور مسکرا کر کہا۔ میر صاحب جرمن زبان میں گفتگو کر رہے ہیں۔

میں نے دیکھا کہ میر صاحب اتنی آسانی اتنی روانی سے جرمن زبان بول رہے تھے کہ جرمن اہلکار کے چہرے پر بھی حیرت کے آثار ابھر آئے تھے۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ ایک پاکستانی کسی جرمن والے کے ساتھ بے تکان جرمن زبان بول رہا ہے...... کلچرل سنٹر سے نکل کر ہم ایک ریستوران میں پل بھر کے لئے بیٹھ گئے۔ معلوم ہوا کہ میر صاحب کو جرمن زبان پر بڑا عبور حاصل ہے۔ یہ کوئی ایسا وصف نہیں تھا کہ جو مجھے میر صاحب کی طرف بے اختیار کھینچ کر لے جاتا۔ جب باتوں ہی باتوں میں معلوم ہوا کہ محمد اسحاق میر صاحب نے زندگی کا بلکہ جوانی کا بیشتر وقت کلکتے میں گزارا ہے تو مجھے ان سے دلچسپی ہوئی کیونکہ کلکتہ ایک زمانے میں مسلم کلچر، مسلم سیاست اور مسلم علم و ادب کا مرکز رہ چکا تھا۔ میں نے بڑے شوق سے پوچھا۔ میر صاحب! کلکتے میں آپ کن کن سے ملے تھے۔ میر صاحب نے چٹکی بجا کر سگریٹ کی راکھ جھاڑی اور ذرا سا مسکرا کر کہا۔ وہاں کانن دیوی کو ایک بار دیکھا تھا۔ میں تو میر صاحب کو دیکھتا رہ گیا۔ اس کے بعد میں تھا اور میر صاحب تھے۔ انہوں نے 58 سال کی عمر میں لاہور میں بیٹھ کر بے سرو سامانی کے عالم میں جرمن زبان سیکھنے کا عزم کیا اور سخت محنت اور قابل قدر لگن کے ساتھ یورپ کی اس مشکل ترین زبان میں اتنی مہارت پیدا کر لی کہ جرمنی کے ممتاز دانشور اور نامور شاعر بھی ان کی جرمن زبان پڑھ کر اور سن کر حیران ہو گئے۔ فرینکفرٹ کی ادبی انجمن نے میر صاحب کو وہاں بلوایا۔ وہاں کے اس وقت کے سب سے مشہور اور ممتاز جرمن شاعر ائرنیسلس برگر نے انہیں اپنے ہاں ٹھہرایا۔ محمد اسحاق میر نے فرینکفرٹ کے ادبی اجلاس میں جرمن زبان میں اقبال اور گوئٹے پر مقالے پڑھے۔ وہ لوگ یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ ایک پاکستانی دانشور نے ان کی زبان پر اس قدر مہارت حاصل کر رکھی ہے۔

صلاح الدین محمود نے اپنی بات ختم کی تو میں نے کہا۔

''آپ نے پہلے میر صاحب کو مجھ سے ملوانے کا کیوں نہ سوچا۔''

صلاح الدین بولے۔ ''بھائی میں یہ سوچ کر چپ ہو جاتا کہ آپ عدیم الفرصت آدمی ہیں اور میری طرح لوگوں سے بہت کم ملتے ہیں۔'' بہرحال ایک روز وہ میر صاحب کو لے کر میرے گھر تشریف لائے۔ میر صاحب کی وضع قطع بالکل پرانے

کشمیریوں والی تھی۔ کوئی بناوٹ، کوئی تکلف نہیں تھا۔ سگریٹ لئے صوفے میں یوں سکون کے ساتھ دھنس کر بیٹھے تھے جیسے اپنے گھر کے دوسرے کمرے میں آ گئے ہوں۔ ان کا یہ اپنائیت کا انداز مجھے بڑا اچھا لگا۔ مجھے میر صاحب سے مل کر بڑی خوشی ہوئی اور اس سے زیادہ خوشی ان کے ساتھ چائے پی کر ہوئی۔ جرمن ادب پر باتیں ہونے لگیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ علامہ اقبال سے تو گوئٹے کے ''ایوان مغرب'' کے حوالے سے وہاں کے دانشور ضرور واقف ہوں گے۔ میر صاحب نے سگریٹ کی راکھ راکھدان میں گراتے ہوئے کہا۔ ''وہاں ہائیڈل برگ میں ایک سڑک کا نام علامہ اقبال کے نام پر رکھا گیا ہے اور علامہ اقبال کا ایک مجسمہ بھی نصب ہے۔ علامہ کی بہت سی نظموں کے جرمن زبان میں تراجم بھی ہوئے ہیں۔'' میر صاحب کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ خود بڑے کم آمیز ہیں اور بہت کم لوگوں سے ملتے ہیں۔ بس اپنے کام میں معروف رہتے ہیں۔ اس کے باوجود میر صاحب دو بار میرے ہاں تشریف لائے جس کیلئے میں ان کا بڑا شکر گزار ہوں۔ جو تھوڑا بہت جرمن ادب ہم نے پڑھا ہے تو انگریزی میں ہی پڑھا ہے۔ میں نے تھامس مان کی کچھ کہانیوں کے ترجمے پڑھے ہیں۔ لیکن مجھے سب سے زیادہ جس جرمن افسانہ نگار نے متاثر کیا وہ ہرمن ہی سے تھا۔ میر صاحب نے کہا۔ ''اگر آپ اس کے ادب کی گہرائی تک جانا چاہتے ہیں تو اسے جرمن زبان میں پڑھیں۔ انگریزی میں ترجمہ ہو کر وہ آدھا جرمنی میں ہی رہ جاتا ہے۔''

میر صاحب کچھ دیر بیٹھ کر تشریف لے گئے۔

اگلی اتوار کو میں اور صلاح الدین محمود پاک ٹی ہاؤس میں بیٹھے میر صاحب ہی کی باتیں کر رہے تھے۔ صلاح الدین محمود چائے بناتے ہوئے کہنے لگے۔

یہ کتنی فخر کی بات ہے ہم پاکستانیوں کیلئے کہ میر صاحب کی جرمن زبان و ادب پر مہارت سے متاثر ہو کر جرمن دانشوروں نے خود میر صاحب کو جرمنی آنے اور جرمن ادب پر لیکچر دینے کی دعوت دی اور کس قدر افسوس کی بات ہے کہ یہاں کے جرمن کلچرل سنٹر کی طرف سے ایسے لوگوں کو سرکاری خرچ پر جرمنی بھجوایا جاتا ہے جو انگریزی میں ترجمہ شدہ جرمن ادب سے بھی ناواقف ہیں۔ اس کی میں آپ کو بڑی دردناک مثال سناتا ہوں۔ یہ میرے سامنے کا واقعہ ہے۔ لاہور میں بھارت کے ملک سے ایک

ایسی ادیبہ اور نقاد خاتون آئیں جنہوں نے فرانسیسی زبان میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے رکھی تھی۔ یہ محترمہ لاہور کی ایک نام نہاد شاعرہ اور دانشور خاتون کے ہاں کھانے پر مدعو تھیں۔ لاہور کی اس نام نہاد شاعر خاتون کو آپ بھی جانتے ہیں۔ وہ اپنی پارٹیوں کی وجہ سے مشہور ہیں۔ بہر حال کھانے کے بعد یہ خاتون بھارتی ادیبہ سے فرانسیسی لٹریچر پر بڑے سطحی انداز میں گفتگو کرنے لگیں۔ اب اس ترقی پسند لاہوری خاتون کی بلا جانے کہ فرانسیسی ادب کہاں سے شروع ہوتا ہے اور کہاں جا کر ختم ہوتا ہے اور بات وہ اس عورت سے کر رہی تھی جس نے فرانسیسی ادب پر ڈاکٹریٹ کی ہوئی تھی۔ لو جناب وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ اس ترقی پسند لاہوری شاعرہ نے بھارتی ادیبہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ آپ کو تو فرانسیسی زبان پر پورا عبور ہو گا۔ بھارتی ادیبہ نے جواب میں کہا ظاہر ہے جس زبان پر مقالہ لکھنا ہو اسے پڑھنا اور اس پر عبور حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس ترقی پسند لاہوری شاعرہ نے کہا۔ ''تب تو آپ نے ہرمن ہیس کو اوریجنل فرانسیسی زبان میں پڑھا ہو گا۔''

یہ سننا تھا کہ وہاں جو دو چار پڑھے لکھے لوگ بیٹھے تھے ان پر سکتہ طاری ہو گیا۔ میں بھی شرم سے پانی میں گڑ گیا۔ بھارتی ادیبہ کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا کیونکہ ترقی پسند شاعرہ نے جس ناول نگار کے بارے میں یہ بات کی تھی وہ فرانسیسی نہیں بلکہ جرمن تھا...... اور یہ نام نہاد لاہوری ترقی پسند شاعرہ سرکاری خرچ پر ادیبوں کے ایک وفد کے ساتھ جرمن کا چکر بھی لگا چکی تھیں۔ میں نے اس واقعہ کا ذکر محمد اسحاق میر صاحب سے کیا تو انہوں نے چٹکی بجا کر سگریٹ کا گل جھاڑا اور کہا۔ ''ایسا تو ہر دور میں ہوتا رہتا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔''

آج میں اسی قبیل کے انسان سے آپ کا تعارف کروا رہا ہوں۔ اس کا نام محمد اسحاق میر ہے۔ محمد اسحاق میر ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ 1924ء میں جبکہ دس برس کے تھے والد فوت ہو گئے اور یہ اپنی بڑی ہمشیرہ کے پاس ناگپور چلے گئے...... وہیں انہوں نے دسویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ یہ خلافت کا دور تھا اور مسلمانوں کے واسطے ملازمت کے بحران کا زمانہ تھا۔ سو بڑی جدوجہد اور انتظار کے بعد ایک ملازمت کا سراغ ملا اور میر صاحب ایسٹ انڈین ریلوے پریس کلکتہ میں بطور نائب پروف ریڈر

ملازم ہو گئے۔

یہ واقعہ 1938ء کا ہے۔ پاکستان کے قیام تک میر صاحب کلکتے میں ہی رہے اور پھر پاکستان بننے کے بعد چٹاگاؤں کے ایک مہاجر کیمپ سے ہوتے ہوئے لاہور پہنچ گئے۔ یہاں وہ ریلوے پریس ہی سے بحیثیت سپرنٹنڈنٹ 1972ء میں سبکدوش ہوئے۔

اگر بات یہاں تک ہی رہتی تو نہ آج مجھ کو ان سطور کے لکھنے کی سعادت نصیب ہوتی اور نہ ہی آپ اس وقت ان کو پڑھنے کی زحمت گوارا کر رہے ہوتے۔ مگر یہاں پہنچ کر 59/58 برس کے تھکے ہارے بیمار انسان کو وہ عشق ہوا کہ جس کی وساطت سے ہم آج ان کو جانتے ہیں...... ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد میر صاحب نے ایک شام، ایک دوست کے گھر یونہی ایک کتاب کو کھولا اور جب غور سے دیکھا تو علم ہوا کہ وہ کتاب تو انگریزی کی بجائے کسی اور زبان میں لکھی ہوئی تھی۔ محمد اسحاق میر کا کہنا ہے کہ جرمن زبان کی یہ پہلی کتاب تھی جو انہوں نے دیکھی۔ اس کتاب کے بند ہونے سے پہلے ان کے مقدر کا فیصلہ ہو چکا تھا اور اب جرمن زبان پر مکمل قدرت اور جرمن تاریخ، تہذیب و تمدن سے شناسائی ان پر عائد ہو چکی تھی۔

اگلے چار برس میر صاحب بالکل تنہا اس کام میں لگے رہے اور آخر اس حیرت انگیز حد تک کامیاب ہو کر ظاہر ہوئے کہ آج ان کی لکھی اور بولی ہوئی جرمن زبان کو جرمنی کے مشہور ناقدین، اساتذہ، شاعر اور ادیب تک مستند سمجھتے ہیں اور سکہ بند اور تخلیق کے فن سے آشنا گردانتے ہیں۔

اب یہاں یہ بھی ایک کمال ہے کہ میر صاحب نے اس گوشہ تنہائی میں ضعیف العمری اور ڈھلتی ہوئی صحت اور حالات کے ناگفتہ بہ ہونے کے باوجود بغیر کسی ذہنی یا مالی امداد کے اس کام کو جاری رکھا اور اسے اوج کمال سے ہمکنار کیا۔ اس دوران انہوں نے کبھی یہ نہ سوچا کہ آخر وہ یہ کام کیوں کرتے ہیں یا یہ کہ اس نہایت ہی مشکل زبان کا حصول ان کے کس کام آئے گا...... آخر عاشق صادق اس قسم کے سوالات کب پوچھتا ہے اور شاید یہی وہ وصف ہے کہ جو انسان کو حقیقت نہ رکھنے کے باوجود حقیقی بناتا ہے اور بہرکیف قائم رکھتا ہے۔ جب تقریباً چھ ماہ ہوئے، ایک دوست کی وساطت سے ان سے

ملاقات ہوئی اور مجھ کو ان کی داستان کا علم ہوا تو پھر میں نے جسارت کر کے ان سے جرمن زبان سے براہ راست تراجم کرنے کی درخواست کی۔

کچھ پس و پیش کے بعد وہ راضی ہو گئے اور انہوں نے ''سویرا'' کے لئے جرمن زبان کے کچھ کلاسیکی شاہکار ترجمہ کئے۔ جرمن ادیب ہرمن ہیسے میر صاحب کو بہت پسند ہیں اور ایزسیلس برگر ان کے دوست ہیں۔ جہاں تک جرمن زبان کو بولنے کا تعلق ہے محمد اسحاق میر پاکستان میں مقیم ایک جرمن خاتون (FARU KARIN JUNGBLUTH) کی محنت اور خلوص کا اعتراف کرتے ہیں کہ جنہوں نے ان کے تلفظ کو درست کیا۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی صحت کو قائم رکھے اور ان کی عمر کو دراز فرمائے۔ محمد اسحاق میر صاحب ہمارے وطن عزیز کے نوجوانوں کے لئے ایک قابل فخر اور قابل تقلید مثال ہیں۔ جس عمر میں آدمی اپنے جہاز کے بادبان لپیٹ کر کسی پرسکون جزیرے میں گوشہ عافیت تلاش کرنے لگتا ہے میر صاحب اس عمر میں نئے نئے جزیروں، نئی نئی زمینوں کی تلاش میں اپنے بادبانی جہاز کو لے کر طوفانی سمندروں میں نکل کھڑے ہوئے اور آخر کار اپنی منزل کو پا لیا۔ پاکستان میں جوہر قابل کی کمی نہیں۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ ایک منزل کا تعین کر لیا جائے اور پھر تعمیر نو کیلئے پوری لگن اور سچے جذبوں سے کام شروع کر دیا جائے۔

آخر میں محمد اسحاق میر صاحب کی جرمن زبان سے ترجمہ کی ہوئی کچھ مختصر مختصر نظمیں پیش کی جاتی ہیں جن میں سے کوئی بھی نظم کسی رسالے میں ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ یہ جرمن نظموں کے تراجم ہیں۔

شانِ نزول

دل پر ہوتا ہے خدایوں نازل
پھول پر جیسے اوس کا قطرہ
(فان ماکئے برگ)

جاودانی خوشبو

اک گلاب نے مجھ سے

ایک دن شکایت کی
کہ جو خوشبو مجھے
بہار نے دی تھی
وہ تو پل بھر میں
اڑ بھی گئی
میں نے اس کو
بطور ہمدردی
اس طرح تسلی دی
تیری خوشبو تو میرے گیتوں میں
اب نئی شان سے مہکتی ہے ٥
اور یہاں بس کے
اس نے بالآخر
اک بقائے دوام پائی ہے
(فریڈرش فان بوڈن شٹیٹ)

دیکھو اس انسان کو!

ہاں میں اس بات سے نہیں غافل
کہ میری اصل حقیقت کیا ہے
ایک شعلے کی طرح بے تاب
اپنی تن آگ میں جلتے جلتے
ہستی اپنی مٹا رہا ہوں
جس کو چھو لوں وہ نور بن جائے
جس کو چھوڑ دوں، وہ کوئلہ ہی رہے
درحقیقت میں ایک شعلہ ہوں
(فریڈرش نیطشے)

اس اتوار کو میں اور صلاح الدین محمود پاک ٹی ہاؤس میں بیٹھے تھے۔ پاک ٹی ہاؤس سے ہماری اور خاص طور پر میری بڑی قیمتی یادیں وابستہ ہیں۔ 1949ء میں ہم سب ادیبوں، شاعروں کی اسی ٹی ہاؤس میں ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ کسی نے کہا کہ میں انبالے سے آیا ہوں میرا نام ناصر کاظمی ہے، کسی نے کہا میرا تعلق لاہور سے ہے اور میرا نام ابن انشاء ہے، کسی نے کہا میں گڑھ مکستر سے آیا ہوں میرا نام اشفاق احمد ہے۔ شعر و ادب کا یہ سفر پاک ٹی ہاؤس ہی سے شروع ہوا تھا۔ وہ بڑے روشن اور چمکیلے دن تھے سارا سارا دن ٹی ہاؤس میں گزرتا۔ کبھی کبھی رات کے ڈیڑھ بھی بج جاتے مگر حیرانی کی بات ہے کہ ہمارا تقریباً سارا تخلیقی کام اسی زمانے میں انجام پایا۔ ناصر کاظمی کی بہترین غزلیں اسی زمانے میں لکھی ہوئی ہیں۔ اشفاق احمد نے گڈریا اسی زمانے میں لکھا۔ میں نے ''زرد گلاب''، ''منزل منزل'' اور ''جہاں برف گرتی ہے'' اسی عہد میں لکھے۔ ہم تقریباً سبھی نوجوان تھے۔ چہروں پر چمک تھی، جذبے عروج پر تھے۔ بہرحال وہ زمانہ گزر گیا جیسے یہ زمانہ گزر جائے گا۔ صلاح الدین محمود کا تعلق علی گڑھ کے ایک علمی ادبی گھرانے سے ہے، ان کے والد بزرگوار پروفیسر محمد عمر الدین مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے فیلو، شعبہ آرٹس کے ڈین اور نفسیات اور فلسفے کے شعبے کے ہیڈ تھے۔ وہ عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں کے عالم تھے۔ امام غزالی کے فلسفے پر انگریزی میں لکھی ہوئی ان کی کتاب (The Ethical Philosophy of AL-Ghazali) اسلامی فکر و فلسفے کی تاریخ میں ایک اہم مقام کی حامل ہے۔ صلاح الدین محمود نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے بی ایس سی (سول اینڈ میکینکل انجینئرنگ) میں ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد پاکستان ہجرت کر کے آ گئے یہاں انہیں اوورسیز سکالرشپ ملا اور انگلستان چلے گئے۔ وہاں مانچسٹر کے میٹروپولیٹن ورکرز میں ایروناٹیکل انجینئرنگ میں تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ سپشلائزیشن کیا پھر پاکستان واپس آ کر واپڈا میں 26 برس خدمات انجام دیں اور بطور سپرنٹنڈنٹ انجینئر کے اپنی مرضی سے ریٹائرڈ ہوئے۔ وہ دل کی گہرائیوں سے ایک سچا مسلمان ہے۔ صوم وصلوٰۃ وغیرہ کا پابند ہے، سگریٹ تک نہیں پیتا۔ واپڈا میں اپنی ملازمت کے دوران اس نے اپنے کمرے کے دروازے کی چق اتروا دی تھی تاکہ کوئی بھی سائل اسے بلا روک ٹوک مل سکے۔ فلسفے اور ادب پر اس کی نظر

بڑی گہری اور مطالعہ وسیع ہے۔ پاکستان سے وہ کسی بھی محب وطن پاکستانی کی طرح پیار کرتا ہے۔ اس کے مزاج میں ایک اٹلیکچوئیل قسم کی سادگی اور متانت ہے۔ انسانی رویوں میں وہ کلاسیکل قدروں اور قدیم شرفا کی روایات کا پابند ہے۔ آج بھی ایک خاندانی جیبی گھڑی اس کے پاس ہے جس کو ٹک کر کے کھولتا اور وقت دیکھتا ہے۔ 1947ء میں جس لانڈری میں اس نے پہلی بار کپڑے ڈرائی کلین کرائے تھے آج بھی اسی لانڈری سے کپڑے ڈرائی کلین کرواتا ہے۔ وہ ضروری چیزوں کو سنبھال کر رکھتا ہے اور ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ وہ گھر سے نکلے اور کوئی چیز ساتھ لانی بھول گیا ہو۔ اسے دن میں جو کام کرنے ہوتے ہیں انہیں رات کو ہی کاغذ پر لکھ کر رکھ لیتا ہے۔ میں بھی ایسا ہی کرتا ہوں۔ وہ صبح خیز ہے میں بھی صبح ہونے سے پہلے بیدار ہو جاتا ہوں۔ میرے کام کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ مجھے صبح سے شام تک گھر پر بیٹھ کر ہی کام کرنا ہوتا ہے اور صلاح الدین سے اتوار کی اتوار ہی تفصیلی ملاقات ہوتی ہے۔ وہ مجھ سے زیادہ پڑھا لکھا ہے اور میں اس سے علمی و ادبی اعتبار سے بہت فائدہ حاصل کرتا ہوں جس کیلئے میں اس کا شکر گزار ہوں۔ وہ سرسید کی طرح گرانڈیل جسم والا ہے اور اگر داڑھی رکھ لے تو سرسید ہی لگے۔ وہ اپنے خاص انداز میں بڑی اعلیٰ پائے کی شاعری کرتا ہے اور اس کی نظموں میں قلبی واردات اور محسوسات سے بھی پرے کی، کسی انجانے ادراک کی کیفیات ہوتی ہیں جو قاری کو انسانی تجربوں اور احساسات کی اصل روح سے متعارف کراتی ہیں۔

مور صلاح الدین کا پسندیدہ پرندہ ہے۔ جن دنوں وہ رسالہ ”سویرا“ کا ایڈیٹر تھا تو اس نے پاکستان کے مایہ ناز مصور عبدالرحمٰن چغتائی سے اپنے مجموعہ کلام کے سرورق پر چھاپنے کیلئے مور کا ایک سکیچ بنوایا تھا۔ صلاح الدین محمود نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں اور اپنا بچپن گزارا وہ سرسید احمد خان کی روایات کو لے کر سرگرم سفر تھا۔ اس کے نانا جان نے سرسید احمد خان کی میت کو غسل دیا تھا۔ وہ سرسید کے مکان کے آنگن میں کھیلا کرتا تھا۔ صلاح الدین محمود نے ”سویرا“ میں سرسید احمد خان پر ایک بڑا خوبصورت مضمون لکھا ہے جس کے کچھ اقتباسات میں یہاں قارئین کی نذر کرنا چاہتا ہوں۔

”......سرسید احمد خان ہمارے خون کے شعور کا ایک حصہ ہیں۔ اللہ کا

رنگ لئے، صدیوں سے رواں، ہمارے اس خون نے، ان کے وقتوں میں، ان کی بھی بات سنی ہے اور چاشنی پائی ہے۔ ایک روز وہ ہمارے دل میں آئے اور خون کو کچھ اپنا رنگ دیا۔ پھر دھیرے دھیرے انہوں نے ہمارے دماغ کے چند ایسے حصوں کو، جو کہ تاریک ہو گئے تھے، دوبارہ روشنی دی۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ہمارے دماغ کے ان روشن ایوانوں میں گشت کرتے ہیں۔ اب ہمیشہ کے واسطے ہمارا خون ان کا ہم راز ہے۔ سرسید احمد خان 1898ء میں فوت ہو چکے تھے۔ میں ان کی وفات کے 36 برس بعد پیدا ہوا۔ میں نے اپنے ان بزرگوں کو دیکھا ہے جنہوں نے سرسید کو دیکھا تھا۔ میں نے اپنے بزرگوں کے وہ اطوار دیکھے ہیں جو سرسید کی موجودگی میں ڈھلے تھے۔ اپنے بزرگوں کی ان آنکھوں میں دیکھا ہے جن میں آنکھیں ڈال کر کبھی سرسید مسکرائے تھے۔ پھر ان ضعیف اور سرد ہوتے ہوئے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں سے گرمایا ہے جنہوں نے اپنی جوانی میں سرسید کو آخری غسل دیا تھا۔ ایسے ہاتھ ابھی دو برس پہلے تک زندہ تھے۔

سرسید کے باغ میں ہم کھیلے ہیں۔ اپنی گیند سے ان کے گھر کے دروازے تک کھٹکھٹائے ہیں، شیشے چٹخائے ہیں۔ ان کے اپنے ہاتھ سے لگائے ہوئے پھل دار درختوں کے پھل بھی کھائے ہیں۔ بچپن کی بے صبری میں کچے ہی نوچ کھسوٹ کر، اور ذرا صبر آنے پر پکے ہوئے توڑ کر...... جس باغ میں ہم کھیلے، سرسید نے زندہ رہنے کے واسطے بنوایا تھا۔ مکتب سے واپسی پر ہر روز ہم نے اس گھر کی دیوار کو ایک مرتبہ آہستہ سے ہاتھ لگایا ہے اور امنگ پائی ہے۔ جب سرسید کو احساس ہوا کہ وہ اس دنیا سے گزرے جاتے ہیں تو اس گھر سے اٹھ کر قریب ہی اپنے ایک دوست کے گھر چلے گئے۔ وہاں چند دن آرام کر کے دم توڑ دیا۔ جس کمرے میں وہ فوت ہوئے کبھی ہمت نہ ہوئی کہ اس میں جھانک سکیں۔ مگر یہ یاد ہے کہ اس کمرے سے ایک دراز

قد کھڑکی، اور ایک کشادہ روشن دان باہر کو کھلتے تھے۔ اس کھڑکی کے قریب، اس پر سائے کے لئے، پرانا گھنا، ہزاروں جاندار ٹہنیاں لئے، بیری کا ایک درخت تھا جس میں یوں لگتا تھا کہ اس چٹیل میدان کی ساری چڑیاں پناہ لیتی ہیں اور جس کی ان گنت ڈالیوں میں سے روشنی چھن چھن کر ہر دم ہم تک پہنچتی تھی اور ہمارا دل خوف زدہ ہو کر ہم سے روز پوچھتا تھا۔

''بھلا بتاؤ تو تم کون ہو؟''

ایک قرن سے، ایک ان تھکے آسمان کے نیچے، ایک چٹیل میدان میں، بیر کا ایک درخت، اپنا سایہ سنبھالے کھڑا تھا۔ ایک اللہ کے بندے کے انتظار میں۔ پھر ایک روز سر سید اس جگہ پہنچے تھے۔ اس وقت ان کی داڑھی اور سر میں کچھ سفید بال آ چکے تھے اور مضبوط ہاتھوں پر نسیں ابھر آئی تھیں۔ جب انہوں نے اس میدان میں قدم رکھا تو اس وقت یہاں چند درخت تھے۔ دور دور پر...... اور ان درختوں کے درمیان ہوائیں چلتی تھیں بال بکھیرنے...... اس غمزدہ میدان میں واقع، ان چند گنے چنے درختوں میں یہ ساری ہوائیں سما نہ پائی تھیں۔ مسکن نہ پا کر اس میدان میں سر پٹختی تھیں۔ یہاں میں اس لمحے کو یاد کرنا چاہتا ہوں جب اس میدان کی اکیلی سنسنان فضا میں، اس قدیم آسمان کی بے پناہ وسعت اور بلندی کو دیکھ کر، سر سید کو اپنے خون میں پوشیدہ اس ایک لمحے کی ابدیت کا احساس پوری طرح ہوا تھا اور انہوں نے اس قدیم آسمان، اس خشک میدان، ان بے کس ہواؤں اور اپنے اس ابدی لمحے کی موجودگی میں اپنے رب سے پکار کر کہا تھا۔

''یا اللہ! میں یہاں تیرا نام لینے والوں کیلئے ایک گھر بناؤں گا۔''

میرے نزدیک سر سید احمد خان کی داستان ہی ہے جس میں انہوں نے ان بے گھر ہواؤں کو گھر بخشنے کا فیصلہ کیا جس میں انہوں نے شجر بہ شجر بکھری ہواؤں کے بال سنوارے اور اس میدان کے بہتے

پانی کو پرانے راستوں سے دوبارہ واقف کروایا۔ میرے شعور نے ایک نئی جلا پائی۔ میرے خون میں نئی تراوٹ آئی اور میں نے بھی لمحے کا راز پایا۔ میں نے سیکھا کہ میں مسلمان ہوں، مجھ کو اپنے دل، اپنے دماغ اور اپنے خون پر، بیتے حالات پر فخر کرنا چاہئے۔ میں نے سیکھا کہ ادب و آداب انسان کی روح میں سے پھوٹتے ہیں اور یہ کہ آداب دوسرے کی عزت کے واسطے استعمال ہوتے ہیں، اپنی وقعت بڑھانے کیلئے نہیں۔ میں نے سیکھا کہ میرے والدین، میرے بزرگ میری عزت ہیں۔ میں نے سیکھا کہ میری عزت ہی میری جان ہے۔ میں نے رحم کرنا بھی سیکھا۔ ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ اور ان کے باوجود ان ہواؤں نے مجھ کو شر، فساد، کوتاہ نظری، بے ادبی اور ظلم کو کچل دینے کی طاقت بھی عطا کی۔ پھر ایک روز مجھے اس قابل کیا کہ میں اپنے اندر والے سے، اس کی بابت، اس پر بیتی داستانوں کی بابت کچھ پوچھ سکوں۔

میرے شعور کو جلا دے کر سر سید فوت ہوئے اور اس اجلے کلاہ والی مسجد کے پہلو میں، جو اس میدان میں انہوں نے خود بنائی تھی، دفن ہوئے۔ علی گڑھ کی اس مسجد کے پچھواڑے ایک قدیم کنواں ہے۔ اس میں اب بجلی کا ایک پمپ لگا ہے۔ گرمیوں میں آس پاس کے تختے اس سے سیراب ہوتے ہیں۔ کنوئیں کے ساتھ مسجد کی بغل میں سیمنٹ کا چھوٹا سا گہرا تالاب ہے جس میں پہلے پانی جمع ہوتا ہے اور پھر نالیوں کے ذریعے دور دور بکھر جاتا ہے۔ جب نل چلتا ہے تو تالاب میں سرد اور شفاف پانی بھر جاتا ہے۔ تالاب کے ایک طرف مسجد کی مضبوط دیوار ہے اور پتھر کی جالیاں، اور دوسری طرف مولسری کا ایک پرانا اور گھنا درخت ہے جو ہر دم شفاف پانی پر سایہ کئے رہتا ہے اور جس کے پھول ہر دم بدلتے پانی پر چھائے رہتے ہیں اور دھیمی دھیمی خوشبو دیتے ہیں۔

گرمیوں کی دوپہروں میں جب سخت لو چلتی تھی تو ہم وہاں جاتے تھے۔ اس قد آدم، شفاف، مولسری کے پھولوں میں بسے، ہردم بدلتے پانی کی تہ میں ہم بیٹھ جاتے تھے۔ جب باہر آتے تو ہوا...... مسجد کے تپتے فرش پر سرخ پتھر سے ٹکرا کر سرسید کے مزار کو چھوتی ہوئی، ان کی خوشبو لیتی ہوئی، پتھر کی جالیوں سے چھن چھن کر ہم تک آتی تھی اور ہمارے جسموں میں جذب ہو جاتی تھی۔ پانی ہردم بدلتا تھا۔ مولسری کے درخت پر کبھی خزاں نہ آتی تھی اور ہم جالیوں کے پاس مسجد کی باہر والی دیوار کے ساتھ کان لگا کر اپنے پیاروں کے دلوں کی دھڑکن سنتے تھے۔ زمین کی گہرائیوں میں پوشیدہ، روشنی میں آ کر نکھر جانے والے پانی کی بے قراری کو اپنے لہو میں محسوس کرتے تھے۔ مولسری کے نیچے، مسجد کے پچھواڑے، سرسید احمد خان کی قبر کے سرہانے دیوار کی دوسری طرف واقع اس چھوٹے سے تالاب میں پانی ہردم بدلتا رہتا تھا۔ یہ بہتا پانی دور دور بکھر جاتا اور پھر یک جا ہو کر اپنے راستوں کو ڈھونڈ کر زمین دوز ہو جاتا۔ اپنے پر قائم ان عمارتوں، ان درختوں، ان عمارتوں میں بھٹکتے ذہنوں اور ان پیڑوں پر بسیرا کرنے والی ہواؤں کو سینچتا اور تازہ کرتا۔ پھر ایک بلاوے پر ہمارے جسموں اور ہماری روح کو چھونے کے لئے دوبارہ نمودار ہوتا۔ ہمیشہ آسمان کی قربت میں واقع مولسری کے درخت سے گرتے ہوئے پھول وہی ہوتے تھے۔ اپنی پرانی ازلی خوشبو بدستور اپنے میں لئے ہوئے......''

آپ نے دیکھ لیا کہ صلاح الدین محمود کا نثر لکھنے کا انداز بھی انفرادی رنگ لئے ہوئے ہے۔ سرسید احمد خان والے مضمون کے ان دو تین اقتباسات میں ہمیں اس ماحول کی ایک دھیمی دھیمی سی مہک ملتی ہے جس میں سرسید احمد خان زندہ تھے۔ مرنے کے بعد بھی زندہ تھے۔ اس روز پاک ٹی ہاؤس سارا وقت سرسید احمد خان پر اور پھر پاکستان پر باتیں کرتے رہے۔ صلاح الدین نے پاکستان پر لکھی ہوئی اپنی نظم بھی سنائی جس کا

عنوان اس نے ''ترانہ اصیل'' رکھا ہے۔ نظم میں جوں کی توں یہاں نقل کر رہا ہوں۔

پاکستان سدا ستوں میں
ایک شجر بینائی کا
اس کا طائر دریا جائے
میداں اک ہریائی کا
خاک کی صورت بارش جیسی
لہو میں جو نہ تھمتی
قد اس کا پیشانی جیسا
تاروں کی شنوائی کا
جنگل جنگل ہر چاندر میں
ایک اگا آئینہ سا
جل بہتا آئینے اندر
شبنم کی گہرائی کا
دریا اس کے شبنم سے نم
ساگر میں دریا کا خم
تن خاکی میداں کی نس میں
بارش کی پیائی کا
پاکستان سدا ستوں میں
ایک شجر بینائی کا
اس کا طائر دریا جائے
میداں اک ہریائی کا

صبح آٹھ بجے پاک ٹی ہاؤس میں ابھی بہت کم لوگ آئے ہوتے ہیں۔ دیوار کے ساتھ والی وہ ٹیبل خالی ہوتی ہے جہاں کبھی میں اور ناصر کاظمی بیٹھا کرتے تھے۔ میں اور صلاح الدین اسی میز پر بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔ کسی روز ناصر کاظمی کی باتیں شروع ہو جاتی ہیں تو پھر ساڑھے نو بجے تک اس کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ کس طرح وہ

سگریٹ انگلیوں میں دبائے، سگریٹ والا ہاتھ منہ کے ذرا قریب رکھے ٹی ہاؤس میں مسکراتا ہوا داخل ہوتا۔ دروازے کے ساتھ ہی شیشے کی دیوار والے صوفے پر شہرت بخاری، قیوم نظر، سجاد رضوی، بقا نقوی، مبارک احمد، انجم رومانی، احمد مشتاق، انتظار حسین اور سجاد باقر رضوی پہلے سے محفل جمائے ہوتے تھے۔ ناصر کاظمی بھی ان میں آ کر بیٹھ جاتا۔ کسی روز اس نے کوئی تازہ غزل کہی ہوتی تو مجھے اٹھا کر اسی ٹیبل پر لے جاتا جہاں آج کل میں اس کی یاد کو زندہ رکھنے کے واسطے بیٹھا کرتا ہوں اور پھر مجھے اپنی غزل سناتا، دھیمی مگر بھاری آواز میں شعر سناتے وقت اس پر ایک طلسمی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ ناصر کاظمی، صلاح الدین کا بھی دوست تھا۔ ہم دونوں ناصر کاظمی کی یاد میں خاص طور پر چائے بنا کر پیتے ہیں۔

میں اور صلاح الدین ٹی ہاؤس سے نکل کر مال کی طرف جاتے ہیں تو کبھی کبھی میں مڑ کر پیچھے دیکھتا ہوں تو مجھے اپنے دوست نظر آتے ہیں۔ ناصر کاظمی کسی بات پر ہنستا ہوا، احمد مشتاق کے ساتھ وائی ایم سی کی سیڑھیاں اتر رہا ہے۔ انور جلال شمزا کا قہقہہ سنائی دیتا ہے۔ قیوم نظر اشارے سے سجاد رضوی کو اپنی طرف بلا رہا ہے۔ اشفاق احمد اپنی سائیکل پر سوار ٹی ہاؤس کی طرف بڑھ رہا ہے پھر یہ سارا منظر، سارے چہرے مال کی ٹریفک کے ہجوم میں نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔

☆......☆......☆

عباس احمد عباسی

اب یہ اچھی طرح سے یاد نہیں رہا کہ انور جلال سے میری پہلی ملاقات پاک ٹی ہاؤس میں ہوئی تھی یا بیڈن روڈ والے اس کے مکان میں...... انور جلال کا چہرہ سامنے آتا ہے تو ماضی کے دھندلکوں میں پاک ٹی ہاؤس کے در و دیوار ابھرتے ہیں۔ کالی سفید نائیلون والا چمکیلا فرش، چوکور سفید پتھر کی میزیں، دیوار پر لگی ہوئی قائداعظم کی تصویر، گیلری کو جاتی سیڑھیاں، بازار کے رخ پر لگی شیشے دار لمبی کھڑکیاں جو گرمیوں کی شاموں کو کھول دی جاتی تھیں اور کونے والے کاؤنٹر پر علیم الدین کا مسکراتا ہوا سانولا چہرہ بھی ابھرتا ہے۔ ریڈیو دھیمے سروں میں بج رہا ہے اور علیم الدین بل کاٹ رہا ہے۔ کتنی دھیمی اور شگفتہ مسکراہٹ تھی علیم الدین کی۔ کیسے چمکیلے ہموار دانتوں کی قطار موتیوں کی طرح چمکتی تھی۔ فضا میں گولڈ فلیک اور تارے والے کیپسٹن میکنم کی خوشبو بسی ہوئی ہے۔ اس خوشبو میں پاک ٹی ہاؤس کی سن 47ء کی بہترین سنہری چائے اور فروٹ کیک کی خوشبو بھی مخلوط ہو رہی ہے اور پھر گیلری کو جاتی سیڑھیوں والی میز پر سے انور جلال کا صحت مند فلک شگاف قہقہہ ابھرتا ہے۔ علیم الدین کاؤنٹر پر بل بناتے بناتے مسکراتا ہے۔ وہ جانتا ہے انور جلال اسی طرح ہنستا ہے۔ تمام بیرے بھی انور جلال کے قہقہوں سے واقف ہیں اور کچن میں اس کے قہقہے کی آواز سن کر وہ بھی زیر لب مسکرا دیتے ہیں۔

حسیب، شہدا، سلو، شیدا، شجاع، ضیا، میں اور کچھ ادیب شاعر بھی ہیں۔ منڈلی لگی ہے۔ بزم گرم ہے، محفل جمی ہوئی ہے، چائے کا دور چل رہا ہے، فروٹ کیک اڑ رہے ہیں، اعلیٰ سے اعلیٰ سگریٹ کا دھواں فضا میں خوشبوئیں پھیلا رہا ہے۔ ہماری منڈلی میں ہر شے اعلیٰ سے اعلیٰ ہوتی تھی۔ ہم سب خوش لباس تھے، خوش خوراک، خوش خیال،

خوش خصال اور خوش شکل تھے۔ صحت مند بھی تھے، انور جلال کا جسم کسرتی نہیں تھا۔ میں نے اسے کبھی ورزش کرتے نہیں دیکھا تھا لیکن اس کا جسم بڑا سڈول اور آئیڈیل تھا۔ چوڑے شانے، مناسب قد، مضبوط اور ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے سفید چمکیلے دانت اور چوڑے صحت مند نتھنوں کے نیچے باریک مونچھیں۔ سیاہ بال جن کی مانگ پہلے تو نہیں بناتا تھا پھر اس روز اس نے بائیں جانب مانگ نکال لی اور اعلان کیا کہ آج سے وہ بالوں کا سٹائل بدل رہا ہے۔ انور جلال ہر بات کا اعلان کرنے کا عادی تھا۔ اس کا لباس، جوتے، بال، مونچھیں، قلم، برش، قہقہے اور تحریریں۔ ہر شے کچھ نہ کچھ اعلان کرتی تھیں آنے سے پہلے بھی وہ اعلان کرتا کہ میں آ رہا ہوں یعنی ٹی ہاؤس میں داخل ہونے سے پہلے اس کے قہقہے کی آواز داخل ہوتی تھی۔ کھلتا ہوا سرخی اور سفیدی مائل رنگ، وہ ایک ہی نظر میں پہچان لیا جاتا کہ یہ کشمیری ہے۔ وہ شملے سے ہجرت کر کے لاہور آیا تھا اور کبھی کبھی مجھ سے شملے کی چیڑھ کے درختوں، جنگل کو جاتی پگڈنڈیوں اور پہاڑی ڈھلانوں پر اترتے سفید بادلوں کا ذکر کیا کرتا۔ اس وقت انور جلال کی آواز دھیمی ہوتی تھی وہ قہقہہ تو بہت بلند لگاتا تھا مگر بات دھیمے لہجے میں کرتا تھا یا پھر رومانٹک ہوتا تھا تو اس کی آواز مدہم ہو جاتی تھی۔

ایک تسلسل کے ساتھ انور جلال کے ساتھ گزارے ہوئے ماہ و سال بیان کرنا شاید ممکن نہ ہو لیکن ماضی کے سمندر میں واقعات اور بھولے بسرے روز و شب کی تصویریں بیشمار جزیروں کی طرح ابھرتی ہیں جن کے رنگ اور جن کی آب و تاب روز اول کی طرح قائم ہے۔ کم از کم میرے لئے یہ تصویریں زندہ پائندہ اور ہر دم جوان ہیں۔ کیونکہ میں نے انور جلال سے دوستی کم کی ہے اور پیار زیادہ کیا ہے اور پیار کی یادوں کے پھول کبھی نہیں مرجھاتے' ان کے رنگ تر و تازہ' شوخ رہتے ہیں اور خوشبو کبھی لاشعور کے ایوانوں سے جدا نہیں ہوتی۔ کبھی میں انور جلال کو اپنے بیڈن روڈ والے مکان کی سب سے اوپر والی منزل میں لینڈ سکیپ بناتے دیکھتا ہوں۔ تجریدی آرٹ سے پہلے انور جلال بڑی خوبصورت لینڈ سکیپس بنایا کرتا تھا۔ تجریدی آرٹ میرا خیال ہے اس نے جھنجھلا کر شروع کیا تھا۔ اس نے شملے کی ایک خیالی لینڈ سکیپ بنائی تھی۔ خیالی ان معنوں میں کہ جو درخت اور سرسبز ڈھلانیں اس نے شملے میں دیکھی تھیں انہیں

کینوس پر رنگوں کے ساتھ منتقل کر دیا۔ اس کی یہ تصویر پاکستان آرٹ نامی ایک جہازی سائز کے انگریزی رسالے میں بھی چھپی تھی جو میرے پاس موجود ہے۔ اس روغنی لینڈ سکیپ میں ہمیں انور جلال کے آنے والے تجریدی عہد کا ایک وعدہ ملتا ہے۔ یہاں برش کا بہاؤ ایک لہر کی طرح ہے جو ہلکے سٹروک کو اپنے بہاؤ کے ساتھ بہاتی، دائروں کو توڑتی' تصویر کے فریم سے باہر نکلتی محسوس ہوتی ہے۔ اس میں انور جلال کی سیماب صفت طبیعت کی جھلک بھی ہے۔ عام حالات میں بھی وہ تیز چلنے کا عادی تھا۔ مال پر جب کبھی ہم چہل قدمی کرنے نکلتے تو وہ مجھ سے ہمیشہ دو قدم آگے ہوتا اور مجھے اسے روک کر پیچھے بلانا پڑتا۔ یہی حال انور جلال کی تصویروں کا ہے۔ وہ اس زمانے میں بھی اس سے دو قدم آگے تھیں۔ اس کا سٹوڈیو بیڈن روڈ والے مکان کی تیسری منزل یعنی کوٹھے پر تھا یہاں ایک کمرہ تھا جس کے آگے کوٹھے کی چھت اور ایک رونش بنا ہوا تھا۔ مئی جون میں یہ کمرہ تنور کی طرح تپنے لگتا۔ کمرے میں ایک چارپائی' ایک میز اور کچھ کینوس پڑے رہتے۔ انور جلال کبھی کبھی جب موڈ میں آتا' تصویر بنانے لگتا تھا۔ یورپ کے تجریدی مصوروں میں اسے ہسپانوی مصور ڈالی بہت پسند تھا۔ ڈالی رات کو اپنی آنکھوں میں عطر ڈال کر سویا کرتا تھا۔ انور جلال کو اس کی یہ ادا بڑی پسند تھی۔ پکاسو تو خیر سب کو ہی پسند تھا۔

مجسمہ سازوں میں ہم مور کے شیدائی تھے اور انور جلال مُور کے مجسموں کی تصویریں لے کر ٹی ہاؤس میں آتا اور گھنٹوں اس کے فن کی باریکیوں اور تجریدی اثرات پر گفتگو کرتا۔ حبیب کا پیمانہ صبر لبریز ہو جاتا تو وہ ماچس اٹھا کر زور سے میز پر مارتا اور انور جلال کا ہاتھ پکڑ کر کہتا۔ ''بس یار! کیہ بور کر ریا ایں۔''

تصویروں پر انور جلال اپنے نام کی جگہ ''شمزا'' لکھتا۔ یہ نام اس نے شاید اپنے کشمیری اجداد میں سے لیا تھا۔ لیکن ہم اسے ہمیشہ انور جلال کے نام سے ہی پکارتے تھے ہم سب اپنی قمیصیں پہلے ایچ ایم حیات سے سلواتے تھے۔ پھر حبیب ایک روز گرے پاپلین کی قمیص پہن کر آیا تو اس کی کالر کے شیپ دیکھ کر ہم دنگ رہ گئے۔ معلوم ہوا یہ قمیص اس نے دھنی رام روڈ کے ایک ماسٹر سے سلوائی ہے۔ بس ہم بھی ادھر کو دوڑ پڑے۔ ڈائمنڈ ٹیلرز اس دکان کا نام تھا اس کا مالک قمیصوں کی کٹنگ کا بادشاہ تھا۔ برٹش اور

امریکی سٹائل کو ملا کر کالر بنا تا۔ اس میں ٹائی کی میڈیم ناٹ ایسی سجتی کہ بس کمال ہو جاتا تھا۔ لباس کی کاٹ تراش اور سلیقے کا ہم سب کو خبط تھا۔ گرمیوں میں بھی ہم گرے ورسٹڈ کی پتلونیں اور سمر کے شوز پہنتے تھے۔ سردیوں میں گرم چیک برٹش ٹائیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے۔ تھری پیس سوٹ ہمیں پسند نہیں تھا۔ انور جلال کا خیال تھا کہ تھری پیس سوٹ صرف لندن کے بوڑھے سکول ماسٹروں کے لئے بنایا گیا ہے۔

انور جلال کا جسم ایسا متناسب تھا کہ اس پر سوٹ بڑا سجتا تھا۔ اس نے ایک روز مجھے کہا کہ میرا جسم ایک ماڈل کا جسم ہے۔ اگر میں یورپ میں ہوتا تو میری تصویریں فیشن کے رسالوں میں چھپتیں اور اس میں کوئی شک بھی نہیں تھا۔ ہم پاک ٹی ہاؤس کی گھٹی گھٹی فضا سے بور ہوتے تو شیزان اور کیفے اورینٹ (لارڈز) اور لورینگو میں آ کر بیٹھ جاتے۔ یہاں کا صاف ستھرا' شفاف اور چمکیلا ماحول ہمیں بہت پسند تھا ان دنوں ہوٹل میں کوئی رش نہیں ہوتا تھا۔ یہ سن 50 یا 52ء کی بات ہے میزیں اکثر خالی پڑی رہتی تھیں۔ مال روڈ والے شیزان کے کونے میں تانبے کے لمبوترے گلدان میں روز کے روز یوکلپٹس کی ٹہنیاں بدلی جاتی تھیں۔ ہوٹل کی فضا میں ان ٹہنیوں کی دھیمی دھیمی سوندھی خوشبو ہر وقت رچی رہتی۔ انور جلال، میں اور شجاع سیف بہترین لباس میں ملبوس خوبصورت چمکیلے چہروں کے ساتھ ہنستے مسکراتے ایک کونے میں بیٹھے مصوری' اعلیٰ ترین ٹرکش سگرٹوں، والٹ ڈزنی کے کارٹونوں' انگرڈ برگمین کی آنکھوں، کالی داس کی شکنتلا اور امریکی اداکاراؤں کے بارے میں باتیں کر رہے ہوتے اور سنہری چائے کی گرم مہک، شیزان کے بہترین فروٹ کیک کے میووں کی خوشبو کے ساتھ مل کر فضا میں کریون اے کے فلیور میں مخلوط ہو رہی ہوتی۔

بڑا خوشبودار زمانہ تھا۔ فروٹ کیک کے میووں اور یوکلپٹس کی ٹہنیوں سے خوشبوئیں آیا کرتی تھیں۔ آج عطر میں خوشبو نہیں رہی۔ فروٹ کیک کے میوے پپیتے کے کالے بیج بن گئے ہیں۔ شیزان کی گیلری سر کے اوپر آ گئی ہے۔ نہ شکنتلا کی بات ہوتی ہے۔ نہ والٹ ڈزنی کے شوخ رنگوں والے کارٹون نظر آتے ہیں اور نہ یارڈلے کریم کی ٹھنڈی مہک ہے اور نہ چائے کی سنہری خوشبو ہے اور نہ ٹرکش سگریٹوں کا فلیور ہے۔ بیرے تلکے سے بھر بھر کر چائے کی چسکیں لے آتے ہیں۔ گاہک سیاسیات، قانون اور سرمایہ کاری پر باتیں کرتے گرم میٹھا پانی پیئے جاتے ہیں۔ نہ وہ گلدان ہے اور نہ وہ یوکلپٹس کی ٹہنیاں ہیں اور نہ ان کی پرسکون تنہائی پسند خوشبو ہے۔

انور جلال اپنا تخلص شمزا انگریزی میں بالکل اسی طرح لکھتا تھا جس طرح آج کل ہمیں شیزان لکھا نظر آتا ہے۔ مال پر شیزان والوں نے انور جلال سے کہا کہ ہمیں بورڈ پر لیٹرنگ کر دے۔ انور جلال نے مجھے کہا۔

"اے حمید! میں نے اپنے دستخط بیچ دیئے ہیں۔"

اور دوسرے روز شیزان کے ماتھے پر جو بورڈ لگا تھا اس کا ایس اے اور زیڈ بالکل انور جلال کے شمزا دستخطوں والا تھا۔ پہلی نظر میں مجھے وہ شمزا لکھا ہوا لگا۔ ویسے انور جلال کو اس کا احساس تھا کہ اس نے اپنے دستخط فروخت کر دیئے ہیں۔ اس سے پہلے کمرشل لیٹرنگ میں لفظ ایس اور زیڈ اس طرح کسی نے نہیں لکھا تھا۔ اس زمانے میں ہمارا ذریعہ معاش ہوائی تھا۔ کبھی پیسے آ گئے، کبھی نہ آئے مگر ہماری جیبیں کبھی خالی نہیں ہوتی تھیں۔ بہترین چائے، خوشبودار فروٹ کیک اور اعلیٰ ترین سگروں کیلئے ہمیں ایک پل کا بھی انتظار نہیں کرنا پڑتا تھا۔ ہمارے ذہن پاکیزہ، خیالات نیلے آسمان کی طرح روشن، ارادے بلند، جذبے سرگرم' پرجوش اور بھرپور تھے۔ خوبصورت لڑکی ہمیں سر راہ کھلا ہوا پھول لگتی تھی جسے ایک نظر دیکھ کر ہم مسکرا کر آگے گزر جاتے۔ ہماری کائنات اعلیٰ لباس، اعلیٰ سگریٹ، اعلیٰ چائے، حد نگاہ تک پھیلی لینڈ سکیپ، بہترین سینٹ، چیک گرم ٹائیاں، چیکوسلواکیہ کے رومال، یارڈلے کی گولڈ مہک اور اولڈ ماسٹرز کی اپنے آپ میں جذب کرنے والی پینٹنگز تھیں۔ گرم پرجوش بلند آرزوؤں کے چراغوں کی روشنی لئے خون ہماری رگوں میں گردش کرتا تھا اور ہم اپنی ہی خوشبو میں مست پھرا کرتے۔ گھٹیا خیالات، سفلی جذبات اور جنس زدگی کے احساس کی گرد بھی ہمیں چھو کر نہیں گزرتی تھی۔ تفس کی دلدل ہمارے اردگرد ضرور تھی لیکن ہمارے چہرے کنول کے پھول کی طرح اس دلدل سے باہر دھوپ کی سنہری کرنوں میں ہر وقت چمکا کرتے۔

انور جلال کمرشل کام کر لیتا تھا۔ میں افسانے لکھ کر تھوڑا بہت کما لیتا تھا۔ پھر اس نے بھی لکھنا شروع کر دیا۔ میں نہیں جانتا اس نے کب اور کیوں لکھنا شروع کیا۔ بہرحال اس کی تحریریں خواسی کی طرح ترو تازہ، شاداب، شگفتہ اور تیکھی تیکھی تھیں۔ انور

جلال کی حس ظرافت کے آگے بہت کم دوست ٹھہرتے تھے۔ بات سے بات نکالتا، بات کو ذرا سا پھیر کر معنی بدل دیتا۔ کبھی ایسا فقرہ کہتا کہ دوسرا ہکا بکا ہو کر رہ جاتا۔ اس کی تحریروں میں بھی اس کی شخصیت کی بھرپور جھلک تھی چنانچہ لوگوں نے اسے پسند کیا۔

ملک دین محمد اینڈ سنز کی جانب سے ایک پندرہ روزہ رسالہ ''احساس'' جاری ہوا تو انور جلال اور عباس احمد عباسی ایڈیٹر ہو گئے۔ عباس احمد عباسی کا نام لکھتے ہی وہ خوش پوش، خوش وضع صاحب طرز نوجوان یاد آ گیا جو پہلی نظر میں اندلس کا شہزادہ لگتا تھا وہ ہمیں چھوڑ کر جنت کو سدھار گیا۔ اس کی پیاری اور دل نشیں یادیں ہم سب دوستوں کا سرمایہ ہیں۔

انور جلال اور عباس احمد عباسی نے مل کر رسالے کو ایک خاص معیار عطا کیا ملک کے نامور ادیب اور شاعر اس میں لکھنے لگے تھے۔ مل روڈ پر اس کا دفتر تھا۔ میں انور جلال سے ملنے وہاں جایا کرتا۔ کھٹا کھٹ مشینیں چل رہی ہیں۔ کتابیں بوریوں میں بھری جا رہی ہیں۔ کاتبوں کی قطار بیٹھی ہے۔ سنگ ساز پلیٹوں پر جھکے تصحیح کر رہے ہیں۔ انور جلال اسی نیچی چھت والے کمرے میں چھوٹی میز پر عباسی کے ساتھ بیٹھا ہے۔ عباسی اپنی بھاری بھرکم دھیمی آواز میں دونوں ہاتھ ہلا کر قہقہہ لگاتا اور مجھے خوش آمدید کہتا۔ انور جلال چپکے سے اپنے چمڑے کا سگریٹ کیس میری طرف بڑھا دیتا۔ انور جلال کو چمڑے کے سگریٹ کیس رکھنے کا بھی بڑا شوق تھا۔ ایک بار میں نے اس کے پاس ایک مصری چمڑے کا سگریٹ کیس دیکھا جس کے باہر فرعون مصر کی تصویر ابھری ہوئی تھی۔ یہ سگریٹ کیس مجھے بہت پسند تھا۔ مگر میں نے انور جلال کو نہیں بتایا کیونکہ وہ اپنی چیزیں دوستوں میں بانٹ دیا کرتا تھا۔

شجاع سیف نے ایک اشاعتی ادارہ کھولا تو انور جلال نے اس کے دفتر کی تمام ڈیکوریشن کی۔ ایک میز ڈیزائن کیا جس کی شکل مصوروں کے ہاتھ میں پکڑنے والے پلیٹ کی طرح تھی۔ شجاع سیف کو بھی کتابیں چھاپنے سے زیادہ دفتر کی آرائش سے دلچسپی تھی۔ چنانچہ دفتر بن سنور گیا اور کتابوں کو چھاپنے کا مرحلہ آیا تو شجاع سیف بیزار ہو گیا اور ایک روز اپنے سنہری بالوں پر ہاتھ پھیر کر بولا۔

''یار یہ تو بڑی بک بک کا کام ہے۔''

انور جلال کی والدہ (اللہ جنت الفردوس میں ان کے درجات بلند فرمائے) ہم سے بڑی شفقت اور محبت سے پیش آتیں۔

وہ انور جلال کے سبھی دوستوں کو اپنا بیٹا سمجھتی تھیں اور ہم جب بھی انور جلال کے گھر جاتے وہ ہمارے لئے خاص طور سے کشمیری چائے بنا کر کھنڈ قلچوں، باقر خانیوں کے ساتھ اوپر بھجواتیں۔ شفقت اور ایثار کے جذبے سے بھرپور وہ ایک باوقار، سنجیدہ کشمیری بزرگ خاتون تھیں۔ انور جلال بھی اپنی والدہ سے بہت پیار کرتا اور ان کا پاس خاطر اسے بہت عزیز تھا۔ انور جلال کے والد صاحب بھی ہم سے ہمیشہ گرم جوشی اور محبت کا سلوک کرتے۔ بڑے وضع دار کم گو اور باہمت بزرگ تھے۔ انہوں نے انور جلال کے کیریئر اور اس کی ترجیحات اور عزائم میں کبھی دخل نہیں دیا۔ انہیں اپنے بچوں کی خوشنودی طبع ہمیشہ عزیز رہی۔ انور جلال کی طرح وہ بھی خوش پوش اور خوش وضع بزرگ تھے۔

ہم اپنے کپڑے ہال روڈ کے مولوی صاحب سے ڈرائی کلین کرواتے اور دھلواتے تھے۔ یہ مولوی صاحب بھی اپنی جگہ پر ایک سکول آف تھاٹ تھے۔ دھلائی کے بل پر اردو کے اساتذہ کے دو تین شعر بڑے خوبصورت خط نسخ میں ضرور لکھتے۔ انہیں اردو کے ہزاروں اشعار زبانی یاد تھے۔ شاعروں ادیبوں کے کپڑے دھلا کر بڑے خوش ہوتے تھے اور چھ چھ مہینے بل ادا نہ کرو۔ کبھی شکایت نہیں کرتے تھے۔ بس ان کے اشعار سننا شرط تھا۔ ہماری قمیضوں پر کلف لگوا کر خود اپنی نگرانی میں استری کرواتے اور تہہ کی ہوئی استری شدہ قمیضیں ایسے لگتیں جیسے چاندنی رات میں سفید پریاں موتیے کے پھولوں کی چادر اوڑھے سو رہی ہیں۔ ہم چار چار دن ایک ہی قمیض میں گزارتے۔ کیا مجال جو کلف لگی قمیض پر گرد کا ایک ذرہ بھی دم بھر کے لئے ٹھہر جائے۔ میں کپڑے لینے جاتا تو مولوی صاحب انور جلال کا پوچھتے کہ وہ کیوں نہیں آیا۔ انور جلال جاتا تو حسیب یا شجاع یا سلو کا پوچھتے کہ وہ کیوں نہیں آئے۔ انہیں ہم سب سے بڑی محبت تھی، پیار تھا۔ بڑے محبت اور پیار کے آدمی تھے۔ ہر وقت گول مٹول سانولے چہرے پر مسکراہٹ رہتی اور دکان کے اندر شعر گنگناتے آتش پارے کی طرح گھوما کرتے۔ آج ہال روڈ پر ان کی دکان کی جگہ ایک کمرشل بلڈنگ کھڑی ہے۔ مولوی صاحب کی دکان کہیں بیچ ہی میں

غائب ہوگئی ہے۔ مولوی صاحب بھی ہماری نظروں سے غائب ہو گئے ہیں۔ پیار کی نشانیاں ایک ایک کر کے غائب ہو رہی ہیں اور ان کی جگہ چھ چھ منزلہ کمرشل عمارتیں کھڑی ہوگئی ہیں آج بھی وہاں ہال روڈ سے گزرتے ہوئے احتراماً اس بلڈنگ کی طرف ضرور دیکھ لیتا ہوں جس کے نیچے مولوی صاحب کی دکان دفن ہو چکی ہے۔ پھر مجھے انور جلال بہت یاد آتا ہے۔ اس شہر لاہور کے ہر موڑ پر میرے دوستوں کی یادیں مہر بلب کھڑی ہیں۔ ہر کمرشل بلڈنگ اور شاپنگ پلازہ کے نیچے ہمارے سنہری دنوں کی روشن شکلیں دفن ہیں۔

انور جلال گھڑی اور ڈائری کے ساتھ چلتا تھا یا شاید اسے کمرشل کام کیلئے وقت اور تاریخ کی پابندی کرنی پڑتی تھی۔ میرے سامنے اس وقت انور جلال کی ایک 1951ء کی پاکٹ ڈائری پڑی ہے۔ یہ اتفاق سے میرے پاس رہ گئی ہے۔ اس کے جنوری کے مہینے کی 19 اور 20 تاریخوں میں لکھا ہے۔

قندیل کے دفتر	11-AM
کریسنٹ پبلسٹی	12-NOON
دین محمدی پریس	؟
مہتاب	2 بج کر تیس منٹ
اے حمید	3 بج کر چار منٹ
ڈراما مجلس	5 بج کر تیس منٹ
رشک	؟

ایک دوسری تاریخ کے ورق پر لکھا ہے۔

کیفے اورینٹ	5/30
عباسی	ریگل
"خراشیں"	ایوب نسیم

کیفے اورینٹ اس جگہ پر تھا جہاں آج کل لارڈز ہوٹل بھی نہیں ہے۔ اس زمانے میں صحافیوں کا پسندیدہ ریسٹورنٹ تھا۔ شام کو ہوٹل کے آگے بید کی آرام کرسیاں اور میزیں باہر لگا دی جاتیں اور لاہور کے بزرگ صحافی وہاں اپنی مجلس سجاتے۔ اس

زمانے میں مسجد شہداء سے نکل کر پی آئی اے کے دفتر تک جاتی سڑک پر تانگہ تو کجا سائیکل مہینے میں ایک بار دکھائی دیتی تھی۔ سڑک پرسکون رہتی۔ صرف مال روڈ پر تانگے سائیکل اور کبھی کبھی کوئی کار گزرا کرتی۔ بس ابھی صرف ایک یا دو نمبر ہی چلنی شروع ہوئی تھی۔ نہ شور ہوتا نہ ہنگامہ ہوتا۔ ہم لوگ بھی کبھی کبھی شام کو یہاں اپنی منڈلی لگا لیتے تھے۔

باغ جناح کے اوپن ایئر ریسٹوران والوں نے پہلو میں ایک بلیئرڈ روم بنوایا جہاں کی نیم روشن فضا میں ایک سبز بڑا سا بلیئرڈ ٹیبل خاموش پڑا رہتا۔ کبھی کبھار کوئی آدمی اندر آ کر لمبی چھڑی کو چاک سے رگڑتا اور بلیئرڈ ٹیبل پر جھک کر سرخ و سفید گیندوں کو تنگ کرنے لگتا اس بلیئرڈ روم کا ایک برآمدہ بھی تھا جو ہمیں بہت پسند تھا۔ یہاں ایک بڑا سا پیانو بھی پڑا رہتا جس پر سال میں ایک بار کوئی آدمی بیٹھا اسے بجاتا دکھائی کم اور سنائی زیادہ دیتا۔ کیونکہ پیانو بہت بڑا تھا۔

ٹی ہاؤس میں داخل ہوں تو دائیں جانب شیشے کی دیوار کے ساتھ ایک صوفہ لگا ہے۔ سامنے ایک لمبی میز ہے۔ میز کی تینوں جانب کرسیاں رکھی ہیں۔ یہاں شام کے وقت عام طور پر حلقہ ارباب ذوق والے ادیب، شاعر اور نقاد بیٹھتے تھے۔ ناصر کاظمی، انتظار حسین، سجاد باقر رضوی، سید سجاد رضوی، قیوم نظر، شہرت بخاری، انجم رومانی، امجد الطاف امجد، احمد مشتاق اور مبارک احمد کی محفل شام کے وقت اسی میز پر لگتی تھی۔ چائے کے دور چلتے تھے اور ادب کے متعلق ہر موضوع پر بڑی گرمجوشی سے بحث مباحثے ہوتے تھے۔ اس کے پہلو میں دوسری میزوں پر بھی بعض ادیب اور شاعر بیٹھتے تھے۔

میں، انور جلال، عباس احمد عباسی، ہیرو حبیب، سلو، شجاع، ڈاکٹر ضیاء وغیرہ قائداعظم کی تصویر کے نیچے جو لمبی میز اور صوفہ بچھا تھا وہاں اپنی محفل سجاتے تھے۔ نواز، ضمیر الحسنین اور جاوید افضل عام طور پر درمیان میں جو گول میزیں لگی تھیں ان میں سے کسی میز پر بیٹھتے۔ میری سب سے دوستی تھی، کبھی میں اٹھ کر انتظار حسین، شہرت بخاری اور ناصر کاظمی کی مجلس میں شامل ہو جاتا۔ کبھی نواز اور ضمیر الحسنین کی میز پر آ جاتا۔ قیوم نظر کا قہقہہ گونجتا تو ہمارے چہروں پر بھی مسکراہٹ آ جاتی۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، سید وقار عظیم، ڈاکٹر وحید قریشی، پروفیسر سہیل احمد خان، پروفیسر عبدالصمد صارم بھی کالج کی

مصروفیات میں سے وقت نکال کر ٹی ہاؤس آ جاتے اور ادبی گفتگو میں مزید گرمجوشی پیدا ہو جاتی۔ یہ ٹی ہاؤس میں ادبی محفلوں کے عروج کا زمانہ تھا۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی اور محمد حسن عسکری اور مشہور ترقی پسند نقاد ممتاز حسن اور سید سبط حسن بھی دن میں ایک آدھ بار ضرور ٹی ہاؤس آتے۔ ہفتے کی شام کو وائی ایم سی اے میں انجمن ترقی پسند مصنفین اور حلقہ علم کے ادبی اجلاس ہوتے۔ اس روز ٹی ہاؤس میں ادیبوں، شاعروں اور ادب کے پرستاروں کا ایک ہجوم ہوتا۔ ہر مکتبہ فکر کے ادیب، شاعر، نقاد اور دانشور اپنی الگ الگ محفل سجائے بیٹھے ہوتے، چائے کے دور چل رہے ہوتے اور بڑ پر جوش بحثیں ہو رہی ہوتیں۔ اس روز ٹی ہاؤس میں حمید اختر، ابن انشاء، عبداللہ ملک، سید سبط حسن، صفدر میر، اصغر سلیم، احمد راہی اور دوسرے تقریباً میرے سبھی ترقی پسند شاعر اور ادیب دوست موجود ہوتے۔

تینوں ادبی جلسوں میں ادب سے محبت کرنے والوں کی بھاری تعداد موجود ہوتی۔ لوگ کمرے کی کھڑکیوں میں چڑھ کر بیٹھے ہوتے اور بڑی خاموشی اور توجہ سے ادبی مقالے، افسانے اور غزلیں نظمیں سنتے اور بعد میں بحث میں بھی حصہ لیتے۔ یہی لوگ حقیقت میں ادب کے سرپرست تھے اور ان ہی لوگوں کی ادب سے محبت اور ادبی شعور نے ہم سے اپنے بہترین افسانے، نظمیں اور غزلیں تخلیق کروائیں۔ ٹی ہاؤس میں بیٹھنے والے اس زمانے کے ادیبوں؛ ور شاعروں میں سے سوائے چند ایک کے باقی کسی کا بھی کوئی مستقل ذریعہ معاش نہیں تھا۔ کسی ادبی پرچے میں کوئی غزل، کوئی نظم، کوئی افسانہ لکھ دیا تو پندرہ بیس روپے مل گئے اور ان میں ہی گزارہ ہو گیا۔ کبھی کسی کے لب پر تنگیٔ معاش کا شکوہ نہیں آیا تھا۔ ہم لوگ ہمہ وقت شعر و ادب کے عالم سرمستی میں رہتے تھے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ کسی دوست کی جیب خالی ہے تو وہ ٹی ہاؤس کی چائے اور سگرٹوں سے محروم رہے۔ جس کے پاس پیسے ہوتے تھے وہ جیب سے نکال کر میز پر رکھ دیتا تھا۔ اگر اس کی جیب بھی خالی ہوتی تو پروا نہیں۔ یکے از مالکان ٹی ہاؤس یعنی علیم صاحب بڑی فراخ دلی سے ادھار کر لیتے تھے۔ اگر علیم صاحب کاؤنٹر پر نہ ہوتے تو نو پرابلم، ٹی ہاؤس کے بیروں سے بھی ہمارا ادھار چلتا تھا۔ وہ نہ صرف چائے بلکہ ہمیں ادھار سگریٹ بھی لا کر دے دیتے تھے۔ علیم صاحب سے میری دوستی بھی تھی۔ مجھے میری

کسی کہانی یا ناول کے پیسے ملتے تو میں بے دریغ خرچ کرتا۔ پیسے ختم ہو جاتے تو ٹی ہاؤس سے میرا ادھار شروع ہو جاتا۔ کسی کتاب کا معاوضہ ملتا تو سب سے پہلے میں ٹی ہاؤس کا حساب چکاتا۔ کیونکہ ٹی ہاؤس ہمارا دوسرا گھر تھا اور اس سے جدائی ہمیں گوارا نہیں تھی۔

افسانہ نگار اشفاق احمد ان دنوں نمبر 1 مزنگ روڈ والے مکان میں رہتا تھا۔ شام کو وہ بھی ٹی ہاؤس آ جاتا۔ خوش مزاج اور دوست نواز شاعر بقا نقوی شاہد بادامی باغ سے روزانہ آتا۔ بڑے اچھے شعر کہتا تھا۔ دبلا پتلا اطالوی چہرے والا لڑکا نور چھاؤنی سے کبھی بس میں اور پیسے نہ ہوتے تو پیدل ہی لاہور چھاؤنی سے چل کر ٹی ہاؤس آتا۔

اشفاق احمد باقاعدگی سے ٹی ہاؤس میں آنے والوں میں سے نہیں تھا لیکن دوسرے تیسرے روز شام کو ضرور آتا۔ دن کو بھی کالج کے کسی خالی پیریڈ میں ٹی ہاؤس آ جاتا۔ چراغ حسن حسرت، ریاض قادر، عبداللہ بٹ اور مصور شاکر صاحب اور معین نجمی، علی امام اور احمد پرویز کی محفل کافی ہاؤس میں لگتی تھی۔ ریاض قادر کے بڑے بھائی احسان قادر ٹی ہاؤس میں بیٹھتے تھے۔ وہ دوسری عالمی جنگ میں آزاد ہند فوج میں جا ملے تھے اور جنگ ختم ہونے کے بعد دلی کے لال قلعے میں ان پر بھی انگریز نے مقدمہ چلایا تھا۔ ان کے بارے میں گوپال متل اپنی کتاب ”لاہور کا جو ذکر کیا“ میں لکھتے ہیں۔

”آزاد ہند فوج میں شامل ہونے والوں میں اردو کے مشہور ناقد سر عبدالقادر کے فرزند احسان قادر بھی تھے جو ضابطے کی کارروائی کے مرحلوں سے گزر کر بہت پہلے لاہور آ چکے تھے......“

سر عبدالقادر کے سارے بیٹے گول مٹول اور گورے رنگ کے تھے لیکن احسان قادر صاحب کی رنگت گہری سانولی تھی۔ موٹے شیشوں کی عینک لگاتے تھے۔ ادیبوں کی منڈلی میں بیٹھتے تھے۔ خاموش طبع تھے کبھی کبھی دھیمے لہجے میں سبھاش چندر بوس اور جاپانیوں کی باتیں سنایا کرتے تھے۔ زیادہ تر دوسروں کی باتیں سنتے تھے، خود کم بولتے تھے۔

جب تک عباس احمد عباسی کراچی منتقل نہیں ہوا تھا اور لاہور میں تھا تو وہ بھی ہماری ٹی ہاؤس کی محفل میں شریک ہوتا تھا۔ عباس احمد عباسی کا تعلق دلی کے ایک ممتاز

عالم دین خانوادے سے تھا۔ اس نے عربک کالج دلی سے گریجوایشن کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم اے اردو کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد اس کا تعلق ریڈیو پاکستان اور پاکستان ٹیلی ویژن سے بھی رہا اور بی بی سی میں بھی اس نے بطور براڈ کاسٹر دس گیارہ سال ملازمت کی۔ وہ رائٹرز گلڈ کے بانیوں میں سے تھا اور کراچی میں اردو سائنس کالج کے قیام میں اہم کردار ادا کرنے کے علاوہ انجمن ترقی اردو کا سیکرٹری جنرل بھی رہا۔ جن دنوں وہ لاہور کے ایک پندرہ روزہ رسالے ''احساس'' کے حلقہ ادارت میں تھا تو اس سے روز ہی ملاقات رہتی اور جلال بھی اس کے ساتھ ہی شعبہ ادارت میں تھا۔

پندرہ روزہ ''احساس'' کا دفتر بل روڈ پر تھا۔ خالص ادبی رسالہ تھا۔ دفتر کے اوقات میں میں بھی وہاں پہنچ جاتا۔ انور جلال اور عباس احمد عباسی پہلے سے وہاں موجود ہوتے تھے۔ دفتر کا کام ختم کر کے ہم تینوں ٹی ہاؤس کی طرف چل پڑتے۔ عباسی کا جسم اکہرا تھا۔ ہماری طرح وہ بھی خوش لباس تھا۔ نکلتا ہوا قد تھا۔ چہرے کا رنگ زردی مائل تھا۔ آواز بڑی گھمبیر تھی۔ مگر بہت کم بولتا اور آہستہ آہستہ بولتا تھا اور بولتے وقت الفاظ کا پورا حق ادا کرتا تھا۔ آنکھوں میں بلا کی ذہین چمک تھی۔ کبھی کوئی فالتو بات نہیں کرتا تھا۔ وضع داری اور خوش مذاقی کا نمونہ تھا۔ ادب آداب اور قدیم شرفاء کی روایات کا بے حد خیال رکھتا تھا۔ ہماری منڈلی کے سبھی شاعر ادیب دوست عباسی سے بہت پیار کرتے۔ چہرے کے نقوش خوبصورت تھے۔ ناک قدیم یونانیوں کی طرح آگے سے پوائنٹڈ تھی۔ چہرے پر ذہانت کی بجائے بچوں ایسی معصومیت تھی۔ والٹ ڈزنی کے کارٹون دیکھ کر بچوں کی طرح قلقاریاں لگاتا مگر کھل کر کبھی نہیں ہنستا تھا۔ کبھی اونچی آواز میں بات نہیں کرتا تھا کبھی کسی دور بیٹھے دوست کو اونچی آواز میں بلانا ہوتا تھا تو وہ مجھے کہتا کہ یار ذرا اس کو آواز دے کر بلاؤ۔ سر ذرا سا جھکا کر آہستہ آہستہ بات کرتا۔ اس کو باتیں کرتے دیکھ کر لگتا تھا کہ اپنے آپ سے ہم کلام ہے۔ معاشی اعتبار سے وہ ایک خوش حال خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ چنانچہ وہ اس پوزیشن میں تھا کہ اپنی خوش لباسی اور لاابالی طبیعت کو برقرار رکھ سکے۔ وہ کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ ہمیشہ کاروبار کرنے کی انوکھی اور نئی نئی سکیمیں سوچتا رہتا۔ ہر روز وہ ایک نئی سکیم سوچتا۔ دو تین دن تک اس پر غور کرتا پھر

اسے بھول جاتا اور کسی دوسری سکیم پر غور و فکر شروع کر دیتا۔ آدمی جو بھی سکیم سوچے جب تک اس پر عمل نہ کرے۔ اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ شجاع کے ساتھ مصیبت یہ تھی اور یہ ہے کہ سکیم وہ بڑی عمدہ سوچتا مگر جب اس پر عمل کرنے کا وقت آتا اس کا سارا جوش فالتو بھاپ بن کر نکل جاتا۔

ایک بار شجاع نے پبلشنگ ادارہ قائم کرنے کی سکیم بنائی۔ دفتر بھی بنا لیا۔ اسے بڑے آرٹسٹک انداز میں سجا بھی دیا۔ مجھ سے ایک ناول کا مسودہ بھی لے لیا لیکن جب مسودے کی لکھائی کا مرحلہ آیا تو پبلشنگ کی سکیم کے ساتھ شجاع کی ساری دلچسپیاں ختم ہو گئیں۔ دفتر چھوڑ دیا، فرنیچر اونے پونے بیچ دیا ایک روز میں ٹی ہاؤس آیا تو شجاع سیف بڑا نفس سوٹ پہنے ٹوئل کی پھولدار ٹائی لگائے اکیلا ہاف سیٹ چائے منگا کر بیٹھا تھا اور بڑی نزاکت سے کپ میں براؤن کلر کی چائے انڈیل رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکرایا، اور بیرے کو ایک اور کپ لانے کیلئے کہا۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس سے پوچھا۔

''کیا بات ہوئی پبلشنگ کا ارادہ بدل دیا؟''

وہ بڑی شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگا۔

''یار بڑی بک بک ہے یہ......''

ہم چائے پیتے ہوئے امریکی ایکٹر باب ہوپ اور والٹ ڈزنی کے کارٹونوں کی باتیں کرنے لگے۔ شجاع کی نزاکت طبع چائے پیتے وقت بھی اس پر غالب رہتی تھی۔ چائے پیتے ہوئے اس کے پتلے ہونٹ بڑے معمولی سے کھلتے۔ ایسے محسوس ہوتا جیسے وہ چائے کے کپ کو بڑی شائستگی سے بوسہ دے رہا ہے۔ کپ بڑی آہستہ سے پرچ میں رکھ کر کہنے لگا۔

''میں ایک اور پروگرام بنا رہا ہوں۔

ایک اور سکیم میرے دماغ میں آئی ہے......''

جب ہماری ٹی ہاؤس کی منڈلی بکھر گئی تو شجاع سیف لندن چلا گیا۔ اس کے بعد اس کی کوئی خبر نہ آئی۔ انور جلال اور عباس احمد عباسی پہلے سے لندن میں موجود تھے۔ وائس آف امریکہ میں نیوز ٹرانسلیٹر میں میرا امتحان ہوا۔ حل شدہ پرچے اور میری آواز کی ٹیپ سر بمہر ہو کر واشنگٹن گئی۔ تین ماہ بعد خط ملا کہ میں پاس ہو گیا ہوں۔ ایک ماہ بعد

مجھے کال آ گئی اور میں امریکہ چلا گیا اور وائس آف امریکہ کی اردو سروس جوائن کر لی۔

پہلے روز VOA کی اردو سروس کے آفس میں پہنچا تو دیکھا کہ شجاع سیف ایک میز پر براجمان خبروں کا ترجمہ کر رہا ہے۔ سب سے زیادہ حیرت مجھے یہ دیکھ کر ہوئی کہ شجاع کام کر رہا تھا۔ میں زندگی میں پہلی مرتبہ اسے ذمے داری سے کوئی کام کرتے دیکھ رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ لندن سے امریکہ آ گیا تھا اور یہاں اس نے امتحان دے کر VOA کی اردو سروس جوائن کر لی تھی لیکن اس کی طبیعت کا لاابالی پن اور کسی جگہ ٹک کر نہ بیٹھنے کی عادت اس کے ساتھ آئی تھی۔ میری فیملی کے امریکہ آنے میں ابھی ہفتہ دس دن کی دیر تھی چنانچہ میں دو دن اکمل علیمی کے پاس رہا۔ پھر شجاع سیف کے فلیٹ میں آ گیا۔ VOA کی نوکری اس اعتبار سے بڑی سخت تھی کہ منہ اندھیرے اٹھ کر پہلے بس اور پھر انڈر گراؤنڈ ٹیوب پکڑنی پڑتی تھی۔ وقت کی پابندی لازمی شرط تھی۔ عین وقت پر آفس پہنچ کر خبروں کا ترجمہ کرنا پڑتا تھا اور خبروں کا بلیٹن عین وقت پر نشر ہونا ہوتا تھا۔

مجھے اس معاملے میں کسی قسم کی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑا کیونکہ مجھے بچپن ہی سے منہ اندھیرے اٹھ کر کمپنی باغ اور امرتسر کے چالیس کنوؤں پر جا کر ورزش کرنے اور سیر کرنے کی عادت تھی۔ صبح صبح ساڑھے چھ بجے کی بس پکڑ کر میٹرو ٹیوب سٹیشن اور وہاں سے ٹرین پکڑ کر ٹھیک ساڑھے سات بجے دفتر پہنچنا پڑتا تھا۔ میں ٹھیک پانچ بجے الارم کے ساتھ اٹھ بیٹھتا۔ صبح کو نہانا بھی میری بچپن سے عادت ہے۔ میں ٹھیک چھ بجے نہا دھو کر کپڑے پہن کر چائے کا مگ لے کر تیار ہو کر بیٹھ جاتا اور شجاع ابھی سو رہا ہوتا تھا۔ میرے جگانے پر وائس آف امریکہ کی نوکری کو برا بھلا کہتا غسل خانے میں گھس جاتا۔ خدا خدا کر کے غسل خانے سے نکلتا۔ بڑی مشکل سے کپڑے بدلتا۔ بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے بار بار منہ کھول کر اپنے دانتوں کا معائنہ کرتا۔ جب بس کے آنے میں صرف پانچ منٹ رہ جاتے تو ہم اپنی اپارٹمنٹ بلڈنگ سے نکل کر سامنے فٹ پاتھ پر بنے بس سٹاپ پر آ کر کھڑے ہو جاتے۔ ایسا شاید ہی کبھی ہوا ہو کہ شجاع آفس جاتے ہوئے کوئی شے لانی بھول نہ گیا ہو۔ کبھی وہ اپنے آفس کے دراز کی چابی لانی بھول جاتا، کبھی بس کی سلاٹ مشین میں ڈالنے کے لئے پینتیس سینٹ کا چینج ساتھ لانا بھول جاتا۔ اگر وقت ہوتا تو وہ جلدی سے فلیٹ میں جا کر مطلوبہ اشیاء لے آتا۔ اگر بس کے

آنے میں دو تین منٹ رہتے ہوں تو مجھے کہتا۔ ''تم جاؤ میں ٹیکسی میں آ جاؤں گا۔''

چنانچہ اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ شجاع اکثر آفس لیٹ پہنچتا جیسا کہ سب کو معلوم ہے امریکہ میں اور خاص طور پر امریکہ کے سرکاری دفاتر میں اور پھر ریڈیو سٹیشن پر ایک ایک سیکنڈ کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ شجاع سیف کے لئے جم کر کام کرنے اور ریڈیو سٹیشن پر کام کرنے کا یہ پہلا تکلیف دہ تجربہ تھا چنانچہ وہ زیادہ دیر وائس آف امریکہ کے ساتھ نہ چل سکا اور نوکری چھوڑ کر واشنگٹن میں ٹیکسی چلانے لگا۔ میرا وہ نہ صرف پرانا یار تھا بلکہ ننانوے فیصد ہمارے ذوق اور مزاج ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ وہ اسی فلیٹ میں رہتا تھا اور میں فیملی کے آ جانے کے بعد اس اپارٹمنٹ بلڈنگ کی چوتھی منزل کے ایک فلیٹ میں آ چکا تھا۔ ہفتہ اتوار کی چھٹی کے دن میں اس کے پاس چلا جاتا۔ وہ اکیلا رہتا تھا۔ زندگی میں شاید اس نے ایک ہی عقل مندی کا کام کیا تھا کہ شادی نہیں کی تھی۔ ہم چائے یا کافی کے مگ لے کر بیٹھ جاتے اور لاہور کی باتیں، اپنے لاہور کے ٹی ہاؤس کے دوستوں کی باتیں، انور جلال' شہزاد اور نواز کی باتیں کرتے رہتے۔ شجاع زیادہ تر ٹیکسی کی دربدری نہیں کرتا تھا۔ صرف رات کو یا صبح کے وقت یورپ اور اندرون امریکہ کی دو چار فلائٹوں کی سواریاں اٹھانے جاتا اور باقی سارا دن اپنے فلیٹ پر لیٹا ٹی وی دیکھتا یا رسالے پڑھتا رہتا یا پھر لندن اور پیرس میں اپنے دوستوں کو ٹیلی فون کرتا رہتا۔ چنانچہ ٹیلی فون لائن پر ہی پیرس کی ایک لڑکی سے دوستی ہو گئی۔ اب شجاع کو ایک کام مل گیا۔ یہ بڑا رومانٹک کام تھا۔ وہ اس لڑکی سے گھنٹوں ٹیلی فون پر آہستہ آہستہ باتیں کرتا رہتا۔ ویک اینڈ پر میں جب بھی اس کے فلیٹ پر جاتا وہ لکڑی کے فرش پر بچھے گدے پر نیم دراز اپنی پیرس کی دوست سے فون پر باتیں کر رہا ہوتا۔ ٹیکسی چلا کر وہ جتنے ڈالر کماتا اس کے آدھے ڈالر ٹیلی فون کے بل پر صرف ہو جاتے لیکن اس کے دوسرے کوئی فضول قسم کے اخراجات بھی نہیں تھے نہ وہ سگریٹ پیتا تھا نہ شراب اس نے کبھی نہیں پی تھی۔ اکیلا آدمی تھا۔ شاید پہلی بار کسی لڑکی سے اس کا رومانس ہوا تھا۔ بڑا جذباتی ہو رہا تھا۔ ایک روز اس نے مجھے اور اکمل کو یہ دھماکہ خیز خبر سنائی کہ وہ اپنی پیرس والی محبوبہ سے شادی کی سکیم بنا رہا ہے۔ میں نے اس خبر کو زیادہ اہمیت نہ دی۔ مجھے معلوم تھا کہ شجاع سیف صرف سکیمیں بناتا ہے۔ ان پر عمل کرنا اس کے بس میں نہیں ہے لیکن اس بار وہ

کچھ زیادہ ہی سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے باقاعدہ شادی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اپنی ہونیوالی بیوی کے لئے کچھ تحفے تحائف بھی خرید کر رکھ لئے۔ اکمل نے مجھے کہا۔ ''خواجہ! شجاع تو شادی کے معاملے میں واقعی سیریس ہو گیا ہے۔'' لیکن مجھے یقین تھا کہ شجاع حسب عادت اپنی شادی کی سکیم کے ساتھ بھی زیادہ دور تک نہیں چل سکے گا۔ وہ واپس آئے ہی آئے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس نے اپنی شادی پر پیرس جانے کے لئے ایئر فرانس کی ایک فلائٹ پر اپنی سیٹ بھی بک کروالی تھی کہ اکمل علیمی نے مجھے دفتر پہنچنے پر یہ خبر سنائی کہ شجاع نے پیرس جانے والی فلائٹ پر اپنی سیٹ کینسل کرا دی ہے۔ اسی شام آفس سے واپسی پر میں شجاع کے اپارٹمنٹ میں اصل حقیقت معلوم کرنے گیا تو وہ لکڑی کے فرش پر بچھے ہوئے گدے پر نیم دراز کافی کا مگ ہاتھ میں لئے کوئی رسالہ پڑھ رہا تھا۔

مجھے دیکھ کر اس نے رسالہ ایک طرف رکھ دیا اور بولا۔

''چینک میں کافی ابھی گرم ہے۔ اپنا مگ بنا کر لے آؤ۔''

میں کافی کا مگ بنا کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔

''پیرس کب جا رہے ہو؟''

شجاع نے کافی کا مگ اپنے ہونٹوں سے الگ کر کے کہا۔

''میں نے شادی کا خیال چھوڑ دیا ہے۔''

میں نے حیران ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

''وہ کیوں؟''

شجاع نے بے نیازی سے کہا۔

''کون اس بک بک میں پڑے یار!''

وہ اپنی گزشتہ روایات اور عادت کے مطابق سب کچھ بھول کر اپنی روزمرہ کی لائن پر واپس آ گیا۔ ایک بار صبح اور ایک بار رات کو ایئرپورٹ سواریاں پکڑنے جاتا اور باقی کا وقت اپنے فلیٹ میں گدے پر نیم دراز ہو کر یا ٹیلی ویژن دیکھتا رہتا اور یا رسالے کتابیں پڑھتا رہتا۔ ویک اینڈ پر میں اس کے پاس آ جاتا۔ کبھی ہم دونوں اکمل علیمی کے

ہاں چلے جاتے اور اس کے ووڈ برج والے مکان کے صحن میں اگے ہوئے سیب کے درخت پر سے سیب توڑ کر کھاتے اور رات کا کھانا بھی وہیں کھاتے۔ واپسی پر شجاع مجھے میرے فلیٹ پر چھوڑ کر خود ایئرپورٹ کی طرف نکل جاتا۔ شجاع اپنی زندگی کے ایک ایسے معمولات سے کبھی نہیں اکتایا تھا۔ اس کے لئے ہر دن ایک نیا سورج لے کر طلوع ہوتا تھا۔ میں نے اسے کبھی مایوس اور غمگین نہیں دیکھا۔ جتنا خوش وہ کوئی نئی سکیم بنا کر ہوتا تھا اس سے زیادہ خوش وہ اس سکیم کو ترک کر دینے پر ہوتا تھا۔ جتنا خوش اور پرجوش ہم نے اسے اپنی پیرس والی محبوبہ سے شادی کرنے کے فیصلے پر دیکھا تھا اس سے زیادہ خوش وہ اس فرنچ لڑکی سے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر کے نظر آ رہا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک بہت بڑی نعمت ہے جو قدرت نے شاید شجاع کی بچوں ایسی معصومیت کے عوض اس کے مزاج کو ودیعت کر رکھی ہے۔

☆......☆......☆

پرانی محبتوں کے نشاں......اصغر سلیم

پاکستان کی ادبی شخصیات کے بارے میں گاہے گاہے باز خواں کے ضمنی عنوان کے تحت میرے جو مضامین نوائے وقت کے سنڈے ایڈیشن میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ قارئین کرام مجھے خط لکھ کر یا ٹیلی فون پر اکثر ان پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ ایک بات ضرور کہتے ہیں کہ ہم نے ان شاعروں اور ادیبوں کے فن پر تو بہت کچھ پڑھا تھا مگر ان کی شخصیت سے ہمارا تعارف صرف آپ کے مضامین کے ذریعے ہوا۔

یہ بات میرے محترم قارئین بہت حد تک ٹھیک کہتے ہیں۔ اس لئے کہ میں اگر ناصر کاظمی، منٹو، راجہ مہدی علی خان، قتیل شفائی یا ابن انشاء کے فن کے بارے میں لکھنا بھی چاہتا تو میں نہیں لکھ سکتا تھا۔ اس لئے کہ میں ادبی تنقید کا آدمی نہیں ہوں۔ مجھے خود اپنے فن کے بارے میں کچھ علم نہیں ہے۔ میں کسی کے فن کے بارے میں کیا لکھوں گا۔ میں نے ان ادبی مشاہیر کی جو شخصیت نگاری کی ہے تو وہ بھی اس خیال سے نہیں کی کہ آگے چل کر پاکستانی ادب کے تذکرہ نگاروں کو ان مضامین سے بہت کچھ حوالہ جات ملیں گے بلکہ یہ سب کچھ میں نے اپنے شوق کی خاطر کیا ہے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ ادب کے ان مشاہیر میں سے اکثریت ایسے شاعر ادیبوں کی تھی جو میرے بے تکلف دوست تھے اور بعض میرے ہم نوالہ و ہم پیالہ بھی تھے۔ اگر میں نے انہیں بڑے قریب سے دیکھا ہے تو انہوں نے بھی مجھے بڑے قریب سے دیکھا ہے۔

چند ایک سینئر بزرگوں کو چھوڑ کر باقی جو میرے ہم عمر شاعر اور ادیب تھے اور جن کا اردو ادب میں بڑا نام ہے ان میں سے اکثر کو میں نے ہر رنگ میں، ہر روپ میں دیکھا ہے۔ انہوں نے بھی مجھے ہر رنگ میں، ہر روپ میں دیکھا ہے۔ وہ میری کمزوریوں

اور میری طاقت کو جانتے تھے۔ میں ان کی کمزوریوں اور ان کی طاقت کو جانتا تھا۔ ہماری تمام اچھائیاں، برائیاں، خود غرضیاں ایک دوسرے پر کھلی تھیں۔ ہم ایک دوسرے سے پیار محبت بھی کرتے تھے اور ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے بھی تھے۔ لیکن میں نے ان دوستوں کی شخصیت نگاری کے بارے میں کبھی نہیں سوچا تھا۔ پھر جب پاک ٹی ہاؤس کی محفلیں درہم برہم ہوگئیں اور وقت کی آندھی ہمیں اڑا کر ایک دوسرے سے دور لے گئی اور پھر جب ایک ایک کر کے یہ میرے پیارے دوست مجھ سے ہمیشہ کیلئے جدا ہوتے چلے گئے تو ان کی اداس یادیں میرے ساتھ رہنے لگیں۔ ان کے ہنستے ہوئے، باتیں کرتے ہوئے چہرے ایک ایک کر کے آنکھوں کے سامنے آنے لگے۔ وہ زمانہ یاد آنے لگا جب ہم پاک ٹی ہاؤس میں بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے دنیا جہان کی باتیں کیا کرتے تھے۔

اشفاق احمد کہتا تھا کہ میں فلاں افسانہ لکھ رہا ہوں۔ ناصر کاظمی اپنی کسی تازہ غزل کے دو چار شعر سناتا۔ ابن انشاء ''چاندنگر'' کی باتیں کرتا۔ صفدر میر زینو، عبداللہ ملک اور حمید اختر ادب کے ترقی پسند نظریات پر گرما گرم بحثیں کرتے۔ صفدر میر زینو کا چھوٹا بھائی اصغر سلیم بہت کم کسی کو اپنے شعر سناتا تھا لیکن ہم اس کے بے تکلف دوست تھے۔ کبھی کبھی ہمیں اپنا ایک آدھ شعر سنا دیتا۔ مجھے اس کی غزل کا ایک مقطع آج بھی یاد ہے:

صبا چمن میں پکارے گی ایک دن ہم کو
مگر سلیم ہم آشفتہ سر کہاں ہوں گے

صفدر میر انتہا پسند ترقی پسند تھا مگر اصغر سلیم کی شخصیت اور اس کے فن میں شعریت کا گداز تھا۔ وہ فیض احمد فیض سے بڑا متاثر تھا۔ یہ دونوں بھائی ان دنوں اپنے مصری شاہ والے مکان میں رہتے تھے۔ ہم بھی مصری شاہ میں رہتے تھے۔ ہمارا مکان اصغر سلیم کے مکان کے قریب ہی تھا۔ کبھی کبھی میں گھر سے نکل کر پاک ٹی ہاؤس جاتے ہوئے اصغر سلیم کے پاس آ جاتا۔ ان کے مکان کا مختصر سا دیوان خانہ بڑا پرسکون تھا۔ اوپر سے چائے آ جاتی۔ ہم دونوں بڑے مزے سے چائے پیتے۔ باتیں کرتے۔ اصغر سلیم، صفدر میر کی طرح کھل کر قہقہہ لگاتا تھا۔ وہ ایک خوددار اور کسی حد تک خود سر شخصیت

کا مالک تھا۔ سوائے اپنے ہم جولیوں کے کسی دوسرے سے بے تکلف نہیں ہوتا تھا۔ مجھے اس کی شخصیت اور اس کے پاؤں ہلا ہلا کر بڑے مزے مزے سے اپنا کوئی شعر سنانے کا انداز بڑا اچھا لگتا تھا۔

وہ بہت کم کسی کو اپنا کوئی شعر سناتا تھا۔ شعر چھپواتا بھی بہت کم تھا۔ شاید وہ صرف اپنے لئے شعر کہتا تھا۔ شہرت کی اسے کوئی خواہش نہیں تھی۔ صفدر میر سے اس کے گھر میں بہت کم میری ملاقات ہوتی۔ ہماری ملاقاتیں پاک ٹی ہاؤس یا پاکستان ٹائمز کے دفتر اور یا ترقی پسند مصنفین کے ادبی جلسوں میں ہی ہوتی تھی۔ اصغر سلیم کا اور میرا آپس میں بڑا پیار تھا۔ اس کی دلکش شخصیت مجھے بڑی اچھی لگتی تھی۔ وہ باتیں بھی بڑی لہک لہک کر گردن کو ایک طرف ذرا سا خم دیئے اس طرح کیا کرتا جیسے شعر سنا رہا ہو۔ وہ بھی ہم سے اچانک بچھڑ گیا۔ صفدر میر بھی ہم سے جدا ہو گیا۔ صفدر میر زینو کے نام سے پاکستان ٹائمز میں کالم لکھا کرتا تھا۔ جب وہ مصری شاہ سے نکل کر آخری عمر میں سکاچ کارنر والی کالونی میں رہنے لگا تو اس سے شاذ و نادر ہی ملاقات ہوتی تھی۔ مجھ سے آخری بار وہ اسلام آباد میں ملا جب ہم دونوں تمغہ حسن کارکردگی وصول کرنے وہاں گئے ہوئے تھے۔

اب میں واپس وہیں پر آتا ہوں جہاں سے میں نے بات شروع کی تھی۔ میں کہہ رہا تھا کہ میں نے اپنے ان ادیب اور شاعر دوستوں کی شخصیت نگاری کوئی خاص ادبی مقصد ذہن میں رکھ کر نہیں کی تھی بلکہ صرف اپنی اس محبت کی خاطر کی تھی جو مجھے ان سے اور انہیں مجھ سے تھی لیکن جب میں پاکستانی ادب کی ان تمام شخصیتوں کے بارے میں لکھ چکا تو مجھے محسوس ہوا کہ ان لوگوں سے میری محبت نے مجھ سے وہ کام کروا دیا ہے جو میرے ہم عصر ادیبوں اور ان شخصیتوں کے دوستوں میں سے کسی نے نہیں کیا اور جو انہیں کرنا چاہئے تھا۔ میں تو عشق و محبت کا آدمی ہوں۔ افسانے بھی عشق و محبت کے لکھتا ہوں۔ یہ عشق و محبت نیچر کے حسن اور جنگلوں کی بارشوں اور اپنے وطن سے پیار کا عشق و محبت ہے۔ میرا کوئی فقرہ غلط سلط ہوتا ہے تو ہو جائے مگر میری محبت میں فرق نہیں آنا چاہئے۔ محبت جو مجھے فطرت کے حسن سے ہے اور اپنے دوستوں سے تھی اور ہمیشہ رہے گی۔

جب میرا کوئی محترم قاری میری اس محبت سے متاثر ہو کر مجھے خط لکھتا ہے، تو میری محبت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ خطوط بہت ہیں لیکن اب یہاں ان کی گنجائش نہیں رہی۔

سرگودھا کے بلاک نمبر 14 سے محترم محمد اشرف شہزاد لکھتے ہیں:

''محترم اے حمید صاحب! ناصر کاظمی پر آپ کا مضمون پڑھا۔ بہت خوشی ہوئی کہ ایک ایسے عظیم شاعر کی شخصی زندگی اور اس کی عادات و اطوار کے بارے میں آپ نے لکھا کہ جس کے بارے میں بہت کم لوگوں کو علم ہے۔ آپ نے ناصر کاظمی صاحب کی معاشرتی زندگی کے تمام گوشوں سے پردے ہٹا کر ایک عام قاری کو بڑی دلچسپ معلومات فراہم کی ہیں۔ میں اور میرے جیسے بہت سے عام لوگ جو ناصر کاظمی کے مداح ہیں آپ کے بڑے ممنون ہیں۔ آپ سے ایک اور عرض بھی کرنی تھی۔ اس دفعہ برسات بہت ہو رہی ہے مگر آپ کا قلم برسات کی بارش کی طرح نہیں برسا۔ بہت تشنگی محسوس ہو رہی ہے۔ برسات کا مزا نہیں آئے گا۔ اگر آپ نے ہمیں سری لنکا، بنگال اور گوجر خان کی بارشوں سے نہ ملوایا۔''

آپ کا قاری محمد اشرف شہزاد

بلاک نمبر 14، سرگودھا

اور یہ خط محمد پور فیصل آباد سے آیا ہے۔ لکھنے والے ہیں محترم آفتاب احمد خان لکھتے ہیں:

محترم اے حمید صاحب!

''آپ نے راجہ مہدی علی خاں کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات کا تذکرہ شروع کیا۔ دل کے تار بج اٹھے۔ آپ کی صحت اور زور قلم کے لئے بارگاہ رب العزت میں دعا گو ہوں۔ راجہ مہدی علی خان کے والد ریاست پٹیالہ میں مدتوں شعبہ تعلیم کے ڈائریکٹر رہے۔ راجہ مہدی علی خان، مولانا ظفر علی خان کے بھانجے تھے۔ راجہ صاحب پہلے پہل اخبار زمیندار سے منسلک تھے۔ پھر لاہور چھوڑ کر دلی چلے گئے اور آل انڈیا

ریڈیو سے وابستہ ہو گئے۔ یہ وہی زمانہ تھا جس زمانے کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ دلی میں کچھ عرصہ قیام کے بعد بمبئی چلے گئے اور فلمی دنیا میں داخل ہو گئے۔ 1976ء میں بمبئی میں ہی ان کا انتقال ہوا۔ بمبئی میں راجہ مہدی علی خان نے دھوم مچا دی۔ اس زمانے میں کوئی بڑا موسیقار ایسا نہ تھا جس کے لئے راجہ صاحب نے گیت نہ لکھے ہوں۔ گلوکارہ آشا بھونسلے راجہ صاحب کی بے حد نیاز مند تھی۔ بمبئی میں راجہ صاحب سے میری اکثر ملاقات رہا کرتی تھی۔ آپ نے اس زمانے کا ذکر بڑے دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ میرے علاوہ راجہ مہدی علی خان کے دوسرے مداحین نے بھی آپ کا مضمون بڑے شوق سے پڑھا ہوگا۔ دعا گو ہوں کہ اللہ آپ کو صحت مند اور تندرست رکھے۔ آپ لکھتے رہیں ہم پڑھتے رہیں۔ ایسی ادبی اور تاریخی شخصیات کے تذکرے تاریخ کا قرض ہے جو آپ نے اتار دیا۔ مجھے دلی والے تیس ہزاری کے کوارٹروں کے زمانے کا ذکر پڑھ کر بڑی دلچسپ حیرت ہوئی۔"

والسلام

آفتاب احمد خان

محترمی آفتاب احمد خان صاحب!

آپ کو میرا مضمون پسند آیا میں شکر گزار ہوں۔ جس زمانے میں مجھے راجہ صاحب سے دلی والے تیس ہزاری کے کوارٹروں میں ملنے کا شرف حاصل ہوا۔ اس زمانے میں میری عمر سولہ سترہ سال کی تھی۔ اس زمانے کی میری آوارہ گردیوں نے مجھے بہت کچھ دکھایا۔ بعض بڑی یادگار زمانہ ہستیوں سے ملوایا۔ مجھے دربدری بھی کرنی پڑی۔ تکلیفیں بھی اٹھائیں۔ لڑکپن کی اس عمر میں کئی راتیں ہندوستان کے بڑے شہروں کے فٹ پاتھوں پر اور خطرناک جنگلوں میں بھی گزارنی پڑیں۔ مگر میں ہر حال میں بڑا خوش رہا۔ جذبہ عشق سلامت ہو اور سچا ہو تو اس قسم کی تکلیفیں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ پھر تو زہر بھی آب حیات بن جاتا ہے۔

یہ میرا جذبہ عشق ہی تھا۔ نئے نئے جنگلوں اور شہروں کو دیکھنے کا۔ جنگلوں میں

گرتی بارشیں دیکھنے کا...... بنگال، مدراس، ترچناپلی اور سری لنکا کے مندروں کی پراسرار دیوداسیاں دیکھنے کا، جو مجھے اس عمر میں بھی اڑائے اڑائے لئے پھرتا تھا۔ امرتسر سے لے کر بمبئی کلکتہ اور کلکتے سے مدراس، مدراس سے سری لنکا اور رنگون اور جنوب مغربی ہند اور لنکا کے گھنے خطرناک جنگل اور ان جنگلوں میں آدھی رات کو شیروں کے گرجنے کی آوازیں سنیں۔ ڈر بھی لگا لیکن جذبہ شوق نے کہیں رکنے نہ دیا۔ پھولوں سے ڈھکے ہوئے درختوں کو دیکھا۔ ایسے ایسے پھول دیکھے کہ جن کی خوشبوؤں میں ایک طلسم تھا۔ ایسی ایسی خوشبوئیں آئیں کہ جن کے پھول تلاش کرنے پر بھی کہیں نہ ملے۔ جنگلی گلابوں میں چھپ کر بہنے والی ندیوں کو دیکھا۔ جنگل میں طلوع ہونے والے سورج کو سمندر میں غروب ہوتے دیکھا۔ ہر جگہ، ہر منظر میں اللہ کی شان نظر آئی۔ اس کے جلال کو دیکھا۔ اس کے جمال کو دیکھا۔ جلال و جمال کے یہ سارے منظر میرے ساتھ رہتے ہیں۔ خوبصورت یادوں کا اتنا خزانہ جمع ہو گیا ہے کہ اگر ایک اور زندگی بھی مل جائے تو یہ ختم نہیں ہوگا۔

☆......☆......☆

اشفاق احمد

پرانے کاغذات دیکھ رہا تھا۔ ان میں سے اشفاق احمد کی دو تحریریں نکل آئیں۔ ایک تحریر داستان گو کے پیڈ پر لکھی ہوئی ہے جو ریحانہ کے نام ہے۔ اس میں اشفاق نے ریحانہ کو تاکید کی ہے کہ میں نے داستان گو کیلئے جو ناولٹ اور ناول لکھنے کا وعدہ کیا تھا وہ مجھے یاد دلائے اور مجھ سے پوچھ کر معلوم کرے کہ مسودوں کی کیا صورت ہے۔ دوسری تحریر اس نے لیل ونہار کے دفتر میں بیٹھ کر لکھی ہے جو دو تین سطروں کی شکل میں ہے اور میرے نام ہے۔ اس میں اشفاق نے مجھے تاکید کی ہے کہ اس نے خاں صاحب نزاکت علی خاں اور سلامت علی خاں سے انٹرویو کا وقت لے لیا ہے چنانچہ میں وقت پر پہنچ جاؤں۔

تیسری چیز جو ان تحریروں کے ساتھ میرے سامنے پڑی ہے وہ سیلون کی چائے کا ایک خوبصورت ٹین یعنی ڈبہ ہے۔ گزشتہ روز ریحانہ' اشفاق کے ہاں گئی تو بانو قدسیہ نے اسے چائے کا یہ ڈبہ دیا اور کہا کہ انتقال سے چار روز قبل اشفاق صاحب نے سیلون کی یہ چائے مجھے دی اور کہا کہ اسے سنبھال کر رکھ لو۔ میں جب اچھا ہو جاؤں گا تو حمید کے ہاں چلیں گے اور اکٹھے وہاں یہ چائے پئیں گے۔ کل سے چائے کا یہ ڈبہ ویسے کا ویسا میری میز پر رکھا ہوا تھا۔ اسے کھولنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ جو چائے میں نے اشفاق کے ساتھ پینی تھی وہ میں اکیلے کیسے پی سکتا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے' کمرے میں آتے جاتے چائے کے خوبصورت ڈبے کو دیکھتا۔ بڑی محبت سے اس پر ہاتھ رکھتا اور اداس ہو کر باہر نکل جاتا۔ مجھے ایسے لگتا جیسے میں نے اشفاق احمد سے ہاتھ ملایا ہے اور پھر اس کا ہاتھ میرے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔

ذوق نے اپنے ایک شعر میں کہا تھا کہ کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا' ملاقات مسیحا و خضر سے بہتر ہے لیکن اشفاق احمد جیسے کسی ہمدم دیرینہ کا بچھڑ جانا' مسیحا و خضر سے جدا ہونے کے غم سے زیادہ الم انگیز ہے۔

میرا اور اشفاق احمد کا ساتھ نصف صدی کا ساتھ تھا۔ قیام پاکستان کے بعد وہ مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے لاہور آیا تو کچھ روز ملتان شہر کے کسی مہاجر کیمپ میں مہاجرین کی آمد وغیرہ کا اندراج کرتا رہا۔ پھر وہاں سے لاہور کے والٹن کیمپ میں آ گیا اور یہاں میری اس سے پہلی ملاقات ہوئی۔ یہ پہلی ملاقات مجھے ایک خواب کی طرح یاد ہے۔ خوبصورت خواب پورے یاد نہیں رہتے۔ پل بھر کیلئے ایک جھلک سی دکھا کر ٹوٹتے ہوئے ستاروں کی دھند میں غائب ہو جاتے ہیں۔ بہت یاد کرتا ہوں تو ایک دھندلا سا منظر ابھرتا ہے۔ میں اور اشفاق کسی جگہ بیٹھے ہوئے ہیں' باتیں کر رہے ہیں۔ وہ بتا رہا ہے کہ پہلے میں ملتان کے مہاجر کیمپ میں تھا' اب میں والٹن کے مہاجر کیمپ میں مہاجرین کی آمد اور ان کے نام اور جہاں سے وہ ہجرت کر کے آئے ہیں ان دیہات اور شہروں کے ناموں کا اندراج کرتا ہوں۔ اس کے گورے چٹے چہرے پر بھرپور شباب کی چمک ہے۔

اس کے بعد خواب کا منظر بدلتا ہے۔ ہم دونوں بانسوں والے بازار میں سے گزرتے شاہ عالمی دروازے کی طرف جا رہے ہیں۔ شاہ عالمی دروازے کا بازار شروع سے لے کر آخر تک یعنی رنگ محل تک جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ بازار غائب تھا' بازار کی جگہ مکانوں کے ملبے کے ڈھیر نہیں بلکہ ملبے کی پہاڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ لوگوں کے چلنے پھرنے سے ان پہاڑیوں پر اونچی نیچی پگڈنڈیاں بن گئی تھیں۔ ہماری بائیں جانب والی پرانی عمارتوں میں سے صرف لال مسجد باقی بچی تھی بلکہ ساری عمارتیں ملبے کا ڈھیر بن چکی تھیں۔ دائیں جانب چند ایک مکانوں کے جلے ہوئے ڈھانچے اس طرح کھڑے تھے کہ ابھی گرے کہ گرے۔ لال مسجد سے ذرا آگے جا کر ہم ملبے کی پہاڑیوں سے اتر کر چوہٹہ مفتی باقر کے ایک بازار میں آ جاتے ہیں جہاں خالی بوتلیں خالی شیشیاں بکتی تھیں' شاید اب بھی بکتی ہیں۔ اشفاق احمد یہاں پونڈز کریم کے سائز کی کچھ خالی شیشیاں خریدنے آیا تھا۔

اس کے بعد میں اس سے ملنے اکثر ان کے نمبر 1 مزنگ روڈ والے مکان میں جایا کرتا۔ پھر ہماری پاک ٹی ہاؤس والی ملاقاتیں شروع ہوگئیں۔ اس دوران ہم دونوں نے افسانے' ناولٹ وغیرہ لکھنے شروع کر دیئے تھے اور ہم نے اردو ادب میں ایک قابل عزت مقام بنا لیا تھا۔ ہم دونوں یعنی اشفاق اور میں نے پاکستان میں آ کر لکھنا شروع کیا جبکہ افسانہ نگار شوکت صدیقی اور انتظار حسین پاکستان بننے سے پہلے سے لکھ رہے تھے۔ اشفاق احمد اپنے افسانوں میں متوسط طبقے کے معاشرتی مسائل اور ان مسائل میں الجھے ہوئے لوگوں کی حقیقت نگاری کرتا جبکہ میرے افسانوں میں محبت اور رومان کی ایک فضا ہوتی۔ قدرت نے اسے کردار نگاری کا خاص وصف عطا کیا تھا۔ دو تین سطروں میں ایک جیتا جاگتا کردار ابھر کر سامنے آ جاتا۔ اس کی کردار نگاری اور حقیقت نگاری میں مجھے جو خاص بات محسوس ہوتی وہ یہ تھی کہ ساری فضا کو سارے کرداروں کو اشفاق احمد کے دل کی شفقت' محبت' رحم دلی اور انسان دوستی نے اپنی آغوش میں لے رکھا ہوتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے پہلے افسانے سے بڑا افسانہ نگار تھا اور اپنے آخری افسانے تک بڑا افسانہ نگار ہے۔

اشفاق احمد کے افسانوں کا (شاید) پہلا مجموعہ 1957ء میں لاہور کے ایک اشاعتی ادارے بک لینڈ کی طرف سے چھپا۔ اس مجموعے کا نام "اجلے پھول" ہے۔ اس کتاب میں سے اس کا افسانہ "گڈریا" نکال کر پڑھیے اور دیکھیں کہ اس شخص نے داؤ جی کا کردار کس قدر اپنے دل کے ساتھ لگا کر پیش کیا ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ آپ کتاب پڑھتے پڑھتے سطروں کی سیڑھیاں اتر کر ایک عالم بے خودی میں کتاب کے اندر چلے جائیں اور جو منظر بیان ہو رہا ہے اس کا ایک حصہ بن جائیں۔ یہ کوئی جادو نہیں ہے۔ کوئی طلسم نہیں ہے۔ اگر کچھ ہے تو دلوں کو فتح کرنے والی محبت ہے اور اشفاق احمد کا دل اس محبت سے لبریز تھا۔ یہ اسی لازوال محبت کی ایک لہر تھی جو لکھتے وقت اس کے قلم سے نکل کر کاغذ کی سطروں میں جاری و ساری رہتی تھی اور جس نے اس کے ادب کو ہمیشہ کی زندگی عطا کر دی ہے۔

ہماری پچاس سالہ دوستی کے عہد میں میرا اور اشفاق احمد کا کبھی کسی بات پر لڑائی جھگڑا نہیں ہوا اور ایسا صرف اس لئے نہیں ہوا کہ اشفاق احمد میری زیادتیوں اور

کمینگیوں کو معاف کر دیا کرتا تھا بس مسکرا کر درگزر کر جاتا تھا۔ شاید اس میں میری محبت کا بھی کچھ اثر تھا جو مجھے اشفاق احمد سے تھی اور ہے۔ میں بے وقوفی کی حد تک محبت کرنے والا بندہ ہوں اور اشفاق احمد سے مجھے ایسی ہی محبت تھی۔ اچھی چائے کو وہ بہت پسند کرتا لیکن اپنی طبیعت سے مجبور ہو کر وہ بری چائے کو بھی معاف کر دیتا تھا جبکہ میں بری چائے کو معاف نہیں کرتا۔ ایک دفعہ میں اس کے ہاں بیٹھا تھا۔ چائے آئی تو میں نے اس کا ہلکا سا گھونٹ لے کر اسے پرے کر دیا اور اشفاق سے پوچھا۔

یہ چائے کس نے دم کی تھی؟ کہنے لگا خانساماں نے بنائی تھی۔ میں نے کہا۔

"یار! مجھے خانساماں کی چائے کیوں پلاتے ہو؟ قدسیہ سے کہو وہ چائے بنا کر لائے۔ وہ چائے بہت اچھی بناتی ہے۔ اس نے ہنس کر قدسیہ کو آواز دی اور کہا یہ کمینہ آ گیا ہے' اس کیلئے تم خود چائے بنا کر لاؤ۔ چنانچہ بے چاری قدسیہ نے سب کام چھوڑ کر میرے لئے چائے بنائی۔ وہ واقعی صحیح معنوں میں چائے تھی۔ چینک کی ٹی کوزی اتارتے ہی کمرے میں چائے کی خوشبو پھیل گئی۔ اشفاق نے ایک گھونٹ لے کر کہا۔ "ہاں! یہ واقعی چائے ہے۔"

اس جہان فانی سے رخصت ہونے سے تین چار دن پہلے سیلون کی چائے کا جوڑبہ اس نے یہ کہہ کر قدسیہ کو دیا تھا کہ اسے سنبھال کر رکھ لو' میں اچھا ہو جاؤں گا تو حمید کے ہاں چل کر اکٹھے یہ چائے پئیں گے' وہ ڈبہ میرے سامنے پڑا ہے۔ اس ڈبے میں اشفاق احمد کی محبتوں کی ساری خوشبوئیں بند ہیں۔ جس روز بارش ہوئی' میں اس چائے کو چینک میں دم کروں گا۔ ایک پیالی اپنے لئے بناؤں گا ایک پیالی اشفاق کیلئے بنا دوں گا۔ پھر ہم دونوں چائے پئیں گے اور پھر بارش کی آواز ہوگی۔ اشفاق احمد کا مسکراتا ہوا چہرہ ہوگا اور لازوال محبتوں کی خوشبو ہی خوشبو ہوگی۔

☆......☆......☆

باتیں ابن انشاء کی

کل چودھویں کی رات تو نہیں تھی مگر ابن انشاء مجھے بہت یاد آیا' ٹیلی ویژن پر کوئی اس کا شعر گا رہا تھا۔ کل چودھویں کی رات تھی' شب بھر رہا چرچا تیرا' ابن انشاء کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آ گیا۔

بچوں ایسی شرارتیں' مسکراہٹ والا ذہین چہرہ اور پھر مجھے وہ زمانہ یاد آ گیا جب ہم روز ملا کرتے تھے۔ میرے پاس ابن انشاء کے کچھ خط ہیں جو اس نے مجھے کراچی سے لکھے تھے اور جو میں نے سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں میں بریف کیس میں سے اس کے پرانے خطوط نکال کر دیکھنے لگا۔ سب سے اوپر والا خط وہ تھا جو اس نے مجھے کراچی سے پہلی بار لکھا' یہ قیام پاکستان کے بعد کا ابتدائی زمانہ تھا۔ ابن انشاء کراچی کے کسی سرکاری ادارے میں بطور مترجم ملازم ہو گیا تھا۔ خط پر سن نہیں لکھا ہوا صرف 25 اکتوبر کراچی ہی لکھا ہوا ہے خط یوں شروع ہوتا ہے۔

"اے حمید! میری جان! تمہارا خط پا کر بے حد خوشی ہوئی' پچھلے کئی دنوں سے تم پر پیار آ رہا تھا اور تمہارا خط نہ بھی آتا تب بھی میں آج تمہیں خط ضرور لکھتا۔ دراصل بات یہ ہے کہ تم مجھے سمجھتے ہو اور میں تمہیں سمجھتا ہوں۔ میں تم سے کئی چیزیں لے سکتا اور تم مجھ سے کئی چیزیں سیکھ سکتے ہو لیکن اب تو حالات ہی ایسے ہیں کہ یکجائی مشکل نظر آتی ہے۔ اول تو کراچی میں مکان ہی میسر نہیں۔ شہر سے کوئی چار میل باہر ایک بیابان میں ایک دوست کا مہمان ہوں' شاید تم اس دوست کو جانتے ہو' اس کا نام لوک پال سیٹھی ہے اور وہ ملٹری اکاؤنٹس میں ملازم ہے۔ ملٹری

اکاؤنٹس کے غیر شادی شدہ مہاجر ملازمین کے لئے ان کے محکمے نے ایک ہسپتال کی بیرک دے رکھی ہے جس میں باقاعدہ بیڈ ہیں۔ شمال کی طرف ہمارے بالکل سامنے ملٹری ہسپتال کی عمارت ہے اور ادھر مغرب میں جہاں سے ہو کر بس گزرتی ہے' سسٹرز میس ہے۔ اس لفظ سے تمہارے دل میں رومانیت جاگ اٹھی ہو گی۔ لیکن میری جان! اس میں نرسیں نہ ہونے کے برابر ہیں اور جو ایک دو کبھی کبھار نظر آ جاتی ہیں وہ سب کی سب حسن عسکری کے افسانوں کے کردار ہیں۔ پھر تم جانتے ہو کہ اپنا یہ راستہ ہی نہیں ہے۔ باقی یہ جگہ چونکہ کراچی شہر سے دور ہے اس لئے تم اسے پرفضا کہہ سکتے ہو لیکن پرفضا ہونے کے لئے سبزے اور روئیدگی کا ہونا ضروری ہے اور یہاں سبزے کی جگہ خاک اڑتی ہے۔ محاورے کی خاک نہیں سچ مچ کی خاک۔ صبح آٹھ بجے اٹھتا ہوں' وہ اس لئے کہ نو بجے پانی بند ہو جاتا ہے۔ اگر نہ اٹھوں تو کوئی جگانے والا نہیں' خیر اس کے بعد ہسپتال کی کینٹین پر ناشتہ کر کے پھر واپس آ جاتا ہوں۔ اتنے میں میرے دوست دفتر چلے جاتے ہیں۔ میری ڈیوٹی سہ پہر کے بعد شروع ہوتی ہے میں پڑھنے لگتا ہوں۔ پڑھتے پڑھتے سو جاتا ہوں کوئی ایک بجے اٹھ کر شیو کرتا ہوں۔ شیو کر کے پھر کینٹین پر چلا جاتا ہوں۔ کینٹین پر روٹی تو نہیں ملتی البتہ ڈبل روٹی' مکھن' انڈے مل جاتے ہیں۔ دوپہر کا کھانا انڈے ڈبل روٹی پر مشتمل ہوتا ہے۔ تین بجے بیرک سے نکل کر بس سٹینڈ پر آ جاتا ہوں وہاں دس پندرہ منٹ انتظار کرنے میں بس مل جاتی ہے جو مجھے صدر پہنچا دیتی ہے۔

صدر' کراچی کے بارونق ترین علاقوں میں سے ہے۔ یہاں اتر کر کیفے جارج میں چلا جاتا ہوں اور ڈیوٹی کے وقت تک یعنی ساڑھے چار بجے تک وہاں بیٹھا رہتا ہوں' چائے وغیرہ پیتا ہوں' ہوٹل سے دفتر کا کوئی پانچ دس منٹ کا پیدل راستہ ہے' وہاں سے دفتر آ جاتا ہوں۔ ڈیڑھ گھنٹہ ترجمہ کرتا ہوں اور پہلی ڈیوٹی ختم ہو جاتی ہے اس کے بعد تھوڑی دیر بازار کی سیر کرتا ہوں پھر دہلی مسلم ہوٹل میں کھانا کھاتا ہوں پھر پارس ہوٹل

میں چائے پیتا ہوں اور ساڑھے سات بجے شام دوسری ڈیوٹی پر چلا جاتا ہوں۔

دوسری ڈیوٹی رات نو بجے ختم ہوتی ہے اس کے بعد دفتر کے دوستوں سے باتیں کرتا ہوں' پھر صدر آ جاتا ہوں۔ وہاں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ چائے نوشی اور گپ بازی میں گزرتا ہے۔ کوئی فلم اچھی لگی ہو تو سینما میں چلا جاتا ہوں ورنہ کوئی گیارہ بجے کے قریب وکٹوریہ روڈ پر ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں گھر کی راہ لیتا ہوں۔ یہاں سے گھر کوئی تین چار میل ہے اور راستہ کافی ویران سا ہے۔ بس دونوں جانب لمبے لمبے احاطوں والی اور سفیدے کے درختوں والی کوٹھیاں ہیں کوئی فلیٹ یا مکان نہیں' کوئی دکان نہیں۔ اس وقت یعنی ساڑھے گیارہ بجے شب وہاں سناٹا چھایا ہوتا ہے۔ میری منزل کے عین درمیان میں فریئر ہال ہے یہ جگہ مجھے کراچی بھر میں سب سے زیادہ پسند ہے۔ کھلا ماحول ہے آدمی کم ہوتے ہیں' فریئر ہال انیسویں صدی کی پرانی عمارت ہے گرجا نما اور تم جانتے ہو کہ مجھے اور تمہیں اسی کلچر' اسی تہذیب اور اسی پراسرار قدامت سے محبت ہے۔ چنانچہ یہاں میں جی بھر کر بیٹھتا ہوں' ایک گھنٹہ' دو گھنٹے' کبھی بارہ بج جاتے ہیں' کبھی ایک اور کبھی دو بھی پھر سب لوگ چلے جاتے ہیں اور میں بھی ہولے ہولے گھر کی راہ لیتا ہوں۔

فریئر ہال سے گھر کوئی ڈیڑھ میل رہ جاتا ہے۔ راستے میں صرف ریلوے لائن اور کراچی چھاؤنی کا سٹیشن آتا ہے۔ اس کے آس پاس بھی ہوٹل ہیں جو دن رات کھلے رہتے ہیں' اس وقت (یعنی رات کے ایک دو بجے) وہاں سے بھی بھیڑ چھٹ چکی ہوتی ہے۔ وہاں ایک پیالی چائے پیتا ہوں اور ریلوے پھاٹک کے پاس پہنچ جاتا ہوں۔ پھاٹک بند ہو یا کھلا وہاں بیٹھنا ضروری ہے اور جب تک ایک دو گاڑیاں گزر نہ جائیں میری طبیعت نہیں بھرتی' یہ کافی رومان انگیز اور روح پرور ماحول ہوتا ہے۔ ٹریفک عموماً ختم ہو چکا ہوتا ہے اور پھاٹک کا چوکیدار بھی میرے ریلوے لائن کے قریب بیٹھنے پر کوئی اعتراض نہیں کرتا' مجھے ریلوے انجن سے محبت ہے۔ اب یہ انجن تیل کے انجنوں میں تبدیل کئے جا رہے ہیں۔ ان کا سائز بھی چھوٹا ہے۔ ان سے نہ دھواں نکلتا ہے' نہ شرارے جھڑتے ہیں' نہ رات کو دور سے انجن کی بھٹی میں لاٹیں مارتی ہوئی آگ ہی دکھائی دیتی ہے۔ غرض کہ نہایت (ان امپریسو) انجن ہیں۔ خیر مطلب یہ کوئلے کے انجن

اب بس تھوڑے دنوں کے مہمان ہیں اور ان کا چارم جاتا رہے گا۔

ریلوے لائن سے گھر کوئی ایک میل ہی رہ جاتا ہے۔ اس ایک میل کو میں جلدی جلدی طے کر کے اپنی بیرک میں پہنچتا ہوں۔ وہاں میرے بستر کے قریب کا بلب رات بھر جلتا رہتا ہے۔ لوگ سو چکے ہوتے ہیں۔ میں خاموشی سے کپڑے بدل کر بستر میں لیٹ جاتا ہوں سونے سے پہلے کتاب ضرور پڑھتا ہوں......

سو یہ ہے روزمرہ زندگی۔ ہفتے کو چھٹی ہوتی ہے' ہفتے کی شام کافی ہاؤس میں گزارتا ہوں۔ اتوار کی صبح منوڑہ جاتا ہوں۔ کشتی کی سیر اچھی رہتی ہے۔ میں بادبانی کشتی میں سیر کرتا ہوں۔ لانچ میں نہیں' وہ کشتی ہی کیا جس میں بادبان نہیں' ملاح نہیں' ڈوبنے کا خطرہ نہیں۔ سو میرے بھائی! یہ ہے آج کل کی زندگی اور مجھے اس زندگی سے کوئی شکوہ نہیں۔ ویرانے کا الو بن گیا ہوں۔ آبادی سے یوں بھی گھبراتا ہوں۔ میرے لئے تو کراچی بھی رہ گئی ہے۔

اوپر کی سطریں کل دفتر میں تمہارا خط ملنے پر لکھی تھیں' جلدی سے چند سطریں اپنی بیرک میں لکھ رہا ہوں۔ موڈ میں زمین آسمان کا فرق ہے' چنانچہ باتیں بھی اسی طرح کی کروں گا' سردیاں شروع ہو چکی ہیں اور رات کو کافی سردی رہتی ہے۔ یہاں کوئٹے سے سردی کی لہر آتی ہے۔ خیر ہر چیز آید برسر اولاد آدم بگور' مالی پریشانیوں سے یہاں بھی چھٹکارا نہیں' میری تنخواہ اڑھائی سو روپے ہے جس میں سے ایک سو اپنے پاس رکھ کر ڈیڑھ سو گھر بھیجتا ہوں اور یہاں مضامین لکھ کر اوسطاً پچاس ساٹھ روپے کمانے پڑتے ہیں تب کہیں گزارا ہوتا ہے۔ پھر کوئی نہ کوئی خرچ سامنے رہتا ہے' پتلون کی سلائی' بوٹ' گرم کوٹ (کپڑا+سلائی)' سائیکل' کمبل' نئی عینک وغیرہ وغیرہ۔ یہاں آ کر سوٹ بنوایا ایک سویٹر خریدا' کچھ قمیض پاجامے بنوائے' غرض کہ کافی خرچ اٹھ گیا کتابوں کا بھی خرچ مثلاً اس ایک مہینے میں اٹھارہ روپے' پاؤں ہر وقت چادر سے نکلے رہتے ہیں۔

میں نے یہاں آ کر چند متفرق مضامین لکھے ہیں جو چھپتے رہتے ہیں 28 اکتوبر کا لکھا ہوا خط آج 9 نومبر کو پوسٹ کر رہا ہوں۔

تمہارا ابن انشاء

ابن انشاء کا ایک اور خط جو اس نے کراچی سے مجھے لکھا اس پر تاریخ 20 مئی

1952ء درج ہے۔

''پیارے حمید! تم بہت دنوں سے میری آنکھوں کے سامنے ہو' میرے دل میں بس رہے ہو۔ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس کی کئی وجہیں ہیں' تمہارا ناول ''جھیل اور کنول'' بہت اچھا ہے لیکن کئی پہلوؤں سے مجھے تمہارا ناول ''ڈربے'' بہت زیادہ پسند ہے' اور ان ہی پہلوؤں سے تمہاری کہانی ''ساوار'' بھی پسند ہے۔ جزئیات نگاری اور ظرافت کے تم بادشاہ ہو' میلوڈراما بھی کمال کا لکھتے ہو لیکن میرے ایسے آدمی کو جس کی زندگی میں محبت کو کبھی دخل نہیں ہوا ''سہیلی کے نام'' ایسی تمہاری چیزیں کیسے پسند آ سکتی ہے؟ ہاں وہ تمہارا ''قبرستان سے خط'' والا مضمون جو یہاں رسالہ ''ادب'' میں چھپا تھا یہاں بہت پسند کیا گیا۔ پھر عجیب اتفاق ہے کہ جس وقت تمہارا یہ احمقانہ اور بیرنگ خط (حرام زادہ) ملا ہے۔ اس وقت میں گورکی کی آپ بیتی کا دوسرا حصہ پڑھ رہا تھا۔ وہ جہاں چرکا اور سنکا کا نام آتا ہے (تم نے خلط ملط کر دیا ہے چرکا میرا نام ہے سنکا تمہارا نوٹ کر لو) جہاں کالی بلی کبوتر کھا گئی ہے' والا گیت ہے اور اس سے پہلے میں نے تمہارا رپورتاژ ''وادیاں'' ختم ہی کیا تھا مجھے یہ رپورتاژ بہت پسند ہے۔

کمینے! تمہارا میرا مزاج کچھ ایسا ملا ہوا ہے کہ تمہیں دیکھ کر دل کا کنول فوراً کھل جاتا ہے۔ اگر تم لڑکی ہوتے تو میں فوراً تم سے شادی کر لیتا' تم ادب کے میدان میں چوکڑیاں بھرتے آگے بڑھتے جاتے ہو اور میں اتنا پیچھے رہ گیا ہوں کہ اس سال کچھ نہ کچھ لکھا تو فخریہ کہا کروں گا' ارے یہ شخص جو اے حمید کے نام سے لکھتا ہے میرا بہت اچھا بے تکلف دوست ہے میرے سامنے اس نے لکھنا شروع کیا بلکہ شروع شروع میں تو مجھ سے اصلاح بھی لیتا رہا۔ اس کا اکثر وقت میرے مکان پر گزرتا ہے' اچھا لڑکا ہے اور ترقی کرے گا وغیرہ وغیرہ...... یار تمہیں سب سے بڑا ایڈوانٹیج یہ ہے کہ تم نے دنیا دیکھی ہے۔ میں گورکی کی آپ بیتی پڑھتے وقت تمہارا اور تمہاری کتاب پڑھتے وقت گورکی کا تصور کئے بغیر نہیں رہ سکتا' اب میں بہت اداس ہوں' تم مجھ سے دور ہو' میں تنہا ہوں۔

مجھے آہنی سلاخوں سے دفتر کی میز کے ساتھ ٹھونک دیا گیا ہے۔ میری گھریلو ذمے داریوں اور پریشانیوں نے میرا امن و سکون چھین لیا ہے۔ میری عمر چھبیس سال ہو چکی ہے۔ دس سال کے اندر اندر میں پوری طرح بوڑھا ہو جاؤں گا' میرے بال ابھی سے سفید ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ مجھے گورکی کی نانی پر حیرت ہے کہ جو ایسے ماحول میں رہتے ہوئے بھی جبکہ نانا صاحب نے انہیں الگ کر دیا تھا' کہتی ہے ''میرے اللہ! یہ دنیا کتنی جمیل ہے۔ میرا بس چلے تو قیامت تک یہیں رہوں۔'' یہ عورت جو آٹھ دس آنے کما لیتی ہے تو اسے بھی خیرات کے طور پر غریبوں کی کھڑکیوں کے چھجوں پر رکھ آتی ہے' خفیہ خیرات کے طور پر۔ حمید اختر جیل سے رہا ہو گیا ہے۔ آخر اسے جیل میں کیا تکلیف تھی؟ ایک صاحب لاہور سے آئے ہیں ان کا بیان ہے کہ اس کے سر کے بال جھڑ گئے ہیں یہ سب نظربندی کا کھیل ہے۔ لاہور بہت یاد آتا ہے۔ تم دوستوں کی محفلیں یاد آتی ہیں۔ میں نے لاہور چھوڑنے کے بعد جتنی نظمیں اور میر کے رنگ میں جتنی غزلیں لکھی ہیں ان سب میں دوستوں سے جدائی اور تنہائی کا شدید احساس ہے ایک غزل کا مقطع تھا۔

انشاء اب ان اجنبیوں میں چین سے باقی عمر کٹے
جن کی خاطر بستی چھوڑی' نام نہ لو ان پیاروں کا

اب تو تمناؤں کا باغ مرجھا رہا ہے اور حسرتوں کا دامن پھیل رہا ہے۔ اب زندگی ''فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے'' تک محدود ہو گئی ہے۔ زیادہ نہ لکھنے کی وجہ بھی یہی ہے' جب میں آسانی سے اچھے اچھے ادیبوں کی کتابیں خرید کر نہایت اطمینان سے پڑھ لیتا ہوں تو مجھے خود لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم کراچی آؤ تو کافی ہاؤس میں بیٹھیں' کلفٹن میں گھومیں' کیماڑی کے تیل آلود سمندر میں کشتی کی سیر کریں۔ طویل شام اس کالے پل پر گزاریں جس پر میں نے اپنی نظم ''مضافات'' لکھی تھی اور تمہارے ساتھ ان چند دنوں میں اتنے قہقہے لگا لوں کہ باقی عمر کے لئے بے نیاز ہو جاؤں۔

ابن انشاء

کراچی ہی سے ابن انشاء نے اپنے چھ ستمبر کی تاریخ والے خط میں مجھے لکھا:

''...... پیارے حمید! تمہارا پیارا خط ملا۔ اس کے بعد میرا منحوس خط بھی ملا ہو گا تمہیں۔ ابھی افسردگی طبیعت میں بہت ہے معذرت نہیں

کروں گا۔

انور جلال صاحب کا خط بھی ملا جس سے معلوم ہوا کہ انہوں نے ''احساس'' چھوڑ دیا ہے۔ میں اپنی مشکل تم سے اپنے پہلے خط میں تفصیل کے ساتھ بیان کر چکا ہوں۔ میں نے اس ایڈونچر میں تمہاری وجہ سے ہاتھ ڈالا تھا۔ میں احسان دھرنے کی کوشش نہیں کر رہا۔ بہر حال میں ہوا میں لٹکتے رہنا بھی پسند نہیں کرتا اور نہ لاہور کے مفت روزوں میں باری باری لکھنے کا خواہشمند ہوں' میں نے ''احساس'' کے ایڈیٹر عباس احمد عباسی کو جن سے میرا اچھا خاصا تعارف ہے' ایک خط لکھا ہے جس میں یہ خوشخبری دی ہے کہ میں عدم ادائیگی معاوضہ کی وجہ سے یہ سلسلہ بند کر رہا ہوں۔ انور جلال تمہارے دوست ہیں لیکن تم میرے عزیز از جان دوست ہو' مجھے روح کی گہرائیوں تک جانتے ہو اور مرد معقول ہو اس لئے غالباً میرے طرز عمل کو قابل اعتراض نہ سمجھو گے البتہ اگر تمہارے نزدیک میرا اقدام غلط ہے تو میں سو فیصدی تمہارے مشورے پر عمل کرنے کو تیار ہوں۔ انور جلال صاحب سے براہ راست میری اتنی رسم و راہ نہیں ہے۔ نہ میں ان کے مزاج سے واقف ہوں۔ تم میرے اور اس کے دوست ہونے کی بناء پر مجھے ٹھیک مشورہ دے سکتے ہو۔ یہ مشورہ مجھ تک رہے گا۔ تم یہ بتاؤ کہ اگر ''احساس'' رسالے والے باقاعدہ پیسے دے کر مجھ سے کالم لکھوانا چاہیں تو مجھے یہ سلسلہ جاری رکھنا چاہئے یا وہاں سے بند کر کے انور جلال صاحب کو اپنا کراچی کا مکتوب بھیجنا چاہئے؟ اتنا ضرور کہوں گا کہ یہ کام عباس احمد عباسی بلا معاوضہ مجھ سے لینے کی توقع نہیں کر سکتے۔ تم کر سکتے ہو۔

اور کیا حال ہے جانی؟ اوپر جو لکھا ہے دفتر بے معنی ہے' اسے غرق مے ناب کردو اور یا شیخ! کوئی داستان محبت سناؤ' گزشتہ بار بصرے کی سیر کیسی رہی؟ تمہاری شہزادی پری بانو کا کیا حال ہے اور پاک ٹی ہاؤس میں تمہارا ایڈریس کب تک چلتا رہے گا؟

تمہارا ابن انشاء.....''

ذکر ابوسعید بزمی کا

ان دنوں میں بیکار تھا اور میرا کام دن بھر کافی ہاؤس میں اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر یورپ کے پیدل سفر کے پروگرام بنانا اور رات کو گھر آ کر اپنے چھوٹے بہن بھائیوں سے لڑائی مارکٹائی کرنا تھا۔ ایک رات میں گھر آیا تو امی نے بتایا کہ کوئی لڑکا میری تلاش میں آیا تھا اور ایک خط چھوڑ گیا ہے۔ یہ لڑکا میرا دوست احمد بشیر تھا اور اس نے خط میں لکھا تھا کہ وہ روزنامہ احسان میں بطور نائب مدیر ملازم ہو گیا ہے اور میرے لئے کوشش کر رہا ہے۔ اس نے دوسرے روز مجھے دفتر احسان میں بلایا تھا۔ ان دنوں نوکری کی بہت ضرورت تھی چنانچہ دوسرے روز میں وقت مقررہ پر ''احسان'' اخبار کے دفتر میں پہنچ گیا۔ یہ دفتر دہلی دروازے کے باہر ایک جہازی عمارت کی دوسری منزل پر واقع ہے اور اس کے دروازے کی دونوں جانب گھوڑوں کے اصطبل ہیں۔ اوپر پہنچ کر جب میں نے دفتر کے خالی لمبے لمبے کمرے اور ان کے وسط میں کہیں کہیں نحیف اور کمزور صورت آدمیوں کو تیز روشنی میں خبروں کا ترجمہ کرتے دیکھا تو ایکا ایکی مجھے محسوس ہوا کہ ابھی کوئی نہ کوئی آدمی آئے گا اور مجھ سے گھوڑوں کی خرید و فروخت پر باتیں شروع کر دے گا۔ پھر جب میں نے ایک کرسی پر احمد بشیر کو بیٹھے کام کرتے دیکھا تو میری جان میں جان آئی' احمد بشیر بگلے کا سگریٹ پی رہا تھا اور اس خدشے سے بے نیاز ہو کر پی رہا تھا کہ ایک سال تک لگاتار بگلے کا سگریٹ پینے کے بعد آدمی بگلا بن جاتا ہے۔ اس نے ڈبیہ میرے آگے کر دی اور میں نے اس کی ڈبیہ پیچھے کرتے ہوئے جیب سے اپنا سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔ اس نے سگریٹ کا دھواں ناک سے نکالتے ہوئے کہا۔

''ابھی بزمی صاحب نہیں آئے' کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔''

ابوسعید بزمی کے بارے میں احمد بشیر نے ہمیشہ مجھ سے یہی کہا تھا کہ وہ تو خواہ مخواہ اس دنیا میں آ گئے ہیں۔ وہ تو فرشتہ ہیں۔ لیکن میرے دل میں کبھی اس فرشتہ کو دیکھنے یا اس سے ملنے کی خواہش پیدا نہ ہوئی تھی۔ احمد بشیر کے اتنا کہنے پر کہ وہ ابھی آ جائیں گے میں نے ٹانگیں میز پر رکھ لیں اور اخبار اٹھا کر فلمی اشتہار اور ریڈیو کا پروگرام دیکھنے لگا۔ جب اس سے اکتا گیا تو ٹیلی پرنٹر کو کام کرتے ہوئے بڑے بڑے انہماک سے دیکھنے لگا۔ اس سے ہٹ کر میں تخت پر بجلی کی تیز روشنی میں بیٹھے ہوئے کاتبوں کو گھورنے لگا' میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ قریباً ہر ایک کاتب کی شکل دوسرے کاتب سے ملتی جلتی تھی اور وہ ایک ہی انداز میں بیٹھے زرد کاغذوں پر خبریں وغیرہ کتابت کر رہے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ ایک ہی کاتب ہے جس کا عکس مختلف آئینوں پر پڑ رہا ہے۔ اتنے میں ایک آدمی سر کھجلاتا اندر آیا اور بلند آواز میں کچھ کہہ کر دوسرے دروازے سے باہر نکل گیا۔ کاتب اور ایڈیٹر اپنی دھن میں مگن بیٹھے رہے۔

اتنے میں باہر سیڑھیوں میں کسی کے آہستہ سے قدم رکھنے کی آواز سنائی دی اور ایک اونچا لمبا سا نوجوان سپید شیروانی اور سپید پاجامے میں ملبوس بیگ ہاتھ میں تھامے غلام گردش میں سے گزرا۔ احمد بشیر نے مسکرا کر مجھے دیکھا۔

''بزمی صاحب آ گئے۔''

میں نہ جانے کیوں ذرا محتاط ہو کر بیٹھ گیا جیسے وہ تھانے کے انچارج ہوں اور میری کار کا چالان ان کے پاس آیا ہو۔ ساتھ والے کمرے سے میز کے دراز کھلنے' بند ہونے اور کرسی کھینچنے کی آوازیں آئیں اور کسی نے ذرا اونچی مگر نرم آواز میں پکارا۔

''اولڑکے ..... پانی لانا بھائی!''

دس منٹ بعد میں سپید شیروانی والے سانولے سے نوجوان کے سامنے بیٹھا تھا اور احمد بشیر ان سے میرا تعارف کروا رہا تھا۔

''..... آپ ہیں اے حمید' ہمارے نئے لکھنے والے اور آپ ہیں ابوسعید بزمی چیف ایڈیٹر احسان.....''

انہوں نے خندہ پیشانی سے مجھ سے ہاتھ ملایا اور شرما کر سمٹ سے گئے۔ ان کے چہرے پر عجیب قسم کی چمک سی آ گئی اور وہ دراز سے پاشنگ شو کا

پیکٹ نکال کر سگریٹ سلگانے لگے۔

''آپ سگریٹ پیتے ہیں؟'' انہوں نے ڈبیہ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

میں نے ہچکچاتے ہوئے سگریٹ لے لیا کیونکہ احمد بشیر نے مجھے ایک گھنٹہ یہی لیکچر دیا تھا کہ بزمی صاحب بڑے آزاد خیال نوجوان ہیں۔ ان کے سامنے جو آدمی تکلف کرے وہ اسے ناپسند کرتے ہیں اور یہ کہ اگر وہ مجھ سے پوچھیں کہ کتنی تنخواہ پر کام کروں گا تو مجھے فوراً یہ جملہ کہہ دینا ہوگا۔

''بزمی صاحب! تنخواہ کا کیا ہے میں تو آپ کے زیر سایہ رہ کر صحافت کی شدبد حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ میں تو یہاں تعلیم حاصل کرنے آیا ہوں نوکری کرنے نہیں۔''

چنانچہ جب میں نے یہی جملہ بزمی صاحب کے سامنے دہرایا جسے میں نے ذہن میں خوب پکا کر لیا تھا تو وہ بے اختیار ہنس پڑے۔ یہ اس دفتر میں زندگی' روشنی اور صحت مندی کا کس قدر پر جوش اور زندگی سے بھرپور قہقہہ تھا۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ وہی جملہ احمد بشیر نے بزمی صاحب سے کہا تھا اور اسی جملے سے خوش ہو کر بزمی صاحب نے اسے نوکر رکھ لیا تھا۔ اسی روز مجھے بھی نوکری مل گئی اور یہ میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ بزمی صاحب اس جملے سے متاثر ہوئے تھے یا میری بے وقوفی سے۔

بہرحال میں نے باقاعدہ دفتر جانا شروع کر دیا شروع شروع میں میری ڈیوٹی دن کے دس بجے سے شام کے پانچ بجے تک تھی۔ اس دوران میں مجھے خبروں کا بے تحاشا ترجمہ کرنا پڑتا۔ باہر سے آئے ہوئے مضامین دیکھنے پڑتے۔ انہیں بعض اوقات دوبارہ لکھنا پڑتا' پروف دیکھنے پڑتے۔ ہفتے میں دو بار خود کسی نہ کسی موضوع پر نیم مزاحیہ مضامین لکھنے پڑتے۔ اس کے بعد بزمی صاحب نے مجھے اپنے ساتھ چھوٹے چھوٹے نوٹ لکھنے پر لگا لیا۔ اب میں شام چار بجے آتا اور رات ایک بجے آخری کاپی پریس میں پہنچا کر نیند میں جھولتا گھر چل دیتا۔ بزمی صاحب عام طور پر شام کو چار پانچ بجے دفتر میں داخل ہوتے تھے۔ اپنے کمرے میں آتے ہی وہ اچکن اتار کر دیوار کے ساتھ لٹکاتے' میز کا دراز کھول کر کاغذ اور تختی نکالتے۔ آرام دہ کرسی پر نیم دراز ہو کر ٹانگیں

دوسری کرسی پر رکھ دیتے اور چپڑاسی کو پانی لانے کو کہہ کر اطمینان کا لمبا سانس لیتے۔

''مولوی صاحب! زندگی ماڈل ٹاؤن اور دہلی گیٹ کے چکر میں پھنس گئی ہے۔''

نہ جانے وہ مجھے مولوی صاحب کیوں کہنے لگے تھے۔ حالانکہ میں اس دفتر میں سب سے زیادہ کم عمر سمارٹ قسم کا لڑکا تھا۔ میں ہنستا مسکراتا دفتر میں داخل ہوتا تھا اور ہنستا، مسکراتا وہاں سے رخصت ہوتا تھا گویا کھیل کے میدان سے پلٹ رہا ہوں۔

بہت جلد بزمی صاحب میرے بہت قریب آ گئے یا میں ان کے بہت قریب چلا گیا۔ میرے ان کے قریب جانے کی وجہ ان کے لاابالی اور صحت مند قہقہے تھے۔ ان میں زندگی کی تمام تر شگفتگی اور ہماہمی تھی۔ اب بھی مجھے ان کے قہقہوں کا خیال آتا ہے تو میں ان کی بازگشت اپنے بالکل قریب سنتا ہوں اور مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے انہوں نے زندگی کے آخری لمحات کا استقبال بھی ایک بلند، بے اختیار اور بے نیاز قہقہے سے کیا ہوگا، گویا زندگی کا آخری لطیفہ سن کر دلی مسرت کا اظہار کر رہے ہوں۔

ان سے مل کر کچھ دیر مجھے یہی محسوس ہوا تھا کہ وہ ہر وقت مسکراتے رہتے ہیں۔ ان کا دن بچوں ایسی معصوم ہنسی کے ساتھ شروع ہوتا ہے اور کسی ریٹائرڈ میجر کے بے ہنگم قہقہے پر ختم ہو جاتا ہے۔ جیسے زندگی ان کے نزدیک دنیا بھر کے مزاحیہ کارٹونوں سے بھری ہوئی کتاب ہو اور وہ گرم چائے اور پاشنگ شو کے سگریٹ پاس رکھے اس کا بڑی دلچسپی سے مطالعہ کر رہے ہوں۔ لیکن کچھ مدت ایک ہی چھت تلے بالکل پاس پاس گزارنے کے بعد انہوں نے مجھے کچھ ایسی باتیں بتائیں کہ مجھے ان کی روزمرہ زندگی کے بارے میں اپنا نظریہ تبدیل کرنا پڑا۔ ہم دونوں ریلوے سٹیشن کے ریفریشمنٹ روم میں بیٹھے تھے انہیں سپنسر کی چائے بہت پسند تھی اور کبھی کبھی ہم اخبار کے دفتر والوں، بازار والوں اور ساری دنیا والوں کی نظریں بچا کر چپکے سے بس میں سوار ہو جاتے ریلوے سٹیشن پہنچ کر ہم پلیٹ فارم کے ٹکٹ لیتے اور بڑی خاموشی اور سکون کے ساتھ ریفریشمنٹ روم کے سرد اور خاموش سے کمرے میں آ کر بیٹھ جاتے۔ اس وقت ہم اپنے آپ کو باہر کی دنیا سے بے تعلق سمجھتے تھے اور جتنی دیر تک وہاں بیٹھتے ایسی باتیں کرتے جن کا سیاست سے کوئی تعلق نہ ہوتا تھا۔ سنہری چائے پیالی میں گرتی دیکھ کر بزمی کے چہرے پر دل آویز شگفتگی سی آ جاتی تھی۔ گویا وہ سردیوں کی ٹھٹھرتی رات میں اچانک گرم آتش دان کے آگے بیٹھے ہوں۔ وہ بڑے پیار اور سلیقے سے پاشنگ شو کا سگریٹ سلگا لیتے اور خوشبودار چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے دھیمی، مہربان اور پرسکون آواز میں یوں باتیں کرنے لگتے جیسے ہسپانوی رات کی نیلگوں چاندنی میں ہم تیولس کے زرد گلاب کی جھاڑیوں کے سائے میں بیٹھے ہوں اور وہ مجھے الحمراء کے محلات میں رہنے والی پراسرار شہزادیوں کی کہانیاں سنا رہے ہوں۔ اسی چمکیلی تنہائی کے پرسکون لمحات میں ایک دن انہوں نے میرے سامنے ان تاریک اور ویران حویلیوں کے دروازے کھول دیئے جہاں لمبی غلام گردشوں میں مکڑیوں نے جالے بن رکھے تھے اور اندھیرے کمروں میں دن کے وقت چراغ ٹمٹماتے تھے۔ اسی سرد نمناک اور نیم روشن حویلی کے ایک گھٹے گھٹے سے کمرے میں انہوں نے جنم لیا تھا۔ اسی حویلی کی دیمک زدہ چھتوں کے نیچے انہوں نے عربی فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی اور جب وہ اس پراسرار حویلی کے اندھیروں سے باہر نکلے تھے تو بھوپال کی اونچی نیچی سڑکیں ایک جال کی طرح ان کی راہ میں بچھی ہوئی تھیں۔ پھر اسی ریفریشمنٹ روم میں انہوں نے ایک روز مجھے بتایا

''میرے والد صاحب نے مجھے صرف اس لئے انگریزی سکھائی تھی کہ گھر میں جب باہر سے تار آتے تھے تو انہیں پڑھنے والا کوئی نہ ہوتا تھا۔''

میں یہاں اس بات کی ایک دفعہ پھر وضاحت کر دینا چاہتا ہوں کہ مجھے ان کی سیاسی اور صحافتی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں جب بھی انہیں کسی صحافتی جلسے یا پریس کانفرنس میں دیکھتا تھا تو میں دیر تک انہیں پہچاننے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ مجھے کبھی یقین نہیں آتا تھا کہ یہ وہی بزمی صاحب ہیں جو مجھے سپنسر کی چائے کے خوشگوار فلیور میں بھوپال کے گھنے جنگلوں اور ان کے درمیان سرخ چٹانوں کے سایوں میں بہنے والے شفاف چشموں کی باتیں بتایا کرتے تھے۔ لہٰذا میں ان کی اخباری یا دیگر سیاسی سرگرمیوں پر کچھ لکھنے سے معذور ہوں۔ میں نے ان کے ساتھ کبھی پنجاب کی نئی وزارت یا کوریا کی تازہ صورتحال پر گفتگو نہیں کی تھی۔ چنانچہ جب میری کہانیوں کا پہلا مجموعہ ''منزل منزل'' شائع ہوا تو میں نے اس کے نسخے پر ایک جملہ لکھا تھا۔

''درویش خدامست ابوسعید بزمی کیلئے جو کسی اخبار کا ایڈیٹر نہیں ہے۔''

یہ پڑھ کر انہوں نے حسب عادت ایک بلند قہقہہ لگایا تھا اور کہا تھا

''تو مولوی صاحب آپ ہمیں ایڈیٹر ہی نہیں مانتے؟''

میں نے انہیں کبھی ایڈیٹر نہیں مانا تھا اور آج بھی اگر وہ زندہ ہوتے تو انہیں ایڈیٹر تسلیم نہ کرتا۔ کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ کوئی بھی کام کیوں نہ شروع کر دیتے وہ ان کے لئے مناسب کام ہوتا مگر اخبار کی ادارت ایک ایسا کام تھا جس کے لئے وہ کبھی پیدا نہیں ہوئے تھے۔ اس وقت میں اس بزمی کا ذکر کر رہا ہوں جو لیڈنگ آرٹیکل لکھنا شروع کرنے سے پہلے میرے ساتھ بھوپال کے سرسبز گھنے جنگلوں' ان جنگلوں میں رہنے والے آدم خور شیروں' وہاں کی جھیلوں' کنول کے پھولوں اور ریاستی جیل خانے کی ہولناک اندھیری کوٹھریوں' اپنے وطن کی پراسرار اونچی نیچی گلیوں اور وہاں کے اچھے برے لوگوں کی باتیں کیا کرتا تھا۔ جو اپنے محلے کے بوڑھے پٹھان کی نقل اس خوبی سے اتارا کرتا تھا کہ ہنسی کے مارے میں کرسی سے اچھل اچھل پڑتا تھا۔ جسے برسات میں آم کی ڈالیوں میں جھولے ڈال کر گانے والی سہیلیوں کے ان گنت گیت یاد تھے۔ جس نے مجھے بتایا کہ وہ ایک بلند نصب العین کے لئے یہ سب کچھ کر رہا ہے اور ایک وقت آئے گا کہ وہ یہ کولہو کے بیل ایسی زندگی سے دامن چھڑا کر ایک دم الگ ہو جائے گا اور اپنے چھوٹے سے کمرے میں بیٹھ کر بڑے سکون سے تاریخ پر کتابیں لکھے گا۔ لیکن میرے خیال میں یہ کام بھی ان کے لئے موزوں نہ تھا۔ وہ تاریخ پر کتابیں لکھنے کے لئے پیدا نہیں ہوئے تھے۔ ان کی کتاب ''تاریخ انقلابات عالم'' پڑھ کر میں نے ان سے کہا تھا کہ انہوں نے جیل میں یہ کتاب لکھنے میں اپنا وقت ضائع کیا ہے۔ اس پر ایک بار پھر انہوں نے ایک بلند ترین قہقہہ لگایا تھا اور مجھے محسوس ہوا تھا کہ میں نے اس لمحے انہیں اس مقام پر دیکھ لیا تھا جہاں ان کے سوا اور کوئی نہیں جا سکتا ... میں اس بزمی کی باتیں کر رہا ہوں جو تنخواہ لینے خود کبھی نہیں جا سکتا تھا اور اگر جاتا تھا تو اپنے مہینے بھر کی عرق ریزی کا معاوضہ یوں طلب کرتا تھا جیسے ان سے قرض مانگ رہا ہو۔ مجھے اس بزمی کا بالکل علم نہیں جو اخبار کے مالک کے پاس بیٹھا گھنٹوں اخبار کی پالیسی پر بحث کیا کرتا تھا۔ جو دیر تک ملنے والوں کے سامنے مصنوعی انکساری سے سر ہلا ہلا کر ان کی ہر بات پر آمنا کہا کرتا تھا اور جو منہ لٹکا کر دیر تک تختی پر جھکا مولانا باری' نواب ممدوٹ یا مسلم

لیگ پر اداریہ لکھا کرتا تھا۔ اس بزمی سے میں کبھی نہیں ملا اور اس بزمی کے متعلق میں کچھ نہیں جانتا۔

ان کی تصنیفات ''جب خون بہہ رہا تھا'' اور ''تاریخ انقلابات عالم'' میں نے بڑے شوق سے پڑھی تھی۔ لیکن پڑھ کر مجھے بڑی ناامیدی ہوئی کیونکہ اس میں بھی وہی بزمی شروع سے آخر تک بول رہا تھا جو اداریہ لکھتے وقت خاموش ہوتا تھا اور میں نے جلدی سے دونوں کتابیں اپنی الماری کے سب سے نچلے خانے میں بند کر دی تھیں۔ ہاں! ایک کتاب کے انتساب میں مجھے اس معصوم' بے ضرر اور بچے ایسے بزمی کی جھلک ضرور نظر آئی تھی اور جب میں نے پڑھا کہ گورکھا سپاہی کے اتنا پوچھنے پر کہ تمہارا نام کیا ہے؟ بزمی نے اسی درویشانہ دلیری اور معصوم سادگی سے کہہ دیا تھا۔

''بزمی''

تو میرا جی چاہا کہ میں اس خطہ ارض کے حسین ترین باغ کا سب سے زیادہ خوشبودار اور خوبصورت پھول توڑ کر لاؤں اور چپکے سے بزمی صاحب کی میز پر رکھ کر باہر نکل جاؤں اور یہ بزمی اس کتاب کے انتساب تک ہی تھا اور اس کے آگے کوئی اور ابوسعید بزمی تھا جس کے متعلق میں کہہ چکا ہوں کہ میں کچھ نہیں جانتا۔

مہینے کے آخری دنوں میں میرے پاس پیسے ختم ہو جاتے تھے اور کافی پریشانی ہوا کرتی تھی میں نے ایک نیا طریقہ ایجاد کر لیا' بزمی صاحب کی عادت تھی کہ وہ اپنے کمرے میں داخل ہو کر سب سے پہلے اپنی گرم یا ٹھنڈی اچکن اتار کر کھونٹی پر ٹانگ دیا کرتے تھے اور ان کی جیب بہت کم خالی ہوتی۔ چنانچہ ایک آدھ منٹ کے لئے جب وہ ذرا ادھر ادھر ہوتے تو میں فوراً ان کی اچکن کی تلاشی لینا شروع کر دیتا۔ جتنی ریزگاری ہوتی نکال کر اپنی جیب میں ٹھونس لیتا اور بڑے مزے سے اپنی کرسی پر بیٹھ کر لکھنے پڑھنے لگ جاتا پھر جب وہ کمرے میں داخل ہوتے تو میرا چہرہ دیکھ کر کہتے ...... ''کہیے جناب مولوی صاحب! کیا شرارت کی ہے جو ہنس رہے ہیں؟''

میں بڑی شان سے کہتا......

''بزمی صاحب! آپ بھی کیا یاد کریں گے چلئے آج آپ کو پنسر کی چائے پلائیں۔''

''اوہو ...... یہ بات ہے! مگر مولانا وقت نازک ہے۔''

''وقت ہمیشہ نازک رہے گا بزمی صاحب! چلئے اٹھئے'' اور میں انہیں بازوؤں سے پکڑ کر کھینچتا ہوا باہر لے آتا۔

ہم سیڑھیاں طے کر کے چپکے سے بس سٹاپ پر آ کر سٹیشن جانے والی بس پکڑتے اور ریلوے ریفریشمنٹ روم میں جا کر بیٹھ جاتے۔ پھر سنہری اور خوشبودار چائے آ جاتی اور بزمی صاحب کے چہرے کے ساتھ ساتھ ان کی گفتگو بھی ایک دم شیریں، شگفتہ اور خوشبودار ہو جاتی۔ مجھے اس بزمی کی باتیں سننے کا شوق جنون کی حد تک تھا اور میں موقع تلاش کیا کرتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح ایڈیٹر بزمی کی خوفناک زد سے اس سادہ لوح، بے خبر اور معصوم بزمی کو بچا لوں۔ جنوری کی ایک ابر آلود دھندلی اور سرد شام کو اس جگہ بیٹھے بیٹھے انہوں نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اچانک میری طرف دیکھ کر کہا۔

''حمید...... میں سوچتا ہوں اگر میں اخباری دنیا میں نہ آتا تو بڑا کامیاب انسان ہوتا۔ میں نہیں جانتا پھر میں کیا کرتا لیکن ہر حالت میں آج سے بہتر اور خوشحال ہوتا...... دیر سے میری خواہش تھی، کہ تمہیں ایک بات کہوں، آج نہ جانے کیوں جی چاہتا ہے کہ تمہیں وہ بات کہہ دوں۔ اگر تم نے اس پر عمل کیا تو تمہاری زندگی انتہائی کامیاب ہوگی۔''

میں نے پیالہ میز پر رکھتے ہوئے کہا

''آپ کہئے میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس پر عمل کروں گا۔''

''وہ کچھ دیر خاموشی سے سگریٹ پیتے رہے۔ پسینے کے چھوٹے چھوٹے قطرے ان کی چوڑی پیشانی پر جھلملا رہے تھے اور آنکھوں میں بڑی تفکرانہ چمک تھی۔

پھر سر اٹھا کر انہوں نے مجھے دیکھا اور کہا......

''پہلی بات تو یہ ہے کہ ابھی پانچ سال تک شادی نہ کرنا۔''

''اور دوسری'' میں جلدی سے بولا کیونکہ وہ پھر خاموش ہو گئے تھے۔

''دوسری یہ کہ اخبار کی نوکری چھوڑ دو...... کوئی اور کام کرو۔''

اس واقعہ کے کچھ ہی عرصہ بعد میں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اخبار کی نوکری چھوڑ دی۔ وہ شام ہماری ملاقات کی آخری شام تھی۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ اس کے بعد

مجھے بزمی صاحب کو کبھی نہیں دیکھنا تو میں خدا سے التجا کرتا کہ وہ اس شام کو کبھی غروب نہ ہونے دے، ہم دونوں سٹیشن سے باہر آ گئے۔

اسکے بعد میں بزمی صاحب کو پھر نہیں دیکھ سکا۔ میں نے پڑھا کہ وہ امریکہ جا رہے ہیں، کیوں جا رہے ہیں؟ انہیں کون بھیج رہا ہے؟ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، میں اسی بات پر خوش تھا کہ جب امریکہ کے لوگ انہیں بات بات پر صحتمند، بلند اور لاابالی قہقہے لگاتے دیکھیں گے تو انہیں محسوس ہوگا کہ پاکستان میں رہنے والے بھی زندگی گزارنے کے ڈھنگ سے واقف ہیں۔ پھر میں نے سنا کہ وہ سب کی نظریں بچا کر چپکے سے رخصت ہو گئے ہیں تو مجھے ان کا وہ جملہ یاد آ گیا۔

''حمید ایک وقت آئے گا کہ میں یہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چپکے سے کہیں چلا جاؤں گا۔''

آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ آج اگر میں رات کے تمام ستارے نوچ کر بھی زندگی کی دہلیز پر رکھ دوں تو بھوپال کی پراسرار گلیوں اور بندھیاچل کے جنگلوں کی باتیں کرنے والا بزمی واپس نہیں آ سکتا، پھر بھی نہ جانے کیوں دل چاہتا ہے کہ وہ ایک بار...... صرف ایک بار پھر ''احسان'' اخبار کے دفتر میں آئیں۔ اچکن اتار کر کھونٹی سے لٹکائیں اور باہر چلے جائیں اور پھر میں ان کی جیبوں کی تلاشی لوں اور جب وہ واپس اندر آئیں تو میں بڑی شان سے کہوں......

''چلئے بزمی صاحب! آج آپ کو سپنسر کی چائے پلائیں۔''

☆......☆......☆

مرزا سلطان بیگ

مرزا سلطان بیگ ریڈیو پاکستان کی ایک پہچان تھے۔ خاص طور پر ریڈیو سٹیشن جن آوازوں سے پہچانا جاتا تھا ان میں مرزا سلطان بیگ کی آواز سب سے نمایاں تھی۔ ان سے میری پہلی بار ملاقات لاہور سٹیشن پر ہی ہوئی۔ پرانے ریڈیو سٹیشن کی عمارت میں جہاں وہ شام کو اپنے سکوٹر پر آیا کرتے تھے پھر جب ریڈیو سٹیشن نئی عمارت میں آیا تو مرزا صاحب سے زیادہ ملاقات رہنے لگی۔ یہ بات تو سبھی جانتے ہیں مرزا صاحب ایک ہمہ صفت انسان تھے۔

مرزا سلطان بیگ کی خوش گفتاری اور بات سے بات نکالنے کا وصف ان کی ذہانت اور وسیع مشاہدے کی دلیل تھی۔ ریڈیو پاکستان لاہور میں وہ شام کے وقت پنجابی پروگرام میں حصہ لیتے تھے جس کا پہلا نام دیہاتی بھائیوں کے لئے تھا۔ پھر سوہنی دھرتی ہوگیا تھا۔ جب مجھے مرزا سلطان بیگ سے زیادہ ملنے جلنے کا موقع ملا تو اس وقت ان کے ساتھ مسافر صاحب کمپیئرنگ کیا کرتے تھے۔ مرزا سلطان بیگ یعنی نظام دین اور مسافر صاحب یعنی چودھری صاحب دیہاتی پروگرام کا سنگھار تھے۔ سگنیچر ٹیون کے بعد پروگرام شروع ہوتا تو یہ دونوں جو آپس میں منٹ ڈیڑھ منٹ کی باتیں کرتے وہ اس پروگرام کی جان ہوتا تھا اور لوگ اسے بڑے شوق سے سنتے تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب میں بھی ریڈیو پاکستان لاہور کے عملے میں شامل تھا یعنی ریڈیو پر بطور پروڈیوسر کام کرتا تھا۔ جب کبھی مجھے دفتر میں شام کے پانچ بج جاتے تو پھر میں وہیں رک جاتا تھا تاکہ دیہاتی پروگرام میں مرزا سلطان بیگ اور مسافر صاحب کی باتیں سن سکوں۔ میرا خیال ہے دیہاتی پروگرام شام کے چھ سوا چھ بجے شروع ہوتا تھا۔

ساڑھے پانچ بجے کے قریب ویسپا سکوٹر پر مرزا سلطان بیگ تشریف لاتے۔ گیٹ پر سے ہی لوگوں کی ان سے سلام دعا شروع ہو جاتی۔ ان کا حلقہ دوستاں بے حد وسیع تھا۔ ہر حلقے میں انہیں محبت اور عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ریڈیو سٹیشن پر تو سبھی ان سے پیار کرتے تھے۔ وہ لابی میں آتے تو دو چار آدمی ان کے ساتھ ہوتے۔ دو چار ڈیوٹی روم میں پہلے سے بیٹھے ان کا انتظار کر رہے ہوتے تھے۔ یہ وہ صاحب ہوتے تھے جن کے کسی نہ کسی دفتر میں کام رکے ہوئے ہوتے تھے۔ مرزا صاحب ان کے تمام جائز کام کروا دیتے تھے۔ ان کا دل لوگوں کی خدمت کر کے بے حد خوش ہوتا تھا۔ انہیں کسی سے کچھ بھی لینا دینا نہیں ہوتا تھا بس محض خدمت خلق کے جذبے سے وہ یہ کام کرتے تھے۔

میں اور مسافر صاحب پہلے ہی سے ڈیوٹی روم کے سامنے صوفوں پر بیٹھے باتیں کر رہے ہوتے۔ مجھے مرزا صاحب کا بے تابی سے انتظار ہوتا تاکہ میں ان کی شگفتہ شگفتہ باتیں سنوں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں ان کی شگفتہ باتوں کا بڑا مداح تھا اور میری کوشش ہوتی کہ ان کو زیادہ سے زیادہ باتیں کرنے کا موقع دوں۔ وہ لابی میں آ کر مسکراتے اور ایک آدھ جملہ مسافر صاحب پر کستے ہوئے ہمارے سامنے بیٹھ جاتے اور پھر وہ محفل کے صدر ہوتے تھے۔ دوستوں اور احباب پر وہ بے دریغ خرچ کرتے تھے۔ آتے ہی ضرورت سے زیادہ چائے اور دوسری لوازمات کا آرڈر دے دیتے، خود چائے بنا کر سب حاضرینِ مجلس کو پلاتے اور اصرار کر کے بسکٹ اور کباب وغیرہ کھلاتے پھر میں مرزا صاحب سے پوچھتا کہ وہ آج کس موضوع پر دیہاتی پروگرام میں بات شروع کریں گے۔

وہ ہنس کر کہتے ”پنجر پر بات شروع کروں۔“ وہ مسافر صاحب کو پنجر کہا کرتے تھے اور انہیں اکثر چھیڑا کرتے تھے مگر مسافر صاحب بھی بے حد کشادہ ظرف انسان تھے اور انہوں نے مرزا صاحب کی چھیڑ خانی کا کبھی برا نہیں مانا تھا۔ دوسری طرف یہ بات بھی تھی کہ مسافر صاحب بڑے پڑھے لکھے آدمی تھے ان کا تاریخی اور دینی مطالعہ بڑا وسیع تھا اور کمپیئرنگ کرتے وقت مرزا سلطان بیگ کے بپھرے ہوئے دریا کو بند مار کر سنبھالنا مسافر صاحب کا ہی کام تھا کیونکہ مرزا سلطان بیگ بھی پنجاب کا انسائیکلوپیڈیا تھے کوئی گاؤں، کوئی ضلع ایسا نہ تھا جس کے کھیت کھیت اور گلی گلی سے ان کی

واقفیت نہ ہو۔ وہ کمپیئرنگ کرتے وقت کسی وقت بھی موضوع پر بات شروع کرتے تو گویا دریا کا بند ٹوٹ جاتا تھا۔ معلومات کا سیلاب امڈ آتا تھا مگر ریڈیو پر وقت نہایت اہم حقیقت ہے چنانچہ مسافر صاحب ہی اسے وائنڈ اپ کرتے تھے جس روز مسافر نہیں ہوتے تھے اس روز مرزا کسی کے روکے نہیں رکتے تھے۔ ان کی کمپیئرنگ کی وجہ سے پروگرام شارٹ ہو جاتا تھا۔ کسی روز پروگرام شروع ہونے سے پہلے میں مرزا صاحب کو کوئی موضوع دے دیتا یا کہتا کہ آج فلاں بات پر پروگرام شروع کریں۔ اس کے بعد ہم تینوں سٹوڈیوز میں داخل ہوتے' مسافر صاحب اور مرز صاحب تو سٹوڈیو میں آمنے سامنے بیٹھ جاتے اور میں سائیڈ روم میں شیشے کی دیوار کے سامنے سٹول پر ریکارڈنگ انجینئر کے پاس بیٹھ جاتا۔ ہری بتی کا سگنل ہوتا تو دیہاتی پروگرام کی سگنیچر ٹیون فیڈ ان ہوتی اور پھر مرزا سلطان بیگ کی بھاری بھرکم' مخصوص بے تکلفانہ آواز السلام علیکم کہتی بلند ہوتی' کبھی کبھی وہ مجھ پر طنز کر دیا کرتے تھے۔ پروگرام کے شروع ہوتے ہی میری طرف اشارہ کر کے مسافر صاحب سے کہتے۔ یہ پٹواریوں کا منڈا امیدا آج پھر آیا ہوا ہے۔ خیال رکھیں کہیں کسی کی بھینس چرا کر نہ لے جائے۔ مسافر صاحب کہتے نہیں نہیں یہ منڈا اپنا ہے۔ بڑا شریف ہے۔ یہ تو میلہ دیکھنے آ گیا تھا وغیرہ۔

مہینے کے آخر میں ریڈیو کی چائے کی کینٹین والوں کی طرف سے ہمیں پرچیاں ملتی تھیں جن پر ہمارا مہینے کے کھانے پینے کا حساب درج ہوتا تھا۔ ہمیں تو یہ بل دفتری اوقات میں مل جاتا مگر مسافر صاحب اور مرزا سلطان بیگ کو یہ بل شام کے وقت ملتا تھا۔

کیونکہ وہ شام کو ہی ڈیوٹی پر آتے تھے۔ مسافر صاحب بڑے سوچ سمجھ کر خرچ کرنے کے عادی تھے جبکہ مرزا سلطان بیگ کا خرچ بڑا کھلا ہوتا تھا۔ چنانچہ کئی بار میں نے دیکھا کہ مرزا صاحب کی پرچیوں کی تعداد تو پچاس ساٹھ سے بھی زیادہ ہوتی جبکہ مسافر صاحب کو کینٹین والا لڑکا صرف دو تین پرچیاں ہی دیتا۔ ان دو تین پرچیوں کو بھی مسافر صاحب بڑے غور سے دیکھا کرتے اور کینٹین کے لڑکے کو بلا کر بار بار پوچھتے۔ ''یہ چار آنے کس چیز کے لکھے ہیں؟ یہ کباب تو میں نے نہیں منگوائے تھے۔''

غالباً یہ سن 1964-65ء کی بات ہے۔ ریڈیو پاکستان لاہور کے سٹاف

آرٹسٹوں کی یونین ہوا کرتی تھی۔ میں بھی اس یونین کا ممبر تھا۔ ایک بار اس کے انتخاب ہو رہے تھے۔ میٹنگ ریڈیو سٹیشن کے ہال کمرے میں ہو رہی تھی۔ انتخاب یونین کے صدر کا ہونا تھا۔ کسی نے صدر کا نام نامزد کرنا تھا اور پھر دوسرے لوگوں کی تائید و حمایت حاصل کرنی تھی۔ مرزا سلطان بیگ بھی وہاں موجود تھے۔ مجھے سیاست اور یونین وغیرہ سے کبھی بھی کوئی دلچسپی نہیں رہی اور یہ باتیں ہمیشہ سے میری سمجھ سے بالاتر رہی ہیں۔ چنانچہ مجھے یاد ہے کہ میں' یاسمین طاہر اور عزیز الرحمان' اناؤنسر ایک طرف بیٹھے آپس میں کسی موضوع پر باتیں کر رہے تھے کہ مرزا سلطان بیگ نے یونین کے صدر کے طور پر میرا نام پیش کر دیا۔ میں چونک پڑا۔ یاسمین طاہر نے کہا یہ لیجئے آپ کا نام مرزا صاحب نے پرپوز کر دیا ہے۔ عزیز الرحمان نے اٹھ کر اس کی تائید کر دی۔ میں حیران سا ہو کر رہ گیا۔ ابھی کچھ بولنے ہی لگا تھا کہ حاضرین مجلس نے ہاتھ کھڑے کر کے میری حمایت کا اعلان کر دیا۔ فریدہ خانم اور امانت علی خان نے بھی پرزور تائید کر دی۔ میں نے کھڑے ہو کر کہا۔ یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ میں اپنے آپ کو اس کے قابل نہیں سمجھتا۔ مگر میری بات کسی نے نہ سنی۔ مرزا سلطان بیگ نے مجھے بازو سے پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا۔

''جوان بن میدیا' اسیں تیرے نال آں۔''

اور میں یونین کا صدر بن گیا پھر صدارت کی مدت کے دوران مجھ سے جیسی بھی خدمت ہو سکی میں نے اس سے دریغ نہ کیا اور مرزا سلطان بیگ صاحب کی معاونت نہ ہوتی تو میں اپنی مدت پوری نہیں کر سکتا تھا۔ میں آج بھی مرزا سلطان بیگ اور لالہ حفیظ جاوید کا ممنون احسان ہوں کہ وہ آزمائش کی اس گھڑی میں مجھے اپنے مفید مشوروں سے نوازتے رہے۔

ایک بار میں ایک نیم سرکاری محکمے کے سیکرٹری صاحب کے دفتر میں بیٹھا تھا کہ مرزا سلطان بیگ بھی تشریف لے آئے۔ ان کے آتے ہی محفل کا رنگ شگفتہ ہو گیا۔ سیکرٹری صاحب کے میز کا کونہ کچھ کھردرا کھردرا سا تھا جیسے کسی نے چاقو سے اسے چھیلنے کی کوشش کی ہو۔ مرزا سلطان بیگ نے میز کے کونے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''یہاں آپ نے کوئی طوطا بٹھا رکھا تھا؟''

لارنس روڈ والی کوٹھی انہوں نے بنوائی تو ایک تقریب پر ریڈیو کے سبھی

دوستوں کو بلایا۔ میں بھی وہاں موجود تھا۔ مرزا صاحب نے مجھے آم اور لیچی کے کچھ درخت دکھائے اور ان کے بارے میں ایسی ایسی تاریخی باتیں بتائیں کہ میں ان کا منہ ہی دیکھتا رہ گیا۔ درختوں' سبزیوں' کاشت کاری' فصلوں کی بوائی' بارش کے حساب کتاب کا انہیں اتنا کچھ معلوم تھا کہ وہ اس موضوع پر ایک پورا انسائیکلوپیڈیا مرتب کر سکتے تھے مگر افسوس کہ ہمارے ہاں ایسی باتوں کا رواج نہیں ہے۔ بڑی بڑی زبردست قابلیت لوگ ساتھ ہی لے کر چلے جاتے ہیں اور کوئی نہیں پوچھتا۔ مرزا سلطان بیگ صاحب نے ایک کام بڑا اچھا کیا کہ پنجاب کے اکھان ''کھلرے موتی'' کے نام سے اپنی زندگی میں ہی مرتب کر کے چھپوا دی تھی۔

لاہور ٹیلی ویژن پر انہوں نے جو دیہاتی پروگرام شروع کیا وہ بھی لوگوں میں بے حد مقبول ہوا۔ لوگ اس پروگرام کا بڑی بے تابی سے انتظار کرتے اور اسے شوق سے دیکھتے تھے۔ مرزا صاحب نے ایک فلم میں بھی کام کیا تھا۔ میں اس فلم کا نام بھول گیا ہوں۔ اس میں نور محمد چارلی بھی تھا۔ مگر مرزا صاحب فلم میں کامیاب نہ ہو سکے اور فلمی دنیا سے ریڈیو کی دنیا میں آ گئے۔ ریڈیو کی دنیا ہی ان کا اصل وطن اور اصل میدان تھا۔ یہاں ان کا کوئی ہم سر نہیں تھا۔ وہ ریڈیو کے بے تاج بادشاہ تھے۔ مرزا صاحب کبھی کبھار ہی دن کے وقت ریڈیو سٹیشن آتے' ان کا کام ہی شام کو تھا لیکن تنخواہ والے دن تو دن کے وقت ریڈیو پر ان سے ضرور ملاقات ہو جاتی تھی اور بڑی خوبصورت محفل لگتی تھی۔ مجھے پتہ چلتا کہ مرزا صاحب آ گئے ہیں تو میں انہیں تلاش کر کے ان کے پاس پہنچ جاتا تا کہ مرزا صاحب کی شگفتہ اور دانش مندی کی باتوں سے فیض یاب ہو سکوں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مرزا صاحب پہلی منزل میں ایک پروڈیوسر کے کمرے میں بیٹھے تھے مجلس گرم تھی۔

مرزا صاحب نے سب کے لئے حسب عادت چائے اور شامی کباب منگوائے اور محفل میں مزید گرمی پیدا ہو گئی۔ مرزا صاحب جس کرسی پر بیٹھے تھے۔ اس کے بازو سٹیل کے تھے اور پائے بھی سٹیل کے تھے۔ وہاں فرش پر بجلی کے ہیٹر یا ٹیبل لیمپ کی تار پھیلی ہوئی تھی اور اتفاق سے وہ اس کرسی کے سٹیل کے پائے کے نیچے آ گئی جس پر مرزا صاحب بیٹھے تھے۔ مرزا صاحب باتیں کرتے ہوئے آگے پیچھے ہل رہے

تھے۔ یہ میرے سامنے کا واقعہ ہے۔ اس طرح رگڑ کھانے سے بجلی کا تار ننگا ہو گیا اور ایک ہلکا سا دھماکہ ہوا۔ ہم سب کے رنگ زرد پڑ گئے کیونکہ دھماکہ مرزا صاحب کی کرسی کے نیچے ہوا تھا۔ مرزا صاحب بھی کچھ گھبرائے مگر کرسی پر ہی بیٹھے رہے۔ خوش قسمتی یہ ہوئی تھی کہ کرسی کے سٹیل کے بازوؤں کے درمیان لکڑی کے ہتھے لگے تھے اور ان ہتھوں پر مرزا صاحب کی کہنیاں ٹکی ہوئی تھیں۔ کرسی کی پشت اور نشست بھی بید کی تھی۔ یوں بڑا بچاؤ ہو گیا اور کرنٹ مرزا صاحب کو نہ لگ سکا۔

کسی نے کہا۔ ''مرزا صاحب! اللہ نے آپ کو بچا لیا ہے فقیروں کو کچھ کھلا پلا دیں۔'' اس پر مرزا سلطان بیگ نے چائے کے ٹرے اور شامی کبابوں کی تھالیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''تو یہ کیا کر رہا ہوں؟''

مطلب یہ تھا کہ فقیروں کو تو میں نے کھلا پلا دیا ہے۔ سب ہنس پڑے اور مرزا صاحب کے اس برجستہ جواب کا سبھی نے لطف لیا۔

مرزا سلطان بیگ بڑا دردمند دل رکھتے تھے۔ ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے بھی مجھے ان کی بعض کیفیات کو بڑے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ میں ان کے پنجابی لہجے' اظہار کی بے ساختگی اور ایک مخصوص انداز کلام کی وجہ سے ان کا زبردست مداح تھا اور یہ میری خوش قسمتی تھی کہ وہ مجھ سے پیار کرتے تھے۔ ان کی زندگی بڑی ہنگامہ خیز اور تجربات و واقعات سے بھری ہوئی تھی کسی کو وہ دکھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔

ایک بار ایسا ہوا کہ پنجاب کے ایک شہر سے ایک نوجوان لڑکی گھر سے بھاگ کر ان کو تلاش کرتی ریڈیو سٹیشن آ گئی۔ اس نے گیٹ پر نظام دین کا پوچھا اور کہا میں ان سے ملنا چاہتی ہوں۔ سکیورٹی آفیسر نے اسے بتایا کہ نظام دین یعنی مرزا سلطان بیگ شام کو ریڈیو سٹیشن آتے ہیں۔ وہ لڑکی وہیں بیٹھ کر انتظار کرنے لگی۔ شام کو جب مرزا صاحب اپنے سکوٹر پر ریڈیو کی عمارت میں داخل ہوئے تو لڑکی بھی ان کے پیچھے پیچھے ڈیوٹی روم کے باہر آ گئی۔ مرزا صاحب ابھی لابی میں آ کر بیٹھے ہی تھے اور انہوں نے چائے کا آرڈر دیا ہی تھا کہ چپراسی نے کہا کہ ایک خاتون آپ سے ملنے آئی ہے۔ اس وقت میں بھی وہیں بیٹھا تھا۔ مرزا صاحب کو اکثر ان کے مداح ملنے آتے رہتے تھے ان

میں خواتین بھی شامل تھیں مگر یہ خواتین عام طور پر فیملی کے ساتھ آتی تھیں مگر یہ لڑکی بالکل تنہا تھی اور چہرے پر پریشانی کے آثار بھی تھے۔ مرزا صاحب نے اسے غور سے دیکھا اور جیسا کہ ان کا انداز تخاطب ہوا کرتا تھا پوچھا۔

''کیہ گل اے پتر! کنوں ملنا ایں؟''

لڑکی نے ہاتھوں میں ایک چھوٹی سی گٹھڑی تھام رکھی تھی۔ اس نے کہا جی مجھے نظام دین سے ملنا ہے۔ مرزا صاحب نے کہا۔ ''میں ہی نظام دین ہوں۔ تم کہاں سے آئی ہو۔ تمہارے ساتھ کوئی مرد نہیں ہے؟''

لڑکی نے نفی میں سر ہلایا۔ مرزا صاحب نے لڑکی کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اسے چائے پلائی۔ اتنے میں پروگرام کا وقت ہو گیا۔ وہ یہ کہہ کر سٹوڈیو میں چلے گئے۔ ''پتر! توں ایتھے ای بیٹھ میں پروگرام کر آواں۔'' سٹوڈیو میں داخل ہونے سے پہلے میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے۔

''مجھے اب اس لڑکی کو گھر پہنچانا ہوگا تم باہر خیال رکھنا۔ یہ ادھر ادھر نہ جائے۔''

پروگرام جب تک ہوتا رہا میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد باہر جھانک کر دیکھ لیتا تھا۔ پروگرام ختم ہوا تو مرزا صاحب مجھے کہنے لگے۔ ''تم میرے ساتھ رہو گے۔'' پھر لڑکی سے پوچھا کہ وہ کہاں سے آئی ہے اور اصل معاملہ کیا ہے؟

لڑکی نے ساری بات اگل دی۔ بات یہ تھی کہ لڑکی کی سوتیلی ماں اس کی شادی زبردستی اپنے رشتے داروں میں ایک ایسے شخص سے کرنا چاہتی تھی جس کا تعلق جرائم پیشہ طبقے سے تھا۔ لڑکی کا باپ اپنی دوسری بیوی کے سامنے بے بس تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بیٹی کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے مگر کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ لڑکی نے اپنی زندگی تباہ ہوتے دیکھی تو گھر سے بھاگ کر سیدھی ریڈیو سٹیشن نظام دین کی تلاش میں آ گئی کیونکہ مرزا صاحب کا لہجہ قوم کے بچے بچیوں کے لئے ہمیشہ پدرانہ شفقت بھرا ہوتا تھا۔

مرزا صاحب نے اپنا سکوٹر سٹیشن پر ہی چھوڑا ریڈیو کی گاڑی لی، مجھے بھی ساتھ بٹھایا اور سیدھا اپنے گھر آ گئے۔ اس کے بعد ریڈیو کی گاڑی بھجوا دی۔ اپنے بیٹے کی گاڑی نکلوائی۔ بیٹے کو ساتھ لیا اور لڑکی سمیت ہم سب لڑکی کے شہر کی طرف روانہ ہو گئے

جو لاہور سے زیادہ دور نہیں تھا۔ لڑکی کو مرزا صاحب نے اس دوران کہہ دیا تھا کہ اگر تم مجھے اپنے باپ کی جگہ سمجھتی ہو تو پھر جو کچھ میں کر رہا ہوں اس پر اعتراض نہ کرنا۔ اتنا میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ وہی ہوگا جو تم چاہو گی۔ بہرحال ہم لوگ رات کے نو بجے کے قریب اس لڑکی کے گھر پہنچے۔ وہاں سوگ طاری تھا۔ لڑکی کا باپ تو بستر پر پڑا تھا۔ سوتیلی ماں بھی پریشان تھی۔ لڑکی کو دیکھ کر باپ نے اسے گلے لگا لیا اور سسکیاں لے لے کر رونے لگا۔ مرزا صاحب کی آنکھیں بھی اشکبار ہو گئیں۔ پھر انہوں نے لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''یہ گھر سے نکل کر سیدھی میرے پاس آئی تھی۔ ان نے مجھے باپ کی جگہ سمجھا تھا اور میں بھی اسے اپنی بیٹی ہی سمجھتا ہوں۔''

اس کے بعد انہوں نے ایسی دانشمندی اور خوش اسلوبی سے معاملہ سلجھایا کہ سوتیلی ماں کا بھی دل پسیج گیا اور اس نے کہہ دیا کہ لڑکی کی شادی اس کی مرضی کے خلاف نہیں ہوگی اور وہ بھی لڑکی کو ساتھ لگا کر پیار کرنے لگی۔ مرزا صاحب نے لڑکی کو مخاطب کر کے کہا۔

''بیٹی! ماں چاہے سوتیلی ہو، وہ ماں ہی ہوتی ہے، تمہیں اس کا اور اپنے باپ کی عزت کا پاس ہونا چاہئے۔ تم نے گھر سے باہر قدم نکال کر بہت بڑی غلطی کی تھی آئندہ ایسی غلطی کبھی نہ کرنا۔ یہ غلطی ہی نہیں گناہ بھی ہے اور اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے تمہاری زندگی تباہ ہو سکتی تھی مگر اللہ تعالیٰ نے تمہیں بچا لیا۔''

لڑکی کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ ایسا گناہ، ایسی خوفناک غلطی پھر کبھی نہیں کرے گی۔ ہم رات کو بارہ ساڑھے بارہ بجے اس شہر سے واپس لاہور آئے۔ یہ واقعہ مجھے کبھی نہیں بھولتا۔ مرزا سلطان بیگ کو اللہ نے بڑی شہرت دی تھی۔ جیسا کہ ہوتا آیا ہے، ان کی شہرت سے لوگ جلنے بھی لگے تھے۔ پھر ایسا ہوا کہ جیسا کہ کہا جاتا ہے ایک سازش کے ذریعے مرزا صاحب پر ایک الزام لگایا گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ بہتان لگایا گیا۔ محکمے نے انہیں ریڈیو پر ''بین'' کر دیا۔

جب سوہنی دھرتی اور جمہوری آواز سے نظام دین غائب ہوا تو لوگوں کے خطوں کے خط آنے شروع ہو گئے۔ مگر محکمے نے ان کا ذرا برابر بھی اثر نہ لیا۔ ہمیں خود بڑا افسوس تھا کہ ایسا کیوں ہوا مگر معاملہ کچھ ایسا تھا کہ ہم بھی کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ مرزا

صاحب پر پابندی جاری رہی۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ الزام غلط ثابت ہوا اور ان پر سے مائیکروفون کے سامنے آنے کی پابندی اٹھالی گئی لیکن مرزا صاحب بڑے دل برداشتہ تھے پھر بھی وہ ہفتہ میں شاید تین بار دیہاتی پروگرام میں کمپیئرنگ کے لئے آنے لگے۔ جس سے ان کے مداحین کو بڑی حد تک خوشی ہوئی مگر خوشی کے یہ لمحات زیادہ دنوں تک برقرار نہ رہ سکے اور مرزا سلطان بیگ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ دنیا کے کام جاری و ساری رہتے ہیں مگر کچھ لوگ ایسے بھی اٹھ جاتے ہیں کہ جن کی جگہ بڑی دیر تک خالی رہتی ہے۔

☆.....☆.....☆

مولوی محمد سعید کی آپ بیتی کی یاد میں

بعض کتابیں اس لئے لکھی جاتی ہیں کہ لوگ نہیں پڑھ کر بھلا دیں۔ بعض کتابیں کبھی کبھی کسی ورق گردانی کے لئے لکھی جاتی ہیں۔ کچھ ایسی کتابیں ہوتی ہیں کہ لکھنے والے کو بھی پتہ نہیں ہوتا کہ وہ ایک ایسی کتاب لکھ رہا ہے جو آگے چل کر تاریخ کا ایک حصہ بن جائے گی۔ ایسی کتاب کوئی تاریخ کی کتاب نہیں ہوتی۔ یہ وہ کتاب ہوتی ہے جسے تاریخ خود مصنف سے لکھواتی ہے۔

اس نوعیت کی کتابیں ہر زبان کے ادب میں پائی جاتی ہیں۔ ایسی کئی تاریخ، ادب اور عمرانیات کی انگریزی کے علاوہ دوسری زبانوں کے ادب اور علم سیاست کی کتابیں انگریزی میں ترجمہ ہو کر میری نظر سے گزری ہیں۔ یہاں میرے سامنے اس وقت صرف دو ایسی کتابیں ہیں۔ پہلی کتاب اخلاق احمد دہلوی کی ''یادوں کا سفر'' ہے اور دوسری کتاب مولوی محمد سعید کی کتاب ''آہنگ بازگشت'' ہے۔ پہلے میں مولوی محمد سعید کی کتاب ''آہنگ بازگشت'' کا تذکرہ کرنا چاہوں گا۔

مولوی محمد سعید کی کتاب آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی ہے بلکہ اگر میں یہ کہوں تو مبالغہ نہیں ہوگا کہ یہ کتاب مولوی صاحب کی آپ بیتی کم اور جگ بیتی زیادہ ہے۔ یہ کتاب 1921ء سے لے کر 1947ء یعنی قیام پاکستان تک پھیلے ہوئے برصغیر پاک و ہند کی سیاسی معاشرتی اور صحافتی تاریخ کے بعض بڑے اہم اور دور رس نتائج مرتب کرنے والے سیاسی واقعات کی ایک مستند دستاویز بھی ہے اور ان واقعات کا عکس دلپذیر بھی ہے۔ مولوی صاحب برصغیر کے مذکورہ عہد کے تقریباً ہر نازک اہمیت والے سیاسی اور صحافتی موڑ یعنی ٹرننگ پوائنٹ کے عینی گواہ بھی ہیں اور ان واقعات کے

ڈرامے کا ایک اہم کردار بھی رہے ہیں۔ غالب نے کہا تھا۔

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیان اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو راز داں اپنا

مولوی صاحب موضوع سخن کی پری وش کا ذکر کچھ ایسے دلفریب انداز میں بیان فرماتے ہیں کہ ان کا رقیب بنے بغیر کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔ جب یہ کتاب مجھے محترم جسٹس (ر) خالد پال صاحب نے مرحمت فرمائی اور میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے کتاب کے متن پر جستہ جستہ نگاہ ڈالی تو پہلی نظر میں ہی میں مولوی صاحب کے اسلوب نگارش کا ہی رقیب بنا تھا۔ اس کے بعد جب کتاب کا مطالعہ کیا تو مولوی صاحب کے جوہر کھلتے چلے گئے اور معلوم ہوا مولوی سعید صاحب نے ربع صدی پر پھیلے ہوئے ایسے سوشل اور سیاسی حالات و واقعات کی تاریخ رقم کر دی ہے جن کے سیاسی عمل کا نتیجہ قدرتی طور پر تحریک پاکستان اور قیام پاکستان کی صورت میں نکلنا ہی تھا۔ شاید میں یہ کتاب نہ پڑھتا اگر یہ کتاب محض سیاسی حالات و واقعات کا مجموعہ ہوتی۔ کتاب کے پہلے صفحے سے ہی مولوی صاحب کے اسلوب تحریر' انداز بیان اور منظر کشی و کردار نگاری نے مجھے اپنی طرف کھینچا اور جب تک کتاب ختم نہیں ہوگئی میں ہر روز دوپہر کو ایک گھنٹہ اور رات کو دو گھنٹے اسے پڑھتا رہا۔ کتاب پڑھنا میری عادت میں شامل ہے۔ دوپہر ایک گھنٹہ سونے سے پہلے پڑھتا ہوں اور رات کو سونے سے پہلے دو تین گھنٹے پڑھتا ہوں۔ مولوی صاحب کے اسلوبِ نگارش کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ پڑھتے وقت قاری پر یہ احساس غالب رہتا ہے کہ جو واقعہ بیان کیا جا رہا ہے اسے مصنف بیان نہیں کر رہا بلکہ واقعہ خود اپنے آپ کو بیان کر رہا ہے۔

مولوی محمد سعید صاحب انگریزی' عربی اور فارسی زبانوں کے عالم ہیں اور ان زبانوں کے ادب پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ ہوا یوں کہ میں ایک سہ پہر کو جسٹس (ر) خالد پال کے دیوان خانے میں ان کے پاس بیٹھا تھا اور بڑی عمدہ قسم کی دم کی ہوئی چائے کی مہک فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ پال صاحب کہہ رہے تھے کہ اب مجھے اپنی آپ بیتی لکھنی شروع کر دینی چاہئے۔ جو ایک دور کی بھرپور تاریخ ہوگی۔ باتوں ہی باتوں میں کہنے لگے۔

"ایک کتاب ہے جو مولوی محمد سعید نے لکھی ہے اور جو انہوں نے خود میرے والد صاحب عبدالسلام پال کو عنایت کی تھی۔ یہ کتاب ایک طرح سے مولوی صاحب کی آپ بیتی بھی ہے۔ آپ اسے ضرور پڑھ لیں۔"

اور انہوں نے اٹھ کر اپنے کتب خانے کی الماری میں سے ایک کتاب نکال کر مجھے دی۔ کتاب کی جلد بڑی مضبوط تھی۔ کتابت بھی لگتا ہے کسی بڑے کمال کے خوش نویس کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ بالکل موتی پروئے ہوئے تھے۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے کتاب کے دو چار صفحے پڑھے تو مجھے مصنف کے انداز تحریر اور اسلوک بیان نے بڑا متاثر کیا۔ میں نے پال صاحب سے کہا۔

"پال صاحب! یہ کتاب کسی ایک کتب خانے کی الماری میں نہیں پڑی رہنی چاہئے۔ اسے میرے کتابوں کے شیلف میں بھی ہونا چاہئے۔"

چنانچہ میں پال صاحب سے کتاب لے آیا اور اسے پڑھنا شروع کیا۔ جیسے جیسے کتاب پڑھتا جاتا تھا۔ مولوی صاحب کے نہ صرف جوہر کھلتے جاتے تھے بلکہ پاکستان کی تاریخ کے ابتدائی عوامل کے تسلسل کی کڑیاں نگاہوں کے سامنے آتی جاتی تھیں۔ کتاب ختم کر کے میں نے کتاب تو اپنے پاس ہی رکھی اور خود پال صاحب کے ہاں پہنچ گیا اور انہیں کہا کہ مولوی محمد سعید صاحب کی یہ کتاب صرف میرے کتابوں کے شیلف میں ہی نہیں رہنی چاہئے' یہ پاکستان کی نوجوان نسل کی امانت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کسی ذریعے سے میں اسے اپنے وطن کی نوجوان نسل تک پہنچا دوں۔ چنانچہ میں نے یہی سوچا کہ میرے پاس ایک ہی ذریعہ ہے کہ میں اپنے اخبار "نوائے وقت" کے اپنے کالم کی وساطت سے پاکستان کی نوجوان نسل تک ان کی امانت پہنچا دوں۔

اب میرے لئے ایک مشکل تو یہ ہے کہ میں اپنے کالم میں پوری کی پوری کتاب درج نہیں کر سکتا۔ دوسری مشکل یہ ہے کہ میں یہ کتاب کسی کو پڑھنے کے لئے بھی نہیں دے سکتا' یہ میری ان کتابوں میں سے ایک کتاب کی حیثیت اختیار چکی ہے کہ جو پلنگ نما تخت پوش کے بالکل قریب پڑی رہتی ہے۔ میں بھونچال سے بڑا ڈرتا ہوں۔ لاہور میں پچھلے دنوں بڑا خوفناک قسم کا زلزلہ آیا تھا۔ مجھے پہلے جھٹکے ہی سے پتہ لگ گیا تھا کہ یہ خطرناک بھونچال ہے۔ چنانچہ میں تخت پوش کے پاس رکھی ہوئی دو تین کتابیں ہی

اٹھا کر مکان سے باہر بھاگ گیا تھا۔ اس کے بعد میں نے گھر والوں سے کہا تھا کہ بھائی تم لوگ بھی باہر آ جاؤ۔

اب ایک ہی طریقہ رہ گیا ہے کہ میں مولوی صاحب کی کتاب کے بعض ٹکڑے، جستہ جستہ تاریخی عوامل اور تسلسل کے ساتھ ''نوائے وقت'' کے توسط سے اپنے پاکستانی قارئین کرام تک پہنچا دوں۔ میں مولوی صاحب کی کتاب کے سمندر کو تو اپنے کالم کے کوزے میں بند نہیں کر سکتا، لیکن اتنی کوشش ضرور کر سکتا ہوں کہ اس سمندر کی کچھ طوفان خیز موجوں کا شور تلاطم اور کچھ نازک خرام پرسکون لہروں کا میوزک آپ تک پہنچ جائے۔

مولوی محمد سعید صاحب نے اپنی کتاب کا آغاز آپ بیتی کے انداز میں ہی کیا ہے، مختصر سے پیش لفظ میں وہ لکھتے ہیں۔

''محترم قاری! سلام مسنون!

یہ چند اوراق جو پیش خدمت ہیں، میں نے ساٹھ برس ایک ماہ اور تین ہفتوں میں لکھے ہیں، یہ تحریر تاریخ نہیں، یہ محض افسانہ بھی نہیں۔ اس لئے کہ یہ دن مجھ پر بیت چکے ہیں۔ یہ دن میری وجہ سے اہم نہیں تھے۔ بلکہ میں ان کی اہمیت کا ایک ادنیٰ تماشائی تھا۔ اکثر سوچتا ہوں کہ اگر یہ دن مجھ پر نہ گزرے ہوتے تو میں کتنا تہی دامن ہوتا!

والسلام مخلص

محمد سعید

پیش لفظ کے دوسرے حصے پر فارسی کا ایک شعر درج ہے:

اے مطرب از کجاست کہ ساز عراق ساخت
آہنگ بازگشت ز راہ حجاز کرد

ترجمہ: یہ مغنی کہاں سے آیا ہے کہ ساز تو اس نے عراقی چھیڑا ہے اور لے حجازی پیدا کی ہے۔

مولوی صاحب نے اپنی آپ بیتی کا آغاز اقبال کے اس مصرعے سے کیا ہے:

ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن

لکھتے ہیں۔

''پسرور سے چار میل جنوب کی طرف ڈیک ندی کے کنارے ایک گاؤں ''کلاس والا'' اکبر کے زمانے سے آباد چلا آ رہا ہے۔ سکھ عہد کی افراتفری میں جہاں اور جگہ چھوٹی چھوٹی سرداریاں قائم ہو گئی تھیں۔ اس گاؤں میں بھی ایک سکھ سردار نے قلعہ اور مہمان خانہ تعمیر کر لیا اور آس پاس کے علاقے سے خراج وصول کرنے لگا۔''

یہ قلعہ منہدم ہو چکا ہے۔ اس کی باقیات میں سے ایک منقش مٹی اس مہیب ڈھیر پر، جسے ہم ''تھیہ'' کہتے تھے، ہمارے بچپن تک سلامت رہی۔ پھر رفتہ رفتہ وہ بھی نابود ہو گئی۔

قلعے سے ملحق بازار کے مغربی کنارے پر جو محلہ واقع ہے اس میں میرا خاندان تقریباً 1740ء میں چنیوٹ سے آ کر آباد ہوا۔ خاندان کی جو مختصر سی زمینداری تھی اس سے بزرگ پہلے 1849ء کے انقلاب میں اور پھر 1857ء کے ابتداء میں دست کش ہو گئے، تاہم خاندان کے بزرگ فن تعمیر میں ہنرمندی کی بدولت، بڑے احترام سے دیکھے جاتے تھے۔ سکھوں کے خاتمے کے وقت میرے دادا حیات محمد نو برس کے تھے۔ والد مفتی محمد قاسم 29 برس بعد پیدا ہوئے۔

اس گاؤں میں میں 23 اکتوبر 1911ء کو پیدا ہوا۔ ماں کی گود کی بہاریں تو یاد نہیں اس لئے کہ شاید فطرت کے پاس باقی ماندہ زندگی کے لئے ان سے بہتر اور کوئی تحفہ نہیں ہوتا، تو وہ انہیں ذہن سے محو کر دیتی ہے۔ لیکن گاؤں کی گلیوں کی بہاریں یاد ہیں۔ جہاں ہر موسم خوشیوں کا تحفہ لے کر آتا۔ بیساکھ سے نیا سال شروع ہوتا اور اس کی ابتداء ایک ہنگامہ آرائی سے ہوتی۔ گیہوں کے سنہرے خوشے، حد نگاہ تک پھیلے ہوئے کھیت، سورج کی تمازت میں لرزاں افق، یہ منظر کاشتکار کے لئے جس سرمستی کا پیغام لے کر آتا ہے۔ وہ بیساکھ کی یکم تاریخ کو اپنے عروج کو پہنچتی ہے۔ گندم گھر پہنچ جاتی تو زمیندار کی نگاہیں پھر آسمان کی طرف اٹھنی شروع ہو جاتیں لیکن لو اور بگولوں کے والہانہ رقص کے علاوہ کچھ نہ پاتیں۔ خشک جوہڑ، ویران کھیت، مرجھائے ہوئے درخت، درماندہ حال انسان وحوش، پچھلے پہر کالی آندھیاں کہ جن میں سورج بے نور صحنک کی طرح آویزاں ہو۔ یکا یک ہوا کا رخ بدلتا، پورب سے آنے والی ہوائیں پتہ دیتیں کہ بادل پانی

لے کر آ رہے ہیں۔ اساڑھ کا پہلا چھینٹا رحمت خداوندی کا پیغام ہوتا۔ دوپہر کو کچے مکانوں کے کونوں میں چھپنے والے لوگ پھر میدانوں میں نکل آتے۔ ابر اللہ کے آتا پھوہار پڑتی اور چہار سو ٹھنڈی ہواؤں میں دھانی رنگ کی چندریاں لہرانے لگتیں......

ساون کی جھڑیاں گزر جاتیں تو "ساون" کی رونق بھی ساتھ لے جاتیں، بھادوں آتا تو چبھتی ہوئی دھوپ ہمس کا تحفہ لے کر آتا۔ کبھی کبھار کوئی بدلی کہیں سے اڑ کر آ جاتی تو اس ادا سے برستی کہ بھینس کا ایک سینگ تر ہو جاتا تو دوسرا خشک رہتا۔ مکئی اور چاولوں کی ہریالی پر دھوپ اور چھاؤں ایک دوسرے کے تعاقب میں گاؤں گاؤں گھومتے پھرتے۔ پھر جب دھوپ بے جان ہونے لگتی اور سائے لمبے ہونے لگتے تو پنجاب کی خزاں بھی اپنی دھانی چنری کے پلو میں تین نعمتیں لے کے وارد ہوتیں، مونجی، مکئی اور کپاس...... ادھر نوجوانوں کی بیٹھکوں میں کوئی خوش گلو یوسف زلیخا اور ہیر وارث شاہ کی آواز لگاتا...... لیکن گاؤں کے ان ہنگاموں سے دور جوہڑ کے پار ایک مرد درویش اپنی دنیا الگ بسائے بیٹھا تھا۔ جہاں آج ایک چٹیل چبوترے پر اپلوں کے ڈھیر ملیں گے۔ وہاں درختوں کے جھنڈ میں دو کوٹھڑیاں تھیں۔ ایک میں خراس نصب تھا اور دوسری میں جس کا جھروکہ جوہڑ کی جانب کھلتا تھا مولوی عبدالحئی کتابوں میں گھرے ہوئے کھجور کی چٹائی پر زہد و استغنا کی تصویر بنے بیٹھے رہتے۔ دنیا کے جھمیلوں سے الگ اس چھوٹی سی کوٹھڑی کا دروازہ ہر آنے جانے والے کے لئے کھلا رہتا۔ ہندو، مسلمان، سکھ بھی اپنے اپنے غم و اندوہ لے کے آتے اور تسکین پا کے جاتے۔ اسلام کے جمالیاتی پہلو کی اس ہلکی سی جھلک نے اس عزلت نشیں کو مرجع خلائق بنا رکھا تھا۔ جوانی میں بڑھئی کا کام کرتے، رزق حلال کھاتے اور درس قرآن دیتے، بڑھاپے میں ایک خراس بنا لیا تھا جس کی پسائی سے گھر کا خرچ چلتا......

اس سادگی میں زندگی گزار کے اور گاؤں میں پچاس برس سے زیادہ قرآن و حدیث کا درس دے کے جب وہ دنیا سے رخصت ہوئے تو گاؤں کی پوری ہندو اور سکھ آبادی جنازے میں شریک ہوئی۔ مولوی صاحب عمر بھر دوسروں کے ٹکڑوں کی محتاجی سے آزاد رہے۔ خود علم کی دولت صبح و شام لٹاتی۔ برادری کی خوشیوں اور غموں میں شریک رہے۔ بیاہ شادی کے لین دین میں ان کا رویہ برادری کے افراد کی طرح تھا۔ علم

دین کے نام پر کبھی رعایت نہیں مانگی۔ وعظ سادہ ہوتا اور پنجابی زبان میں۔ جنہیں ان کی صحبتیں میسر آئی ہیں وہ حیرت میں رہ جاتے۔ قرآن پاک کے اس اعجاز پر کہ ایسی سادہ بولی میں ڈھل کے بھی اس کا حسن برقرار رہتا ہے۔ یہ وعظ جس میں نہ خطیبانہ زور بیان ہوتا اور نہ حکیمانہ موشگافیاں، محض اپنی سادگی اور خلوص کی بدولت دلوں میں اتر جاتا۔ میری آنکھیں اب تک ایک سفید ریش سکھ کو جمعہ کے روز منبر کے قدموں میں بیٹھا ہوا دیکھ رہی ہیں، توحید کے بیان پر اس کا سر دھننا، وہ سکھ بزرگ پورا خطبہ سنتے اور نماز کے وقت الگ بیٹھ جاتے۔ اس بزرگ سکھ کا نام بابا عطر سنگھ تھا۔ برسوں کے بعد میں نے ایک دفعہ مولوی صاحب سے پوچھا کہ اس بزرگ سکھ کی شیفتگی اسلام کس حد تک تھی۔ کہنے لگے بابا عطر سنگھ نے مجھے اپنی بیماری کے دنوں میں یاد کیا۔ میں گیا تو اپنی اولاد سے کہا کہ مجھے مولوی صاحب سے تخلیئے میں کچھ کہنا ہے۔ جب سب جا چکے تو کہنے لگے۔ "مولوی صاحب اپنا ہاتھ بڑھائیے میرے ہاتھ کو تھام کر کہنے لگے۔ میں دو چار روز کا مہمان ہوں۔ میرے مرنے کے بعد میرے عزیزوں سے تعرض نہ کیجئے گا۔ انہیں ہر رسم کر لینے دیجئے گا۔ یہ مجھے نذر آتش بھی کریں گے کر لینے دیجئے۔ لیکن آپ حشر کے روز میرے ایمان کے گواہ رہئے، پھر کلمہ پڑھا اور جلدی سے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور کہا۔ "آپ اب جائیے، اگلے دن عطر سنگھ انتقال کر گئے۔"

مولوی محمد سعید صاحب اپنی آپ بیتی "آہنگ بازگشت" میں آگے چل کر لکھتے ہیں "اپریل 1919ء" میں والد نے ہمیں لدھیانے آنے کو کہا۔ لدھیانہ پہنچ کر کمیٹی کے سکول میں داخلہ مل گیا، اس وقت شہر کشادہ اور صاف دکھائی دیا۔ پرانے قلعے کی سیر، روشنی کا میلہ، ہاتھی کی سواری، لدھیانے کی یادیں ہیں۔ لدھیانے کے آس پاس کے جوہڑوں میں مرغابیوں کی کثرت رہتی تھی۔ بہت برسوں کے بعد معلوم ہوا کہ لدھیانہ ان خانہ بدوش مرغابیوں کی گزرگاہ پر واقع ہے جو ہر سال روس کے دریائے وولگا کے یخ بستہ کناروں سے اڑتے ہیں اور گرم پانیوں کی تلاش میں ہندوستان کے قلب تک اتر جاتے ہیں۔ لدھیانے میں یہ مرغابیاں گھڑی بھر کے لئے کمر کھولتی ہیں اور اسی اثناء میں ان پر کوئی نہ کوئی شکاری قیامت بن کے ٹوٹ پڑتا ہے۔ روس کے ہر سفر کی منزل گرم پانی ہے، لدھیانے میں دو برس قیام رہا، پھر والد جگراؤں کے قریب ایک

گاؤں چوہڑ چک تبدیل کر دیئے گئے۔ چوہڑ چک کی زندگی عجیب پر کیف زندگی تھی۔ نہر کا بنگلہ' نہر کا کنارہ' وسیع باغ' چاروں طرف شاداب کھیت' وہاں کے ولولہ پرور لوگ جن کے مزاج میں انتہا پسندی تھی۔ نٹوں کا تماشہ ہو یا راس دھاریوں کی شب آرائی' بیساکھی کا موقع ہو یا سانڈنیوں کی دوڑ' جب بھی خلق خدا کے جمع ہونے کا کوئی بہانہ ملتا' خون بہنے کے لئے تیار ہو جاتا۔ عموماً لڑائی کا آغاز اس وقت ہوتا جب محفل اپنے عروج پر ہوتی۔ کسی شرابی کی للکار ایک دعوت مبارزت ہوتی۔ جس سے اغماض نامردی کی علامت سمجھی جاتی' آن کی آن میں ٹکوے چمک اٹھتے اور چھویاں اور بھالے خون میں نہا جاتے۔ کشت و خون کا یہ ہنگامہ چند منٹوں کے بعد فرو ہوتا تو پچھلا حساب تو کیا بے باق ہوتا کئی نئے کھل جاتے...... لاہور سے جب ''زمیندار'' اخبار آتا۔ والد مضطرب ہو جاتے' اکثر اوقات صبح کی تلاوت کے بعد بڑے پردرد لہجے میں مولانا ظفر علی خان کی کوئی نظم پڑھتے۔ چند مہینوں کے بعد پھر رخت سفر باندھنا پڑا' ہمارا قافلہ چوہڑ چک سے نکل کر فاضلکا پہنچا۔ سیٹھ رگھبیر دیال کی گلی میں مکان ملا۔ گلی جہاں ختم ہوتی تھی وہاں ایک شکستہ حال مسجد تھی۔ فاضلکا کے اسلامیہ مڈل سکول میں داخلہ لیا۔ اسکول' ابوہر جانے والی پکی سڑک پر شہر کی آخری عمارت تھی۔ اس سے آگے ذخیرہ تھا اور پھر ریگستان۔ یہ سکول ایک نیک سرشت وکیل پیر محمد کی ملت دوستی کا مرہون تھا...... تغلقوں کا دور ہی وہ زمانہ ہے جب اس خطے میں حضرت فریدالدین گنج شکرؒ کے ہاتھ پر کنار ستلج کے راجپوت حلقہ بگوش اسلام ہوئے اور یہی وہ بادیہ و دشت ہیں جہاں باوا صاحبؒ نے زہد و ورع کی منزلیں طے کیں۔ اجودھن کو پاک پتن میں بدلا۔ سلطان الاولیاء حضرت نظام الدین کی جھولی علم و عرفان سے یہیں بھری گئی۔ تغلقی نہروں کا سلسلہ نہ معلوم کب زمانے کے ہاتھوں معدوم ہوا اور یہ علاقہ گوالوں اور خانہ بدوشوں کا مسکن کب بنا؟ البتہ اپنی ویرانی کے زمانے میں بھی یہ پنجابی ادب کے دامن کو موتیوں سے مالا مال کر گیا' پاک پتن سے ساہیوال جاتے ہوئے پانچ میل دور ملکہ ہانس کا وہ گاؤں واقع ہے جہاں وارث شاہ نے ہیر کی لافانی داستان قلم بند کی۔

سچیانوالہ سے رخصت ہوئے تو بادیہ پیمائیاں بھی ختم ہو گئیں۔ اب زندگی میں حضر کا دور شروع ہوا۔ جنگلوں کی وسعتیں پیچھے رہ گئیں اور ان کی جگہ شہروں کی کوچہ

نوردیوں نے لے لی۔ لاہور پہنچے تو دیکھا کہ ایک نئی دنیا میں آ نکلے ہیں۔

شہر لاہور کہ ہے سجدہ گہ اہل نظر

تنگ و تاریک گلیاں' بازاروں میں ہجوم' بلند و بالا عمارتیں' خوش پوش' خوش خوراک لوگ' گفتگو میں بے باک' عادات میں آزاد و بے فکر۔ ہر سو سیاست کا چرچا' ہر جماعت فعال و متحرک...... مسلمانوں میں تجارت کا شعور بیدار ہونے کے باوجود تعلیم کا مقصد اولیٰ مسلمانوں کے ہاں ہنوز ملازمت ہی تھا...... تجارت کی طرف سے مسلمانوں کے اندر یہ بے رغبتی پیدا کرنا ہندو بنیئے کی اس مہم کا حصہ تھی جو اس نے منڈیوں پر اپنے قبضے کو قائم رکھنے کے لئے شروع کر رکھی تھی۔ ہر مسلمان خود بھی کچھ تو اس جز رسی کو کہ جو تجارت کا لازمہ اولین ہے' کمینگی سمجھتا تھا اور کچھ وہ گاہک کے ساتھ تملق سے بات کرنے کو اپنی شان سے کم تر سمجھتا۔ بعض مسلمان دکانداروں کے طنطنے کا یہ عالم دیکھا کہ گاہک اگر سودے سے مطمئن نہ ہو کر پلٹنے لگتا تو اس پر آوازے کسے گئے' ہندو دکانداروں کا رویہ اس سے قطعی مختلف بلکہ الٹ تھا......

1928ء میں لاہور بڑی تیزی سے سیاست کا مرکز بنتا جا رہا تھا۔ یہ فخر اسی شہر کو حاصل ہے کہ چمنستان ہند کی سیاسی روشوں پر جتنی کلیاں پھوٹی ہیں' وہ یہیں کھل کے پھول بنیں۔ اس کے کئی وجوہ تھے پورے ملک میں لاہور کے پائے کا اردو پریس اور کہیں نہیں تھا۔ دو انگریزی کے جریدے بھی تھے ایک انگریز کی سامراجیت کا نفس ناطقہ اور دوسرا ہندو کی تمناؤں کا مظہر۔ اردو صحافت میں آریہ سماجی ذہنیت کے سب سے بڑے علم بردار مہاشہ کرشن' مہاشہ خوش حال چند' خورسند اور نانک چند ناز جیسے صاحب قلم اسی شہر میں ہندو ذہن کو صیقل کر رہے تھے۔ مسلمان اخبار نویسوں کا ایک بے باک گروہ جس کے سرخیل مولانا ظفر علی خان اور سید حبیب تھے جو لاہور ہی کی فضا کو نعرہ رستا خیز سے معمور کئے ہوئے تھے۔ چنانچہ لاہور کا ہر سکول' ہر کالج اور ہر قومی ادارہ کسی نہ کسی سیاسی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ مسائل اب ایک نئے روپ میں سامنے آ رہے تھے۔ مسلمان اب تک سوچتا رہا تھا کہ کسی نہ کسی طرح انگریز سے چھٹکارا پانے کا ولولہ برحق' لیکن اس چھٹکارے کے بعد؟

ہندو ذہن چونکہ اپنے مستقبل کے بارے میں صاف تھا اسی لئے اسے کوئی

الجھن نہیں تھی اور مسلمانوں کی اس قدرتی الجھن کواس نے بڑی چابکدستی سے ملوکیت
پرستی پر محمول کر دیا تا کہ مسلمان اس اتہام سے بچنے کے لئے ان کی گود میں آ گرے اور
اپنے مسائل کو زبان پر لانے کی جرأت نہ کرے۔ اس کے خلاف اور مسلمانوں کے
مسائل کے حق میں جن صحافیوں نے قلم اٹھایا ان میں غلام رسول مہر اور عبدالمجید سالک
بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ ان دنوں نہرو رپورٹ کا بڑا چرچا تھا۔ مہرو سالک ''زمیندار''
سے قطع تعلق کر چکے تھے اور ایک نیا اخبار ''انقلاب'' کے نام سے جاری کر چکے تھے۔ یہ
اخبار بڑا شستہ جریدہ تھا۔ لیکن اس کے دونوں مدیر عملی طور پر سیاستدان نہیں تھے۔ چنانچہ
''زمیندار'' اور ''انقلاب'' میں نظری بحثیں بھی ہوتی رہتیں اور چپقلش بھی۔ مہر نے منطقی
دلائل میں اور سالک نے مزاح میں رنگ پیدا کیا جو بڑا مقبول ہوا۔ انقلاب وہ پہلا
روزنامہ تھا جس نے ہندوؤں کے مقابلے میں دلائل سے جنگ لڑنے کی ابتدا کی۔
چھوٹے موٹے سے بے شمار روزنامے نکل رہے تھے۔ مولانا ظفر علی خان چونکہ
نیوز کانگرس سے وابستہ تھے اس لئے ہر قسم کی پھبتی کا ہدف بنے' ''انقلاب'' اخبار کی
پشت پر نوجوان شعراء کا ایک گروہ تھا۔ حفیظ جالندھری' تاثیر بخاری' ہری چند اختر'
نکیش۔ مولانا ظفر علی خان جو کھلی لڑائی لڑ رہے تھے۔ سیاسی طور پر دونوں کے درمیان
وجہ نزاع نہرو رپورٹ کے رد و قبول کا سوال تھا' اس رپورٹ سے جو موتی لعل نہرو کی
قیادت میں مرتب ہوئی' مسلمانوں کے مفادات کو نقصان پہنچنے کا احتمال تھا۔ مولانا محمد علی
جو پانچ برس قبل کوکناڈا کانگریس کے صدر کی حیثیت سے ایک طویل خطبہ ارشاد فرما چکے
تھے اب اپنی تمام ذہنی اور جسمانی توانائیوں کے ساتھ کانگریس کے خلاف صف آراء ہو
چکے تھے۔ نہرو رپورٹ پر اختلافات پیدا ہونے کی وجہ سے مولانا محمد علی نے کانگریس کو
ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا۔ کانگریس پر ان دنوں تین ہستوں کا قبضہ تھا' موتی لعل نہرو'
جواہر لعل نہرو اور گاندھی۔ ہندو قوم بذات خود ایک مثلث کی صورت میں مربوط ہو چکی
تھی۔ ہندو مہا سبھا اس مثلث کا قاعدہ تھی' لبرل دو ضلعے تھے اور نقطہ ماسکہ کانگریس تھی۔
کانگریس کا خام مواد مہا سبھا تھی۔ چنانچہ مہا سبھائی ذہنیت کا اثر کانگریس کے رگ و پے
میں سرایت کر چکا تھا۔ مسلمانوں کے خدشات فی الواقعہ اس ذہنیت کے اظہار کے وقت
از خود ابھر آتے' مسلمانوں کو اندیشہ تھا کہ اگر کوئی کارگر تحفظ میسر نہ آیا تو اقتصادی

شکست کے بعد سیاسی اور سماجی شکست بھی ان کے لئے مقدر ہو جائے گی اور مسلمانوں
کا بہ حیثیت ایک قوم کے زندہ رہنا محال ہو جائے گا کانگریس کی منزل کے تعین نے
مسلمانوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ اگر علیحدہ قومیت کے حامل ہیں تو ان کا نصب
العین بھی جدا ہونا چاہئے۔ اس کے بعد کانگریس اور مسلم لیگ کی منزلیں یکساں نہ رہیں'
ہندوؤں کے ایک مخصوص فرقے آریہ سماج نے مسلم آزاری کے مقصد سے حضور علیہ
الصلوٰۃ والسلام کے خلاف چند دریدہ دہن ہندو مصنفین نے اس شدت سے گندگی اچھالنا
شروع کی کہ مسلمانوں کے تن بدن میں آگ بھڑک اٹھی۔ پوری مسلم قوم خیبر سے لے
کر راس کماری تک شعلہ بدامن ہو گئی۔ ان ہی دریدہ دہن ناشروں میں ایک رسوائے
زمانہ راجپال بھی تھا جس نے ایک کتاب نعوذ باللہ ''رنگیلا رسول'' شائع کی گو مصنف کا
نام مخفی رکھا گیا۔ عام خیال تھا کہ یہ کتاب ''پرتاب'' اخبار کے مہاشہ کرشن نے لکھی تھی۔
راج پال پر حملے ہوئے دو مرتبہ تو وہ بچ نکلا اور مسلمان حملہ آور لمبی سزائیں بھگتنے کے
لئے جیلوں میں ڈال دیئے گئے۔ ماہ اپریل کی ایک دوپہر کو جب لاہور کی گلیاں خاموش
تھیں لاہور کے سریاں اوجھڑیاں والے بازار کے ایک بڑھئی طالع مند کا بیٹا غازی علم
الدین شہید چوہٹہ مفتی باقر سے ہسپتال روڈ آیا۔ اس نے دریدہ دہن راجپال کو دکان
میں بیٹھے دیکھا۔ جب آگے بڑھا تو راجپال نوجوان کے ہاتھ میں خنجر دیکھ کر گھبرایا۔ اس
نے مدافعت کی لیکن اس کی مدافعت سے پہلے ہی غازی علم الدین کا خنجر راجپال کے جگر
کے پار اتر چکا تھا۔ اسے خون میں نہلا کر غازی علم الدین خاموشی سے آہستہ آہستہ چل
کر لکڑی کے گوداموں تک گیا' پھر یکایک خیال آیا کہ وار اوچھا نہ پڑا ہو اور راجپال
کہیں پھر نہ بچ نکلا ہو۔ وہیں سے لوٹا تو پولیس نے اسے پکڑ لیا۔ مقدمہ چلا اور سیشن جج
نے پھانسی کی سزا سنا دی۔ ہائی کورٹ میں اپیل ہوئی۔ غازی علم الدین کی وکالت کے
لئے بمبئی سے مسٹر محمد علی جناح تشریف لائے۔ احاطے میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ فین
روڈ پر ہجوم جمع ہو رہا تھا اور ہر لحظہ بڑھتا جا رہا تھا اس ہجوم میں آہنی جنگلے کے ساتھ مجھے
بھی قدم رکھنے کی جگہ مل گئی یکایک آواز آئی ''جناح صاحب آ رہے ہیں۔'' ہم نے
جنگلے کے سہارے ذرا اونچے ہو کر دور سے دیکھا کہ برآمدے میں جمع ہونے والے لوگ
راستہ دے رہے ہیں اور مسٹر جناح سیاہ گون میں ملبوس بڑے وقار کے ساتھ عدالت کے

کمرے کی جانب جا رہے ہیں۔ ان کے پیچھے علم الدین غازی کے والد طالع مند تھے اور ان کے ہاتھ میں ایک سیاہ رنگ کی صندوقچی تھی۔ بحث کے دوران جناح صاحب نے زیریں عدالت کے فیصلے اور گواہوں کے بیانات کے پرخچے اڑا دیئے۔ عدالت تک تو ہم نہ پہنچ سکے کہ وہاں صوبے بھر کے نامور وکلاء کا ہجوم تھا۔ اگلے روز اخبارات میں جو خبر چھپی اس میں عاشقان رسولؐ کے لئے تازگی ایمان کا بڑا سامان تھا' انگریز جج نے دلائل سننے کے بعد وہی فیصلہ دیا جس کی مسلمانوں کو توقع تھی۔ غازی علم الدین کی سزائے موت بحال رہی۔ اسے میانوالی جیل منتقل کر دیا گیا اور وہیں ایک صبح اس عاشق رسولؐ نے جام شہادت نوش کیا۔ اخبارات میں آخری لمحوں کی جو روداد چھپی اس کے مطابق غازی علم الدین نے موت کو مردانہ وار خوش آمدید کہا اور بلند آواز سے:

بنا کردند خوش رسمے بہ خاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

پڑھ کر کلمہ طیبہ پڑھا اور جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ مسلمانوں کے لئے یہ ایک بڑے اندوہ والم کی بات تھی کہ ان کا ایک ہیرو اور شہیدیوں پنجاب کے ایک دور دراز علاقے میں دفن کر دیا جائے' چنانچہ غم و غصے کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا اور باقاعدہ تحریک کی شکل اختیار کر گیا۔ علامہ اقبالؒ، سر شفیع اور مولانا ظفر علی خان اس تحریک کے روح رواں تھے۔ اقبال اور شفیع گورنر سے ملے اور اسے یقین دلایا کہ مطالبہ حصول میت تک محدود ہے۔ گورنر نے اس یقین دہانی کے بعد میت مسلمانوں کے سپرد کر دینے کا فیصلہ دیدیا۔ دسمبر کی ایک یخ بستہ صبح کو غازی علم الدین شہیدؒ کی میت گاڑی میں لاہور لائی گئی چھاؤنی کے سٹیشن پر پل کے نزدیک گاڑی رکی اور گورا فوج کا ایک دستہ تابوت لے کر گورنر ہاؤس تک آیا۔ جہاں اسے مسلمان زعماء کے سپرد کر دیا گیا۔

ایسا جنازہ غازی علم الدین شہید کو میسر آیا کہ تاریخ میں خال خال شخصیتوں کو میسر آیا ہو گا' لاہور کی نواحی بستیاں تو درکنار دور دور کے مقامات سے لوگ اتنی تعداد میں آئے کہ شہر کے لئے ان کا سنبھالنا دشوار ہو گیا۔ نماز جنازہ کے لئے وہ میدان منتخب ہوا جسے چاند ماری کہتے تھے اور جہاں آج کل چوبرجی کوارٹرز ہیں یہ علاقہ دریا کی ترائی تک بڑا سرسبز تھا۔ جنازہ کے بعد تابوت اٹھایا گیا تو چارپائی سے لمبے لمبے بانس باندھ

دیئے گئے تاکہ لوگ کندھا دینے کی سعادت سے محروم نہ رہیں۔ جنازے کے آگے پھولوں سے لدی ایک بیل گاڑی جا رہی تھی۔ جو ہجوم میں پھول تقسیم کرتی جا رہی تھی' کلمہ طیبہ کے ورد اور پھولوں کی بارش میں جنازہ میانی صاحب پہنچا قبر کے قریب اژدحام بے پناہ تھا میں نے بدقت تمام جھانک کر دیکھا تو لحد میں پھولوں کی سیج بچھی ہوئی تھی شہید کا جسد خاکی لحد میں اتار دیا گیا......

ہندو مہاسبھا خالص ہندوؤں کی جماعت تھی اس لئے ہر اس تعصب میں غرق تھی جو ہندو ذہنیت کا جزو ہے...... جب تک زمیندار اخبار کا دفتر جہازی بلڈنگ دہلی دروازے میں رہا مولانا ظفر علی خان کا ایک پاؤں دفتر میں ہوتا اور دوسرا جلسہ گاہ میں۔ جن لوگوں نے لاہور کا وہ دور دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ جو قوم درویشوں سے عافیت کوش اور مصلحت اندیش ہو چکی تھی اس کی اگلی نسل کی تربیت کہاں ہو رہی تھی۔ ان شکستہ دیواروں سے عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی للکاریں ٹکرا چکی ہیں۔ موچی دروازے نے اقبال کا جواب شکوہ سنا ہے۔ دہلی دروازے نے مولانا ظفر علی خان کے ملی نغمے اور نعتیں سنی ہیں۔"

مولوی محمد سعید صاحب کی آپ بیتی میں سے جگ بیتی کے ٹکڑے نکال نکال کر یہاں درج کر رہا ہوں۔ اس عمل میں بھی مجبوراً اختصار سے کام لینا پڑ رہا ہے۔ میری یہ کوشش ضرور ہے کہ برصغیر کے اہم سیاسی اور تاریخی واقعات کا تسلسل قائم رہے مولوی صاحب فرماتے ہیں۔

"9 جولائی 1935ء کا دن شہید گنج کے پرستاروں کے لئے قیامت کا دن تھا۔ لاہور دہلی دروازے کے باہر محلہ دارالشکوہ پر مسلمانوں کی یورش ہو رہی تھی۔ ناکہ خاردار تاروں سے بند تھا۔ کوتوالی کی برجیوں پر گورا فوج ہتھیار نصب کئے بیٹھی تھی۔ جوانان لاہور سینے کھولے موجوں کی صورت میں آگے بڑھتے جاتے تھے اور شہادت کا رتبہ حاصل کرتے جاتے تھے۔ یہ خبر مجھے احرار کے جلسے میں ملی...... شہید گنج کا مسئلہ طول کھینچ گیا۔ واقعات کی رواروی میں مسلمانوں کی یک جہتی ویران ہو گئی...... حالات نے پشاور سے پنجاب واپس بلا لیا اور ہم سیالکوٹ میں اس درسگاہ سے وابستہ ہو گئے جہاں اپنی عمر کے آخری لمحوں تک حضرت علامہ اقبالؒ کے استاد محترم میر حسن درس دیتے

رہے۔ یہ مرے کالج تھا...... سیالکوٹ کی سرزمین جن دو ہستیوں کی وجہ سے زندہ جاوید ہوگئی ہے ان کا ذکر ایک مرتبہ مولانا ابراہیم میر نے اپنی ایک جمعہ کی تقریر میں کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا۔ ''سیالکوٹ دو ہستیوں پر قیامت تک نازاں رہے گا۔ ایک ملا عبدالحکیم ہیں اور دوسرے ڈاکٹر علامہ اقبال۔''

ملا عبدالحکیم شاہ جہاں کے دور کے ایک بلند پایہ فقیہ' منطقی اور فلسفی تھے۔ ان کے تبحر علمی کا اعتراف بلاد اسلامیہ کے علماء پچھلی تین صدیوں سے کرتے آ رہے ہیں۔ لیکن اقبال کی جنم بھومی بن کر اس شہر نے جو عزت و تکریم پائی ہے وہ فقید المثال ہے۔ جب کبھی احباب سے ملنے کشمیری محلے گیا ہمیشہ وہی راستہ انتخاب کیا جس پر حضرت علامہ کا مکان واقع ہے۔ اس لئے کہ ہر بار یہی احساس ہوا کہ اگرچہ علامہ زندہ نہیں اور یہ گلیاں وہی خفتگان خاک کی امانت نہیں بنیں' تاہم تاریخ نے انہیں اپنے سرمائے خانے میں محفوظ کر لیا ہے اور ان کی عظمت شیراز و قونیہ کی طرح ابدی ہو چکی ہے...... سیالکوٹ میں چند ماہ گزار کر ہم علی گڑھ روانہ ہو گئے۔ لاہور' دہلی' سمرقند' بخارا' اصفہان اور استنبول کی طرح مسلمانوں کی تاریخ میں علی گڑھ کو بھی ایک لازوال مقام حاصل ہے۔ وہ شہر اسلام کے عروج کے مظہر تھے' یہ اس کی نشاۃ ثانیہ کی دلیل بنا۔

علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہو کر لاہور واپس آ گئے کہ میدان صحافت میں قسمت آزمائی کی جائے۔ کچھ دنوں کے بعد ریلوے روڈ سے گزر رہا تھا۔ ایک جگہ ''شہباز'' کا بورڈ آویزاں دیکھا۔ سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔ مرتضیٰ احمد خان میکش کا کمرہ سامنے تھا۔ اجازت لے کر اندر چلا گیا۔ انہوں نے آنے کی وجہ پوچھی۔ میں نے کہا زندگی کے کئی میدانوں میں قسمت آزمانے کی کوشش کی ہے۔ ناکام رہا ہوں۔ صحافت کا خیال بار بار دل میں ابھرتا رہا ہے۔ موقع دیجئے کہ یہ بھی آزما دیکھوں۔ ناکامی کی صورت میں آپ کا ممنون ہوں گا کہ ایک بھرم اور کھل گیا۔ میکش صاحب نے دو چار لمحے توقف کیا اور کہا۔ ''کل سے کام پر آ جایئے۔ تنخواہ 35 روپے ماہوار ہوگی۔'' اگلے روز شہباز کے دفتر میں آ کر کام شروع کر دیا۔ ایک خبر ترجمہ کو دی گئی میں نے کر دی۔ پھر دوسری اور تیسری خبر بھی انگریزی میں سے اردو میں ترجمہ کر دی۔ دوسرے دن میری ترجمہ کی ہوئی خبریں اخبار میں چھپیں تو انہیں دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ یوں

ہماری صحافتی زندگی ایک خاص نہج پر چل پڑی۔

خالص سیاسی اخبار نویسی کی ابتدا کسی حد تک مہر و سالک کے انقلاب نے کی اور حمید نظامی کے ''نوائے وقت'' نے اس کے خدوخال میں اور نکھار پیدا کیا۔ انگریزی صحافت میں مسلمان قریب قریب ناپید ہو گیا۔ مولانا محمد علی کا کامریڈ 1911ء میں شہاب ثاقب بن کر ابھرا لیکن جلد ہی غروب ہو گیا۔ لاہور میں ''مسلم آؤٹ لک'' کچھ عرصہ آہن OBESON کی زیر ارادت نکلتا رہا۔ پھر مجید ملک اس کے ایڈیٹر ہو گئے۔ ''ٹائمز'' جو مولانا عبداللہ یوسف علی کی ادارت میں نکلا ان کے صرف ایک ہی دستخطی مقالے کے بعد دوسرے ہاتھوں میں منتقل ہو گیا۔ بہر حال انگریز کے سول اینڈ ملٹری گزٹ اور ہندو کے ''ٹریبون'' کے سامنے ان کی حیثیت ایک ٹمٹماتے ہوئے دیئے کی سی تھی۔ چنانچہ مسلمانوں کا نقطہ نظر عام فہم سیاسی اخبار نہ ہونے کی وجہ سے عوام کے سامنے پیش نہ ہو سکا اور مسلمان بڑے عرصے تک اغیار کے دست نگر رہے۔ لاہور میں ''نوائے وقت'' اور دلی میں ''ڈان'' کے اجراء کے ساتھ ہی ملت اسلامیہ کی جس تحریک آزادی کو مہمیز کی ضرورت تھی وہ ان دونوں اخباروں کے اجراء سے مل گئی......

اس عرصہ میں ہندو اخبارات بڑی سرگرمی سے پاکستان کی مخالفت کرتے رہے۔ قائداعظم چونکہ ایک مسلمہ لیڈر بن کر مسلمانوں کی زمام سیاست اپنے ہاتھوں میں لے چکے تھے' اس لئے ہندو قیادت کے لئے پاکستان کی مخالفت آسان نہیں رہی تھی۔

میں دلی میں جنرل ہیڈ کوارٹر کے شب و روز سے اکتا گیا تھا' اسی پریشانی میں تھا کہ ایک روز ''ڈان'' کے نائب مدیر عزیز بیگ سے ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے کہا دوبارہ صحافت میں کیوں نہیں آ جاتے؟ الطاف حسین صاحب کلکتے سے تازہ وارد ہوئے تھے۔ میں ان سے ملنے چلا آیا۔ اپنے کمرے میں کمبل اوڑھے بیٹھے تھے۔ کہنے لگے۔ ''کیسے آنا ہوا؟'' میں نے کہا۔ ''ڈان میں کام کرنا چاہتا ہوں۔'' چنانچہ اگلے دن میں نے ''ڈان'' میں کام کرنا شروع کر دیا...... شملہ کانفرنس سے قبل دو بڑی اہم سیاسی سرگرمیاں پورے ملک کے لئے جاذب توجہ رہیں۔ ایک بمبئی میں قائداعظم اور گاندھی کی ملاقاتیں اور دوسرے ان مذاکرات کے ناکام ہونے پر سر تیج بہادر سپرو کی صلح کی کوشش۔ گاندھی نے مذاکرات کے دوران سیاست بڑی چابک دستی سے چلائی اور

قائداعظم کی چٹانی شخصیت کوگداز کرنے کی کوشش کی۔ انہیں بکری کا دودھ اور کھجوریں بھیجیں۔ گجراتی میں خط لکھا اور پیارے قائداعظم کہہ کر خطاب کیا۔ لیکن قائداعظم ان سحر طرازیوں سے بالکل نہ پسیجے۔ بلکہ اسی گفت وشنید میں دونوں قوموں کی اپنی اپنی ہیئت نکھر کے سامنے آ گئی۔ قائداعظم نے ایک خط میں یہ لکھ کر مسلمان قوم کی پوری شخصیت نمایاں طور پر متعین کر دی کہ:

''مسلمان اور ہندو دو بڑی قومیں ہیں۔ جوہر اعتبار سے ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ ہمارا اپنا جدا تہذیبی اور ثقافتی ورثہ ہے۔ ہم زبان' ادب' فن' تعمیرات' نام اور ناموں کی ہیئت' اعلیٰ اقدار' عدالتی قوانین' اخلاقی ضابطہ حیات میں الگ ہیں۔ ہماری رسوم' ہمارا مہ وسال کا شمار' ہماری روایات اور تاریخ' استعداد اور امنگیں سب جدا ہیں۔ زندگی کیا ہے اور اسے کیسے پروان چڑھایا جائے اس کے بارے میں ہمارا علیحدہ نقطہ نظر ہے۔''

1946ء کے آتے آتے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تینوں فریقوں کو احساس ہو چلا تھا کہ اب ان کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ انگریز' ہندو اور مسلمان تینوں سرگرمی سے مصروف عمل تھے۔ ہر ایک کو وقت کی نزاکت کا شدت سے احساس تھا۔ اس وقت قائداعظم کی ولولہ انگیز قیادت میں مسلمان ایک پلیٹ فارم پر متحد ہو چکے تھے۔ 1946ء کی مسلم لیگ کنونشن سات اپریل کو دلی کے اینگلو عربیک کالج کے احاطہ میں منعقد ہوئی۔ جلسہ چھ بجے شروع ہوا' قائداعظم صدر چنے گئے۔ ہلکے بادامی رنگ کی اچکن اور سفید شلوار میں ملبوس جب قائداعظم تقریر کرنے کے لئے اٹھے تو پورا پنڈال تالیوں سے گونج اٹھا۔ آپ نے کہا پاکستان کے مسئلے پر کسی سمجھوتے کی قطعی گنجائش نہیں۔ پاکستان کامل طور پر ایک آزاد اور خودمختار مملکت ہوگی۔ ہم چونکہ حق پر ہیں اس لئے اللہ کی نصرت ہمارے ساتھ ہے۔ ہم اس کے لئے لڑیں گے۔ جان دینا پڑی تو جان بھی دینگے' لیکن پاکستان لے کے رہیں گے پنڈال میں دو کتبے بڑے اہم آویزاں تھے۔ ایک پر قائداعظم کے خط کا وہ مشہور اقتباس تھا جس میں انہوں نے بتایا تھا کہ مسلمان کیوں علیحدہ قوم ہیں اور دوسرے پر یہ رقم تھا کہ' آزادی کی منزل پاکستان کی راہ سے حاصل ہوگی۔ اس کنونشن میں دو باتیں بڑی اہم طے ہوئیں۔ ایک بالتصریح

اور دوسری نیتجتاً' ایک قرارداد لاہور کی تکمیل تھی اور دوسری ایک عہد نامہ تھا۔ برطانیہ کی طرف سے جو سعی اس مسئلے کے حل کی' کی جا رہی تھی۔ اس کا ثبوت اسی ماہ کیبنٹ مشن کی آمد تھی۔ اس مشن میں سر اسٹیفورڈ کرپس جیسا روباہ مزاج اور ہندو پرور انگریز آیا جو قانون دان اور ڈپلومیٹ تھا...... پنجاب سے ان ہی دنوں خبر آئی کہ خضر کے بعد گورنر مکنسی بھی مستعفی ہو گئے ہیں۔ اس پر ''نوائے وقت'' نے صرف ایک سطر کا اداریہ لکھا۔ ''خس کم جہاں پاک۔''

قائداعظم نے بھانپ لیا تھا کہ جب تک مسلمانوں کی سرگرمیاں گفت وشنید تک محدود رہیں گی الفاظ کا اچ پچ جاری رہے گا۔ چنانچہ انہوں نے ''راست اقدام'' کا آوازہ بلند کیا اور قوم سے کہا کہ سولہ اگست کو ملک بھر میں احتجاجات کئے جائیں۔ مسلمانوں نے انگریز کے دیئے ہوئے خطابات واپس کر دیئے...... ہندو اس عرصے میں یہ سب کچھ بڑی تشویش سے دیکھ رہا تھا اور بڑی سرگرمی سے تیار ہو رہا تھا۔ کلکتے میں ان کی تیاری بے پناہ تھی۔ چنانچہ سولہ اگست کو ہی کلکتے میں مسلمانوں کا کشت وخون شروع ہو گیا۔ حسین شہید سہروردی صوبے کے وزیراعلیٰ تھے۔ ان میں بلا کا حوصلہ تھا' انہوں نے کھلی موٹر میں فساد زدہ علاقوں کا دورہ کیا...... کلکتے کے فسادات نے ہندو کو اور بھی خون آشام بنا دیا۔ کلکتے کے ساتھ ہی بہار' نواکھلی اور گڑھ مکتیسر میں فسادات کی آگ بھڑک اٹھی...... بہار کے فسادات میں جے پرکاش نرائن جیسے بڑے بڑے وسیع مشربوں کا بھانڈا بھی پھوٹ گیا اور وہ بھی خنجر بدست جتھوں کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے دکھائی دیئے۔ ان فسادات سے ایک بات واضح ہو گئی کہ مسلمانوں کی رضامندی کے بغیر ہندوستان کے قضیئے کا حل ناممکن ہے...... نہرو نے صوبہ سرحد کا دورہ کیا۔ ڈان کی طرف سے میاں محمد شفیع صورت حال دیکھنے کے لئے وہاں پہنچے۔ نہرو مایوس لوٹے۔ صوبہ سرحد بھی اب ان کے ہاتھ میں نہیں تھا...... آخر پاکستان بن کر رہا۔ دو جون کو ڈان کے دفتر میں احباب جمع تھے کہ خبر آئی کل آل انڈیا ریڈیو سے قائداعظم خطاب کرینگے۔ ہر شخص مسرور تھا۔ قوم کی کشتی کو قائداعظم طوفان سے نکال کر کنارے لے آئے تھے اور یہ کنارا مسلمانوں کی منزل پاکستان تھا...... میں جب موجودہ نسل کے اندر اپنے وطن سے بے نیازی کہیں کہیں دیکھتا ہوں تو اکثر سوچتا ہوں کہ کاش یہ نسل قائداعظم کی ان مساعی سے واقف

ہوتی اور پھر ان سے یہ بھی سنتا رہتا کہ "ہماری طرز فکر' ہمارا طرز حیات ہمیں علیحدہ قوم بناتے ہیں اور ہم کسی صورت بھی کسی غیر قوم کے جور و ستم کے تحت زندگیاں گزارنے پر رضامند نہیں ہوں گے۔" ہندوستان تقسیم ہو چکا تھا اور پاکستان جانے والے سرکاری ملازمین کی سپیشل ٹرینیں نئی دہلی کے ریلوے سٹیشن سے یکے بعد دیگرے روانہ ہو رہی تھیں...... اخبار "ڈان" کا سٹاف بھی دو حصوں میں بٹا' جنہیں کراچی پہنچ کر نئے اخبار کا ڈول ڈالنا تھا وہ تیار ہونے لگے...... ان ہی دنوں میاں افتخار الدین لاہور سے آئے۔ انہیں پاکستان ٹائمز کے لئے سٹاف چاہیے تھا۔ الطاف صاحب شام کو دفتر آئے تو مجھے کہا میاں صاحب امپریل ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں ان سے مل لینا۔ تمہارے لاہور جانے کا انتظام ہو گیا ہے...... چنانچہ ایک روز میں بھی لاہور جانے کے لئے فرنٹیئر میل میں سوار ہو گیا۔ گاڑی جمنا کا پل عبور کر رہی تھی کہ مجھے نیند کے جھونکے آنے شروع ہو گئے۔ میری نیند لدھیانے پہنچ کر کھلی۔ ہمارے ساتھ ایک مسلمان آن ملے۔ گاڑی بیاس کے پل پر پہنچی تو انہوں نے کھڑکیاں بند کر دینے کا مشورہ دیا۔ اس لئے کہ ایک روز قبل مسلمانوں کی ایک گاڑی اس مقام پر لٹ چکی تھی۔ چار پانچ میل طے کرنے کے بعد ہم نے کھڑکیاں کھول لیں۔ دیکھا تو پورا علاقہ سنسان تھا۔ سورج کافی بلند ہو چکا تھا۔ جب ہم امرتسر پہنچے ریلوے سٹیشن پر چند ہندو مسافر اترے۔ ہو کا عالم تھا۔ نہ کوئی قلی نہ خوانچہ والا' صرف چند سکھ کرپانیں لہرا رہے تھے۔ گاڑی نے رسمی وسل دیا اور چل دی۔ پھر مرہٹہ آیا گزر گیا' اٹاری واہگہ ہربنس پورہ آیا اور لاہور کے مضافات شروع ہو گئے۔ دور سے سبز ہلالی پرچم فضا میں لہراتے دکھائی دیئے۔ ٹرین پاکستان زندہ باد' قائداعظم زندہ باد کے فلک شگاف نعروں سے گونج اٹھی۔ لاہور پہنچے' لاہور ان دنوں ایک درویش کی گدڑی ہفت رنگ' دو عالم پناہ تھا۔ مہاجرین کے لئے لاہور نے دل فرش راہ کر دیا تھا۔ جگہ جگہ امدادی کیمپ قائم تھے۔ پناہ گزینوں کی انفرادی اور اجتماعی خبر گیری ہو رہی تھی۔ اس افراتفری میں بھی ایک سکون اور خود اعتمادی تھی۔ لاہور نے بارہا ان کے قدم چومے جو اسلام کا پرچم لہراتے ہوئے آئے' خواہ وہ فاتح عالم ہوں یا لٹے ہوئے قافلے۔ پانی پت کے لئے توپ اگر لاہور میں ڈھلی تو پاکستان کے لئے پرچم بھی یہیں لہرایا...... میں پاکستان ٹائمز سے وابستہ ہو چکا تھا۔ پنجاب یونیورسٹی میں ان دنوں جرمن اور فرانسیسی

پڑھانے کی کلاسیں شام کو شروع ہوتی تھیں۔ میں نے جرمن کلاس میں داخلہ لے لیا۔ ڈاکٹر بی اے قریشی' جو اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل رہ چکے تھے ہمارے استاد تھے۔ ایک عرصہ جرمن رہ چکے تھے۔ ایک مرتبہ کئی روز کلاس میں نہ آئے۔ واپسی پر ہم نے سبب پوچھا۔ کہنے لگے دلی گیا ہوا تھا۔ دلی لوگ آتے جاتے رہتے تھے۔ صرف یہ دیکھ لیتے تھے کہ امن و امان کی صورت کیا ہے۔ ہم نے پوچھا دلی میں قیام کہاں رہا؟ کہنے لگے مولانا ابوالکلام آزاد کے ہاں۔ یہ سن کر اشتیاق بڑھا۔ میں نے پوچھا۔ مولانا کا خیال پاکستان کے بارے میں کیا ہے؟ کہنے لگے "میرے روبرو ایک صاحب لاہور سے وارد ہوئے تھے۔ مولانا نے ان سے پوچھا کہیے ان دنوں لاہور کیسا ہے؟ تو وہ صاحب بولے۔ بس ایک عجیب افراتفری کا سا عالم ہے۔ ان کے اتنا کہنے پر مولانا کا مزاج برہم ہو گیا اور جوش میں آ کر بولے۔ "پاکستان کو اب ہر حالت میں قائم و دائم رہنا ہے۔ ایشیا کے مسلمانوں کا نام اب پاکستان سے وابستہ ہے۔ مسلمانان عالم کی فلاح اسی میں ہے کہ پاکستان مستحکم ہو اور پھلے پھولے"

بعد میں میرا قیام گنگا رام بلڈنگ میں تھا۔ ایک شام لورینگ ریستوران کے قریب الطاف صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ کہنے لگے۔ "ڈان" کراچی تمہاری راہ دیکھ رہا ہے۔ ہمارے پاس کیوں نہیں آ جاتے...... کراچی ڈان میں پہنچ کر کچھ احباب تو دلی ڈان کے ملے' کچھ نئے چہرے تھے۔ صحافت بھی ایک نئے دور میں داخل ہو رہی تھی۔ اپنی صحافتی زندگی کے اس زمانے میں ایک وفد کے ساتھ حافظ و سعدی شیرازی کی سرزمین جانے کا حسن اتفاق ہوا۔ صبح کے نورانی دھندلکے میں ہم ایک فوجی ڈکوٹا میں مشہد کے لئے روانہ ہوئے۔ دوران سفر جہاز میں ایک جگہ اعلان ہوا کہ ہم نیشاپور کے اوپر سے گزر رہے ہیں۔ میں نے کھڑکی میں سے دیکھا تو نگاہیں دور درختوں میں ایک جھنڈ پر پڑیں۔ یہی نیشاپور تھا۔ ناممکن تھا کہ خیام یاد نہ آتا...... لیکن نیشاپور کے ساتھ ایک اور بھی یاد وابستہ ہے۔ کہتے ہیں کہ چوتھی صدی ہجری میں جب سامانی خاندان کے نصرالدین نے خراسان زیر کیا تو فتح مندی کا جشن نیشاپور میں رچایا' ایک رشک فلک خیمے کے نیچے تخت زرنگار بچھایا گیا جس پر جواں سال بادشاہ نصرالدین آ کے بیٹھا۔ سر پر مرصع تاج' پہلو میں شمشیر خاراشگاف۔

تخت پر بیٹھتے ہی حکم دیا کہ جشن کی ابتدا تلاوت قرآن کریم سے کی جائے۔ ہجوم میں سے ایک مرد درویش آگے بڑھے اور انہوں نے سورہ مومن کی وہ مشہور آیت تلاوت کی جس میں حشر کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ کس طرح اس روز رب ذوالجلال پکاریں گے۔

ترجمہ: ''آج کس کا دبدبہ و اختیار ہے؟ اس بے مثال و بے ہمتا خدائے قہار کا۔'' اتنا سننا تھا کہ نصرالدین تخت سے نیچے اترا سر سے تاج اتار کر زمین پر رکھ دیا اور سربسجود ہو کر پکار اٹھا۔

''مولیٰ! بادشاہی تیری ہے' میری نہیں۔''

ذہن میں اس تاریخی واقعہ نے ایک تجسس پیدا کر دیا کہ یہیں کہیں وہ گز بھر زمین ہوگی جہاں کھڑے ہو کے اس مرد درویش نے ایک فاتح عالم کو بتلا دیا کہ تیری اوقات کچھ نہیں ہے۔ جی چاہا کہ وہ سلطان' وہ درویش کہیں سے پھر لوٹ آئیں لیکن پھر خیام ہی نے آہستہ سے کان میں کہا۔

از جملہ رفتگان ایں راہ دراز
باز آمدہ کیست تابما گوید راز

☆......☆......☆

عبدالشکور بیدل و دیگر

آج کی نئی نسل نے شاید ہی لاہور کا پرانا ریڈیو اسٹیشن دیکھا ہو۔ وہ صرف ایمپریس روڈ والے نئے ریڈیو اسٹیشن کی عمارت سے ہی واقف ہے۔ پرانا ریڈیو اسٹیشن شملہ پہاڑی سے جو سڑک گورنر ہاؤس کے ذیلی دروازے کو جاتی ہے وہاں پر ہوا کرتا تھا۔ یہ ایک پرانی کوٹھی میں بنایا گیا تھا اور قیام پاکستان سے پہلے بھی اسی جگہ سے پروگرام نشر ہوا کرتے تھے۔

قیام پاکستان سے پہلے میں دو تین بار یہاں آیا تھا۔ یہاں میں نے میوزک کمپوزر جیون لال مٹو کو دیکھا۔ اختری بائی فیض آبادی کو دیکھا۔ بس قیام پاکستان سے پہلے کے ریڈیو اسٹیشن کے صرف یہی دو چہرے مجھے یاد ہیں۔ جیون لال مٹو کشمیری نژاد گورے چٹے دوہرے بدن کے تھے۔ ان کی بیگم مادھوری لال مٹو بھی کلاسیکل گاتی ہیں اور بڑی سریلی آواز ہے ان کی۔ اس کے بعد میری یادوں کی سکرین پر دھند آ جاتی ہے اور یہ دھند قیام پاکستان کے بعد کے ریڈیو اسٹیشن کے ساتھ پوری طرح سے چھٹ جاتی ہے۔ قیام پاکستان کے ساتھ ہی لاہور ریڈیو اسٹیشن پر میرا اس لیے بھی آنا جانا زیادہ ہو گیا تھا کہ میں نے کہانیاں' ناول لکھنے شروع کر دیئے تھے اور ریڈیو کیلئے فیچر بھی لکھنے لگا تھا۔ کبھی گیتوں بھری کہانی لکھتا' کبھی کوئی تقریر لکھ دیتا' کبھی ڈرامہ وغیرہ۔ میرے کچھ دوست بھی ریڈیو اسٹیشن پر تھے۔ جن میں شاد امرتسری' اکرم بٹ' رضی ترمذی' سلیم شاہد' اخلاق احمد دہلوی کے نام نمایاں ہیں۔

ریڈیو پاکستان لاہور کی پرانی عمارت کا زمانہ بڑا بارونق اور تخلیقی زمانہ تھا۔ اردو ادب کے بڑے معتبر اور نامور ادیب اور شاعر ریڈیو کیلئے لکھتے تھے۔ مثلاً سید امتیاز

علی تاج، سید عابد علی عابد، رفیع پیر، حفیظ جالندھری، حفیظ ہوشیار پوری، تاجور نجیب آبادی اور کئی دوسرے مشہور لوگ۔ فنکاروں میں ایک سے ایک بڑھ کر تھا۔ موہنی حمید عرف آپا شمیم کی آواز پہلی بار اسی پرانے ریڈیو اسٹیشن سے سنائی دی تھی۔ آفتاب احمد، محمد حسین، عقیل احمد، میراجی کے چھوٹے بھائی کامی، سلیم طاہر، ایس ایم سلیم، یاسمین طاہر، سلطان کھوسٹ، مرزا سلطان بیگ اور عبداللطیف مسافر اس ریڈیو اسٹیشن کی پہچان تھے۔

اناؤنسروں میں مصطفی علی ہمدانی، اخلاق احمد دہلوی اور عزیز الرحمان کی آوازیں آج بھی لوگوں کو یاد ہیں۔ عزیز الرحمان کی آواز اور لہجہ تو ریڈیو پاکستان کا سرمایہ تھا۔ اس زمانے میں یہ سب لوگ زندگی کی حرارت اور صلاحیتوں سے بھرپور تھے۔ اس ریڈیو اسٹیشن کے دو گیٹ تھے۔ ایک گیٹ کا آہنی دروازہ ہمیشہ بند رہتا تھا، جس کے باہر بشیر نامی ایک نوجوان نے پان کی چھابڑی لگائی ہوئی ہوتی تھی۔ بشیر ریڈیو اسٹیشن کے ایک ایک شخص کے نام سے واقف تھا۔ دوسرے گیٹ میں سے لوگ آتے جاتے تھے۔ اس گیٹ کا دربان شیر محمد تھا۔ آرٹسٹ اور فنکار تانگوں پر ہی آتے تھے۔ گاڑی جہاں تک مجھے یاد ہے صرف اسٹیشن ڈائریکٹر کی ہی ہوا کرتی تھی۔ جو پورچ میں آ کر خاموشی سے کھڑی ہو جاتی۔ سامنے والی سڑک سارا دن سنسان سی رہتی۔ ایک تو ابھی لاہور میں ٹریفک کا شور اور افراتفری نہیں مچی تھی۔ دوسرے یہ چھوٹی سی سڑک آگے جا کر گورنر ہاؤس کے گیٹ پر ختم ہو جاتی تھی۔

گانے والوں اور گانے والیوں میں پاکستان کے نامور ترین فنکار شامل تھے۔

استاد برکت علی خان، خان صاحب مبارک علی خان، بڑے غلام علی خان، چھوٹے غلام علی خان، سلامت علی نزاکت علی خاں، طبلہ نواز فلو سے خاں، سارنگی نواز استاد نبی بخش خاں، شریف غزنوی، روشن آراء بیگم، وحیدہ خانم، فریدہ خانم، ثریا ملتانیکر، امید علی خاں، دلی والے سردار خان، بھائی لعل، شہباز اور نہ جانے کتنے ہی مایہ ناز گلوکار اور گلوکارائیں تھیں جو پروگرام کرتیں۔ قوالوں میں جالندھر والے مبارک علی خان، فتح علی خان کا ڈنکا بج رہا تھا۔ استاد سنتو خان کے بھی عروج کا زمانہ تھا۔ آغا بشیر احمد قوال اور رشید احمد فریدی قوال کا بھی کوئی جوڑ نہیں تھا۔ یہ لوگ اپنے اپنے انداز کے بہترین قوال تھے۔

میوزک کمپوزروں میں نیاز حسین شامی، طفیل فاروقی اور صادق علی مانڈو کے

نام نمایاں تھے۔ سلطان کھوسٹ نے اس زمانے میں ہمارے پنجابی ادب کو پرانے ریڈیو اسٹیشن کی وساطت سے پنجابی کے ہمیشہ زندہ رہنے والے گیت دیئے۔ جن میں یہ گیت آج بھی سب کو یاد ہوگا۔

چرخہ گل کردا

یہ بڑا تخلیقی دور تھا۔ پرانے ریڈیو اسٹیشن سے زندہ پروگرام ہوتے تھے۔ ابھی ریکارڈنگ کا زمانہ شروع نہیں ہوا تھا۔ ڈرامے میں صوتی اثرات دینے والوں میں قدیر ملک اور الطاف الرحمان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ یہ دونوں اپنے اپنے فن کے درجہ کمال تک پہنچے ہوئے تھے۔ سازندوں میں مجھے صادق علی مانڈو کلارنٹ نواز، نبی بخش سارنگی نواز، کالے خان ستار نواز، بابو خاں بانسری نواز اور شوکت حسین طبلہ نواز کے نام اور شکلیں یاد رہ گئی ہیں۔ ریڈیو کی کینٹین کوٹھی کے گیراج میں بنا دی گئی تھی۔ گیراج کے اندر باہر کرسیاں لگی تھیں۔ بنچ بھی لگے ہوتے تھے۔ جہاں بیٹھ کر آرٹسٹ اور ادیب شاعر لوگ چائے پیتے، باتیں کرتے، جگت بازی بھی ہوتی اور قہقہے بھی گونجتے تھے۔ یہ میرا بھی شروع شروع کا زمانہ تھا۔ میں نے لکھنا شروع ہی کیا تھا مگر اپنے رومانوی اسلوب کی وجہ سے پہلے ہی افسانے سے مقبول ہو گیا تھا۔ لوگ مجھ سے بڑا پیار کرنے لگے تھے۔

آج کا مقبول گلوکار غلام علی ابھی استاد برکت علی خاں کی بیٹھک پر اپنے استاد کی خدمت کر رہا تھا اور مشہور گلوکار مہدی حسن کے نام سے بھی ابھی کوئی واقف نہیں تھا۔ فیض فرید سرود نواز بھی ہوا کرتے تھے۔ بڑے کم گو، شریف اور مرنجاں مرنج تھے۔

پرانے ریڈیو اسٹیشن کی ایک روایت تھی کہ موسم بہار میں اس کے لان میں میوزک کانفرنس منعقد ہوتی۔ یہ دو دن جاری رہتی اور اس کی بڑی دھوم مچتی تھی۔ ٹکٹ لگانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اعزازی پاس جاری ہوتے تھے جس کے حصول کیلئے لوگ بڑی بڑی سفارشیں ڈالتے تھے۔ اس میوزک کانفرنس میں ملک کے بڑے نامور گلوکار اور گلوکارائیں شرکت کرتیں۔ ایک رات ہلکی پھلکی موسیقی کے پروگرام پیش کیے جاتے اور دوسری رات کلاسیکی موسیقی کی محفل جمتی۔ ریڈیو اسٹیشن کے لان میں سٹیج لگتی۔ روشنیاں لگائی جاتیں، صوفے اور کرسیاں بچھا دی جاتیں۔ لان چھوٹا تھا چنانچہ جب محفل موسیقی شروع ہوتی تو لوگ سڑک پر کھڑے ہوتے۔ درختوں پر بھی چڑھے

ہوتے اور دیواروں پر بھی بیٹھے ہوتے۔ میں بھی اپنے دوستوں کے ساتھ اس محفل موسیقی میں بڑے شوق سے شرکت کرتا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ لوگوں کا ہجوم اتنا زیادہ بڑھ گیا کہ نقص امن کا خطرہ لاحق ہوگیا۔ چنانچہ پولیس نے ہلکا سا لاٹھی چارج بھی کیا اور شائقین کو دھکیل کر سڑک کے سرے پر کر دیا۔ کسی کو پاس دکھائے بغیر جانے کی اجازت نہ تھی۔ اس رات کو پاس والوں کو بھی اندر نہیں جانے دیا جاتا تھا کیونکہ رش بہت بڑھ گیا تھا۔ میں اپنے دوست کے ساتھ ذرا لیٹ یعنی رات کے دس بجے کے قریب پہنچا تو ہمیں شملہ پہاڑی کے پاس ریڈیو سٹیشن کو جاتی سڑک پر ہی پولیس نے روک لیا۔ میں نے پاس دکھایا مگر ہمیں پھر بھی آگے جانے کی اجازت نہ دی گئی۔ عذر یہ پیش کیا گیا کہ لان میں تل دھرنے کی بھی جگہ نہیں ہے۔

ہم بھی ایڈونچرس تھے میں نے اپنے دوست سے کہا۔

''میرے ساتھ آؤ ہم ایک اور ترکیب آزماتے ہیں۔''

ریڈیو اسٹیشن کی کینٹین والی دیوار دوسری کوٹھی کے ویران لان کی طرف تھی۔ میں نے اپنے دوست سے کہا کہ ہم یہ دیوار پھاند کر ریڈیو اسٹیشن میں داخل ہوں گے۔ یہ دونوں کوٹھیوں کے لان کی مشترکہ دیوار تھی۔ یہ کوٹھی ایجرٹن روڈ پر ہوا کرتی تھی۔ اب یہاں ایک شادی گھر ''شہنائی'' کے نام سے کھل گیا ہے۔ ان دنوں اس کوٹھی میں کوئی کلب ہوا کرتی تھی۔ یہ بڑی ویران ویران سی کوٹھی تھی اور دن کے وقت بھی وہاں کوئی آدمی نظر نہ آتا تھا۔ اس وقت رات کے دس بجنے والے تھے۔ میرا خیال تھا کہ کوٹھی ویران ہوگی اور ہم بڑی آسانی سے اس کی دیوار پھاند کر ریڈیو اسٹیشن میں داخل ہو جائیں گے۔ اس ویران اور نیم آسیبی کوٹھی کا ایک چھوٹا سا گیٹ ہوتا تھا جس کا ایک پٹ غائب تھا۔ کوٹھی کے چاروں طرف میدان میں جنگلی گھاس اگی ہوئی تھی۔ درمیان میں چھوٹی سی کاٹیج نما ایک منزلہ بوسیدہ سی عمارت تھی۔ ہم گیٹ میں داخل ہوکر میدان کے گھاس پر سے گزرتے ریڈیو والی دیوار کی طرف بڑھ ہی رہے تھے کہ ایک پٹھان چوکیدار ڈنڈا لیے اندھیرے میں سے نکل کر ہمارے سامنے آگیا۔

''کدھر جاتا ہے؟''

ہم رک گئے۔ مجھے کسی چوکیدار کے آجانے کی بالکل توقع نہیں تھی۔ میں نے

کہا۔

''خان صاحب ہم ریڈیو پاکستان کے آدمی ہیں۔ گیٹ پر بڑا رش ہے اس لیے دیوار پھاند کر اندر جانا چاہتے ہیں۔''

پٹھان چوکیدار نے کہا۔

''منیجر صاحب سے بات کرو چل کر۔ وہ اجازت دے گا تو ہم تم کو جانے دے گا۔ نہیں تو یہاں سے بھاگ جاؤ۔''

کوٹھی میں دھیمی سی روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے دوست کو ساتھ لیا اور ہم کلب کے منیجر سے ملنے پٹھان کے ساتھ کوٹھی کی طرف بڑھے۔ اس نے بوسیدہ سا دروازہ کھول کر منیجر سے کہا۔

''صاحب دو آدمی ادھر دیوار پھاند رہا تھا۔ ہم اسے یہاں آپ کے پاس لایا ہے۔ کیا حکم ہے؟''

اندر جو صاحب بیٹھے تھے انہوں نے ہمیں اندر بلوا لیا۔ میں نے دیکھا کہ اونچی چھت والے پرانی طرز کے چھوٹے سے کمرے میں آتشدان کے پاس میز لگی ہے۔ جس کے قریب لال لال چہروں اور چڑھی ہوئی آنکھوں والے دو ادھیڑ عمر آدمی بیٹھے ہماری طرف گھور رہے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں سگریٹ سلگ رہے ہیں۔ میز پر کریون اے سگریٹ کا پیکٹ اور شراب سے بھرے ہوئے گلاس پڑے ہیں۔ ان میں جو صاحب اس گمنام ویران کلب کے منیجر تھے بولے۔

''کون ہو تم؟ کیا چوری کرنے آئے ہو؟''

دوسرا کہنے لگا۔

''ہمارے پاس تھوڑی سی شراب رہ گئی ہے۔ اگر چاہو تو ہمارے ساتھ شامل ہو سکتے ہو۔''

میں نے کہا۔

''سر! بات یہ ہے کہ میرا نام استاد سلامت علی خاں ہے۔ یہ استاد شوکت علی خاں طبلہ نواز ہے۔ ریڈیو کے لان میں جو محفل موسیقی ہو رہی ہے مجھے وہاں ایک آئٹم پیش کرنی اور استاد شوکت صاحب کو روشن آراء بیگم کے ساتھ طبلے کی سنگت کرنی ہے۔

ہمارا ریڈیو اسٹیشن کے اندر جانا بہت ضروری ہے۔ گیٹ پر پولیس کسی کو اندر نہیں گھسنے دے رہی۔'' روشن آراء کا نام سن کر منیجر کے سینے سے ایک دل دوز آہ نکلی اور وہ سر پر ہاتھ مار کر بولا۔

''روشن آراء بیگم تو ہمارے ملک کی شاندار کلاسیکل سنگر ہیں۔ ان کا گانا تو میں بھی سنوں گا۔ چلو میں بھی تمہارے ساتھ دیوار پھاندوں گا۔''

یہ کہہ کر منیجر صاحب اٹھے مگر لڑکھڑا کر پھر وہیں بیٹھ گئے۔

''سوری دوستو! اس وقت میں بہت مصروف ہوں پھر کبھی روشن آراء بیگم کا گانا سنیں گے۔''

میرے دوست نے پوچھا۔

''تو کیا ہمیں اجازت ہے؟۔''

منیجر نے ہاتھ بلند کر کے ہوا میں ایک دائرہ بنایا اور کہا۔

''اجازت ہے۔ استاد صاحب اجازت ہے۔ جاؤ روشن آراء بیگم جی کے پاس جاؤ اور انہیں ہمارا سلام پہنچاؤ۔''

پھر وہ اپنے ساتھی کو کوئی کلاسیکل راگنی بھدی آواز میں گا کر سنانے لگا۔

پٹھان نے ہماری طرف متوجہ ہو کر کہا۔

''ٹھیک ہے تم لوگ جاؤ۔''

وہ ہمیں دیوار کے پاس لے گیا اور دیوار پر چڑھنے میں اس شریف آدمی نے ہماری مدد کی۔ جب ہم دیوار کی دوسری طرف گرے تو استاد علی بخش، ظہور مانڈو صاحب کے ساتھ بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ہمیں دیوار سے چھلانگ لگاتے دیکھ کر مانڈو نے بے ساختہ کہا۔

''یہ آپ لوگ آسمان سے گرے ہیں یا کسی کھجور سے گرے ہیں۔''

اس زمانے میں غزل گانے والوں میں استاد برکت علی خان کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ویسے تو آج بھی برکت علی خاں جیسی غزل کوئی نہیں گا سکتا۔ اس کی نقل بہت کی جاتی ہے۔ ان کے بعد' ان دنوں غزل گانے والوں میں دو نام بڑے مشہور اور مقبول تھے۔ ان میں ایک علی بخش ظہور تھے اور دوسرے علی بخش قصوری' یہ دونوں اپنے اپنے

انداز' اپنے اپنے رنگ کے بادشاہ تھے۔ علی بخش ظہور کی آواز بڑی گونج دار تھی اور وہ غزل کی گائیکی میں کلاسیکل رنگ کا رچاؤ اس مہارت سے کرتے تھے کہ غزل کی اصلیت بھی مجروح نہیں ہوتی تھی۔ دوسری طرف علی بخش ظہور کے پاس قصور کا سوز و گداز تھا۔ وہ اپنی طرز کے واحد غزل گانے والے تھے۔ ان کے رنگ میں غزل گانے والا بھی پھر پیدا نہ ہوا۔ ان لوگوں میں خاص بات یہ تھی کہ ان کا رنگ خالص پنجاب کا رنگ تھا جو سوز و گداز اور سروں کے رچاؤ اور پھیلاؤ میں منفرد ہے اور برصغیر کے کسی صوبے کو یہ انداز' یہ رنگ نصیب نہیں ہوا' سوائے پنجاب کے۔ اس کے بعد اگرچہ مہدی حسن نے غزل گانے والوں میں بڑا نام پیدا کیا اور اس میں کوئی شک شبہ نہیں کہ مہدی حسن بے حد سریلا ہے اور وہ سروں پر سواری کرتا ہے مگر اس کا رنگ پنجاب کا رنگ نہیں ہے۔ ہمیں آج بھی پنجاب کا رنگ اگر کہیں اپنی پوری شان اور روشنی کے ساتھ ملتا ہے تو وہ صرف غلام علی ہی ہے۔

بہرحال میں ان دنوں کی بات کر رہا ہوں جب یہ دونوں فنکار ابھی گوشۂ گمنامی میں جدوجہد کر رہے تھے اور ملک میں علی بخش ظہور اور علی بخش قصوری کا طوطی بولتا تھا۔ قصور کو اللہ تعالیٰ نے سر کی بے بہا دولت بخشی ہے اور یہاں کے فنکاروں نے سارے برصغیر میں اپنے شہر کا نام اونچا کیا ہے۔ بڑے بڑے گنی لوگ بھی ان کے فن کے رچاؤ اور دل گدازیوں کا اعتراف کرتے ہیں اور ان کا بھی یہی خیال ہے کہ قصور پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔

میرا سوہنا شہر قصور نی

ہم دیوار پر سے چھلانگ لگاتے ہی مسکراتے ہوئے اٹھے۔ میں نے صادق علی مانڈو کو بتایا کہ اصل قصہ کیا تھا۔ وہ بڑا ہنسے۔ اس وقت سٹیج پر فریدہ خانم غزل سرا تھیں۔ ساز بج رہے تھے۔ لوگ خاموش بیٹھے اس نامور گلوکارہ کو سن رہے تھے۔ ہم بھی ایک طرف جامن کے درختوں کے نیچے جا کھڑے ہوئے۔ ان درختوں کے جامن بڑے میٹھے ہوتے تھے۔ ساون کی جھڑی لگتی تو ان درختوں پر سے کالے کالے جامن ٹپ ٹپ گرا کرتے۔ مجھے اپنے شہر امرتسر کی کمپنی باغ کے جامن یاد آ جاتے۔ کمپنی باغ میں رام باغ والے دروازے کی طرف سے داخل ہوں تو دونوں جانب جامن کے درخت

تھے۔ ان کے جامن بڑے میٹھے ہوتے تھے۔ یہ لمبوترے، پتلے اور کالے سیاہ ہوتے تھے۔ ایسے جامن بڑے میٹھے ہوتے ہیں جبکہ موٹے جامن عام طور پر ذرا ترش ہوتے ہیں۔ امرتسر میں موٹے جامنوں کا تریجہ بھی بکا کرتا تھا۔ پھیری والے بڑے بڑے چھابوں میں ان جامنوں کے ڈھیر اٹھا کر لاتے تھے۔ یہ سارے کے سارے پھٹے ہوئے اور گلے ہوئے جامن ہوتے تھے۔ یہ لوگ انہیں تریجہ کہتے تھے۔ مجھے آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ اس نام کے معنی کیا ہیں۔ یہ جامن سستے بھی بکتے تھے اور بڑے میٹھے بھی ہوتے تھے۔

بہرحال ریڈیو پاکستان کے اندر لان کی ایک جانب دوسرے بند گیٹ کے سامنے جامن کے درختوں کے جامن بھی پتلے، گہرے سیاہ اور لمبوترے اور بڑے ہی میٹھے تھے۔ جس زمانے میں وہاں مشہور شاعر صوفی غلام مصطفےٰ تبسم بطور سٹاف آرٹسٹ معاہدے پر ملازم ہو گئے تھے تو وہ میرے ساتھ مل کر بچوں کی طرح زمین پر گرے ہوئے جامن اٹھا کر کھایا کرتے تھے۔ جامن اٹھا کر وہ رومال سے صاف کرتے اور منہ میں ڈال کر کہتے۔

''یار یہ بڑے میٹھے جامن ہیں۔''

صوفی تبسم کے ریڈیو اسٹیشن پر آ جانے سے وہاں کی فضا میں مزید رنگینی اور چمک دمک آ گئی تھی۔ صوفی صاحب بڑے زندہ دل اور زندگی سے بھرپور شخصیت کے مالک تھے۔ وہ حقہ پیتے تھے مگر ریڈیو اسٹیشن میں اپنا حقہ ساتھ نہیں لاتے تھے۔ یہاں وہ سگریٹ پی کر ہی گزارہ کر لیتے تھے۔ ریڈیو کی عمارت کے بغل میں سیڑھیوں کے پاس ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ صوفی صاحب اس کمرے میں بیٹھتے تھے۔ اس وقت میں بھی ریڈیو پر بطور سٹاف آرٹسٹ ملازم ہو گیا تھا اور میری کرسی بھی اسی کمرے میں ڈال دی گئی تھی۔ یوں مجھے صوفی صاحب کی ہم نشینی سے فیض پہنچنے لگا تھا۔ وہ کبھی کبھی کوئی فارسی کا شعر سنا کر مجھے اس کے مشکل الفاظ کے معنی بھی بتاتے۔ جس کیلئے میں آج بھی ان کا شکرگزار ہوں۔ صوفی صاحب کی وجہ سے وہاں کئی دوسرے مشہور گانے والے اور گانے والیاں اور دانشور لوگ آ کر بیٹھتے تھے اور مجھے ان کی باتیں سننے اور انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا تھا۔ اسی کمرے میں میں نے پہلی اور آخری بار مشہور موسیقار رفیق غزنوی کو دیکھا اور ان سے باتیں بھی کیں۔ یہ اس حسین اور ہردلعزیز خوش اطوار، خوش

گفتار موسیقار کے زوال کا زمانہ تھا اور اس کے بال سفید ہو رہے تھے۔ پھر بھی اس کی شخصیت میں بلا کی کشش تھی۔

آج کے نامور اور بزرگ نعت خواں اعظم چشتی کا وہ شباب کا زمانہ تھا۔ وہ بڑے خوش لباس اور خوبصورت تھے۔ رخساروں پر سرخی جھلکتی تھی۔ گرمیوں میں اکثر بوسکی کی قمیض اور لٹھے کی شلوار میں ملبوس ہوتے۔ سردیوں میں گرم کشمیرے کا نسواری سوٹ پہن لیتے تھے۔ قمیض میں سونے کے بٹن لگے ہوتے۔ بڑے خلیق، ملنسار، ہنس مکھ اور خوش گو شاعر تھے۔ صرف سگریٹ پیتے تھے۔ موسیقی اور علم و ادب پر بھی انہیں کافی عبور حاصل تھا۔ فارسی زبان پر بھی گہری نظر تھی۔ سید امتیاز علی تاج اور بخاری صاحب بھی صوفی صاحب سے باتیں کرنے اسی کمرے میں آ کر بیٹھتے۔ وہ آپس میں گفتگو کرتے اور میں ان کی باتیں بڑے غور اور دلچسپی سے سنا کرتا تھا۔

تب ایسا ہوا کہ میرے اور انور جلال شمزہ کے مشترکہ دوست سلیم شاہد اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہو کر ریڈیو لاہور پر آ گئے۔ اب ہماری محفلیں ان کے کمرے میں لگنے لگیں۔ سلیم شاہد ہندو سے مسلمان ہوا تھا۔ اسے انگریزی ادب سے اس حد تک لگاؤ تھا کہ اس نے اپنی شخصیت کو انگریزی کلچر میں ڈھال لیا تھا۔ وہ دھیمی آواز میں بات کرتا۔ اچھا سگریٹ پیتا اور سردیوں میں اپنے کمرے کے آتشدان میں آگ جلوا دیتا۔ پھر چائے منگوا کر کہتا۔

''آؤ آتشدان کے پاس بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔''

آتشدان کے پاس دو صوفے آمنے سامنے رکھے ہوتے تھے۔ ہم وہاں بیٹھ کر چائے پیتے اور سلیم شاہد انگریزی ادب کی باتیں شروع کر دیتا۔ اس کی دھیمی آواز میں شارلٹ برونٹے کے ناولوں اور شخصیت کی باتیں ہمیں بڑی اچھی لگتی تھیں۔ اس زمانے میں ٹینیسی ولیم کے ڈراموں کا لاہور میں بڑا شہرہ تھا۔ ریگل سینما میں اس کے ایک ڈرامے کی فلم بھی لگی تھی۔ جس کا نام ''اے سٹریٹ کار نیمڈ ڈیزائر'' تھا ہم دیر تک وہاں بیٹھے اس فلم پر گفتگو کیا کرتے۔

ریڈیو اسٹیشن کی کوٹھی کے سامنے ایک تکونا پلاٹ تھا۔ جہاں جامن کے سات آٹھ گھنے درخت تھے۔ خدا جانے یہ درخت کس کی ملکیت تھے۔ ساون کے دنوں میں

جب جامن پک جاتے تو یہ درخت ٹھیکے پر دے دیئے جاتے۔ ٹھیکیدار کے آدمی وہاں آ کر اپنی جھونپڑی بنا لیتے۔ ان کی لمبی لمبی سیڑھیاں درختوں کے ساتھ لگ جاتیں۔ جب وہ جامن اتارتے تو سڑک پر بھی کئی جامن گرتے۔ اردگرد کے لڑکے وہاں پہلے سے موجود ہوتے جو جامن اٹھا کر مزے سے کھاتے۔ ٹھیکیدار کے آدمی سڑک پر گرنے والے جامنوں کو نہیں اٹھاتے تھے۔ وہ لڑکوں کو کچھ نہیں کہتے تھے۔

شاد امرتسری ریڈیو اسٹیشن کی دوسری منزل پر بیٹھتا تھا۔ بعد میں وہ پہلی منزل پر عقبی باغیچے کے ایک کمرے میں آ گیا تھا۔ جہاں اس کے ساتھ ظہیر صدیقی بھی بیٹھا کرتا تھا۔ دوسری منزل پر ہی میں نے پہلی بار امراؤ ضیاء بیگم کو دیکھا تھا۔ یہ وہی امراؤ ضیاء بیگم تھیں جن کا بچپن میں ہم یہ ریکارڈ بڑے شوق سے سنا کرتے تھے۔

میرا سلام لے جا' یثرب کو جانے والے

گجرات کے چوہدری اقبال صاحب بھی یہاں اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائریکٹر ہوتے تھے۔ وہ بڑا ادبی ذوق رکھتے تھے۔ انگریزی ادب پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ میرا پہلا ناول ''ڈربے'' چھپ چکا تھا۔ یہ ناول انہیں بہت پسند تھا۔ مگر اس پر انہیں اعتراض بھی تھا۔ جب انہوں نے تنقید کی تو مجھ پر یہ بھید کھلا کہ ان کے اعتراضات بالکل جائز تھے۔ میں نے اسی وقت عہد کر لیا کہ میں اس قسم کی غلطی ادب میں پھر نہیں کروں گا۔ اس کیلئے میں چوہدری اقبال صاحب کی روح کا آج بھی شکر گزار ہوں۔ وہ سگریٹ بڑی سنجیدگی اور دل جمعی سے پیتے تھے۔ انہیں تمباکو سے بڑی محبت تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ تمباکو سے محبت کرتے ہیں انہیں تمباکو کچھ نہیں کہتا۔ جس طرح سپیرے اپنے سانپوں سے پیار کرتے ہیں اور سانپ انہیں کچھ نہیں کہتے۔ اقبال صاحب نے بھی تمباکو کو پالا ہوا تھا اور اس کا زہر نکال لیا تھا۔ آج کل لوگ سگریٹ پیتے بھی ہیں اور ان سے خوف بھی کھاتے ہیں۔ یہ ایسی بات ہے کہ ہم کسی ایسے مہمان کی مہمانداری کر رہے ہوں۔ جس سے ہمیں جان کا خطرہ بھی ہو کہ وہ کسی بھی وقت پستول نکال کر ہمیں ہلاک کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سگریٹ ہمیں ہلاک کر ڈالتا ہے۔ چونکہ آج کے زمانے میں محبت اور دل جمعی غائب ہو گئی ہے اور ہم دوسری محبتوں کے ساتھ ساتھ سگریٹ کی محبت سے بھی محروم ہو گئے ہیں۔ اس لیے لازم ہے کہ ہم سگریٹ نوشی سے پرہیز کریں۔ وہ

ہمیں نقصان پہنچائے ہی پہنچائے۔ ویسے بھی آج کل وہ اصلی تمباکو نہیں رہے۔ خدا جانے کیا کیا کچھ سگریٹوں میں بھر دیا جاتا ہے۔ نئی نسل کو میں یہی مشورہ دوں گا کہ وہ ہرگز ہرگز سگریٹ وغیرہ کو ہاتھ نہ لگائیں۔

میں پرانے ریڈیو اسٹیشن میں ایوب رومانی اور عبدالشکور بیدل اور رشید حبیبی کا ذکر کرنا بھول گیا ہوں۔ ایوب رومانی لاہور کا رہنے والا تھا۔ اونچا لمبا خوبصورت کشمیری جوان' گھنے گھنگریالے سیاہ بال' چہرے پر ہر وقت کھیلتی ہوئی مسکراہٹ' بلند بانگ قہقہے' جگت بازی میں یکتا۔ میوزک کی گہرائی تک اترنے والا۔ خود نہیں گاتا تھا مگر گانے والے اس سے درس حاصل کرتے تھے۔ بھائی لعل امرتسری ایسے میوزک کے عالم اور گنی بزرگ کا شاگرد رہا تھا۔ پرانے ریڈیو اسٹیشن پر وہ بھی دلکشی روشنی اور زندہ دلی کا سرچشمہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں ریڈیو اسٹیشنوں پر صرف وہی لوگ ملازمتیں کرنے آتے تھے یا صرف ان ہی لوگوں کو انٹرویو میں پاس کیا جاتا تھا' جنہیں ادب' آرٹ اور میوزک سے گہرا لگاؤ ہوتا تھا۔ جو خوش شکل اور خوش لباس ہوتے تھے۔ جنہیں شوق ہوتا تھا کہ وہ ریڈیو پر ملازمت کریں اور وہ اس ملازمت کے سوا کسی دفتر میں ملازمت نہیں کر سکتے تھے۔ آج یہ بات نہیں ہے۔ آج ایسا ہے کہ لوگ دس دس جگہوں پر درخواستیں دے دیتے ہیں۔ محکمہ انکم ٹیکس سے کال نہ آئی اور ریڈیو والوں نے بلا لیا تو وہیں آ گئے۔ آج کے بیشتر پروڈیوسروں کو ادب' آرٹ' میوزک سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ مگر وہ ادبی اور میوزک کے پروگرام نشر کرتے ہیں جس کی وجہ سے ریڈیو کے پروگرام زوال پذیر ہیں۔

ایوب رومانی شاعر بھی تھا۔ اس خوب صورت جوان کو دیکھ کر ہی پتہ چل جاتا تھا کہ یہ ریڈیو اسٹیشن پر ہی کام کرتا ہوگا۔ وہ سگریٹ خود بنا کر پینے کا عادی تھا۔ وہ ہماری طرح بڑا خوش لباس تھا۔ میری طرح وہ بھی سوٹ کا کپڑا اور ٹائیاں تلاش کرتا رہتا تھا۔ ایک اور بات ایوب رومانی میں بڑی نمایاں تھی۔ اکثر سازندے اس کے پاس آ کر بیٹھتے تھے۔ اگر کسی کو قرض کی حاجت ہوتی تو ایوب انہیں خاموشی سے قرض دے دیتا تھا۔ سازندے بھی اتنے ذمے دار تھے کہ جیسے ہی تنخواہ ملتی سب سے پہلے ایوب رومانی کا قرض ادا کرتے اور مہینے کی آخری تاریخوں میں اس سے پھر قرض لینے کا سلسلہ شروع

ہو جاتا۔

ایک روز میں ایوب رومانی کے پاس بیٹھا تھا۔ ایک وائلن نواز سازندہ اندر آیا اور کھسر پھسر کرنے لگا۔ ایوب رومانی نے میز کی دراز میں سے کچھ نکال کر اس کی مٹھی میں تھما دیا۔ سازندہ چلا گیا۔ مجھے ایوب رومانی نے بالکل نہ بتایا کہ اس نے اسے کیا دیا ہے۔ میں نے بھی نہ پوچھا' کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ سازندہ کیا مانگنے آیا تھا۔ اتفاق کی بات ہے کہ پہلی دوسری تاریخ کو میں اس وقت بھی ایوب رومانی کے پاس ہی بیٹھا تھا جب وہی سازندہ دوبارہ کمرے میں داخل ہوا اور اسے ایک لفافہ دے کر شکریہ ادا کرتا ہوا چلا گیا۔ تب ایوب نے مسکراتے ہوئے مجھے بتایا کہ یہ لوگ بڑے خرچیلے ہیں۔ کھانے پینے پر ان کی تنخواہ پندرہ تاریخ کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد مجھ سے کبھی کبھی قرض لے جاتے ہیں مگر پہلی کے بعد بڑی ذمے داری سے ادا بھی کر جاتے ہیں اور وہ سگریٹ سلگا کر ہلکے ہلکے کش لگانے لگا۔ کمرے میں خود بنائے ہوئے سگریٹ کی تلخ خوشبو پھیل گئی۔

موسیقی نے ایوب رومانی کے دل میں بڑا گداز پیدا کر دیا تھا۔ جب وہ کلاسیکی موسیقی کی بات کرتا تو اس کے چہرے پر ایک عجیب سی چمک آ جاتی تھی۔ جیسے کسی فانوس کے اندر کسی نے موم بتی روشن کر دی ہو۔ وہ خان صاحب وحید خان سے لے کر بڑے غلام علی خان تک بڑے اعتماد سے بات کر لیتا تھا۔ ان کے اسلوب' ان کی گائیکی' ان کے سر کے رچاؤ کا تجزیہ کرتا۔ ان کے گھرانوں کے فرق مجھے بتاتا۔ فلاں گویا سر کتنی خوبصورتی سے لگاتا ہے۔ فلاں گویا اسی سر کو کتنے بھدے طریقے سے لگاتا ہے۔ کون سا راگ صرف ایک سر کو ذرا سا اتار دینے سے دوسرے راگ میں بدل جاتا ہے اور کون سا سر ہے جو فلاں راگ میں پورا نہیں لگتا' یعنی بھر کر نہیں لگایا جاتا۔ ایوب رومانی نے میرے علم میں بھی بے پناہ اضافہ کیا کیونکہ مجھے شروع ہی سے موسیقی' کلاسیکی موسیقی کو سمجھنے کا بڑا شوق رہا تھا۔ ایوب رومانی گویوں' سازندوں اور موسیقاروں سے بڑا گھل مل گیا تھا۔ اس میں افسروں والی نخوت نہیں تھی۔ بڑے گویوں کو ایوب رومانی خود آگے بڑھ کر بڑے ادب سے ملتا۔ ویسے ایوب رومانی میں غرور نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ اپنے چپڑاسی کو بھی بیٹا کہہ کر بلاتا۔ بعد میں جب وہ ریڈیو کا بڑا افسر بن گیا تب بھی اس

میں غرور نہیں آیا تھا اور طبیعت کی انکساری اسی طرح قائم تھی۔ سٹاف کے کسی شخص کیخلاف بھی تحکمانہ کارروائی نہ کرتا۔ کسی سے کوئی غلطی ہو جاتی تو اسے سمجھا دیا کرتا۔

جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں۔ کلاسیکی موسیقی میں وہ امرتسر کے نابغہ روزگار بھائی لعل یا بھائی لال امرتسری کا شاگرد رہا تھا۔ ایوب رومانی نے بھائی لعل کی بڑی خدمت کی تھی اور اس عظیم استاد نے بھی ایوب کو موسیقی کے ایسے ایسے رموز بتا دیئے تھے کہ بڑے بڑے گویئے بھی ایوب رومانی کے آگے سنبھل کر بات کرتے تھے۔ بھائی لعل کی باتیں کرتے ہوئے ایوب رومانی بڑا جذباتی ہو جاتا تھا۔ اسے استاد برکت علی خاں سے بھی بڑا لگاؤ تھا۔ وہ استاد برکت علی خاں کا بے حد احترام کرتا تھا۔ ایوب رومانی نے اپنے کمرے میں بیٹھے چائے پیتے ہوئے مجھے ایک واقعہ سنایا تھا:

''خواجہ! ایک بار استاد برکت علی خاں کلکتے گئے۔ واپس آئے تو میری بیگم کیلئے ایک کشمیری شال لیتے آئے۔ انہوں نے تہہ کی ہوئی شال میری میز پر رکھ دی۔ میں نے غلطی سے پوچھ لیا کہ خان صاحب اس کی کتنی رقم پیش کروں۔ اس پر استاد برکت علی خاں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور کہا کہ ایوب صاحب میں تو آپ کو اپنا بیٹا سمجھ رہا تھا اور آپ افسر نکل آئے۔''

اتنی بات سنا کر ایوب رومانی پر بھی رقت طاری ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے۔ جلدی سے رومال نکال کر آنکھیں پونچھیں۔ سگریٹ سلگایا اور چپڑاسی کو بلا کر کہا

''بیٹے فل سیٹ چائے لے آنا' تم بھی پینا۔''

یہ رقت بڑی انمول ہوتی ہے۔ یہ قدرت کی طرف سے عطا ہوتی ہے۔ قاضی عبدالغفار نے اپنی مشہور زمانہ کتاب ''لیلیٰ کے خطوط'' میں لیلیٰ کی زبانی ایک جملہ کہلوایا تھا۔ لیلیٰ اپنے عاشق کو خط لکھتے ہوئے کہتی ہے کہ

''تم چاہو کہ اپنی ساری دولت دے کر سورج کی ایک کرن خرید لو تو ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہ قدرت کا انمول تحفہ ہے جو یا تو مفت ملتا ہے اور یا کسی قیمت پر نہیں ملتا۔''

رقت بھی میں سمجھتا ہوں کہ قدرت کی طرف سے ملتی ہے۔ یہ رقت میں نے کئی لوگوں پر طاری ہوتے دیکھی ہے۔ ان میں وہ لوگ بڑے افضل تھے جن کے ہونٹوں پر نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام آتے ہی ان پر رقت طاری ہو جاتی تھی۔ کوئی حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام مبارک لیتا تو ان پر رقت طاری ہو جاتی تھی اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو جاتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ رقت ہر مسلمان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوئی ہے۔ ایوب رومانی بھی اس معاملے میں بڑا رقیق القلب تھا۔ کوئی دلگداز سر بھی اس کی آنکھوں میں آنسو بھر لاتا تھا۔

ایوب رومانی میں یہ بات بڑی اچھی تھی کہ وہ ہر کسی کی مدد کرنے کو تیار ہو جاتا تھا۔ آج کے زمانے میں آدمی دوسرے کی مدد کرنے سے پہلے کئی بار سوچتا ہے کہ کہیں میں خود تو کسی مصیبت میں نہیں پھنس جاؤں گا مگر ایوب رومانی میں یہ بات نہیں تھی۔ وہ کسی کو مشکل یا مصیبت میں مبتلا دیکھتا تو فوراً اس کی مدد پر تیار ہو جاتا۔ کوئی اگر اسے مشورہ دیتا کہ ایوب تم خود نہ کسی مصیبت میں پھنس جانا تو وہ ہاتھ کو جھٹک کر کہتا۔

''چھڈ یار دیکھا جائے گا۔''

کشمیری ہونے کے ناطے ایوب رومانی کو بھی کھانے پکوانے اور اچھے کھانے کا شوق تھا۔ دوسروں کی دعوت پر وہ ہمیشہ تیار رہتا تھا۔ ایک بار باغ جناح کے اوپن ایئر تھیٹر میں محفل موسیقی ہوئی۔ کھانا وغیرہ بھی پکوایا گیا تھا۔ ایوب رومانی اس کا انچارج تھا مگر ایسا ہوا کہ ایوب رومانی مہمانوں کو کھلانے میں ہی لگا رہا اور جب اس کی باری آئی تو کھانا واقعی ختم ہو چکا تھا۔ دیگوں میں کھرچن بھی باقی نہیں بچی تھی کیونکہ وہاں کافی لوگ باہر سے بھی آ کر کھانا کھا گئے تھے۔ ایوب رومانی نے ایک آدمی کو دو سو روپے دے کر کہا۔

''یار! کچھ سازندوں نے بھی کھانا نہیں کھایا۔ مزنگ جا کر مچھلی نان لے آؤ۔ میں کنسرٹ کروا رہا ہوں۔ فارغ ہو کر کھا لوں گا۔''

جب محفل موسیقی ختم ہوئی تو میں بھی وہاں پر موجود تھا۔ یقین کریں کہ ایوب رومانی کیلئے سوائے ڈیڑھ نان اور چٹنی کے کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔ ایوب رومانی نے سازندوں کو دو چار گالیاں دیں اور وہیں نان چٹنی کھانے بیٹھ گیا۔

سُر اور شعر کے لوگ عام طور پر حساب کتاب کے جھنجھٹوں سے دور ہوتے ہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ ایوب رومانی حساب کتاب بھی پوری ذمے داری سے نبھاتا تھا۔ جب نئے ریڈیو اسٹیشن پر وہ کمرشل سروس کا انچارج لگا تو اس کا کام ہی حساب کتاب رکھنا تھا۔ یہ ڈیوٹی اس نے آخر وقت تک ایسی ذمے داری اور دیانت داری سے نبھائی کہ ایک پائی بھی کہیں سے ادھر ادھر نہ ہوئی اور اس نے لاکھوں روپے کمرشل اشتہاروں سے ریڈیو پاکستان کو کما کر دیئے۔ وہاں بھی جب وہ حساب سے فارغ ہوتا تو کتاب کھول لیتا اور ہمیں اپنے اور دوسروں کے شعر سنا کر لطف اندوز ہوتا۔

اس میں ظرافت کی حس بھی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ موسیقاروں کے بھولے پن کے لطیفے اسے ازبر تھے۔ اس کی زبان سے کئی بار سنا ہوا لطیفہ ایک بار پھر سن کر بھی ہم لوگ بے حد محظوظ ہوتے۔ شروع میں اس کے پاس ایک سائیکل ہوتی تھی۔ اس کے بعد اس نے ایک لمبریٹا سکوٹر کہیں سے خرید لیا۔ یہ سکوٹر نئے ریڈیو اسٹیشن کی عمارت میں بھی اس کے ساتھ آیا اور آخری عمر تک چلا۔ آخری دنوں میں اس کے ہونہار بچوں نے قالینوں کا کام شروع کر دیا تھا اور وہ گاڑی میں آنے جانے لگا تھا۔ جب لمبریٹا سکوٹر اس کے پاس تھا تو آپ کو یاد ہوگا کہ وہ چھوٹا یعنی ذرا منی سائز کا سکوٹر ہوا کرتا تھا۔ ایوب رومانی اونچا لمبا آدمی تھا۔ لمبریٹا سکوٹر اس کے نیچے دب جاتا تھا۔ وہ یوں کہ آدھے سکوٹر کو ایوب کے اوورکوٹ نے ڈھانپ رکھا ہوتا۔ دور سے دیکھنے پر یوں لگتا تھا جیسے ایوب رومانی سڑک پر بیٹھ کر چلا آ رہا ہے۔ سکوٹر کی گدی کثرت استعمال سے ایک طرف کو جھک گئی تھی۔ سکوٹر کے تقریباً سارے پرزے کھڑکھڑانے لگے تھے۔ ایوب رومانی کے کمرے میں بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے محسوس ہوتا کہ ہم ریڈیو اسٹیشن میں بیٹھے ہیں۔ ورنہ بعد میں ریڈیو اسٹیشن کا ماحول بہت حد تک بدل گیا تھا۔ آخری دنوں میں ایوب رومانی کے بال سفید ہونے لگے تھے مگر اس کا دل دوستوں کی محبت میں اسی طرح گرم تھا۔

یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ سکی کہ ایوب رومانی کو وہ مہلک بیماری کیوں لگ گئی تھی جو اس کی بے وقت موت کا سبب بنی۔ ویسے تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہر شخص کی موت کا ایک دن معین ہے اور یہاں کسی کو دم مارنے کی اجازت نہیں ہے۔ ہم کیا اور

ہماری بساط ہی کیا ہے کہ ہم موت کے اسرار سمجھ سکیں۔ بہرحال ایوب رومانی اچانک بیمار پڑ گیا۔ ایک روز پتہ چلا کہ وہ ہسپتال میں ہے اور اسے کینسر ہو گیا ہے۔ ہم ہسپتال اس کی عیادت کو پہنچے۔ وہ ہمیں دیکھ کر مسکرایا۔

''خواجہ! سگریٹ تو پلاؤ۔ یہ لوگ مجھے سگریٹ بھی نہیں پینے دیتے۔''

انتقال سے شاید دو تین دن پہلے ایوب رومانی گاڑی میں بیٹھ کر نئے ریڈیو اسٹیشن آیا۔ وہ اسٹیشن ڈائریکٹر کے کمرے میں صوفے پر نیم دراز تھا۔ سب لوگ اسے وہیں آ کر مل رہے تھے۔ وہ کمزور ہو گیا تھا مگر چہرے پر وہی معصوم اور شگفتہ مسکراہٹ کھلی ہوئی تھی۔ میں بھی اس سے ملنے گیا اور اس کے قریب ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔

''خواجہ! اچھا کیا جو تم نے مجھ پر مضمون لکھ دیا اور میں نے اپنی زندگی میں ہی پڑھ لیا۔''

میں نے اسے رسمی تسلی دی۔ اس کے بعد ایوب رومانی بھی ہم سے بچھڑ گیا۔ اللہ تعالیٰ اسے جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین

پرانے ریڈیو اسٹیشن پر ہی عبدالشکور بیدل بھی ملازم تھا۔ عبدالشکور بیدل کا تعلق امرتسر کے ایک باعزت گھرانے سے تھا۔ وہ ہمارا دوست بھی تھا اور پاک ٹی ہاؤس میں ہمارے ساتھ بیٹھتا تھا۔ بڑے صاف ستھرے شعر کہتا تھا۔ ان دنوں وہ گورنمنٹ کالج میں پڑھتا تھا۔ میں یہاں بتاتا چلوں کہ عبدالشکور کے چھوٹے بھائی کا نام میوزک ڈائریکٹر خیام ہے۔ جو برصغیر کے ممتاز فلمی میوزک ڈائریکٹروں میں شمار ہوتا ہے مگر عبدالشکور نے کبھی اس کا ذکر نہ کیا تھا۔ ہاں اسے خوشی اور فخر ضرور تھا کہ اس کے چھوٹے بھائی نے بڑا نام پیدا کیا ہے۔ شکور بیدل کو بھی اچھے کپڑے پہننے کا بڑا شوق تھا۔ سوٹ کا کپڑا بڑی کاوش اور تلاش کے بعد خرید کر لاتا اور اسے بڑے اہتمام سے سلوا کر پہنتا۔ ہمارے بھی دوست خوش لباس تھے۔ شکور کو اپنے شعر سنانے کی عادت نہیں تھی۔ کبھی کبھی ہم اصرار کر کے اس سے اس کی کوئی تازہ یا پرانی غزل سن لیتے تھے۔ کلاسیکی میوزک کا وہ ماہر تھا۔ خود بھی لائٹ گیت اور کافیاں بڑی مہارت سے گایا کرتا تھا۔ پاکستانی فلم انڈسٹری کے آغاز میں اس نے کچھ فلمی گانے بھی گائے مگر پھر اس دنیا سے کنارہ کش ہو

گیا۔ اس کی طبیعت میں درویشی بہت تھی۔ نماز روزے کا شروع ہی سے پابند تھا۔ آخری دنوں میں تو اس نے انگریزی لباس ترک کر دیا تھا اور کھدر کی شلوار قمیض پہنتا تھا۔ پرانے ریڈیو اسٹیشن میں وہ بڑا فیشن ایبل ہوا کرتا تھا مگر نئے ریڈیو اسٹیشن پر آنے کے کچھ عرصہ بعد درویشی اس پر غالب آ گئی تھی اور وہ ریڈیو کی مسجد میں باجماعت نماز ادا کرتا تھا۔ اب ہم بھی اس کو مذاق نہیں کرتے تھے بلکہ سبھی دوست اس کا احترام کرتے اور ادب سے پیش آتے تھے۔

میرے پاس ان دنوں صبح کا پنجابی پروگرام ہوتا تھا۔ شاید اس پروگرام کا نام ''راوی دیاں چھلاں'' تھا۔ اسی میں پنجابی گانے لگتے تھے۔ ایک روز عبدالشکور بیدل کہنے لگا۔

''خواجہ صاحب! میں نے امتیاز علی، ریاض علی کی آوازوں میں خواجہ فریدؒ کی ایک کافی ریکارڈ کروائی ہے۔ وہ اپنے پروگرام میں لگا لیا کریں آپ کو بڑی پسند آئے گی۔''

میں نے ریکارڈ روم میں جا کر وہ کافی سنی تو مجھے بڑی اچھی لگی۔ اس میں شکور بیدل نے چٹکی ایک خاص ردھم کے ساتھ بجائی تھی۔ میں نے وہ کافی اپنے پروگرام میں لگائی تو اسے لوگوں نے بھی بہت پسند کیا اور اکثر اس کی فرمائش آنے لگی۔ جب میں امریکہ جانے لگا تو میں اپنے ساتھ یہ کافی بھی اپنے کیسٹ پر چڑھا کر لے گیا تھا۔ یہ بڑے کمال کی کافی ہے خواجہ غلام فریدؒ کی اور دونوں بھائیوں امتیاز علی، ریاض علی نے بڑی محبت سے گائی ہے۔ واشنگٹن میں میں روز ہی شام کو یہ کافی لگا کر سنا کرتا تھا۔ پچھلے دنوں ریڈیو پر امتیاز علی سے ملاقات ہوئی تو میں نے اسے کہا کہ وہ عبدالشکور بیدل کی طرز میں بنائی ہوئی خواجہ فرید کی کافی بھی ٹی وی پر گا لیا کرے وہ کہنے لگا۔

''اگلی بار ضرور گاؤں گا۔''

پھر گہرا سانس بھر کر بولا۔

''حمید صاحب! شکور صاحب کی چٹکی بھی اس ریکارڈ میں ہمیشہ کے لیے ریکارڈ ہو گئی ہے۔ کتنے بے نظیر پروڈیوسر تھے عبدالشکور صاحب۔''

عبدالشکور بیدل نے لاہور ریڈیو اسٹیشن سے اپنا ٹرانسفر کراچی کروا لیا۔ اس کی

وجہ یہ تھی کہ اس کے بچے کراچی میں آباد ہو گئے تھے۔ میں ان ہی دنوں کراچی گیا تو وہاں ریڈیو اسٹیشن پر اپنے ہمدم دیرینہ انعام صدیقی سے ملنے آیا۔ اس نے اسی وقت شکور بیدل کو خبر کر دی کہ لاہور سے خواجہ صاحب آئے ہیں۔ شکور بیدل سب کام چھوڑ چھاڑ کر انعام صدیقی کے کمرے میں آ گیا۔ ہم بغل گیر ہو کر ملے۔ شکور بیدل کے بال سفید ہونے لگے تھے۔ ہم نے انعام صدیقی کے کمرے میں ہی کھانا کھایا۔ چائے کا دور چلا تو شکور بیدل نے لاہور کے پرانے ریڈیو اسٹیشن کی باتیں شروع کر دیں۔ جہاں سے اس نے اپنی ریڈیو کی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ ان پرانے ساتھیوں کی یاد تازہ کی جو ہم سے بچھڑ گئے تھے اور جن سے پہلی ملاقات پرانے ریڈیو اسٹیشن پر ہی ہوئی تھی۔ پھر ٹھنڈا سانس کھینچ کر عالم جذب میں کہنے لگا۔

''خواجہ صاحب! یہ دنیا چل چلاؤ کا میلہ ہے بس' یہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انجام اچھا کرے اور ہمارے گناہ معاف فرما دے۔''

ہماری فرمائش پر شکور بیدل نے اپنی تازہ غزل سنائی جو واقعی بہت کمال کی غزل تھی۔ یہ آخری غزل تھی جو میں نے اپنے پرانے ساتھی کی زبانی سنی۔ میں لاہور واپس آ گیا۔ ریڈیو کے سارے دوستوں کو بتایا کہ شکور بیدل سے ملاقات ہوئی تھی اور وہ تم سب کو سلام کہہ رہا تھا۔ یہ شکور بیدل کا آخری سلام تھا۔ اس کے بعد وہ بھی ہم سے ہمیشہ کیلئے جدا ہو گیا۔

رشید حبیبی بھی پرانے ریڈیو اسٹیشن پر ہی آ کر ملازم ہوا تھا اور اپنی طرز کا واحد نوجوان تھا۔ اسے دیہاتی پروگراموں سے زیادہ دلچسپی تھی۔ چنانچہ وہ بعد میں دیہاتی پروگرام کا ہی انچارج لگا۔ وہ شاعر بھی تھا۔ پنجابی کی اس کی ایک رومانی نظم آج بھی لوگوں کو یاد ہوگی۔

میریاں گلاں یاد کریں گی
رو رو کے فریاد کریں گی
فیر میں تینوں یاد آواں گا

ریڈیو پاکستان لاہور کی نئی عمارت میں اٹھ آنے کے ساتھ ہی ریڈیو کا ایک خاص مزاج ایک خاص کلچر پرانی عمارت میں ہی دفن ہو کر رہ گیا۔ اب وہاں وہ کھنڈر بھی

باقی نہیں رہا مارکیٹیں بن گئی ہیں۔ سڑک پر شور' ہنگامہ' ٹریفک کی افراتفری مچی رہتی ہے۔ جامن کے دو چار درخت باغیچے میں اب بھی کھڑے ہیں مگر وہ بھی چشم حیرت سے آنے جانے والوں کو دیکھتے رہتے ہیں۔ ایک وقت آئے گا کہ یہ درخت بھی کٹ جائیں گے اور وہاں سے ایک دوسری سڑک نکل آئے گی۔

☆......☆......☆

حسن بخت

پھر ایک روز حسن بخت بھی ہم سے بچھڑ گیا۔ اخبار میں ایک چھوٹی سی خبر چھپی۔ دو روز بعد لاہور کی دو ایک ادبی تنظیموں کی جانب سے تعزیتی قرارداد پاس کی گئی اور بات ختم ہو گئی۔ لوگوں کیلئے یہاں بات ختم ہو گئی...... لیکن میرے لئے بات یہاں سے شروع ہوئی۔ حسن بخت کے بارے میں وہم و گمان بھی نہ تھا کہ اپنے پیارے دوست ناصر کاظمی کے بعد اس پر بھی مجھے آنسو بہانے پڑیں گے۔

حسن بخت سے میری آخری ملاقات...... مگر نہیں میری اس کی بات ختم نہیں ہوئی۔ میں ابھی اس کی آخری ملاقات بیان نہیں کرونگا۔ میں شروع سے بات کرتا ہوں جس شہر میں حسن بخت نے اپنا بچپن گزارا اسی شہر کی فضاؤں میں' میں پل بڑھ کر جوان ہوا۔ امرتسر میں اس سے اپنی پہلی ملاقات مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے۔ یہ ملاقات کامریڈ ہوٹل میں ہوئی۔ یہ ہوٹل امرتسر کا ٹی ہاؤس تھا۔ یہاں سیف الدین سیف' ظہیر کاشمیری' خلش کاشمیری' عیسیٰ کاشمیری' اقبال کوثر' نفیس خلیلی' ظہور الحسن ڈار' احمد راہی' عارف عبدالمتین اور دوسرے شعر و ادب اور موسیقی کے پرستار بیٹھتے تھے۔ شعر سنائے جاتے' افسانوں کے ٹکڑے پڑھے جاتے' طب' معاشیات' جدلیات اور ادب کے فلسفے پر بحثیں ہوتیں۔ میں چھوٹا تھا۔ دسویں جماعت تھرڈ ڈویژن میں بڑی مشکل سے پاس کی تھی اور شہر میں آوارہ گردی کیا کرتا اور یا کامریڈ ہوٹل میں آ کر اپنے دوستوں کے پاس بیٹھ جاتا۔ اسی ہوٹل میں ایک روز گھنگھریالے سیاہ بالوں' مضبوط سفید دانتوں اور چوڑے شانوں والے ایک نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ میں ہوٹل میں داخل ہوا تو دوستوں کی منڈلی میں ایک طرف کرسی پر بیٹھا یہ نوجوان اپنی تازہ غزل سنا رہا تھا۔ چائے کی نیلی

چینکوں کا دور چل رہا تھا۔ کمرہ پاسنگ شو اور قینچی کے سگریٹوں کے دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ مجھے ایسا کمرہ بہت پسند ہے جس کی فضا میں سگریٹ' چائے اور پان کی خوشبو پھیلی ہو۔ میں احمد راہی کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ سردیوں کا موسم تھا۔ میرے پاؤں میں کلکتے کے کالے سلیپر تھے اور حسب معمول فرد یعنی کشمیری شال اوڑھ رکھی تھی۔ امرتسر میں ہم کشمیری سردیوں میں گرم شالیں اوڑھا کرتے۔ گرم کوٹ صرف سکول میں پہنتے تھے۔ میں نے بھی پاسنگ شو کا سگریٹ سلگایا اور بڑی توجہ سے اس چوڑے چکلے نوجوان کے شعر سننے لگا۔ ایک شعر پر سب نے بڑی داد دی۔

نوجوان کا چہرہ خوشی سے لال ہو گیا۔ کمرے کی گرم فضاء میں اس کے کھلے گندمی چہرے پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔ وہ داد پا کر شرما بھی رہا تھا اور مسکرا بھی رہا تھا۔ مجھے اس کے سیاہ گھنگریالے بال اور بھرپور سفید دانت بڑے اچھے لگے اس نوجوان شاعر بلکہ نوعمر شاعر کا تخلص سمیت نام حسن بخت تھا۔ میری اس سے بھی دوستی ہو گئی۔

ایک روز میں گرم شال اوڑھے اکیلا ہی کمپنی باغ میں گھوم پھر رہا تھا کہ میں نے حسن بخت کو دیکھا۔ وہ ٹھنڈی کھوئی کی جانب سے چلا آ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکراتا ہوا میری طرف بڑھا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"یار دھوپ بڑی پیاری ہے گھاس پر بیٹھ کر سگریٹ پیتے ہیں۔"

ان دنوں ہماری سب سے بڑی عیاشی سگریٹ پینا ہوتی تھی اور ہم ایک دوسرے سے ملتے وقت ہاتھ نہیں ملایا کرتے تھے بلکہ ایک دوسرے سے ملتے وقت کندھے پر ہاتھ مارا کرتے تھے۔ ہاتھ ملانے کی مصیبت بہت بعد شروع ہوئی۔ ہم کمپنی باغ کی دھوپ میں گھاس پر بیٹھ گئے۔ حسن بخت نے خاکی قمیض کی جیب سے پاسنگ شو کی ڈبی اور ماچس نکالی۔ بڑی محبت سے مجھے سگریٹ دے کر سلگایا اور بولا۔

"یار ایک غزل کے دو شعر ہوئے ہیں۔ سناؤں؟"

اس نے تحت اللفظ دو شعر سنائے پھر ہم باتیں کرنے لگے۔ ادھر ادھر کی باتیں' دوستوں کی باتیں۔ احرار پارٹی کے جلسے جلوسوں کی باتیں' عطا اللہ شاہ بخاری' غازی عبدالرحمان' سیف الدین کچلو اور مولانا افضل حق کی تقریروں کی باتیں' ایم اے او کالج اور ڈی اے او کالج کے کرکٹ میچ کی باتیں۔ ہم باتیں کرتے رہے اور دھوپ کمپنی باغ

کے درختوں کے سائے پھیلاتی آگے بڑھتی گئی۔ وقت گزرتا گیا اور کامریڈ ہوٹل میں ہماری ملاقات تقریباً ہر روز ہوتی۔ مجھے اس نوجوان شاعر کے بے ساختہ قہقہے اور چھوٹی سے چھوٹی بات پر بچوں کی طرح خوش ہو کر ہنسنے کی عادت بہت پسند تھی۔ اسے ہنستا دیکھ کر مجھے بھی ہنسی آ جاتی۔ پھر ہم دونوں خوب ہنستے' ہنستے ہنستے حسن بخت کا چہرہ سرخ ہو جاتا اور ماتھے پر پسینہ آ جاتا وہ تھا تو شاعر لیکن قد کاٹھ جہلم کے جیالے فوجیوں جیسا۔

کامریڈ ہوٹل میں ہمارے ساتھ بیٹھ کر اگر وہ چائے کی پوری چینک خالی کر جاتا تو رام باغ کے باہر حلوائی کی دکان پر سیر دہی کی لسی کا پیالہ بھی کھڑے کھڑے پی جاتا۔

کامریڈ ہوٹل کی چائے کی نیلی چینکیں خالی ہوتی رہیں۔ پاسنگ شو کے سگریٹ سلگ سلگ کر بجھتے رہے۔

کمپنی باغ کے درختوں میں سورج طلوع ہو کر غروب ہوتا رہا اور وقت گزرتا چلا گیا۔ ہندو مسلم فساد شروع ہو گئے۔ فسادات نے شدت اختیار کر لی۔ پہلے مکانوں کو آگ لگی تھی۔ اب پورے کے پورے محلے' گلیاں اور کٹڑے جلنے لگے۔ 14 اگست 1947ء کے روز امرتسر میں ہر طرف آگ لگی تھی۔ گولیاں چل رہی تھیں۔ سڑکوں' گلیوں' بازاروں' مکانوں میں لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ ہم لوگ بھی دوسروں کے ساتھ پاکستان آ گئے۔

لاہور آ کر ایک نئی آوارہ گرد زندگی کا آغاز ہوا۔ پیچھے جو کچھ تھا وہ لٹ چکا تھا۔ آگے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ مجھے خوشی تھی تو صرف اتنی کہ میرے امرتسر کے تقریباً سارے ہی دوست گوالمنڈی لاہور میں جمع ہو گئے تھے۔ اب گوالمنڈی کے شیراز ہوٹل کو وہی مقام مل گیا جو امرتسر کے کامریڈ ہوٹل کو نصیب تھا۔ سب ہی رشتہ دار' دوست' ملنے جلنے والے گوالمنڈی ہی میں مقیم تھے۔ حسن بخت نے بھی اسی محلے میں مکان الاٹ کرا لیا۔ شیراز ہوٹل میں ہم سارے دوست رات گئے تک بیٹھے شعر و ادب پر باتیں کرتے۔ ایک دوسرے کو مذاق کرتے۔ امرتسر کی خالص ترین گالیوں کو زندہ رکھنے کیلئے ہر ممکن کوشش کرتے۔ حسن بخت' ہر محفل' ہر مجلس میں ہمارے ساتھ ہوتا۔ ہماری مجلس کے ساتھ میرے یہ دوست تھے۔ شنو پان فروش' عنایتی شیر فروش' حافظ صاحب' حکیم جاوا' شفیع

تاندرو' میاں پستول' حاجی حرامدہ' کوبی ڈکیت وغیرہ' حسن بخت نے اب باقاعدہ غزلیں کہنا شروع کر دی تھیں۔ وہ بڑی صاف ستھری غزل لکھنے لگا تھا۔ بہرحال مجھے اس کی غزلوں سے کبھی بھی کوئی سروکار نہیں رہا تھا۔ میں اس کی غزلوں کو اس کی زبانی بڑے غور سے سنتا اور سننے کے ساتھ ہی ساتھ بھولتا جایا کرتا تھا۔ مجھے وہ دوست اور ساتھی کی حیثیت سے عزیز تھا۔ گوالمنڈی کے شیراز ہوٹل میں امرتسر کے بعد ایک نئے دور' ایک نئے عہد کا آغاز ہوا۔ یہ دور قریباً بارہ تیرہ برس تک رہا۔ اب میں نے بھی افسانے لکھنے شروع کر دیئے تھے۔ گوالمنڈی کا خوبصورت اور یادگار دور ختم ہو گیا۔ میں فلیمنگ روڈ اور اس کے بعد سمن آباد میں منتقل ہو گیا۔ حسن بخت چشتیہ ہائی سکول میں بچوں کو پڑھانے لگا۔ اس سے اب کبھی کبھی ملاقات ہونے لگی۔ ریڈیو پاکستان لاہور کے مشاعرے میں شرکت کیلئے آتا تو دور ہی سے دونوں بازو پھیلا کر کہتا۔

''یار میں آ گیا ہوں۔''

اور پھر ہم دونوں چائے پر بیٹھ جاتے اور امرتسر والے کمپنی باغ کی طرح ''چھوٹی چھوٹی باتوں پر'' اتنا ہنستے' اتنا ہنستے کہ ہمارے اردگرد پلاٹ میں بیٹھی ہوئی چڑیاں ڈر کر اڑ جاتیں۔ میرے ایک دوست کا بچہ چشتیہ ہائی سکول میں پڑھتا تھا۔ وہ ایک جماعت میں فیل ہو گیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں کسی ٹیچر سے بات کروں کہ وہ اسے اگلی جماعت میں چڑھا دے۔ میں نے حسن بخت سے ذکر کیا تو اس نے کہا۔

''یار حمید! تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ میں ایماندار آدمی ہوں۔ لڑکا فیل ہو چکا ہے۔ اگلی جماعت میں نہیں چڑھ سکتا۔ ہاں میں اتنا کر سکتا ہوں کہ اسے محنت کراؤں تاکہ وہ اگلے سال اچھے نمبروں میں پاس ہو جائے۔'' اور اگلے برس جب اس لڑکے کا باپ مجھے ملا تو اس نے میرا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں تھام کر کہا۔

''حمید صاحب! آپ کے دوست نے میرے بچے کو بڑی محنت کرائی۔ وہ نہ صرف اول آیا بلکہ اسے وظیفہ بھی مل گیا ہے۔'' حسن بخت سے میں نے اس کا ذکر کرتے ہوئے شکریہ ادا کیا تو اس نے میرے کندھے پر زور سے ہاتھ مار کر قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''یار یہ تم کہہ رہے ہو! میری جان! یہ تو ہر ٹیچر کا فرض ہے کہ وہ بچے کو جی لگا

کر پڑھائے......اور پھر میں تو بچوں کا اس طرح خیال رکھتا ہوں کہ جیسے وہ میرے بچے ہیں۔'' حسن بخت کے بال سفید ہو گئے تھے اور وہ خضاب لگانے لگا تھا۔ ''ہر شاخ گل صلیب'' اس کا مجموعہ کلام چھپا تو کتاب لے کر میرے پاس ریڈیو اسٹیشن آیا۔

''حمید! تمہیں اپنا مجموعہ کلام دیتے ہوئے مجھے بڑی خوشی ہو رہی ہے۔ خدا کی قسم سچ کہہ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اوئے مجموعہ کلام کیا ہوتا ہے کمینے؟''

اس پر وہ اس قدر ہنسا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ماتھے پر پسینے کے قطرے جھلملانے لگے۔ مجھے امرتسر کے کمپنی باغ کا حسن بخت یاد آ گیا۔ سیاہ گھنگریالے بال، مضبوط بھرپور سفید دانت، چوڑے شانے، خاکی قمیض شلوار اور جیب میں پاسنگ شو کے سگریٹ۔ دھوپ کمپنی باغ کے درختوں کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھتی گئی۔ سائے پیچھے رہ گئے۔ وقت گزرتا گیا۔ حسن بخت دھوپ کی روشنی کے ساتھ آگے نکل گیا۔ ہم سائیوں کے ساتھ پیچھے رہ گئے۔ ایک روز اخبار اٹھایا تو حسن بخت کے انتقال کی خبر تھی۔ کمپنی باغ کا ایک اور درخت ٹوٹ کر گھاس پر گر پڑا تھا۔ دو روز بعد اسی اخبار میں خبر پڑھی کہ حسن بخت کو سپرد خاک کر دیا گیا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

☆......☆......☆

شاعر ایوب رومانی

وائس آف امریکہ کی دوسری مجلس کا پروگرام دن کے ساڑھے بارہ بجے ختم ہوتا ہے۔ پہلی مجلس میں خبریں پڑھتا ہوں۔ دوسری مجلس میں کبھی خبریں پڑھتا ہوں اور کبھی اناؤنسمنٹ کرتا ہوں۔ دوسری مجلس کا پروگرام ختم کرنے کے بعد ہمارا لنچ کا وقفہ شروع ہو جاتا ہے جو 45 منٹ کا ہوتا ہے۔ کل میں دن کے ساڑھے بارہ بجے دفتر کی وسیع و عریض عمارت کے تھرڈ سٹریٹ والے دروازے سے نکل کر لاں فاں پلازہ کی طرف چل دیا۔ یہ علاقہ واشنگٹن کے خوبصورت ترین علاقوں میں سے ہے۔ یہاں لاں فاں پلازہ بلڈنگ کی پہلی منزل میں بہت بڑی مارکیٹ ہے۔ یہاں دنیا کی ہر شے ملتی ہے۔ شیشے کے دروازوں والی چمکیلی دکانیں اور ریستوران جہاں بیٹھ کر لنچ کے اوقات میں عورتیں اور مرد مختلف قسم کے کھانے کھاتے ہیں اور بیئر پیتے ہیں۔ یہاں ایک ریستوران میں ہالینڈ کی بیئر اور یونانی کھانا بہت پسند کیا جاتا ہے۔ کالی مرچ اور مصالحے میں بھنا ہوا گوشت، دہی، سلاد اور مائیکرو ویو تنور میں پکی ہوئی روٹی۔ کبھی کبھی میں دوستوں کے ساتھ یہاں آ کر دوپہر کا کھانا کھاتا ہوں۔ کل میں اکیلا ہی یہاں آ کر بیٹھ گیا۔ کھانے کے بعد میں سگریٹ پی رہا تھا کہ میری نظر کاؤنٹر پر پڑی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایوب رومانی میری طرف پیٹھ کیے کھڑا کاؤنٹر گرل سے باتیں کر رہا ہے۔ وہی قد کاٹھ، ویسے ہی گنجان سفیدی مائل سیاہ بال۔ میں اٹھنے ہی والا تھا کہ وہ مڑا۔ اب جو دیکھتا ہوں تو وہ ایوب رومانی نہیں تھا۔ اسے ایوب رومانی ہونا بھی نہیں چاہئے تھا۔ کیونکہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ ایوب رومانی پیچھے سے تو ایوب رومانی ہو اور سامنے سے کچھ اور ہو۔ وہ پیٹھ پیچھے بھی وہی ہے اور منہ پر بھی وہی ہے۔

ایوب رومانی سے میری پہلی ملاقات لاہور ریڈیو سٹیشن پر ہوئی۔ یہ غالباً 1948ء کا زمانہ تھا۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آپ کسی سے پہلی بار ملتے ہیں تو وہ پہلی اور آخری ملاقات ثابت ہوتی ہے اور کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پہلی ملاقات وقت کی قید سے نکل کر صدیوں پر پھیل جاتی ہے اور یہ یاد ہی نہیں رہتا کہ آپ اس شخص سے پہلی بار کس موسم میں ملے تھے اور کیا کیا باتیں ہوئی تھیں؟ مجھے اتنا تو یاد ہے کہ ایوب رومانی سے میں پہلی بار لاہور ریڈیو سٹیشن پر ملا تھا۔ لیکن یہ یاد نہیں کہ موسم کیسا تھا؟ درختوں کے پتے گر رہے تھے یا شاخوں پر سے نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ ہم نے کس موضوع پر بات چیت کی تھی اور کیسے کپڑے پہن رکھے تھے۔ ماضی کے شالامار باغ میں داخل ہو کر جب میں دور دھندلے درختوں والے 1948ء والے تختے کی طرف دیکھتا ہوں تو مجھے ایک دراز قد سرخ و سفید خوبصورت کشمیری نوجوان دکھائی دیتا ہے۔ بال گھنے سیاہ گھنگریالے ہیں' چہرے پر مسکراہٹ کی شگفتگی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ریڈیو سٹیشن پر بیشتر خوش شکل لوگ دیکھنے میں آتے تھے۔ خوش شکل' خوش ذوق' خوش وقت اور شعر و ادب سے وابستگی رکھنے والے۔ ان دنوں ریڈیو سٹیشن پر صرف وہی لوگ نوکری کرتے تھے جو اور کسی جگہ نوکری کرنا پسند نہ کرتے ہوں۔ آج کی طرح نہیں تھا کہ ایک درخواست پولیس ڈیپارٹمنٹ کو ایک عرضی کارپوریشن کو اور ایک درخواست ریڈیو سٹیشن کو لکھ دی۔ اس خیال سے کہ جہاں نوکری مل جائے گی کر لیں گے۔ ریڈیو سٹیشن کی فضا میں صرف وہی لوگ داخل ہوتے تھے جو اس فضا کیلئے بنائے گئے تھے اور جن کا دوسرے دفتروں کی فضا میں دم گھٹتا تھا۔ ایوب رومانی ریڈیو سٹیشن کی طرح اس زمانے کی سنہری روایات کی علامت ہے اور میرا خیال ہے کہ ریڈیو کی دو ایک آخری نشانیوں میں سے ہے۔ میں جب ریڈیو سٹیشن میں اس کے کمرے میں جاتا تھا تو محسوس ہوتا تھا کہ میں ریڈیو سٹیشن میں ہوں۔ سٹیشن ڈائریکٹر تک کے کمرے میں خالص کلرکوں ایسا دفتر نما ماحول تھا اور وہاں بیٹھے مجھے محسوس ہوا کرتا تھا کہ میں کسی تھانے میں پوچھ گچھ کیلئے بلایا گیا ہوں۔

لاہور ریڈیو سٹیشن پر جب اسے دیکھتا ہوں تو یقین آتا ہے کہ میں ریڈیو سٹیشن میں ہوں۔ وہی ریڈیو سٹیشن کے پرانے' سنہری دور والی بے ساختگی' عدم منافقت' خوش فکری' خوش خیالی' خوش شکلی' کشادہ دلی اور اپنے عہدے کی ترقی اور تنخواہ کے گریڈوں

سے بے نیازی' چائے کی خوشبو' سگریٹ کی مہک اور شعر و ادب کی باتیں' موسیقی کی باتیں' کلاسیکی موسیقی کے بڑے بڑے استادوں کی باتیں۔ اس کے دفتر سے باہر نکلتا ہوں تو منافقت' بے مروتی' بے حسی' دل آزاری' انسان دشمنی اور بدصورتی شروع ہو جاتی ہے۔ پر کبھی کبھی' کہیں کہیں' کسی کے کمرے میں سے محبت کی دبی دبی سی آواز سنائی دیتی ہے' جیسے کسی بہت بڑے پتھر کے نیچے کوئی پھول کھلا ہوا ہو۔ کوئی پھول دبا ہوا ہو۔ جیسے کسی اہرام کے اندھیرے تہہ خانے میں سے لوبان کی دھیمی دھیمی مہک آ رہی ہو۔ جیسے کوئی گہرے کنویں میں سے کسی کو آواز دے رہا ہو اور تھوڑی دیر کے بعد یہ محبت' یہ خوشبو' یہ آواز غائب ہو جاتی ہے اور میں دیکھتا ہوں سامنے ریڈیو پاکستان لاہور کا سرسبز و شاداب صحن ہے اور دیوار کے ساتھ ساتھ سرو اور یوکلپٹس کے درختوں کی قطار چلی گئی ہے۔ ان درختوں نے کئی برکت علی خانوں' بشیر علی ماہیوں اور ساغر صدیقیوں کو پچیس روپے کے چیک کے لئے جولائی کی تیز دھوپ اور دسمبر کی برفیلی بارشوں میں ریڈیو سٹیشن کے چکر لگاتے اور پروڈیوسروں کے لئے پان سگریٹ لاتے دیکھا ہے۔ پسینہ بہہ رہا ہے' سردی میں ٹھٹھر رہے ہیں۔ پیٹ خالی ہے' جیب خالی ہے' بال بچوں کے لئے آٹا لانا ہے۔ پروڈیوسر کے لئے برابر کا الائچی والا' لونگ والا' تمباکو والا پان بھی لانا ہے۔ چونی کا پان آ گیا ہے' بس کا کرایہ پان والے کو' پروگرام والے کو دے دیا ہے۔ اب ریڈیو سٹیشن سے دھوپ کی تپش میں' سرد ہواؤں کے تھپیڑے کھاتے' پیدل ہی مصری شاہ' شاد باغ اور چونا منڈی جانا ہوگا۔

ریڈیو پاکستان لاہور کے درختوں کو ریڈیو کے پروگراموں کی حاجت نہیں ہے۔ ورنہ وہ کھڑے کھڑے سوکھ جاتے۔ دیکھتے دیکھتے ان کی شاخوں میں آگ لگ جاتی اور ان پر کھلے ہوئے پھول انگارے بن کر گرنے لگتے۔ یہ انسانوں ہی کا حوصلہ ہے کہ ملامتیں سہہ کر بھی زندہ ہیں۔ آگ میں بھی نہیں جلتے اور اپنے سینوں کے اندر شعر و ادب اور موسیقی کے سروں کے پھولوں کو سمیٹے رکھتے ہیں۔ لیکن لاہور ریڈیو کے صحرائے اعظم میں جب کوئی فن کار پیاس سے نڈھال ہو کر اپنی جلتی ہوئی شاخوں کو پھیلائے ایوب رومانی کے کمرے میں داخل ہوتا ہے تو آگ بجھ جاتی ہے۔ اور شاخیں پھر سے ہری بھری ہو جاتی ہیں اور خشک پیاسے ہونٹوں پر ٹھنڈی شبنم کے قطرے گرنے

لگتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ایوب رومانی کا کمرہ فنکاروں کے لئے خاص طور پر صحرائے اعظم میں ایک نخلستان کی مانند ہے۔ جہاں کھجور کے جھنڈوں میں، ٹھنڈی چھاؤں میں، ٹھنڈے میٹھے پانی کا چشمہ بہتا ہے۔ جب مسافر یہاں آتے ہیں تو سکھ کا سانس لیتے ہیں اور اپنی بھوک مٹاتے ہیں۔ ایوب رومانی اپنے میز کی دراز کھول کر تمباکو نکال کر سگریٹ بناتا ہے اور دوسری دراز کھول کر کسی کو میٹھا پھل اور کسی کو چشمے کا ٹھنڈا پانی دیتا ہے اور چپڑاسی کو بلا کر کہتا ہے۔

''فل سیٹ چائے لاؤ اور معین سے کہنا کہ کچھ کباب اور بسکٹ بھی دے دے۔''

اسی ریڈیو سٹیشن میں ایک ایسا کمرہ بھی ہے جہاں جو مہمان آتا ہے وہ میزبان کے لئے چائے اور بسکٹ بھی منگواتا ہے۔ اس کمرے میں مہمان کا فرض ہوتا ہے کہ وہ میزبان کی مہمان نوازی کرے۔ اپنے میزبان کیلئے پان سگریٹ لائے۔ ماچس جلا کر ان کا سگریٹ سلگائے۔ اس کی خدمت میں کوئی نذر پیش کرے لیکن ایوب رومانی کے کمرے میں بن بلائے مہمان کی بھی خدمت کی جاتی ہے اور میزبان کی طرف سے نذر پیش کی جاتی ہے۔

ایوب رومانی کے اپنے دوسرے بلوں کی طرح اس کا کینٹین کا بل بھی بڑا ہوش اڑا دینے والا ہوتا ہے۔ میں اس کے سامنے صوفے پر بیٹھا ہوں، مہینے کی آخری تاریخیں ہیں۔ ایوب ہنس ہنس کر مجھ سے باتیں کر رہا ہے۔ سگریٹ اس کی انگلیوں میں سلگ رہا ہے۔ کینٹین کا ملازم آتا ہے اور اس کی میز پر کینٹین کا بل اور پرچیوں کا گٹھا رکھ کر چلا جاتا ہے۔ ایوب بل دیکھ کر سر کھجاتا ہے اور کہتا ہے۔

''خواجہ! بڑا بل بن گیا ای ایس وار۔''

مگر اس کا ہر بار اتنا ہی بل بنتا ہے۔ حالانکہ میں نے بہت ہی کم اسے چائے کے ساتھ کچھ کھاتے دیکھا ہے اور ایسا تو کبھی دیکھا ہی نہیں کہ کوئی شخص اس کے کمرے میں داخل ہو کر بیٹھ جائے اور پھر چائے پئے بغیر وہاں سے واپس جائے۔ ایوب کے کمرے میں ایسے لوگ بھی کھانا کھا لیتے ہیں جو گھر سے کھانا کھا کر آئے ہوں۔ لوگ ایوب سے واپس دینے کیلئے بھی قرض لیتے ہیں اور کبھی واپس نہ دینے کے لئے بھی قرض

لیتے ہیں۔ وہ دو چار بار اونچی آواز میں پوچھ لیتا ہے۔

''اوئے تو نے پہلی کا وعدہ کیا تھا۔ اوئے تیری پہلی نہیں آئی ابھی۔''

اور دو تین بار یاد دہانی کرانے کے بعد ایوب رومانی خود بھول جاتا ہے کہ میں نے کسی فنکار سے کچھ پیسے واپس لینے ہیں۔ پھر جب کوئی فنکار اس سے بطور قرض لیے ہوئے پیسے واپس کرتا ہے تو ایوب رومانی سر کھجاتے ہوئے گردن ٹیڑھی کر کے پوچھتا ہے۔

''بیٹے! یہ مجھے کیوں دے رہے ہو۔''

ایوب رومانی نے ہمیشہ اچھے اور قیمتی کپڑے پہنے ہیں۔ اب وہ کپڑوں سے کسی حد تک بے نیاز ہو گیا ہے۔ لیکن نوجوانی میں جب وہ ریڈیو سٹیشن کی پرانی عمارت میں داخل ہوتا تھا تو لگتا تھا کہ کوئی داخل ہوا ہے۔

اس زمانے میں، میں خود بڑا خوش لباس تھا۔ چنانچہ ہم ایک دوسرے کے سوٹ کے کپڑوں، ٹائیوں اور گرم قمیصوں کے بارے میں ضرور تبادلہ خیال بھی کرتے تھے۔ ریڈیو سٹیشن پر خوش لباس اور خوش شکل اور خوش خیال لوگوں کا آخری زمانہ تھا۔ اس کے بعد لوگوں نے وہاں کپڑے ضرور پہنے ہیں مگر لباس نہیں پہنا۔ ریڈیو سٹیشن کی پرانی عمارت میں اس زمانے میں بھی ایوب رومانی کے کمرے میں سدا ورت لگا رہتا تھا۔ چائے اور پان سگریٹ کے دور چلا کرتے تھے اور وہ کبھی اس جیب میں ہاتھ ڈال کر، کبھی اس جیب میں ہاتھ ڈال کر، کبھی کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر، کچھ نہ کچھ نکال کر ضرورتمندوں کو ضرور دے دیا کرتا تھا۔ اس کے کمرے میں ایسے ضرورت مند بھی آتے جنہیں کچھ کھانا ہوتا اور ایسے ضرورت مند بھی آتے جنہیں کچھ پینا ہوتا تھا۔ دوسری قسم کے ضرورت مندوں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی۔ اتفاق سے اگر ایوب رومانی کے پاس پیسے نہ ہوتے یا کم ہوتے یا اس نے کسی ناگزیر ضرورت کے لئے رکھے ہوتے تو وہ اپنے کسی دوست سے قرض لے کر بھی دے دیا کرتا تھا۔ یعنی ایوب ادھار لے کر بھی ادھار دے دیا کرتا تھا۔

ہمارے ریڈیو کے ایک سازندے ہیں۔ میں ان کا نام نہیں لوں گا۔ ہم انہیں کندرم کہا کرتے تھے۔ اس کا کام یہ تھا کہ ایوب رومانی کے کمرے میں آیا۔ جھک کر

اس کے کان میں کچھ کھسر پھسر کی اور پھر کھڑے ہو کر مسکرانے لگا۔ ایوب رومانی نے گردن ٹیڑھی کر کے اس کو دیکھا۔ ایک گالی دی۔ انگلیوں میں سلگتا ہوا سگریٹ اپنے ہونٹوں میں دبایا' دایاں ہاتھ جیب میں ڈال کر کچھ نوٹ نکالے اور کندرم کو میز کے نیچے سے تھما دیئے اور کندرم لمبے لمبے ڈگ بھرتا سلام کر کے کمرے سے نکل گیا۔ سٹیج کا پردہ ایک بار پھر اٹھتا ہے۔ کندرم سلام کر کے کمرے میں داخل ہوا' لمبے لمبے ڈگ بھرتا ایوب رومانی کے پاس آیا۔ مٹھی میں دبائی ہوئی قرض کی رقم جھک کر اس کے حوالے کی۔ سلام کیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا کمرے سے نکل گیا۔ ایسے منظر ایوب رومانی کے کمرے کی سٹیج پر کئی بار دیکھنے میں آتے تھے اور آتے ہیں' اس کا سدا ورت آج بھی لگا ہے۔

ایوب رومانی طبعاً بھولا ہے۔ زبان سے اگرچہ وہ کہتا ہے کہ میں سامنے آتے ہی آدمی کو پہچان جاتا ہوں مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑی آسانی سے دھوکہ کھا جاتا ہے اور اسے موقع واردات پر پتہ بھی نہیں چلتا کہ ابھی ابھی جس سے وہ باتیں کر رہا تھا وہ اس کا کوٹ اتار کر لے گیا ہے پھر جب تھوڑی دیر بعد اسے سردی کا احساس ہوتا ہے تو سر جھٹک کر کہتا ہے۔

''آج پھر کوٹ گھر بھول آیا ہوں۔''

ایوب رومانی خود کوٹ اتار کر دے دینے والا آدمی ہے' مگر لوگ خود بھی اس کا کوٹ اتار لیتے ہیں اور اسے خبر بھی نہیں ہوتی۔ وہ دنیاداری کی باتیں بڑے اعتماد سے کرتا ہے۔ کاروباری رموز بیان کرتا ہے لیکن نہ اسے دنیاداری آتی ہے اور نہ کاروبار کی گہرائیوں میں اتر کر بہی کھاتوں کے دیوان مرتب کرنے آتے ہیں۔ اس کی وجہ محض یہ ہے کہ وہ طبعاً بھولا اور بے نیاز ہے۔ اگر دل نہیں مانتا تو اپنا فائدہ چھوڑ کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہو گا۔ جس شخص کے بارے میں وہ جو رائے رکھتا ہے اس کے منہ پر بیان کر دے گا۔ چاہے دوسرا اسے پسند کرے یا نہ کرے۔ بھلا ایسا آدمی کاروباری اور دنیادار ہو سکتا ہے؟ کاروبار اور دنیاداری تو یہ سکھاتی ہے کہ جس شخص کے سر پر بال نہیں اسے یہ کہو کہ آپ کے بال کس قدر گھنے اور خوبصورت ہیں لیکن ایوب رومانی ایسا نہیں کر سکتا۔ بعض لوگوں کے چہرے کی کھال اتنی سخت ہوتی ہے کہ وہ جو کچھ سوچتے ہیں اس کا معمولی سا اشارہ بھی ان کے چہرے سے نہیں ملتا۔ لیکن ایوب رومانی کے چہرے پر اس کے

کردار کے خیالوں کا براہ راست عکس پڑتا ہے۔ وہ آپ کے بارے میں جو سوچ رہتا ہوتا ہے وہ اس کے چہرے کے سرورق پر تحریر ہونے لگتا ہے۔ آپ اس تحریر کو صاف صاف پڑھ سکتے ہیں اور اگر آپ پڑھ نہیں سکتے تو دوسرے لمحے وہی تحریر ایوب کی زبان پر آ جاتی ہے۔ اس کا دل اس کی زبان میں دھڑکتا ہے۔ وہ جو زبان سے کہتا ہے وہی اس کے دل میں ہوتا ہے اور جو اس کے دل میں ہوتا ہے وہی اس کی زبان پر آتا ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں ہے کہ جن کی زبان تو آپ کی تعریف بیان کر رہی ہو اور دل آپ کو کنویں میں دھکا دینے کے منصوبے بنا رہا ہو۔

سُر نے اس کے دل میں گداز پیدا کر دیا ہے۔ جب وہ کلاسیکی موسیقی پر باتیں کر رہا ہوتا ہے تو اس کے سرخ و سپید چہرے پر ایک چمک سی آ جاتی ہے۔ جس طرح کوئی فانوس کے اندر موم بتی روشن کر کے رکھ دے۔ وہ خان صاحب وحید خان سے لے کر آج کے کلاسیکی گویوں تک ہر ایک پر بات کرتا ہے۔ ان کے اسلوب اور گائیکی کا تجزیہ کرتا ہے۔ کلاسیکل موسیقی کے گہرے اسرار و رموز بیان کرتا ہے۔ کس راگ کی شکل کونسا سر ذرا چڑھا کر لگانے سے کیسے کیسے بدل جاتی ہے؟ فلاں گویا فلاں سر کیسے لگایا کرتا تھا۔ اور کون سا سر کس راگ میں بھر کر لگایا جاتا ہے۔ گویا اسے چھو کر گزر جاتا ہے اور یہ بڑا مشکل کام ہے۔ موسیقار ایوب رومانی سے پیار کرتے ہیں اور وہ بھی ان سے پیار کرتا ہے۔ وہ ان کا افسر ہے مگر ان کے ساتھ بھائیوں کی طرح گھل مل جاتا ہے۔ وہ گردن اکڑا کر ان کے سلام کا انتظار نہیں کرتا کہ کب وہ لوگ سلام کریں اور یہ محض گردن ہلا کر جواب دے اور پائپ جھاڑتا ہوا گزر جائے۔ وہ ان درد دل رکھنے والے سازندوں اور موسیقاروں کی جھکی ہوئی گردنوں پر اپنی نخوت اور غرور کی پرورش نہیں کرتا۔ وہ خود انہیں سلام کرتا ہے اور آگے بڑھ کر گلے لگتا ہے۔ وہ اپنے چپڑاسی کو بھی بیٹا کہہ کر بلاتا ہے اور سٹاف کے کسی آدمی سے کوئی غلطی ہو جائے تو وہ اسے معاف کر دیتا ہے۔ کمرے میں بلا کر یا خود اس کے پاس جا کر تھوڑی سی سرزنش کرتا ہے اور پھر کہتا ہے۔

''یار برا نہ ماننا ویسے آگے سے خیال رکھنا۔''

اور ہاتھ جھٹک کر اپنے کمرے کی طرف چل پڑتا ہے۔

علم موسیقی کے میدان میں وہ بھائی لعل امرتسری کا شاگرد ہے۔ بھائی لعل کی اس نے بڑی خدمت کی ہے اور بھائی لعل نے بھی اسے علم موسیقی کے لعل ہائے گراں بہا سے نوازا ہے۔ اپنے استاد کی باتیں کرتے ہوئے وہ جذباتی ہو جاتا ہے۔ موسیقی کی باتیں ریڈیو سٹیشن پر دوسرے لوگ بھی کرتے ہیں۔ میرا مطلب ہے دوسرے افسر بھی کرتے ہیں مگر وہ جذباتی نہیں ہوتے بلکہ پتھر کی طرح سخت بنے رہتے ہیں۔ ان کے بے حس، بے جان اور پتھریلے چہرے پر کوئی چمک نہیں آتی مگر ایوب رومانی جذباتی ہو جاتا ہے۔ اس کا چہرہ اور لہجہ موسیقی کے سروں میں ڈھلنے لگتا ہے۔ اس وقت وہ مجھے بڑا پیارا لگتا ہے کیونکہ میں خود اپنے استاد کی باتیں کرتے ہوئے جذباتی ہو جاتا ہوں۔

ایوب رومانی کو اپنے استاد سے عشق کی حد تک پیار ہے۔ ایک روز وہ مجھے بتانے لگا۔

''ایک بار استاد برکت علی خاں کلکتے گئے۔ واپس آئے تو میری بیوی کے لئے کشمیری شال لیتے آئے۔ انہوں نے شال میری میز پر رکھ دی۔ میں نے پوچھا کہ اس کا ہدیہ کیا پیش کروں؟ خان صاحب باقاعدہ رونے لگے اور بولے میں تو تمہیں بیٹا سمجھ کر یہ شال لایا تھا۔ تم تو افسر نکلے۔''

اتنا کہہ کر ایوب رومانی پر رقت طاری ہو گئی۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اس نے جلدی سے رومال نکال کر آنکھیں پونچھیں سگریٹ سلگایا اور چپڑاسی کو بلا کر کہا۔

''بیٹے ہاف سیٹ' نہیں فل سیٹ چائے لے آ' تم بھی پینا۔''

یہ رقت میں نے ریڈیو کے کسی بھی افسر میں نہیں دیکھی کہ جو واقعی موسیقی کو جانتا بھی ہو۔ ویسے تو ریڈیو کا ہر دوسرا پروڈیوسر سر پر سر ملانا جانتا ہے اور کئی تو انگلیوں پر ماترے بھی گننے لگتے ہیں لیکن سر ان کے دل میں اثر نہیں کرتا۔ سر ان کے دل میں گداز پیدا نہیں کرتا۔ ان پر رقت کبھی طاری نہیں ہوتی۔ سر کا تیر ان کی کھوپڑی کے پتھر سے ٹکرا کر نیچے گر پڑتا ہے لیکن یہ تیر ایوب رومانی کے دل سے پار ہو چکا ہے بلکہ میں یہ کہوں گا کہ نیم کش ہے۔ اس گداز نے اس کی شخصیت میں محبت کی کبھی نہ بجھنے والی شمع روشن کر رکھی ہے۔ لوگ اس کے پاس بیٹھ کر سکون محسوس کرتے ہیں۔ وہ ایوب رومانی کے کمرے میں اپنے دکھ درد بھول جاتے ہیں۔ گویا محبت کے لطیف بازو انہیں اپنے سینے

سے لگا لیتے ہیں۔ یہ فضا ریڈیو سٹیشن کے کسی دوسرے کمرے میں انہیں نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ایوب رومانی کے کمرے میں آپ کو کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی وقت لاہور کا کوئی نہ کوئی موسیقار مل جائے گا۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ رقت' یہ گداز خدا کی دین ہے۔ وہ جسے چاہے دے دیتا ہے جسے نہ چاہے نہیں دیتا۔ لوگ چاہے جتنی ٹکریں ماریں یہ گوہر یک دانہ ہاتھ نہیں آتا۔ یہ گوہر بے بہا یا تو مفت ملتا ہے یا پھر کسی بھی قیمت پر نہیں ملتا۔

اور یہ گوہر یک دانہ ایوب رومانی کو خدا نے عطا کر رکھا ہے۔ اس شمع کی روشنی سے اس کا سینہ روشن ہے۔ اس اترے ہوئے ریکھب کے درد نے ایوب رومانی کو محبت کی ان وادیوں میں پہنچا رکھا ہے جہاں ہر انسان سے محبت کی جاتی ہے۔ اس مضراب نے اس کے جسم کی ایک ایک رگ کو ایسے سر کیے ہوئے تار میں بدل دیا ہے کہ اس کے ایک بار چھڑنے سے ہزار بار آنس پیدا ہوتی ہے۔ ایوب رومانی اٹنگ آدمی نہیں ہے۔ وہ مینڈھ کا آدمی ہے۔ اس کی شخصیت کے روہی امروہی میں ساتوں سر لگتے ہیں۔ وہ کسی سر کو محض چھو کر نہیں گزرتا۔ وہ ہر سر کو ساتھ لے کر چلتا ہے اور اس کا پورا پورا حق ادا کرتا ہے۔ جس طرح وہ اپنی بیوی اور بچوں کے حق ادا کرتا ہے۔ وہ تو اپنے ان دوستوں کے بھی حق ادا کرتا ہے جن کا اس پر کوئی حق نہیں ہوتا۔ اگر کوئی اسے کہے کہ فلاں شخص کی مدد کرنے سے تم خود کسی مصیبت میں نہ پھنس جانا تو وہ سر کھجاتے ہوئے ہاتھ جھٹک کر کہے گا۔

''چھڈ یار......کوئی گل نہیں۔''

ایوب رومانی کشمیری ہے اور دوسرے کشمیریوں کی طرح اسے بھی صرف کھانے کا ہی نہیں کھلانے کا بھی شوق ہے۔ خود چاہے کم کھائے مگر دوسروں کو کھلانے کیلئے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ میل ملاقات یا کسی معمولی سے فنکشن یا تقریب کی بات ہو تو ایوب رومانی ایک جملہ ضرور کہتا ہے۔

''اوئے یار فیر پلاؤ شوربہ پکالیں گے ساتھ۔''

ایوب رومانی دوسروں کی دعوت کرنے کا ذرا سا بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ حالانکہ لوگ دعوت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ایک بار باغ جناح کے

اوپن ایئر تھیٹر میں کنسرٹ ہوا۔ ایوب رومانی ذرا دیر سے وہاں پہنچا۔ اس نے ایک آدمی کو دو سو روپے دے کر کہہ دیا کہ سازندوں کیلئے پچھلی تان لے جانا۔

''اور میرے لئے بھی رکھ چھوڑنا' ہاں۔''

وہ جب رات کو اوپن ایئر تھیٹر پہنچا تو اس کے لئے کھانے کو سوائے ڈیڑھ ایک نان اور چٹنی کے کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ اس نے اتنی موٹی گالی دی اور وہ پتلا سا نان ہی چٹنی کے ساتھ کھا کر کنسرٹ سننے بیٹھ گیا۔ ایوب رومانی کی خالص پنجابی اور کشمیری گالیاں بڑی مزے دار ہوتی ہیں۔ وہ گالیوں کا ماہر نہیں ہے مگر گالی بڑے سر میں دیتا ہے اور اس کا بھی پورا پورا حق ادا کرتا ہے۔ اس کی گالیوں کے سارے سر چڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ شارٹ ہینڈ میں گالی دیتا ہے یعنی زبان سے گالی کا محض ایک لفظ بولے گا اور باقی گالی وہ آنکھ مار کر یا گردن ہلا کر پوری کرے گا اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی ایک فن ہے۔ ویسے وہ گالی اسی کو دیتا ہے جس سے وہ پیار کرتا ہے۔ یہ بھی ایک متنازعہ مسئلہ ہے کیونکہ ایوب رومانی دشمن کو دشمن ضرور سمجھتا ہے مگر اس سے نفرت نہیں کرتا۔ وہ اپنے دشمن کے خلاف سازش کا دام نہیں بچھاتا۔ بلکہ دشمن کی سازشوں سے ہوشیار رہتا ہے اور وقت آنے پر دشمن کو معاف بھی کر دیتا ہے اور اس کے خلاف دل میں کوئی کدورت نہیں رکھتا۔ وہ بغض اور کدورت کا آدمی نہیں ہے۔ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ اس کے دل کے آئینے میں ان منفی جذبوں کا زنگار نہیں ہے۔ وہ دوستوں کا غم خوار ہے' دوستوں کی غم خواری ہی ایوب کی شخصیت کے راگ کی استھائی ہے۔ وہ ایک ہزار ایک تان پلٹے مار کر واپس اپنی استھائی پر آ جاتا ہے۔ دوستوں کی غم خواری میں بھی آپ اسے کبھی بے سرا نہیں پائیں گے۔ وہ ان جذبوں میں بڑے صحیح اکار کا آدمی ہے اور صحیح اکار بھی خدا کی دین ہے۔

ایوب رومانی شاعر بھی ہے۔ رومانی اس کا تخلص ہے۔ اس مخلص آدمی کو یہ تخلص اچھا لگتا ہے۔ اصل میں لوگ رومانی اسے سمجھتے ہیں یا سمجھنا چاہتے ہیں کہ جو رومان کی دنیا میں گم ہو اور بال بکھرائے سگریٹ سلگائے دور خلاؤں میں گھور رہا ہو۔ یہ اصطلاح بڑی گمراہ کر دینے والی ہے۔ میرے خیال میں رومانی وہ انسان ہے جو انسانوں سے پیار کرتا ہو۔ ان کا بھلا چاہتا ہو اور دکھ درد میں ان کی ہر ممکن مدد کرنے پر تیار رہتا ہو۔ ایسے

آدمی کو چمن میں جا کر گلاب کے پھولوں کو دیکھنے یا حسین وادیوں میں بنفشے کے جنگلی پھولوں سے بھرے ہوئے راستوں میں خوش خرامی کرنے کی حاجت نہیں ہوتی کیونکہ بنفشے کے پھول ان کے دلوں میں کھلے ہوتے ہیں اور گلاب کے سرخ پھولوں سے بھری ہوئی وادیاں ان کے جسم میں پھیلی ہوتی ہیں اور میٹھے پانیوں کے چشمے ان کے رگ و پے میں جاری ہوتے ہیں۔ اس لئے ایوب کے تخلص سے میں کبھی نہیں چونکا کیونکہ بظاہر ایک نظر دیکھنے سے وہ رومانی کم اور باکسر زیادہ لگتا ہے لیکن میں اسے رومانی سمجھتا ہوں۔

اگرچہ اس نے بڑے خوبصورت دلکش گیت بھی لکھے ہیں مگر وہ غزل کا شاعر ہے اور بڑی عمدہ غزل کہتا ہے۔ وہ خود بحرِ طویل کا آدمی ہے مگر غزل چھوٹی بحر میں کہتا ہے۔ اس بحر میں تلاطم بھی ہوتا ہے اور سکون بھی۔ اس کے مضمون بھی غزل کے ہوتے ہیں اور بڑی مہارت سے انہیں باندھتا ہے۔

جب اس نے تازہ غزل کہی ہو اور اتفاق سے میں اس کے کمرے میں آ جاؤں تو پھر وہ بڑی محبت کے ساتھ اپنی تازہ غزل سناتا ہے۔ میز کے دراز میں سے ہزاروں کاغذ نکال کر ان میں سے غزل کا کاغذ تلاش کرتا ہے اور ایک ایک شعر تحت اللفظ پڑھ کر سناتا ہے۔ اس کے کمرے کی کھڑکی میں سے باہر باغ کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ باغ کی کیاریوں میں گلاب کے پھول کھلے ہوتے ہیں۔ اس باغ کی جانب سے تازہ ہوا آتی ہے' جس میں کبھی کبھی پھولوں کی خوشبو بھی ہوتی ہے۔ شہتوت اور دھریک کے درختوں پر بلبلیں بول رہی ہوتی ہیں۔ سردیوں کی دھوپ میں بیری کے درخت کے پتے چمک رہے ہوتے ہیں اور ایوب رومانی رک رک کر دھیمے انداز میں اپنی غزل کے شعر سنا رہا ہوتا ہے۔ پیارے دوستوں کی رفاقتوں کے کچھ ایسے منظر بھی ہوتے ہیں جو یادوں کی محرابوں پر کندہ ہو جاتے ہیں۔ ایوب کے شعر سنانے کا منظر بھی میرے دل پر نقش ہے۔

سُر اور شعر کے لوگ عام طور پر حساب کتاب میں دلچسپی نہیں لیا کرتے مگر ایوب رومانی حساب کتاب بھی پوری توجہ سے کرتا ہے۔ اس نے ریڈیو کی طویل زندگی میں بہترین کمپوزیشن بنائی ہیں۔ بہترین ڈرامے پروڈیوس کیے ہیں۔ خوبصورت ترین غنائیے لکھے ہیں اور انہیں خود ہی پروڈیوس بھی کیا ہے۔ میوزک کے یادگار قسم کے فیچر لکھے ہیں۔ وہ اسسٹنٹ سٹیشن ڈائریکٹر کی حیثیت سے نظم و ضبط کا کام بھی کرتا رہا ہے اور

آج کل وہ ریڈیو سٹیشن کے سیلز کے شعبے کا ڈپٹی کنٹرولر ہے اور خالصتاً حساب کتاب کا کام کرتا ہے اور ایسی مہارت اور یکسوئی سے یہ کام کرتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے وہ حساب کتاب کا آدمی ہے حالانکہ ایسی بات نہیں ہے۔ وہ کتاب کا آدمی ضرور ہے مگر حساب کا آدمی نہیں ہے۔ جب وہ دفتر کے کام سے فارغ ہو جاتا ہے تو حساب بند کر کے کتاب کھول لیتا ہے اور اس کی شگفتہ بیانی' لطیفہ گوئی اور صحت مند بلند قہقہے مردہ دلوں میں بھی زندگی کا تازہ خون دوڑا دیتے ہیں۔

اسے سازندوں اور موسیقاروں کی ایسی ایسی دلچسپ باتیں اور ان کے لطیفے یاد ہیں کہ آدمی سنتا رہ جائے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس کی زبان سے کئی بار کا سنا ہوا لطیفہ بھی بالکل نیا لگتا ہے۔ اس میں حس ظرافت کمال کی ہے۔ بعض لوگوں پر لطیفے کا اثر بالکل نہیں ہوتا یا ہوتا ہے تو دیر بعد ہوتا ہے مگر ایوب رومانی کو آپ لطیفہ سنائیں وہ آدھے لطیفے میں ہی بات کی تہہ تک پہنچ جاتا ہے اس کے ہونٹوں پر مخصوص مسکراہٹ نمودار ہونے لگتی ہے۔ لوگ منہ کھول کر ہنستے ہیں۔ ایوب جی کھول کر ہنستا ہے۔ اسے بے اختیار ہنستا دیکھ کر دوسروں کے چہروں پر بھی مسکراہٹ آ جاتی ہے۔

لمبریٹا سکوٹر ایوب رومانی کے ساتھ بہت دیر تک چلا ہے۔ ایوب چونکہ اونچا لمبا اور تنومند آدمی ہے اس لئے سکوٹر اس کے نیچے دبا دبا سا رہتا تھا۔ آدھا سکوٹر اوپر سے ایوب کے لمبے اوورکوٹ نے ڈھانپ رکھا ہوتا۔ دور سے یوں لگتا جیسے ایوب رومانی بیٹھا بیٹھا چلا آ رہا ہے۔ سکوٹر کی گدی ایک طرف کو جھک گئی تھی۔ اس کے سارے کل پرزے کھڑکھڑانے لگے تھے۔ آخر خدا نے لمبریٹا سکوٹر کی دعا سن لی اور ایوب رومانی نے گاڑی خرید لی لیکن گاڑی نے بھی ایوب رومانی کا کچھ نہ بگاڑا۔ وہ اپنی نئی گاڑی میں بھی یوں بیٹھتا ہے جیسے سکوٹر پر بیٹھا ہو۔ جیسے ریڈیو کینٹین کے بنچ پر بیٹھا ہو۔ ایوب رومانی کے بارے میں یہ مضمون میں واشنگٹن میں اپنے اپارٹمنٹ کے بیڈ روم میں بیٹھا لکھ رہا ہوں۔ پینل کے شیشوں میں سے درخت نظر آ رہے ہیں جن کے پتے موسم خزاں کے استقبال میں سرخ ہو رہے ہیں۔ مجھے ایوب کے کمرے کا خیال آ رہا ہے جہاں بیٹھ کر میں چائے پیا کرتا تھا اور اس کی شگفتہ باتیں سنا کرتا تھا اور بیٹھ کر مجھے احساس ہوتا تھا کہ میں ریڈیو سٹیشن میں ہوں۔ کسی پولیس سٹیشن میں نہیں ہوں۔

ایوب رومانی کے بالوں میں برف گرنے لگی ہے لیکن اس برف کے نیچے اس کے بال سیاہ ہیں۔ چمکیلے ہیں اور اس کا دل دوستوں کی محبت سے معمور ہے۔ میں نے اسے دوستوں کے لئے دوسروں سے قرض لیتے دیکھا ہے۔ میں نے اسے ضرورت مندوں کے ہاتھوں میں میز کے نیچے سے پیسے پکڑاتے دیکھتا ہوں۔ میں اسے سکوٹر پر ریڈیو سٹیشن کے دروازے سے داخل ہوتے اور اپنی موٹر گاڑی میں ریڈیو سٹیشن سے باہر جاتے دیکھتا ہوں۔ ریڈیو سٹیشن کا چمن اسی ایک پھول سے مہک رہا ہے۔ یہ ریڈیو سٹیشن کے چمن کا آخری پھول ہے۔ یہ گاڑی میں بیٹھ کر یہاں سے نکل گیا تو ریڈیو کی سنہری روایات کی کتاب پر ختم شد لکھ دیا جائے گا۔ پھر آپ کو یہاں اکڑی ہوئی گردن والے آفیسر ملیں گے۔ خوبصورت' خوش لباس' خوش خیال' دردِ دل رکھنے والے ایوب رومانی نہیں ملیں گے۔

ایوب رومانی نے ایک بار مجھے خدا جانے کس راگ کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا تھا کہ اس راگ میں رکھب بھر کر نہیں لگایا جاتا صرف اسے چھو کر گزر جانا ہوتا ہے اور اس نے کہا تھا کہ یہ بڑا مشکل کام ہے۔ ایوب رومانی کیلئے دنیا ایک ایسا راگ ہے کہ جس میں دنیاداری کا سر بھر کر لگایا جاتا ہے مگر ایوب رومانی اسے چھو کر گزر گیا ہے اور بے سرا نہیں ہوا اور یہ بڑا مشکل کام ہے۔

☆......☆......☆

دلدار پرویز بھٹی

لاہور پریس کلب کے بانی صدر اور معروف ٹی وی اداکار اور پروڈیوسر ناصر نقوی صاحب نے بڑی دردمندی سے ایک خط لکھا ہے جو میں اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ناصر نقوی صاحب لکھتے ہیں:

محترم اے حمید صاحب!

السلام علیکم!

گزشتہ دنوں آپ کے کالم میں اردو اور پنجابی کے منفرد کہانی نویس' نواز صاحب کے بارے میں نہ صرف پڑھا بلکہ ان کے عہد جوانی کی ایک خوبصورت تصویر بھی دیکھی۔ یقین جانئے کالم پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ وہ لوگ بہت اچھے اور قابل فخر ہیں جو دنیا سے رخصت ہو جانے والوں کو ان کے کارناموں کے حوالے سے یاد رکھتے ہیں بلکہ ان کی اچھی اچھی باتیں دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔

30 اکتوبر ایک ایسا ہی دن ہے جب ہم سب کا پیار اور ہر دلعزیز دلدار پرویز بھٹی اس دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ نو سال قبل اس روز ہزاروں بلکہ لاکھوں افراد میرے سمیت آنسوؤں کا نذرانہ لے کر اس کے سفر آخرت میں شریک ہوئے۔ یہ دن میری زندگی کا اہم ترین دن تھا کیونکہ اللہ پاک نے اس دن مجھے اولاد نرینہ سے سرفراز فرمایا تھا لیکن دلدار پرویز بھٹی کی بڑی بڑی آنکھوں والا مسکراتا چہرہ میری نظروں کے سامنے تھا۔ جب میری شادی پر وہ میرے ایک عزیز کے بیٹے کو گود میں اٹھا کر میرے لئے اولاد نرینہ کے لئے ناچ ناچ کر دعا کر رہا تھا۔ وہ خود اس نعمت (اولاد) سے محروم ہونے کے باوجود ہر کسی کے لئے دعا گو ہوتا۔ اس لئے کہ وہ مصلحت خداوندی کو تسلیم

کرتے ہوئے ایک مطمئن زندگی گزار رہا تھا۔

وہ انگریزی کا ایک قابل استاد' کالم نویس' منفرد کمپیئر' باصلاحیت اداکار اور شاعر ہونے کے ناطے ایک دردمند دل رکھنے والا مخلص انسان تھا۔ اس لئے جب اس نے حکم ربی سے دنیا چھوڑی تو ہر طبقے کے افراد اداس اور غمزدہ تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیائے فانی سے رخصت ہونے والوں کے لئے سوائے دعا کے کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے دعائے مغفرت کے علاوہ اپنے مرحوم دوست کو نذرانہ عقیدت پیش کرنے کے لئے اپنے بیٹے کی آج تک کوئی سالگرہ نہیں منائی۔ میں جانتا ہوں کہ میرے اس فیصلے سے مرحوم کی ذات کو کوئی فائدہ نہیں ہو گا لیکن نو سال بعد بھی میں اپنی خوشیوں میں دلدار پرویز بھٹی کو خوش ہوتا ہوا دیکھتا ہوں۔ اس لئے 30 اکتوبر کو جو چہرہ میں نے دیکھا وہ بھول کر میں کس طرح خوشی منا سکتا ہوں۔ نو سال قبل جب دلدار پرویز بھٹی اپنے آخری سفر پر روانہ ہوا تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ کئی لوگ اس کے غم میں اس کے ساتھ ہی رخصت ہو جائیں گے۔ ہر طرف ویرانی اور دلدار کی اچانک موت پر ماتمی کیفیت طاری تھی۔ لیکن آج صورتحال یہ ہے کہ اس کے تعزیتی ریفرنس میں بار بار آنسو بہانے والے آج اس کا نام تک بھول گئے ہیں۔ اس مادہ پرستی کے دور میں اپنے پرائے سب دلدار بھٹی کو فراموش کر بیٹھے ہیں۔ ایسا کیوں ہوا ہے؟ کیا ہمیں پنجاب کے سچے سپوت' پاکستان پر اپنی جان قربان کر دینے کا جذبہ رکھنے والے محب وطن اور پنجابی کے خوش فکر شاعر اور ہر دل عزیز پروگرام کے ہر دلعزیز کمپیئر دلدار پرویز بھٹی کو اسی طرح بھول جانا چاہئے تھا؟ کیا یہ ہماری نسل کی ذمے داری نہیں کہ اس کی فنی' ادبی اور ثقافتی خدمات کو نئی نسل تک پہنچانے کا کوئی اہتمام کریں؟ کیا وہ اپنی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں در کارکردگی کے حوالے سے ایک منفرد شخصیت نہیں تھی؟ کیا نو سال گزرنے کے بعد کوئی س کا نام لیوا نہیں ہے۔ آخر ہم کیوں اسے بھول گئے ہیں؟

30 اکتوبر دلدار بھٹی کی برسی کا دن ہے۔

محترم! آپ نے پاکستان کی بقید حیات اعلیٰ کارکردگی کی حامل ادبی' ثقافتی ور سائنسی شخصیات کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنی ثقافت اپنے ادبی اور علمی ورثے سے بھی روشناس کرایا ہے اور کرواتے رہتے ہیں۔ میری گزارش ہے کہ آپ اس حوالے سے

اپنے قلم کو حرکت میں لائیں اور پاکستان کے محب وطن' خوش فکر شاعر اور ہر دلعزیز کمپیئر دلدار پرویز بھٹی کے کارناموں سے بھی نئی نسل کو روشناس کروائیں تاکہ 30 اکتوبر 2003ء تک نو برس میں ہم جیسے دوستوں کو جو مایوسی ہوئی اس کا ازالہ ہو سکے۔

آپ سے میں یہ درخواست اس لئے کر رہا ہوں کہ نوائے وقت ایک معتبر اور محب وطن اور ہر طبقہ فکر کا پسندیدہ اخبار ہے اور اسے ملک میں بھی اور بیرون ملک بھی لاکھوں کروڑوں افراد پڑھتے ہیں۔ آپ دلدار پرویز بھٹی پر بھی ضرور کچھ لکھیں تاکہ ایک دنیا پر یہ بات واضح ہو جائے کہ پاکستانی قوم ایک زندہ قوم ہے اور اپنے ادبی علمی اور ثقافتی ورثے کی حفاظت کرنا جانتی ہے۔ چلتے چلتے یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ دلدار پرویز کے دوستوں اور پرستاروں کی بے رخی اور تغافل آمیز رویے سے دلبرداشتہ ہو کر دلدار بھٹی کے اہل خانہ نے بھی کسی قسم کی برسی کی تقریب کا اہتمام نہیں کیا۔ گزشتہ برس میں پی ٹی وی صبح کی نشریات میں چند منٹوں کا خصوصی پروگرام پیش کیا کرتا تھا' جو دلدار بھٹی سے منسوب تھا۔ یہ پروگرام بھی اس مرتبہ غائب تھا یہاں تک کہ دلدار بھٹی کی نویں برسی کے موقع پر مرحوم کی قبر پر اس کے 9 دوست بھی جمع نہ ہو سکے اور صرف چھ دوست مرحوم کی فاتحہ خوانی اور اس کو نذرانہ عقیدت پیش کرنے پہنچے۔

ہم اور آپ اگر اپنے آپ کو زندوں میں شمار کرتے ہیں تو پھر ہمیں جدا ہو جانے والوں کا حق ضرور دینا چاہئے تاکہ جب ہم چلے جائیں تو یہ غم اپنے ساتھ لے کر نہ جائیں کہ ہمارے پیچھے ہمیں کوئی یاد کرنے والا نہیں ہوگا۔ اگر آپ نے میرے یہ احساسات نئی نسل تک اپنے کالم کے ذریعے پہنچا دیئے تو صرف میں ہی نہیں بلکہ بہت سے دلدار بھٹی کے خاموش چاہنے والے جن کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے ''نوائے وقت'' کے احسان مند ہوں گے۔

فقط

ناصر نقوی

بانی صدر لاہور پریس کلب لاہور

دلدار پرویز بھٹی بلاشبہ ایک ہر دلعزیز شخصیت تھی۔ وہ ایک خوش گفتار ٹی وی سٹیج کمپیئر تھا۔ وہ بے جان محفل میں جان ڈال دیتا تھا۔ پنجابی اور اردو کا خوش فکر مگر کم گو

شاعر تھا۔ اس نے کچھ عرصہ اخباروں کے لئے کالم بھی لکھے جسے لوگوں نے بہت پسند کیا۔ علم و ادب کی سنجیدہ گفتگو بھی بڑے سلیقے سے کرتا اور ضلع جگت میں بھی کم لوگ ہی اس کے سامنے ٹھہرتے تھے۔ وہ خوش گفتار اور خوش پوش تھا۔ اپنی خداداد صلاحیتوں کی بدولت دلدار پرویز نے سوسائٹی میں اور خاص طور پر ریڈیو' ٹی وی اور فلم کے میڈیا میں قابل قدر مقام حاصل کر لیا تھا۔ لیکن اس عروج کے باوجود اس کی ذات میں غرور کی بجائے انکسار تھا۔ درگزر کا مادہ تھا۔ وہ ہر کسی کے کام آتا۔ حاتم طائی تو سوال کرنے والوں کی حاجت پوری کرتا تھا لیکن دلدار پرویز بھٹی ان نیک دل لوگوں میں سے تھا جو بغیر سوال کے بھی حاجت مندوں کی حاجت روائی کرتے ہیں۔ وہ کسی حاجت مند کو ''دوست ہو یا نہ ہو'' حرف سوال زبان تک لانے کا موقع ہی نہیں دیتے اور اس کی حاجت کو سمجھ جاتے ہیں اور اس طریقے سے اس کی حاجت پوری کر دیتے ہیں کہ اگلے کو محسوس تک نہیں ہوتا کہ اس پر کسی نے کوئی احسان کیا ہے۔

ناصر نقوی صاحب نے ایک بار بھٹی صاحب کی اس خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے ایک واقعہ سنایا تھا کہ دلدار بھٹی کو پتہ چلا کہ ٹی وی کا ایک ٹی وی والوں کے اعتبار سے کم تر درجے کا آرٹسٹ ان دنوں کام نہ ملنے کی وجہ سے نیم فاقہ زدہ زندگی بسر کر رہا ہے۔ دلدار بھٹی یہ سنتے ہی اس کے گھر پہنچا اسے باہر بلا کر دس ہزار روپے کے نوٹ لفافے میں بند کر کے دیئے اور کہا۔

''پنجابی کی ایک نئی فلم بن رہی ہے۔ پروڈیوسر نے اس میں کام کرنے کے واسطے مجھے اور تمہیں کاسٹ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ دس ہزار مجھے ایڈوانس دیا ہے اور یہ دس ہزار روپے تمہارے ایڈوانس کے ہیں۔ جس وقت شوٹنگ شروع ہو گی تمہیں اطلاع مل جائے گی۔''

اور اتنا کہہ کر دلدار پرویز بھٹی سلام دعا کر کے الٹے پاؤں واپس چلا گیا۔ وقت گزرتا رہا۔ دو تین مہینے گزر گئے تو وہ ٹی وی آرٹسٹ ایک روز دلدار پرویز بھٹی کے پاس آیا اور کہنے لگا۔

''سر! ابھی تک پروڈیوسر کی طرف سے بلاوا نہیں آیا۔ اگر فلم نہ بنی تو سوچتا ہوں کہ ایڈوانس کی رقم کہاں سے پوری کروں گا؟ دلدار پرویز نے اس کی طرف بڑی

حیرانی کے ساتھ دیکھا اور کہنے لگا۔

"بڑے بے وقوف ہو تم' اس میڈیا میں کبھی کوئی ایڈوانس کی رقم بھی واپس کرتا ہے۔ مجھے بھی انہوں نے دس ہزار ایڈوانس دیا تھا۔ میں بھی واپس نہیں کروں گا' تم بھی واپس نہیں کرو گے۔ یہ تو اس میڈیا کا ایک نارمل اور عام دستور ہے۔"

اور اس ٹی وی آرٹسٹ کو ایک لمحے کے لئے بھی محسوس نہ ہوا کہ یہ رقم دلدار پرویز نے اپنی جیب سے ادا کی تھی۔ مشکل کے وقت دلدار بھٹی ہر کسی کے کام آتا تھا جو کرسکتا تھا ضرور کرتا تھا۔

جناب احمد ندیم قاسمی نے بالکل صحیح لکھا ہے:

"دلدار ہر دلعزیز تھا۔ اس کی ہر دلعزیزی سب حدیں پھلانگ گئی تھی۔ اس کا ماتم کرنے والوں میں ہمارے معاشرے کا ہر طبقہ شامل تھا۔ وہ طبقہ بھی جو ٹی وی نہیں دیکھ سکتا اور نہ بڑے بڑے فائیو سٹار ہوٹلوں میں قدم رکھ سکتا ہے۔ سب اسے اپنا کہتے تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں کسی کے مرنے پر دھاڑیں مار مار کر اتنے بے شمار رونے والے کم ہی دیکھے ہیں۔ میری دلدار پرویز سے کبھی کبھار ہی ملاقات ہوتی تھی۔ جب میں کبھی ٹی وی پر کسی پروگرام کے سلسلے میں جاتا اور اس سے آمنا سامنا ہو جاتا تو وہ بڑے ادب سے ملتا۔ مجھے اس کی کمپیئرنگ' اس کی حاضر جوابی اور خوش گفتاری بڑی پسند تھی۔ میں کیا سبھی اس کے گرویدہ تھے۔"

جناب عنایت حسین بھٹی مرحوم نے دلدار پرویز کی موت پر لکھا۔

"دلدار پرویز جب کمپیئرنگ کرتا تو اپنی شگفتہ کلامی سے لوگوں کو مسکراہٹیں اور قہقہے دیتا تھا۔ دل دار میرا کچھ نہیں لگتا تھا لیکن وہ تو میرا اپنا تھا۔ مجھے پیار کرتا تھا۔ میرا ہی نہیں بلکہ سب انسانوں کا احترام کرتا تھا۔ دلدار عجز و انکسار کا مرقع بھی تھا اور خودداری کا پیکر بھی تھا۔ میں نے اسے ان لوگوں کے ساتھ گردن اٹھا کر بات کرتے دیکھا ہے جو اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا سمجھنے کے وہم میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور غریب محنت کشوں کے ساتھ عاجزی سے گفتگو کرتے دیکھا ہے۔ دلدار پرویز دوسروں میں بڑی

فیاضی سے خوشیاں بانٹتا تھا۔ یہاں تک کہ اپنی جھولی خالی کر لیتا تھا۔ وہ جہاں بھی ہوتا تمام لوگ اس سے مسکراہٹیں اور قہقہے طلب کرتے اور دلدار پرویز خوشیاں بانٹنے میں انہیں کبھی ناامید نہیں کرتا تھا۔"

آخر میں خواجہ پرویز کی اس نظم کے چند اشعار یہاں درج کرنا چاہتا ہوں جو اس نے دلدار پرویز بھٹی کی وفات حسرت آیات کے موقع پر لکھی تھیں۔

وہ یاروں کا یار تھا سارے کہتے ہیں
وہ سب کا دلدار تھا سارے کہتے ہیں
سب کو پتہ تھا اس کی لاش فضا میں ہے
جس دن الحمرا میں اک تقریب ہوئی
بیس برس سے اس تقریب کی جان تھا وہ
بھول گئے ہم کتنا بڑا انسان تھا وہ
افسر تھے' سازندے تھے' فنکار نہ تھا
اس محفل میں سب کچھ تھا دلدار نہ تھا
دنیا سے وہ آنکھ چرا کر چلا گیا
خود رویا لوگوں کو ہنسا کر چلا گیا

☆……☆……☆

حافظ صاحب

امرتسر کے ہال دروازے سے باہر نکل کر جب آپ داہنی جانب کو ہوں تو پیر ظاہر اولیؒ کے مزار کے پہلو میں ایک نالے کا چھوٹا سا پل عبور کر کے سامنے' انجمن پارک کا ریتلا میدان آ جاتا ہے۔ یہ میدان ریلوے کے اونچے پل کی ڈھلانوں کے سائے میں ہے۔ ان ڈھلانوں پر سڑک کی اترائی کے ساتھ ساتھ لوہے کا جنگلا لگا ہے' جس پر یوکلپٹس کے گھنے درختوں کا سایہ پھیلا ہوا ہے۔ کونے میں ایک چھوٹی سی مسجد ہوا کرتی تھی۔ پاس ہی ایک کنواں اور اکھاڑہ بھی تھا۔ انجمن پارک' امرتسر کی سیاسی اور سماجی زندگی کی آماجگاہ تھا۔ یہاں اگر ایم اے او کالج اور ڈی اے وی کالج کے معرکہ خیز کرکٹ میچ ہوا کرتے تھے تو مجلس احرار' مسلم لیگ اور نیلی پوشوں کے ہنگامہ پرور جلسے بھی منعقد ہوتے تھے۔ کرکٹ میچوں میں ایم اے او کالج کے دینیات کے استاد حافظ نور شاہ صاحب زمین پر چوکڑی مار کر بیٹھ جاتے اور تسبیح کا ورد کرتے ہوئے دعا پڑھ پڑھ کر مروت حسین شاہ کو باؤلنگ کرتے ہوئے دور سے پھونکیں مارا کرتے۔ جب ہندو کالج کی وکٹ اڑتی تو حافظ نور شاہ اپنے خاکی کوٹ اور خاکی کلہ پگڑی میں بانہیں پھیلا کر اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے اور دوبارہ دھڑا دھڑ تسبیح اور دعاؤں کا ورد شروع ہو جاتا۔ مجلس احرار اور مسلم لیگ کے جلسوں میں لوگ گلے پھاڑ پھاڑ کر اسلام زندہ باد کے فلک شگاف نعرے لگاتے اور ڈٹ کر تیل کے قیمے والے پٹھورے اور نان چھولے کھاتے۔ کیا مجال جو کسی کے گلے میں خراش تک بھی پڑتی۔

دلی' بمبئی سے کوئی سرکس امرتسر آتا تو انجمن پارک کے میدان میں آ کر اترتا۔ تنبو قناتیں' تن جاتیں۔ چھولداریاں لگ جاتیں' خاردار جنگلوں کی دوسری طرف

زنجیروں سے بندھے ہوئے قوی الجثہ ہاتھی' گھاس کے ڈھیروں کے پاس جھولتے نظر آتے۔ پنجروں میں بند شرارتی بندروں کی خوخو کی آوازیں آتیں۔ کبھی کبھی کسی بوڑھے شیر کی نحیف سی ''ہائیں ہائیں'' بھی سنائی دے جاتی۔ سرکس کے ملازمین میدان میں ادھر ادھر میخیں گاڑنے اور جانوروں کو چارہ ڈالنے میں مصروف دکھائی دیتے۔ ہم رات کو سرکس میں کرتب دکھانے والوں کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے پہروں خاردار جنگلوں کے پاس کھڑے رہتے مگر وہ لوگ سوائے رات کے دن کو کبھی دکھائی نہ دیتے تھے۔
انجمن پارک کے مشرق میں مسجد نور تھی جس کی ٹونٹیوں سے ہم منہ لگا کر پانی پیا کرتے تھے اور جس کی اونچی چھت پر میناروں کے قریب کھڑے ہو کر ہم سرکس والوں کے چھپے ہوئے شیر کو دیکھنے کی کوشش کیا کرتے۔ مغربی جانب گندے نالے کے پار پرل ٹاکیز کی پرانی طرز کی اونچی لمبی عمارت کھڑی تھی۔ اسے مہان سنگھ کا منڈوا بھی کہتے تھے۔ کسی زمانے میں یہ تھیٹر تھا اور الفریڈ تھیٹریکل اور کورنتھین تھیٹریکل کمپنیاں اس کی سٹیج پر آغا حشر کے کھیل کھیلا کرتی تھیں۔ اندر سے اس کی گیلری یورپ کے تھیٹر گاہوں کی طرح بڑی منقش اور قدیم سٹائل کی تھی۔ سینما کو عروج حاصل ہوا تو اس کی سٹیج پر پردہ لگا کر رنجیت مووی ٹون کا ''بھولا شکار'' ''طوفان میل'' ''روپ بسنت''، پربھات سینے ٹون کی ''سیرندھیری'' ''استریوں کا راج'' اور ''پڑوسی'' ایسی فلموں کی نمائش شروع ہو گئی۔ نیو تھیٹر ماز کی ''دھوپ چھاؤں'' ''منزل'' ''ڈاکو منصور'' اور ''دیوداس'' کی نمائش بھی اسی سینما ہاؤس میں ہوئی تھی۔ امرتسر کا یہ بڑا پرانا اور سب سے پہلا تھیٹر ہاؤس تھا۔

گندے نالے کی اس جانب ڈنڈے شاہ کا تکیہ اور تھوڑی سی آبادی تھی۔ اس آبادی کے مکانوں کی کھڑکیاں اور اکثر کے دروازے گندے نالے کے داہنے کنارے پر کھلتے تھے۔ تکیہ ڈنڈے شاہ میں جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے پکی اینٹوں کی دو چار قبروں' ایک اکھاڑے اور دھریک اور نیم کے سایہ دار درختوں کے سوا اور کچھ نہیں دیکھا۔ ہاں ذرا پرے مسجد نور کے قریب ہی ایک اونچے چبوترے پر کسی بزرگ کا مزار ضرور تھا جس کے درخت پر سبز اور سفید جھنڈے ہوا میں پھڑ پھڑایا کرتے تھے۔

امرتسر کے جس درویش کی میں یہاں کہانی بیان کرنے لگا ہوں' ان کا مکان بھی اسی تکیہ ڈنڈے شاہ کی آبادی میں تھا۔ مکان کیا تھا بس گندے نالے کے کنارے پکی

کچی اینٹوں کی ایک کوٹھڑی تھی جس پر کھپریل ڈال کر گارا پھیر دیا گیا تھا۔ اس درویش کا نام حافظ شفیع تھا اور اس جھونپڑی نما مکان میں غالباً ان کی بوڑھی والدہ صاحبہ رہا کرتی تھیں۔ حافظ صاحب والدہ کی بے حد خدمت کیا کرتے۔ حافظ صاحب بڑے زندہ دل' محفل پرست' پرہیزگار' ہنس مکھ اور قناعت پسند درویش تھے۔ پان تمباکو قوام والا کھاتے۔ تمباکو بالکل نہ پیتے۔ چائے خود بنا کر اور اس میں زعفران ڈال کر پیتے اور دوستوں کو پلاتے۔ تھوڑی تھوڑی طبابت بھی جانتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی مریض آ جاتا تو اسے اپنے پاس سے دوائی خرید کر اور گھوٹ کر بھی دیتے۔ حافظ قرآن تھے اور نماز پنج وقتہ ادا کرتے تھے۔ دبلا پتلا چھریرا بدن' ستوان ناک' باریک ہونٹوں کے پیچھے بھنی ہوئی مونگ پھلی کے دانوں ایسے ہموار دانت فرنچ کٹ مختصر سی داڑھی اور باریک مونچھیں' نرم چمکیلے سیاہ بالوں کے پٹے' گھر میں دھلی ہوئی بغیر استری کی قمیص اور شلوار' پاؤں میں باٹا کی چپل' سردیوں میں لوئی کی بکل مار کر ساری سردیاں گزار دیتے۔ ہرن ایسی بڑی بڑی آنکھوں میں سرمے کی لکیر اور ہونٹوں پر ہردم کھیلتی زندہ دلی کی مسکراہٹ۔ یہ تھے ہمارے درویش دوست حافظ شفیع۔

انہوں نے مسجد شیخ خیر الدین مرحوم میں ڈیرہ لگا رکھا تھا۔ یہ ہال بازار میں میوہ منڈی کے دروازے کے عین سامنے تھی۔ مسجد خیر الدین میں داخل ہوتے ہی ایک چھتی ہوئی ڈیوڑھی میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ اس ڈیوڑھی میں ہر موسم میں ٹھنڈا ٹھنڈا اندھیرا چھایا رہتا۔ کونے والے ستون پر عشق پیچاں کی بیل چڑھی ہوئی تھی۔ اس ستون کے پہلو میں ایک حجرہ تھا جس میں حافظ شفیع کا ڈیرا تھا۔ حجرے میں ایک دری صرف بچھی تھی۔ کونے میں ایک جازم پر صندوقچی رکھی تھی۔ الماری میں شرع' فقہ اور حدیث شریف کی پرانی کتابیں پڑی رہتی تھیں۔ ایک دھسہ' دو جوڑے قمیص شلوار اور ایک پرانا بستر یہ حافظ شفیع کی کل کائنات تھی۔ میں سردیوں میں عشاء کی نماز کے بعد حافظ صاحب سے ملنے ان کے حجرے میں جاتا۔ مسکرا کر سر کو والہانہ انداز میں جھٹکتے اور کہتے۔

''سبحان اللہ۔''

یہ ان کا تکیہ کلام تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے' جب انہیں والدہ کے انتقال کی خبر ملی تو اس وقت بھی انہوں نے سر کو آہستہ سے جھٹک کر کہا تھا۔

''سبحان اللہ۔''

میں لکڑی کی پرانی صندوقچی کے پاس جازم پر کشمیری فرد کی بکل مار کر بیٹھ جاتا۔ حافظ صاحب فوراً دھواں کھائے سماوار میں کوئلے ڈالتے۔ کاغذ جلا کر اس میں آگ سلگاتے اور پانی میں چائے کی پتی ڈال دیتے۔ جب حجرے کی فضا میں چائے کی مہک اڑنے لگتی اور سماوار کی ٹونٹی بھاپ دینے لگتی تو الماری میں سے سبز پتوں والے چینی پیالے نکالتے۔ ایک نسواری شیشی کا ڈھکن بڑی احتیاط سے کھول کر اسے سونگھتے اور آنکھیں بند کر کے سر ہلا کر کہتے۔

''سبحان اللہ۔''

پھر مجھے سنگھاتے ہوئے کہتے۔

''بٹ صاحب! اسے کہتے ہیں اصلی زعفران۔''

تھوڑا تھوڑا زعفران وہ دونوں پیالوں میں ڈالتے اور چائے کی محفل گرم ہو جاتی۔ حافظ صاحب' رومی اور شیخ سعدی کے فارسی شعر سنانے لگتے۔ وہ رومی اور سعدی کے عاشق تھے۔ میں نے بہت کم لوگوں کو اتنی محبت سے زعفرانی چائے پیتے اور رومی و سعدی کے شعر پڑھتے دیکھا ہے۔ چائے کے بعد وہ کسی لڑکے کو بھیج کر چوک سے پان منگواتے۔ بڑے سلیقے سے پان منہ میں رکھ کر جیب سے رومال نکال کر ہونٹوں کے کنارے پونچھتے اور جھوم کر کہتے۔

''سبحان اللہ! قوام چوک والا ہی بنا سکتا ہے۔''

اگر میں یہ کہوں کہ حافظ شفیع کو زندگی اور خدا کی نعمتوں سے پیار تھا اور وہ ان چیزوں کی قدر کرتے تھے تو یہ تکلف ہوگا۔ دراصل حافظ صاحب زندگی اور خدا کی نعمتوں کا ایک حصہ تھے۔ وہ کسی اچھائی یا نیکی کے کام کو اصول سمجھ کر سرانجام نہیں دیتے تھے بلکہ یہ فعل خود بخود ان سے ہو رہا تھا اور اصول بنتے چلے جا رہے تھے۔ اصل میں وہ زمانہ ہی اچھے افعال کا تھا۔ اصولوں کی تبلیغ کا نہیں تھا۔ حافظ صاحب معمولی سے معمولی کام کو بھی اس طرح کرتے جیسے وہ کسی بہت بڑی ایجاد کی بنیاد رکھ رہے ہوں۔ وہ سڑک پر اس مزے سے چلتے جیسے دلدلوں میں سے نکل کر پہلی بار پکی سڑک پر قدم رکھ رہے ہوں۔ باتیں اس طرح لہک لہک کر کرتے گویا ایک مدت کی خاموشی کے بعد انہیں پہلی بار

زبان ملی ہو۔ چائے یوں شوق سے پیتے جیسے وہ ان کی آخری پیالی ہو۔ ان کی عمر زیادہ نہیں تھی بس یہی کوئی تیس بتیس برس کے ہوں گے۔ ایک بال بھی سفید نہیں تھا۔

پتلے دبلے بدن میں ہرن ایسی چستی تھی۔ صالح خون میں محنت اور حلال کی کمائی گردش کر رہی تھی۔ مسجد میں آئی ہوئی روٹی کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے تھے۔ والدہ کی وفات کے بعد جھونپڑی پر کسی دوسرے نے قبضہ جمانا چاہا تو آپ نے اپنا بستر سر پر اٹھایا اور ''سبحان اللہ'' کہہ کر مسجد خیر الدین میں آ کر ڈیرہ جما لیا۔ ان کی شرع' حدیث شریف اور فقہ کی باتوں کے اسرار و رموز میری ناپختہ سمجھ سے باہر تھے۔ میں ان کی درویشانہ مسکراہٹ اور اچھی اچھی باتوں کا شیدائی تھا۔ رمضان شریف میں وہ تحصیل پورے والی مسجد میں تراویح پڑھایا کرتے تھے۔ ایک بار مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ یہ مسجد تحصیل پورے کی مسلمان آبادی میں ایک گلی کے کونے پر تھی۔ حجرے میں دو تین مولوی صاحبان بیٹھے داڑھیوں میں ہاتھ پھیر پھیر کر بڑے جوش و خروش سے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے بھی کندھوں پر مدینے شریف کا بسنتی رومال ڈال رکھا تھا۔ مجھے دیکھ کر ایک مولوی صاحب نے حافظ شفیع سے پوچھا۔

''یہ برخوردار بھی حافظ قرآن ہیں کیا؟''

اور حافظ شفیع نے بلا جھجک کہا۔ ''جی ہاں! جی ہاں! سبحان اللہ۔''

بعد میں جب میں نے پوچھا کہ حافظ صاحب آپ نے جھوٹ کیوں بولا تو سر ہلا کر بولے۔

''سبحان اللہ! خدا جھوٹ نہ بلوائے۔''

میں پہلی صف میں حافظ شفیع کے پیچھے کھڑا ہو کر تراویح پڑھتا۔ تراویح کے بعد جب انہیں دودھ سے بھرا ہوا گلاس ملتا تو پہلے آدھا مجھے پلاتے اور جھوم جھوم کر کہتے۔

''کیوں خواجہ صاحب؟ اسے کہتے ہیں خالص دودھ۔'' میں نے ان کی جیب میں دو تین آنوں کے سوا کبھی ایک پائی نہ دیکھی تھی۔ انہیں فالتو پیسے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ حجرے میں وہ بچوں کو فارسی اور قرآن شریف پڑھاتے مگر ان سے کچھ نہ لیتے۔ مسجد خیر الدین کا فرش دھوتے' برآمدوں میں جھاڑو دیتے۔ سقادے صاف کرتے' نماز کے وقت بچوں کے ساتھ مل کر صفیں بچھاتے لیکن مسجد میں گلی محلے سے جو طرح طرح

کے کھانے آتے ان میں سے ایک لقمہ تک نہ لیتے۔ جو تھوڑی بہت طبابت انہوں نے سیکھ رکھی تھی بس اسی پر قناعت تھی۔ دو چار آنے کی دوائیں روز بک جاتی تھیں۔ تنور سے دال روٹی منگوا کر وہیں حجرے میں بیٹھ کر کھا لیتے اور سبحان اللہ کہہ کر سماوار میں چائے کے لئے کوئلے سلگانے لگتے۔

ایک بار ہال بازار کے مشہور لکھ پتی تاجر نند لعل کا اکلوتا بیٹا کندن لعل سخت بیمار پڑ گیا۔ وہ میرا ہم جماعت بھی تھا۔ اس کے پیٹ میں کچھ خرابی ہو گئی تھی اور حالت روز بروز تشویشناک ہوتی جا رہی تھی۔ نند لعل اپنے بیٹے کندن لعل کے لئے انتہائی پریشان ہو گیا۔ اس نے گھر پر امرتسر' جالندھر اور لاہور کے نامی گرامی ڈاکٹروں کو جمع کر لیا مگر اتفاق کی بات ہے کہ یہ سارے ڈاکٹر مل کر بھی کندن لعل کی بیماری کو دور نہ کر سکے۔ اس کی حالت بگڑتی چلی گئی۔ میں نے کندن لعل کے پتا جی سے کہا کہ حافظ صاحب کو بھی دکھا لیں کیا خبر اللہ شفا دے دے۔ لالہ جی خود حافظ صاحب کو لے کر گھر آئے۔ کندن لعل کی حالت واقعی بہت خراب تھی۔ دنوں میں وہ سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا اور نقاہت کے عالم میں ایک شاندار پلنگ پر لیٹا نحیف سانس لے رہا تھا۔ اس کی ماتا جی سرہانے سر جھکائے بیٹھی آنسو بہا رہی تھیں۔ میز پر بڑی بڑی قیمتی دوائیں پڑی تھیں۔ لوہے کی الماریوں اور آہنی سیفوں میں ہزاروں روپے کے زیورات بند پڑے تھے' مگر کندن لعل کو کوئی نہ بچا سکتا تھا۔

حافظ صاحب کو اندر داخل ہوتا دیکھ کر ماتا جی نے سفید ساڑھی کا گھونگھٹ سا نکال لیا۔ حافظ شفیع نے بسم اللہ پڑھ کر کندن لعل کی نبض ٹٹولی اور آنکھیں بند کر لیں تھوڑی دیر بعد آنکھیں کھول کر مسکرائے اور نند لعل سے بولے۔

''فکر نہ کریں لالہ جی! بچہ اچھا ہو جائے گا۔ سبحان اللہ۔''

پھر جیب میں سے ٹین کی ایک ڈبیا نکال کر اسے کھولا۔ اس میں سے ننھی منھی چھ پڑیاں نکال کر میز پر رکھیں اور کہا۔

''دو دو گھنٹے بعد پانی کے ساتھ ایک پڑیا دیتے جائیں اللہ شفا دے گا۔ خدا کی قدرت کہ اگلے روز کندن لعل کی حالت سنبھل گئی۔ حافظ شفیع نے مزید چھ پڑیاں بھجوا دیں۔ تیسرے روز کندن لعل پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چوتھے روز وہ اپنے گھر میں چل پھر

رہا تھا اور پانچویں دن وہ اپنے والد کی دکان پر بیٹھا تھا۔ لالہ نند لعل اسی روز اپنے لختِ جگر کو لے کر حافظ صاحب کے پاس حجرے میں حاضر ہوا۔ میں بھی وہیں شال کی بکل مارے صف پر بیٹھا تھا۔ حافظ صاحب سماوار میں کوئلے سلگاتے ہوئے پنکھے سے ہوا کر رہے تھے۔ لالہ جی نے ہاتھ جوڑ کر بندگی کی اور اپنے بیٹے کے ساتھ دوزانو ہو کر بڑے ادب سے صف پر بیٹھ گئے۔ حافظ شفیع نے مسکرا کر کہا۔

"خدا نے آپ کے بچے کو شفا دے دی۔ سبحان اللہ۔"

لالہ نندلال بچھا جا رہا تھا۔ بڑے انکسار سے ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"حافظ جی! میں آپ کی دوا کے پیسے دینے آیا ہوں۔ انہیں قبول کیجئے۔ اس کے ساتھ ہی لالہ جی نے جیب سے سو سو روپے کے بیس نوٹ نکال کر حافظ شفیع کے قدموں میں رکھ دیئے۔ حافظ شفیع نے نوٹوں کو دیکھا پھر لالہ جی کو دیکھا اور سر جھٹک کر مسکراتے ہوئے بولے۔

"مگر لالہ جی! میری دوا تو تین آنے کی تھی۔"

میں وہ منظر ساری زندگی نہیں بھول سکتا کہ کس طرح امرتسر کا لکھ پتی تاجر لالہ نند لعل، حافظ شفیع کو دو ہزار روپے قبول کرنے پر اصرار کر رہا تھا اور حافظ شفیع کس بے نیازی سے صرف تین آنے لینے پر بضد تھے۔ دو ہزار روپے 1945ء میں بیس ہزار سے کم نہ تھے۔ آخر لالہ جی کو سارے نوٹ واپس لینے پڑے اور اپنے کوٹ کی جیب میں سے تین آنے نکال کر حافظ جی کے قدموں میں رکھ دیئے۔ اس وقت لالہ جی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ انہوں نے فرطِ عقیدت سے حافظ شفیع کے پاؤں کو چھو کر ہاتھ اپنے ماتھے پر لگائے۔ جب لالہ جی چلے گئے تو حافظ شفیع نے پنکھا صف پر پھینک کر دروازے میں سے سر باہر نکال کر دیکھا کہ لالہ جی مسجد سے نکل گئے ہیں؟ پھر جو پلٹے تو ان کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ بچوں کی طرح مسرور ہو کر بولے۔

"سبحان اللہ! آج کی روٹی کا بندوبست ہو گیا بٹ صیب۔"

آج کی روٹی...... یعنی دو پیسے کی دو روٹیاں اور پیسے کی دال...... کسی وقت ہم دونوں کمپنی باغ کی سیر کو نکل جاتے۔ راستے میں کوئی جنازہ مل جاتا تو حافظ شفیع کلمہ شریف پڑھ کر اس طرف لپکتے اور کندھا دے کر ساتھ ہو لیتے۔ میں بھی ان کے ساتھ ہو

جاتا۔ محلے میں کسی لڑکی کی شادی ہوتی تو حافظ شفیع بن بلائے ہی وہاں پہنچ جاتے۔ دریاں بچھا رہے ہیں، قناتیں لگا رہے ہیں، دستر خوان جھاڑ رہے ہیں، مٹوں میں پانی ڈلوا رہے ہیں، براتیوں کو پانی پلا رہے ہیں۔ تھال بھر بھر کر پلاؤ اندر لے جا رہے ہیں اور جب برات چلی جاتی تو عمر تنور والے کی دکان پر آ کر وہی دو روٹیاں اور دال لیتے اور سبحان اللہ کہہ کر کھانا شروع کر دیتے۔ صبح صادق کو اٹھ کر مسجد میں اذان دیتے۔ مسجد کے صحن میں جھاڑو دیتے اور منبر کو اپنے بسنتی رومال سے جھاڑتے۔ رمضان شریف میں سحری کے وقت محلے میں ہر گھر پر جا کر دروازہ کھٹکھٹاتے اور صاحب خانہ کا نام لے کر اسے جگاتے۔ افطاری کے وقت مسجد میں انواع واقسام کے پھلوں اور کھانے کے ڈھیر لگ جاتے مگر حافظ شفیع کو میں نے ہمیشہ نمک اور کھجور سے ہی روزہ افطار کرتے دیکھا۔ افطاری کے بعد میرے ساتھ نماز ادا کرتے۔ تنور پر جا کر دال روٹی کھاتے اور پھر مجھے ساتھ لے کر تراویح پڑھانے تحصیل پورے والی مسجد کی طرف روانہ ہو جاتے۔ سارا راستہ ہنس ہنس کر باتیں کرتے جاتے۔ رومی اور سعدی کے شعر سناتے۔ زعفرانی چائے کے فوائد پر لہک لہک کر باتیں کرتے۔ سبحان اللہ کیا لوگ تھے۔

حافظ شفیع سے امرتسر میں میری آخری ملاقات 23 اگست 1947ء کو شریف پورے کے باہر ریلوے لائن پر ہوئی۔ امرتسر کے در و دیوار فسادات کی آگ میں جل رہے تھے۔ شہر پر ہندو سکھ فوج نے قبضہ کر رکھا تھا اور امرتسر کے مسلمان مہاجرین سے بھری ہوئی ریل گاڑیاں شریف پورے سے پاکستان کی طرف جا رہی تھیں۔ ہر شخص پریشان اور بے حال تھا۔ چہروں کے رنگ اڑے ہوئے تھے۔ آنکھیں ویران ہو رہی تھیں۔ کسی کا بیٹا شہید ہو گیا تو کسی کا باپ، کسی کے بھائی کی لاش بے گور و کفن شہر کی کسی سڑک پر پڑی رہ گئی تھی تو کسی کی بہن محلے کے کنویں میں چھلانگ لگا کر عزت کی موت مر گئی تھی۔ امرتسر جل رہا تھا۔ ہر طرف آگ اور خون کا کھیل جاری تھا۔

شریف پورے والی ریلوے لائن کے آس پاس مہاجرین کا سیلاب امڈ آیا تھا۔ بلوچ رجمنٹ کے جوان مشین گنیں سنبھالے جالندھر اور بٹالے کی طرف پوزیشنیں لئے بیٹھے تھے۔

شریف پورے کے آس پاس کی آبادی کو مہاجرین کیمپ قرار دیا جا چکا تھا۔

شہر میں رہے سہے مسلمانوں کے پریشان حال قافلے یہاں جمع ہو رہے تھے۔ رات رات بھر شہر کی طرف سے ہندو اور سکھ فوجی اس کیمپ پر فائر کھول دیتے۔ سارے کیمپ پر ایک دہشت کی فضا طاری تھی۔ ہمارے خاندان کے تقریباً سبھی افراد پہلی گاڑی میں لاہور روانہ ہو چکے تھے۔ اب مجھے یاد نہیں کہ میں کس لئے اکیلا شریف پورے میں رہ گیا تھا۔ بہر حال میں ریلوے لائن کے پاس دوسرے ہزاروں مہاجرین کے ساتھ پتھروں پر بیٹھا پاکستان جانے والی گاڑی کا انتظار کر رہا تھا۔ اتنے میں امرتسر ریلوے سٹیشن کی جانب سے چھک چھک کرتی خالی گاڑی آئی اور ہمارے پاس آ کر رک گئی۔ بس اس کے بعد کچھ خبر نہیں کہ کیا ہوا۔ دیکھتے دیکھتے ریل گاڑی کے اندر، باہر اور چھت پر تل دھرنے کو جگہ باقی نہ تھی۔ میں بھی کسی نہ کسی طرح ہجوم میں گھس گھسا کر ایک ڈبے میں سوار ہو کر کسی کے سامان پر بیٹھ گیا۔ میں ایک آدمی کی ٹانگ اور دوسرے آدمی کے بازو میں سے کھڑکی کے باہر کا کچھ منظر دیکھ رہا تھا۔ ہر طرف ایک شور، ایک ہنگامہ اور ایک قیامت برپا تھی۔ اتنے میں، میں نے حافظ شفیع کو دیکھا۔ وہ ایک میلا سا تھیلا کندھے پر ڈالے ایک طرف سگنل کے کھمبے کے پاس کھڑے تھے۔ انہوں نے دو ایک بار گاڑی میں سوار ہونے کی کوشش بھی کی مگر لوگوں نے انہیں دھکا دے کر پیچھے ہٹا دیا۔ وہ ایک بار پھر چپ چاپ سے کھمبے کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ مجھ سے کافی فاصلے پر تھے اور میں انہیں آواز نہ دے سکتا تھا۔ گاڑی چل پڑی۔ بچے کھچے لوگ بھاگ بھاگ کر سوار ہونے لگے۔ میں نے دور سے حافظ شفیع کو دیکھا۔ انہوں نے بھی لپک کر ایک ڈبے میں سوار ہونے کی کوشش کی لیکن ایک آدمی نے جو پائیدان پر لٹکا ہوا تھا حافظ جی کا ہاتھ پرے جھٹک دیا۔ گاڑی اب شریف پورے سے آگے نکل آئی تھی۔ شریف پورہ کیمپ سے پاکستان آنے والی یہ آخری گاڑی تھی اس کے بعد جو گاڑی بھی آئی اسے کاٹ دیا گیا۔ کچھ دور تک میں حافظ شفیع کو دیکھتا رہا۔ وہ ریلوے لائن کے قریب اکیلے کھڑے تھیلا کندھے پر ڈالے چپ چاپ پاکستان کو جانے والی گاڑی کو تک رہے تھے۔ اس وقت میں ان کے پاس نہیں تھا مگر مجھے یقین ہے کہ انہوں نے ایک بار ضرور سر جھٹک کر مسکراتے ہوئے کہا ہو گا۔

''سبحان اللہ۔''

اے حمید سے ملاقات

(فارحہ ارشد)

میں باہر کھڑی حیرانی سے اس پھولوں کی چادر میں لپٹے گھر کو دیکھ رہی تھی۔ لگتا تھا اینٹ گارے کی جگہ پھول کلیوں سے در و دیوار اٹھائے گئے ہوں۔ موسم قدرے گرم تھا مگر صحن میں پہنچتے ہی سبزے، پھولوں کی تر و تازہ کیاریوں اور خوشبو بھری فضا نے عجیب ٹھنڈک سی من میں اتار دی تھی۔ لاہور کی نفسانفسی اور ہوس زر کی مضطرب و منتشر بھاگ دوڑ سے نکل کر، جیسے میں پھولوں بھری ٹھنڈی پرسکون وادی کی پناہ میں آ گئی تھی۔ سفید بے داغ لباس میں ملبوس، اے حمید اس ملاوٹ اور تصنع سے پاک منظر میں سب سے زیادہ معتبر لگے کہ ان ہی کی وجہ سے پھول کا عرفان اور خوشبو کا احساس زندہ تھا۔

کمرے کی سادگی و نفاست نے روح پہ اور اثر کیا۔ عین کمرے کے وسط میں میز کے اوپر پیتل کا پیالہ سفید تازہ موتیے کی کلیوں سے چھلک رہا تھا اور اصل حسن اس کمرے کی دائیں دیوار تھی جہاں کھلے شیشوں سے پرے سبزے، کلیوں اور کچی گیلی مٹی کی مہک نے ماحول کو پراسرار اور مجھے مسحور و ساکت کر دیا تھا۔

مجھے لگتا تھا اب تک کیے جانے والے انٹرویوز میں سب سے مشکل یہی ہو گا۔
بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی

والی بات تھی، لیکن جب سندباد جہازی اور پھولدار بیلوں میں چھپی ہوئی گیلریوں کے نیچے چاندنی راتوں میں محبت کے گیت گانے والے مطرب نے لب کھولے تو لفظ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔

میں خود اے حمید صاحب کی تحریروں کی زبردست ''پرستار'' ہوں۔ یہ انٹرویو کم

اور وہ فینٹسی زیادہ تھی' جس میں ان کا قاری انہیں پڑھتے ہوئے کھو جاتا ہے۔ وہ فینٹسی جب لاہور کے مال روڈ پہ تانگے چلتے تھے' اور اچھرہ' سانده' نواں کوٹ وغیرہ سرسبز کھیتوں میں گھرے دیہات تھے۔ (خاص طور پر اہل لاہور کے لیے) جب جنگل' خوشبو' بارش کی بات ہو تو آپ خود اس سارے منظر میں خود کو محسوس کریں اور جس نے کہ چائے اور سگریٹ جیسی چیزوں کو بھی رومینٹسائز کر دیا۔

O حسب معمول تعارف سے ہی بات شروع کرتے ہیں۔

☆ ''امرتسر میں پیدا ہوا۔ سن مجھے یاد نہیں۔ پارٹیشن سے پہلے کی بات ہے' ایم او ہائی سکول امرتسر سے آٹھویں کے بعد رنگون گیا۔ نویں جماعت پاس کی پھر کولمبو چلا گیا۔ بعد میں آیا تو میٹرک کے لیے داخلہ مشکل ہو گیا۔ محلے میں ایک سکول سے ہی میٹرک کا امتحان دیا اور پھر بھاگ گیا۔ یہ مجھے خاص طور پر یاد ہے کہ میں کلکتے جا رہا تھا گھر سے بھاگ کر۔ لکھنؤ سٹیشن پہ گاڑی رکی' صبح کا وقت تھا۔ سول ملٹری گزٹ اخبار آیا۔ رول نمبر مجھے یاد تھا۔ میں نے جلدی سے دیکھا' میں پاس ہو گیا تھا۔ کالج میں داخلہ لینے کو میرا دل نہ کرتا تھا۔ ایم او کالج میں مجھے فیض صاحب ملے۔ اسی دوران فسادات شروع ہو گئے۔ کولمبو میں میری بہن رہتی تھیں۔ ریڈیو سیلون سے بڑے اچھے گانے آتے تھے لیکن وہ تھا امریکن اور فوجی۔ سول ورلڈ وار ختم ہو چکی تھی تو جو قابض فورسز تھیں' ساؤتھ ایسٹ ایشیا میں۔ سنگاپور' برما' ملایا ان کے لئے پروگرام آتے تھے۔ آدھا حصہ انڈین فورسز کے لئے پروگرام ہوتا تھا۔ آدھا اردو میں' آدھا انگریزی برٹش اور امریکن۔ تو جو اردو سیکشن تھا اس کے انچارج میرے بہنوئی تھے۔ کیپٹن ملک' وہاں میں کچھ عرصہ رہا۔ پاکستان بنا تو ہم یہاں آ گئے لاہور۔ میں صرف رومینٹک لکھتا ہوں یا ایڈونچر پر۔ میں نے نہ کانگریس پر لکھا' نہ انگریزوں کے بارے میں' نہ انقلاب پر' نہ کامرس' نہ سوشل پرابلمز۔ ''ادب لطیف'' میں عارف عبدالمتین تھے۔ احمد راہی تھے' یہ ایڈیٹر ہو گئے۔ میرے دوست تھے' کہنے لگے حمید یار! تم ڈائری وائری لکھتے ہو۔ لٹریچر کا بھی تمہیں شوق ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ تم لکھ سکتے ہو' ذرا ایک افسانہ لکھو۔ میں نے کہا میں نے کبھی لکھا نہیں۔ یہ 1948ء

کی بات ہے' میں نے لکھا تو میرا لکھنے کا انداز بھی الگ تھا۔ بالکل دل سے نکلی ہوئی بات۔

O ریڈیو کب جوائن کیا؟

☆ ریڈیو میں نے 1955ء میں' وہ بھی اس لیے کہ انہوں نے مجھے بطور سٹاف آرٹسٹ رکھا۔ میں نے کہا بھئی میں نوکری نہیں کر سکتا' پابند نہیں ہو سکتا۔ کام میں کر لوں گا تین سو روپے مجھے ملتے تھے جو بہت تھے۔ سٹاف آرٹسٹ کا کنٹریکٹ ہوتا تھا' سال کے سال۔ ریڈیو کا دور بہت خوبصورت تھا۔ بہت لوگ ملے وہاں مجھے۔ پاکستان کی جو کریم ہے نا وہ مجھے وہاں ملی۔ میوزک کا جو ہمارا طبقہ ہے اس پر لکھا میں نے۔

O میوزک سے بھی آپ کو کچھ شغف تھا؟

☆ ہاں کلاسیک سمجھتا ہوں۔ میوزک کے بغیر میں رائٹر بن ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ میرا جو لکھتا ہے یہ میوزک پوئٹری ہے ساری۔ اس کے بغیر میں نہیں لکھ سکتا' یہ دنیا ہی میوزک کی شاعری ہے۔ یہ مسائل تھوڑے ہیں انسان کے۔ بس پھول کھلتے رہنے چاہئیں۔

"Nature is satisified with so little."

میں بہت مطمئن ہوں دل کی دنیا میں۔ یا لکھتا ہوں یا سو جاتا ہوں اور کیا چاہئے۔

O پاک ٹی ہاؤس کب جانا شروع کیا؟

☆ 1952ء میں۔ پہلے یہ انڈیا ٹی ہاؤس کہلاتا تھا تو جب ہم آئے تو انڈیا کاٹ کے پاک لکھا جا رہا تھا۔ وہاں اشفاق بھی آ گیا۔ ناصر کاظمی' یہ ایک روشن دور تھا۔ میری بیوی مجھے وہیں ملی۔ اس کے ساتھ میرا رومانس آخری تھا۔ جو ابھی تک آخری ہے۔

O وہ کیا کرتی تھیں؟

☆ کنیئرڈ کالج میں پڑھتی تھی۔ بی اے میں۔ لکھتی بھی تھی ریحانہ قمر کے نام سے۔ میرے افسانوں کی عاشق تھی۔ دہلی گیٹ کی رہنے والی تھی۔ کنیئرڈ میں کوئی

فنکشن ہوتا تو مجھے بلا لیا جاتا۔ پھر وہ لارنس جانا' مال پہ پھرنا۔

O مطلب اچھا خاصا زوردار افیئر چلا آپ کا شادی سے پہلے۔

☆ ہاں بالکل' اس پہ میں نے ناول لکھا' بہت کچھ لکھا اس پہ بھی۔ لوگ خواہ مخواہ آپ کی ذاتی زندگی میں دخل نہیں دیتے تھے۔ ہم لارنس میں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ لارڈز میں' کیبن میں بیٹھے چائے پی رہے ہیں۔ کوئی پوچھتا نہ تھا۔

O آپ کی تحریروں سے بھی لگتا ہے کہ آپ کو نوسٹلجیا بہت ہے؟

☆ ہاں میں نوسٹیلجک ہوں۔ میں اس سے نکلنا ہی نہیں چاہتا۔ اس سے نکلتا ہوں تو باہر کچھ بھی نہیں سوائے انتشار کے۔ ہر آدمی بھاگتا پھر رہا ہے۔ پوچھیں کہ کہاں جا رہے ہو۔ ہسپتال جا رہا ہوں' تھانے جا رہا ہوں' تنخواہ لینے جا رہا ہیں' میں نہیں یہ سب کر سکتا۔ گوتم بدھ نے ایک بڑی اچھی بات کہی ہے ہرمن ہسے' جرمن رائٹر نے انگریزی زبان میں اپنے ناول کے ترجمے میں لکھا ہے' اس نے کہا کہ گوتم بدھ اپنے مریدوں میں بیٹھا تھا۔ کہا گوونداد نیا میں آفات مصیبتیں ہیں' زلزلے طوفان' تیر چل رہے ہیں تو شاگرد یعنی مرید نے کہا۔ ماسٹر ان سے بچنے کا ذریعہ کیا ہے' طریقہ کیا ہے؟ اس نے بڑی اچھی بات کہی اور یہ وہی کہہ سکتا تھا۔ کہنے لگا۔ ''تیر چلانے والے کے پاس آ کے بیٹھ جاؤ۔'' اور تیر چلانے والے کے پاس آ کے بیٹھنے کے کچھ اصول ہیں' ضابطے ہیں' وہ ضابطہ کیا ہے' نیچر کے ضابطے' اخلاق' میرز' پھر تیر کیسے لگ سکتا ہے۔

O زرد گلاب ناول لکھنے کی کیا وجہ تھی؟

☆ وجہ (سوچتے ہوئے) اصل میں جو میرے افسانوں کے رومانس ہیں' وہ رئیل ہیں۔ اگر میں سوچ کے لکھوں تو مجھے لگتا ہے جیسے میں جھوٹ لکھ رہا ہوں' باقی ایڈونچر لکھ لیتا ہوں' رومان کے لیے میرا تجربہ' اس کی خوشبو ہونی چاہیے۔ ہے نا؟ تو یہ پہلا ناول ہے میرا جو میں نے ایک زرد پھول کو دیکھ کر لکھا تھا۔ ہم مصری شاہ رہتے تھے' وہاں سے ٹی ہاؤس آ رہے تھے۔ گوالمنڈی سے نکل کر میو ہسپتال کے بیچ میں سے آتے تھے تو وہاں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے لان میں بڑے خوبصورت پھول کھلا کرتے تھے۔ انگریزی گلاب۔ تو میں اور میرے

ساتھ نواز ہوتا تھا یا حسن طارق جو بعد میں فلم ڈائریکٹر بنا۔ یہ میرے شاگرد تھے' ایک طرح سے۔ تو میں' آہستہ آہستہ چلتے گیٹ کے پاس آ کر رک جاتا' ایک زرد گلاب میں نے دیکھا۔ اتنا خوبصورت۔ پتا نہیں اس نے کیا کیا میرے ساتھ۔ بس وہ لڑکی کا تصور میرے ذہن میں لے گیا۔ ایسا ہو جاتا ہے نا کبھی کبھی کہ بعض لڑکیوں کو دیکھ کر گلاب یاد آتا ہے۔ یہاں الٹا ہو گیا تو یوں میرے ذہن میں پلاٹ آیا۔

O حلقہ ارباب ذوق کل کیا تھا اور آج کیا ہے؟

☆ میں ان کے پاس جاتا ہی نہیں تھا۔ میں اپنے افسانے Progressive Union میں پڑھتا تھا۔ حمید اختر' عبداللہ ملک' ابراہیم جلیس' ساحر لدھیانوی اور ابن انشاء وغیرہ تھے اس میں۔ میں حلقہ ارباب ذوق کے لوگوں کے بارے میں کہا کرتا تھا' یہ بے چارے سیدھے لوگ ہیں۔ ایک تو ان کی شکلیں بڑی سیدھی ہیں' عینکیں لگائی ہوئیں۔ میرے دوست سب خوش لباس تھے' سوٹ اور ٹائیاں لگانے والے۔ ٹائی کی ناٹ دیکھتے تھے کہ کس کی اچھی ہے۔ تھے ہم مڈل کلاس لوگ۔ مصری شاہ میں رہتے تھے۔ کپڑے وہاں سے پریس کراتے۔ تانگے میں لے کے جاتے۔ انور جلال آرٹسٹ تھا' بڑا خوبصورت آدمی تھا۔ انگلینڈ میں جا کے فوت ہوا۔ یہ جو میجر جنرل تنویر نقوی ہے' اس کی شکل ہو بہو انور جلال سے ملتی ہے۔ پھر سلوتھا' حسیب تھا۔ ''نت'' کا ہیرو۔ حلقہ ارباب ذوق میں کبھی کبھی ہم تفریح کے طور پر بیٹھا کرتے تھے۔

O سگریٹ' خوشبو اور چائے کا ذکر بطور خاص آپ کے ہاں ملتا ہے۔ کیا یہ شعوری کوشش ہوتی ہے؟

☆ بھئی میں ایک رومینٹک آدمی ہوں۔ بغیر رومانس کیسے میں افسانہ نہیں لکھ سکتا۔ میں کیسے ان چیزوں کے تذکرے کے بغیر لکھ سکتا ہوں۔ چائے جو میری بیوی بناتی ہے یا میں بناتا ہوں مجھ پہ بہت اثر کرتی ہے۔ اسی طرح اچھا سگریٹ بھی۔ اب سگریٹ خراب ہو گئے ہیں۔ آس پاس کی چیز لکھنے والے کی تحریر میں ضرور نظر آتی ہے' خاص طور پر پسندیدہ چیز۔

O آپ کی تحریروں کا ایک خاص موڈ ہے' جو پڑھنے والے پہ بھی طاری ہو جاتا ہے۔

☆ ہاں مجھے لکھنے کے لیے ایک خاص قسم کا موڈ بنانا پڑتا ہے۔ کیفیت طاری کرنا پڑتی ہے' اس میں جائے بغیر میں لکھ نہیں سکتا۔ میں بہت کم کھاتا ہوں۔ پتا ہے؟ شیبے نے کہا تھا۔ میں عورت کو کھاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ میں نے کہا یہ اصل رومینٹک آدمی ہے۔ یہی حال میرا ہے۔ میں بھی نہیں دیکھ سکتا۔ خود بھی ہلکی پھلکی چیزیں کھاتا ہوں تاکہ معدہ ہلکا پھلکا رہے۔ مٹھائی سموسے یہ میں نہیں کھاتا۔

O اسی لیے آپ ابھی تک صحت مند اور ماشاءاللہ ہلکے پھلکے دکھائی دیتے ہیں۔

☆ اسی لیے سمارٹ ہوں۔ امانت علی خاں مجھے کہا کرتا تھا۔ یار یہ پیٹ کیسے اتار رکھا ہوا ہے تم نے۔ میں نے کہا کھانا کم کر دو' اور کیفیت یا تو محبت سے طاری ہوتی ہے' ایک Pain' ایک درد یا کوئی خیال آ جائے بچھڑ جانے کا یا خواب میں کچھ دیکھ لیا۔

O فرائڈ نے جو منٹو اور اسی طرح بہت اچھے لکھنے والوں کو متاثر کیا تھا مثلاً ممتاز مفتی وغیرہ کو تو کیا آپ کا بھی کچھ اس طرف رجحان رہا؟

☆ نہیں وہ میری لائن ہی نہیں ہے۔ منٹو صاحب کا لکھنا مجھے پسند نہیں۔ لیکن ممتاز مفتی صاحب بہت اچھا لکھتے تھے۔ تو جس پنڈ نہیں جانا اس کی راہ کا کیا پوچھنا ہے۔ کرشن چندر مجھے پسند تھا۔ بڑا رومینٹک آدمی تھا۔

O آج تک اردو ادب کے حوالے سے نوبل پرائز نہیں ملا تو آپ کیا سمجھتے ہیں کہ آج تک کیا اس طرح کا افسانہ یا ناول نہیں لکھا گیا؟

☆ اصل میں یہ زبان انٹرنیشنل نہیں۔

O مگر رابندر ناتھ ٹیگور نے بھی بنگالی میں لکھا انہیں تو نوبل پرائز ملا ہے۔

☆ وہ تو انٹرنیشنل لیول کا آدمی تھا۔ اس نے انگریزی میں بھی لکھا' ترجمہ بھی کیا' میوزیشن تھا بہت بڑا۔

O ترجمہ کیا ہمارے ہاں نہیں ہو سکتا؟

☆ ہم بھی ترجمہ کریں تو پھر ہے' میرے ترجمے ہوئے ہیں انڈیا وغیرہ میں۔ ابن انشاء نے مجھے خط میں لکھا تھا کہ تمہیں پتا ہی نہیں کہ تم کیا ہو۔ قرۃ العین حیدر نے تمہارے ایک افسانے کا ترجمہ کیا ہے۔ وہ بھجوایا اس نے۔ اب اردو میں نوبل پرائز کے لئے ہمہ گیر کام ہونا ضروری ہے۔ اس کی Presentation کے لیے پوری لابی چاہئے۔ اس میں منشی پریم چند کا کفن' منٹو' غلام عباس صاحب کے افسانے آ سکتے ہیں۔ قاسمی صاحب ہیں مگر کوئی کام کرے تو پھر ہے نا۔ یہ سلیکشن ہونی چاہئے۔

O فیض صاحب اور احمد ندیم قاسمی میں سے کس کو بڑا شاعر سمجھتے ہیں آپ؟

☆ دونوں ہی بڑے شاعر ہیں۔ قاسمی صاحب افسانہ نگار بھی بہت اچھے ہیں' ان کے افسانے پڑھ کر ہم نے لکھنا شروع کیا تھا۔ ایمانداری کی بات ہے..... تو ''چوپال'' وغیرہ پڑھے تھے ہم نے' بڑا اثر ہوا تھا۔ اب بھی متاثر ہوں' قاسمی صاحب سے۔ بہت نائس آدمی ہیں۔ بہت اچھے افسانے اور شاعری ہے ان کی۔ بھئی ان کی اپنی ایک دنیا ہے' جس میں وہ لکھتے ہیں اور فیض صاحب کی اپنی ایک دنیا ہے' جس میں وہ لکھتے ہیں۔ پچھلے دنوں کنٹروورسی چل رہی تھی۔ اخبار والوں نے مجھ سے بھی پوچھا تو میں نے کہا بھئی مجھے نہ الجھائیں اس میں۔ فیض صاحب کی مجلس میں ہمیں بھی بیٹھنے کا موقع ملا ہے۔ تو وہ بھی کسی کو برا نہیں کہتے تھے۔ بڑی رواداری تھی ان میں۔ سب کا اچھی طرح ذکر کرتے تھے۔ ہم نے تو ان کی زبان سے قاسمی صاحب کے بارے میں کبھی کچھ نہیں سنا اور اگر قاسمی صاحب نے یہ کہا تو مجھے نہیں پتا۔ ہمارے سامنے تو قاسمی صاحب نے ایسی بات کبھی نہیں کی۔

O ابن انشاء کے ساتھ آپ کی کیسی دوستی تھی؟

☆ بہت اچھی۔ چونکہ ہم سب پروگریسو رائٹر تھے۔ پہلے سے ہی جو میرے دوست تھے' وہ بھی پروگریسو رائٹر تھے۔ پارٹیشن ہوا تو ہم سب دوست اکٹھے یہاں آئے۔ حمید اختر' ساحر لدھیانوی' جلیس' عبداللہ ملک' ابن انشاء' اکٹھے چلنا پھرنا' میٹنگیں ہوئیں۔ افسانے پڑھے۔ اس دوران ہی ابن انشاء سے میری دوستی بہت زیادہ ہو گئی۔ اس کے جو خطوط میرے پاس ہیں نا وہ بڑے پیارے خط

ہیں اس کے۔ اس نے اس میں لکھا ہے کہ حمید! تم سے زیادہ مجھے کوئی نہیں جانتا اور نہ کوئی سمجھ سکتا ہے اور نہ ہی یہ کسی کو حق ہے کہ میرا کوئی مضمون چھاپے۔ ہاں اگر تم چھاپو تمہیں پورا حق ہے۔ جو آدمی مجھے یاد آتے ہیں نا ان میں ناصر کاظمی اور ابن انشاء مجھے بہت یاد آتے ہیں۔ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا جس دن یہ دونوں مجھے یاد نہ آتے ہوں۔ آخری ملاقات بھی ابن انشاء سے میری اسی مکان میں ہوئی۔ وہ جب بھی آتا مجھ سے ضرور ملتا۔ آخری بار جب آیا تو ہمارے ہاں کوئی دعوت تھی۔ دعوت ختم ہونے کے بعد زردہ پلاؤ کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ کہنے لگا۔ ''گھر میں کوئی دعوت ہے؟'' میں نے کہا۔ ''ہاں یار! کچھ کھالو۔'' تو کہنے لگا۔ ''ریحانہ کڑے! (یعنی لڑکی) کڑے کہتا تھا وہ ریحانہ کو۔ کڑے زردہ لا بھئی۔ تو بالکل تھوڑا سا اس نے کھایا۔ میں باہر الوداع کہنے آیا۔ اس وقت وہ جاپان سے آیا تھا چیک اپ کروانے۔ وہاں انہوں نے کہیں کہہ دیا تھا کہ تمہیں کینسر ہے تو انگلینڈ جا رہا تھا چیک اپ کے لئے۔ تو میں نے پوچھا۔ ''یار! ڈاکٹرز نے کیا کہا ہے؟ کہنے لگا۔'' کچھ نہیں اپنی اپنی باتیں کرتے ہیں یار!...... میں ٹھیک ہو جاؤں گا اور وہاں سے جا کے خط لکھوں گا۔'' وہاں گیا۔ ہسپتال داخل ہوا اور اس کی ڈیتھ ہو گئی۔ بڑی جلدی فوت ہو گیا۔ ان لوگوں کو نہیں مرنا چاہئے تھا اتنی جلدی۔''

اے حمید صاحب کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔ ہم نے موضوع بدلا۔

O انسان کی کامیابی میں مقدر کا کتنا ہاتھ ہے؟

☆ جتنا مقدر میں لکھا ہے وہ انسان کو ضرور ملے گا۔

O محنت پہ یقین ہے یا توکل پر؟

☆ محنت کر کے توکل کرنا چاہئے؟ توکل ویسے بڑی مشکل سے پیدا ہوتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں۔ مگر ایسا ہوتا نہیں۔ میں تو دعا کرتا ہوں سب کو ہو جائے۔ میرا تو ایمان ہے اللہ پر۔

O ہمارے کسی صحافی دوست نے کہا تھا کہ آپ کا ایک ناول پڑھ لیں تو لگتا ہے سارے پڑھ لیے ہیں؟ سب ایک جیسے لگتے ہیں تو کیا یہ یکسانیت اثر انداز نہیں

ہوتی؟

☆ میں بار بار یاد دلانا چاہتا ہوں کہ میں نے یہ کہا ہے۔ ن م راشد نے مجاز سے کہا۔ ''یار! تم ہر مشاعرے میں پرانی غزل کیوں پڑھتے ہو؟'' کہنے لگا۔ ''اس لیے کہ میری پہلی غزلیں ابھی لوگوں کو یاد نہیں ہوئیں۔ وہ یاد ہو جائیں تو نئی پڑھوں۔'' حمید صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔

O تو یہ بار بار کی تکرار کیا صحیح ہے؟

☆ نہیں یہ تکرار نہیں۔ اب آپ دیکھیں' ہر بہار میں پھول کھلتے ہیں' کلیاں آتی ہیں' کوئی تنگ نہیں پڑتا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ دیکھنے والے کی کیفیت میں فرق آ جائے۔ مثلاً اگر دس بیس سال پہلے مجھے پڑھا تھا تو اب کی تحریروں میں رومینٹسزم کے ساتھ Wisdom کی بات نظر آئے گی۔ کوئی بات ایسی ہو گی جو پہلے سے ہٹ کے ہو گی۔

O محبت کے بارے میں کچھ کہیے؟

☆ محبت ایک بڑا مجرد لفظ ہے کس سے محبت؟

O چلیں عورت سے کہہ لیں۔

☆ عورت سے محبت کے بغیر تو میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ عورت کی محبت اصل چیز ہے جس نے مجھے سب کچھ دیا۔

O ایک سے زیادہ محبت ہو سکتی ہے؟

☆ مجھے تو ہو جاتی ہے۔ انہوں نے مسکرا کر کہا۔ ''جیسے نئی کونپلیں پھوٹتی ہیں۔''

O محبت دینا اہم ہے یا لینا؟

☆ نہیں نہیں' اس میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کون کر رہا ہے' کون کروا رہا ہے۔ یہ نہیں ہوتی بات۔ یہ تو ایک خوبصورت چیز ہے' خوشبو آ رہی ہے' یہ دیکھتا ہی نہیں کہ کہاں سے آ رہی ہے۔ خوشبو ہے۔ چاندنی ہے۔ میرا نوسٹلجیا بچپن کا بھی ہے۔ وہ باغ مجھے نہیں بھولتے۔

O یہ جو آپ کے سفرنامے ہیں کیا یہ حقیقت ہیں یا صرف تخیل؟

☆ حقیقت ہی ہیں۔ Event اس میں ہیں' کچھ فکشن ہے۔ دیکھا ہوا ہے میں

نے سب۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ میرے ساتھ ہوا ہو۔ کسی اور کے ساتھ ہوا میں نے اس میں لکھ دیا۔

O کیا رائٹر کو کمرشل ہونا چاہیے؟

☆ مشکل پڑ جائے تو ہونا چاہیے۔ مجھے تو مشکل پڑی ہوئی ہے۔ میں نہ لکھوں تو کیا کروں۔ میرا معاملہ تو بجٹ کا ہے۔ یہ نہ ہو تو میں صرف رومینٹک لکھوں۔ نہ میرے پاس کوئی بینک بیلنس ہے۔ اشفاق کی طرح۔ وہ تو لکھ پتی سے بھی زیادہ ہے۔ جانے کہاں سے آ گیا اس کے پاس اتنا پیسہ۔ میں پوچھتا ہوں اس سے' وہ ہنس پڑتا ہے۔ میرے سامنے وہ غریب آدمی بن کے ملتا ہے۔ میرا یار ہے وہ' مجھے اس سے پیار بھی ہے۔ بہت اچھا افسانہ لکھتا ہے بلکہ ایک دفعہ اس کا ایک پرانا افسانہ چھپا تو میں نے فون کر کے اس سے کہا تھا۔ ''تم نے کمال کر دیا ہے۔'' کہنے لگا۔ ''تم محبت کرتے ہو نا...... میں نے کہا۔ ''نہیں تم بہت اچھا لکھتے ہو۔'' اس کی بائیوگرافی بھی میں نے لکھی ہے۔

O بانو آپا کیسی ہیں؟

☆ اس کو میں نے نہیں پڑھا۔

O عورت رائٹرز میں کون پسند ہے؟

☆ قرۃ العین حیدر اور حجاب امتیاز علی۔ وہ تو ماسٹر ہیں۔ وہ عورتیں تو مجھے اب بھی انسپائر کرتی ہیں' یہ دو عورتیں مجھے پسند ہیں لکھنے میں۔ باقی میری لائن کی نہیں ہیں' میری سمجھ میں نہیں آتا' وہ کیا لکھتی ہیں۔

O شادی کب ہوئی تھی آپ کی؟

☆ میرا خیال ہے 1954ء میں۔ یہ لو میرج تھی اور بڑی مشکل سے ہوئی۔ میں کشمیری فیملی کا اور یہ مغل تھے لاہور کے۔ میں رائٹر تھا' یہ بہت بڑی فیملی تھی۔ بڑے روایتی لوگ تھے۔ بڑے سنسکار تھے ان کے اپنے۔ انہوں نے پوچھا کہ ''یہ کام کیا کرتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''رائٹر ہوں۔'' کہتے ''وہ کیا ہوتا ہے؟'' وہ سچے تھے۔ انہوں نے انکار کر دیا۔ پھر قاسمی صاحب سے میں نے کہا اور شفیق الرحمان سے۔ میرے گھر والے کہنے لگے۔ ''وہ ٹھیک کہتے ہیں تم کام نہیں

کرتے۔ دوسروں کی لڑکی لا کے خراب کرنی ہے تم نے...... بھوکا مارنا ہے اسے۔'' وہ بھی میرے خلاف تھے۔ کہتے تھے کوئی نوکری کرو' پھر شادی کریں گے۔ ایویں تم شادی کرنے چل پڑے ہو۔ قاسمی صاحب کو میرے رومان کا پتا تھا۔ یہ پھر گئے اس کے والد صاحب کے پاس۔ ''فکر نہ کریں' بڑا اچھا لڑکا ہے پیسے کماتا ہے۔'' کیونکہ مجھے تو پہلے افسانے سے پیسے ملنے شروع ہو گئے تھے۔ یونہی تو نہیں بوسکی کی قمیصیں آتی تھیں۔ پینٹ' شوز' پھر وہ مان گئے۔ خاندانی لوگ تھے' شریف' یوں شادی ہو گئی۔ ہم اب بھی دوستوں کی طرح رہ رہے ہیں میاں بیوی۔

O بچے کتنے ہیں؟

☆ دو۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ لڑکا مسعود NCA میں لیکچرر ہے۔ میرے ساتھ ہی رہتا ہے۔ یہ آرٹسٹ ہے پینٹنگز بناتا ہے جبکہ بیٹی لالہ رخ' وہ امریکہ میرے ساتھ گئی تھی۔ ہم چار پانچ سال وہاں رہے ہیں۔ اس نے کمپیوٹر میں پروگرامنگ کی اور سٹی بنک میں ملازم ہو گئی۔ وہ کمپیوٹر پروگرامر ہے' اس کا خاوند بھی سٹی بنک میں کریڈٹ کارڈز کا انچارج ہے' ترقی ہو گئی ہے ان کی' اس لیے اب وہ کراچی جا رہے ہیں۔

O پرانے لاہور اور نئے میں کیا فرق ہے؟

☆ بہت فرق ہے۔ اس لیے میں تو بہت کم باہر نکلتا ہوں۔ اب تو بہت شور شرابا ہو گیا ہے۔ جو بہت دکھی کرتا ہے۔ پرانے لاہور کی تو کیا بات تھی۔ میں اب بھی خیالوں میں اسی میں رہتا ہوں۔

O ادب اور صحافت میں کیسے فرق کرتے ہیں؟

☆ بڑا فرق ہے۔ ادب تو ایک مستقل قدر ہے' جبکہ صحافت ایک پیریڈ ہے' دور ہے۔ اس کی کہانی ہے' جس کا تعلق انسان کی بنیادی قدروں سے نہیں۔ سیاسی افسانے جو ایک دور میں ہوتے ہیں' ختم ہو جاتے ہیں۔ میں اخبار میں رہا ہوں مگر میرا دل نہیں لگتا وہاں۔

O شاعری نہیں کی آپ نے؟

☆ نثر میں جو شاعری کر رہا ہوں۔ اگر قدرت وہ چیز پیدا کر دیتی تو میں شاعر ہوتا۔

O عوام میں اپنا مقام بنانا زیادہ مشکل ہے یا ادب میں؟

☆ عوام کے بارے میں تو کسی لیڈر سے پوچھیں۔ مجھ سے تو ادب کا پوچھیں۔ ادب میں اگر آدمی مقام کا سوچ کر آئے تو وہ ''مکان'' تو بنا سکتا ہے ''مقام'' نہیں۔

O ادب کتنی مدد کرتا ہے زندگی سمجھنے میں؟

☆ بہت زیادہ۔ گورکی کو میں نے بہت پڑھا۔ بچپن میں اور چیخوف کو تو اگر کوئی رشین سامنے آئے تو وہ جانا پہچانا لگتا ہے کہ وہ ایسے بیٹھتے ہیں' ایسے باتیں کرتے ہیں۔ اسی طرح احمد علی کے افسانے ''ہماری گلی'' سے دلی کے پرانے لوگ سامنے آتے ہیں۔ دیہات کا نقشہ قاسمی صاحب سے بہتر کس نے کھینچا ہے۔ یہ زندگی کے لوگ ہیں۔ لوگوں کے رویے سمجھنے میں بڑا ہاتھ ہے ادب کا۔

O کتنی کتابیں اب تک شائع ہوئیں آپ کی؟

☆ کافی ہیں لیکن افسانوں پہ چار پانچ ہیں۔ کچھ ناول' ناولٹ ہیں۔ سنگ میل والوں نے میرا انتخاب چھاپا ہے۔ ''بارش اور خوشبو'' کے نام سے ''زرد گلاب'' ''جنگل روتے ہیں'' ''جھیل اور کنول'' ''منزل منزل'' دوبارہ چھپے ہیں۔ باقی سفرنامے' کمرشل ایڈونچر' بچوں کے لیے۔ آج کل ایبٹ آباد میں ایک سیریل کی شوٹنگ ہو رہی ہے جو جلد آن ایئر آئے گا۔

O عینک والا جن آپ کے مزاج سے بہت مختلف ہے۔

☆ کیا کروں' انہوں نے کہا۔ بچوں کے لئے لکھنا ہے تو بچوں کے لیے اسی طرح کا ہی ہو سکتا ہے۔ پبلک نے بہت پسند کیا۔ غالباً چار سال چلا۔ اس کے کیریکٹرز ابھی بھی لوگ یاد کرتے ہیں۔

O اتنا آپ گھومے پھرے کوئی خاص واقعہ؟

☆ میری عمر چودہ پندرہ سال کی تھی جب میں گھر سے نکلا۔ نیچر نے مجھے دیوانہ کیا ہوا تھا۔ ایک اضطراب تھا۔ دیوانگی تھی۔ وہاں میں نے طوفان' بارشیں دیکھیں' جنگلوں کے سناٹے' نیچر کے عجیب موڈز دیکھے میں نے۔ اس وقت پتا چلا کہ

آدمی نے کیوں پوجا شروع کر دی تھی۔ درختوں کی' سورج کی۔ واقعات سے میری کتابیں بھری پڑی ہیں۔

O کیا تنقید کو تخلیق کہا جا سکتا ہے؟

☆ نہیں۔ تنقید' دوسرے کی تخلیق کو لے کر لکھنا' کہ میں سمجھتا ہوں یوں ہونا چاہئے' کوئی دوسرا کہتا ہے۔ نہیں یوں ہونا چاہئے' آپ کو کیا پتا بھئی' یہ تخلیق نہیں۔

O پرائڈ آف پرفارمنس بھی ملا آپ کو؟

☆ ہاں لیکن صرف یہ فرق پڑا کہ ٹی وی کا معاوضہ بڑھ گیا۔ پچاس ہزار دے کر چپ بیٹھ گئے۔ کچھ پنشن لگاؤ بھئی' آدھا کرایہ کر دو جہاز کا۔ شہریار نے مجھے فون کیا کہنے لگا۔ ''یہ کیا پرائڈ آف پرفارمنس دے کے چپ ہو گئے ہیں۔ کچھ ایسا ہوتا جس سے مستقل فائدہ ہوتا۔ ڈبوں میں تصویریں پڑی ہیں۔ کیا کریں اس کو لے کے۔''

O مردوں میں پسندیدہ رائٹر کون ہے؟

☆ کرشن چندر اور سید رفیق حسین۔

O اپنا افسانہ کون سا پسند ہے یا ناول؟

☆ منزل منزل اور زرد گلاب۔

O کس بات سے ڈر لگتا ہے؟

☆ خدا سے اور کسی چیز سے نہیں ڈرتا۔ اس کے اصول وضوابط سے ڈرتا ہوں۔ وہ بڑا بے نیاز ہے۔ مجھ پر مہربان بھی ہے۔ میں نے کہا۔ ''تیری وجہ سے ہے جو کچھ بھی میرے پاس ہے۔ جو کچھ تو نے مجھے دیا میں نے اس کو خراب نہیں کیا۔ اتنا خوبصورت جو تو نے مجھے دیا' اتنا میں رکھ نہیں سکا' یہ مجھے معاف کرنا۔'' اللہ سے زیادہ حسن کار کوئی نہیں جس نے پھول بنائے ہیں' نیچر بنائی۔ خوبصورت عورت بنائی' وہ خود کیا ہو گا ایک فلم آئی تھی اس میں گانا تھا ''یہ کون چتر کار ہے۔'' ذہن میں نہ ہو تو Create نہیں ہو سکتا' وہ کیسا ہو گا خود۔ عورت بوڑھی ہو جاتی ہے۔ پھول مرجھا جاتا ہے' وہ وہی رہتا ہے۔ اس کو کبھی کچھ نہیں ہو سکتا۔ ایک فقرہ مجھے بڑا پسند آیا کہ روشنی کبھی بوڑھی نہیں ہوتی۔ وہ بھی نور

ہے۔ آدمی کا جو بیوئی کا Conception ہوتا ہے نا' یہ زندہ رہنا چاہیے۔ آدمی جب مر جاتا ہے تو روح تو وہی ہوتی ہے۔ وہ بوڑھی نہیں ہوتی۔ بس آدمی خود اسے دکھی کر دیتا ہے۔ یہ کس جسم میں آ گئی؟ یہ کیا کر رہا ہے آدمی میرے ساتھ؟ ہم کہتے ہیں' میں ہوں' میری ایک روح ہے۔ نہیں میں ایک روح ہوں' میں ایک جسم ہوں۔ یہ تو کھوٹ ہے' ایک پرانا کپڑا ہے۔ مر گیا۔ گھبرا کے دوسرے دن پھینک دیں گے مجھے۔ اصل روح ہے چپکے سے چلی جاتی ہے۔ دیکھتی ہے' کیا کیا تم نے میرے ساتھ؟ تھوڑا سا بوجھ دے دیا ہے' کچھ غم دے دیا ہے' کچھ ندامت۔ میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ وہ بے چاری بوجھل ہو جاتی ہے۔ پرواز کرتی ہے اوپر۔ جانا تو اوپر ہی ہے اس نے' تو پرواز ذرا نیچی ہو جاتی ہے۔ پھر قدرت آہستہ آہستہ اسے پاک صاف کر دیتی ہے۔ اپنے پاس لے آتی ہے۔ تو آدمی کو چاہیے کہ روح کو آزردہ نہ کرے اور اس کی یہی ایک شکل ہے جو شارٹ کٹ میں نے چالاکی سے ڈھونڈا ہے' وہ ہے نیچر سے محبت۔ باقی سب بھول جاؤ۔ اس کے ہاں نہ شادی ہے نہ بچے ہیں۔ وہ بس محبت ہی محبت ہے۔ کوئی پھول آپس میں شادی نہیں کرتے۔ بچوں سے آدمی کو پیار تو ہوتا ہے لیکن جو لگاؤ ہے نا فارحہ! وہ انسان کو اپنے اصل سے ہوتا ہے جس کے پاس جانا ہے۔ ایک بار میں نے پڑھا تھا۔ ''اس آدمی کو افسوس ہوتا تھا کہ اس کا جسم بھی ہے۔'' کیسی اچھی بات ہے۔

O موجودہ ادبی منظرنامے پہ آپ کیا کہتے ہیں؟

☆ لکھنے پر پابندی ہو تو کوئی لکھے گا کیا؟ مجھے ایک دفعہ کسی نوجوان لکھاری نے کہا۔ جس وقت آپ لکھتے تھے تب بڑی آزادی تھی وہ آزادی ہمیں نہیں ملی۔ میں نے کہا۔ سوچ Genuin (خالص) ہونی چاہیے باقی تو چلتا رہتا ہے۔

O ہماری خواتین رائٹرز کو کچھ کہنا چاہیں گے؟

☆ عورتوں کو تو میں یہ کہوں گا نہ لکھو' کوئی اور کام کرو۔ کیریئر بناؤ یا پھر واقعی بہت اچھا لکھو' سچا۔ کھوٹ سے پاک۔ اگر ان کے اندر ریئلیٹی ہے' دل ہے تو لکھیں اور یہ چیز بھول جائیں کہ کوئی ان کو پسند کرتا ہے یا نہیں۔

O ہمارے قارئین سے کچھ کہیں گے؟

☆ ان کے لیے یہی کہ میں بڑا مشکور ہوں کہ میرا لکھا ہوا پسند کیا گیا ہمیشہ اور میری زیادہ ریڈرز لڑکیاں ہی ہیں۔ مجھے بہت خط آتے رہتے ہیں۔ کوئی انکل کہتا ہے کوئی کچھ' مگر ایک لڑکی نے لکھا۔ ''پیارے اے حمید...... وغیرہ وغیرہ تو میں ڈر گیا۔''

انہوں نے ہنستے ہوئے کہا تو ہم نے بھی اس بات سے لطف لیتے ہوئے اے حمید صاحب سے اجازت چاہی۔

☆......☆......☆